شہید

بھگت سنگھ

دستاویزوں کے آئینے میں

تدوین

چمن لال

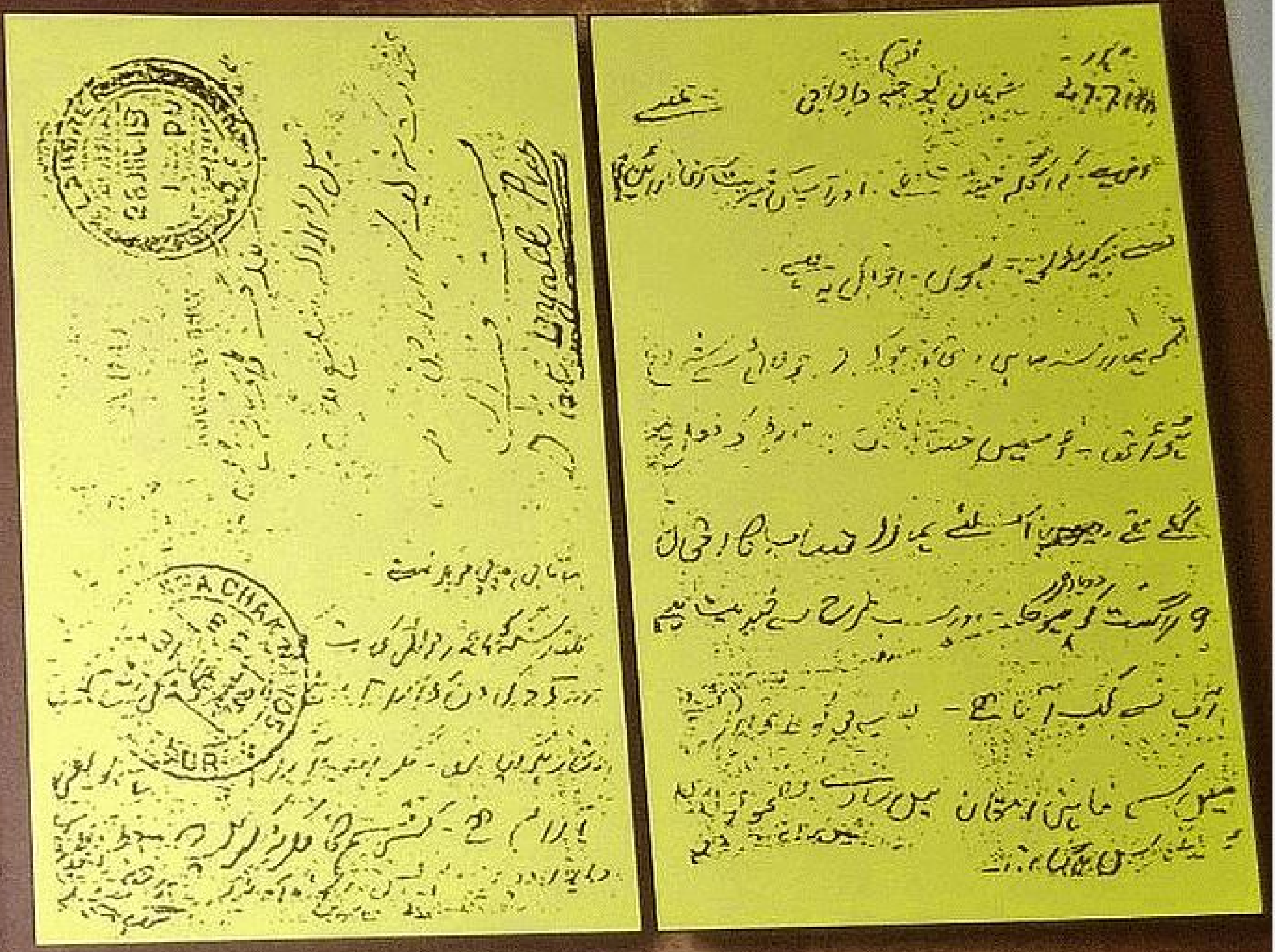

شہید بھگت سنگھ کے تحریر کردہ سب سے پہلے خط کا عکس جو انہوں نے اردو میں تحریر کیا تھا۔

قیمت : 345.00 روپے

پبلی کیشنز ڈویژن
وزارت اطلاعات ونشریات
حکومت ہند

ISBN 81-230-1934-5
BIO-URD-TR-21-2014-15

شہید

بھگت سنگھ

دستاویزوں کے آئینے میں

تدوین

چمن لال

بھگت سنگھ

(28 ستمبر 1907-23 مارچ 1931)

شہید بھگت سنگھ

دستاویزوں کے آئینے میں

تدوین
چمن لال

پبلی کیشنز ڈویژن
وزارت اطلاعات ونشریات
حکومت ہند

شک 1936 (2014)

پبلی کیشنز ڈویژن

PD	ISBN No.81-230-1934-5
BN	BIO-URD-TR-110-2013-14

قیمت: روپے

ایڈیشنل ڈائریکٹر، پبلی کیشنز ڈویژن
وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند
سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی۔ 110003
ویب سائٹ: http://www.publicationsdivision.nic.in

فروخت مراکز: پبلی کیشنز ڈویژن سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی۔ 110003. ہال نمبر 196، اولڈ سکریٹریٹ، نئی دہلی۔ 110054. بی۔ 701، بی ونگ، کیندریہ سدن، بیلاپور، نوی ممبئی 400614. 8، اسپلینیڈ ایسٹ، کولکاتا۔ 700069. اے ونگ، راجاجی بھون، بیسمنٹ نگر، چنئی۔ 600090. پریس روڈ، نزد گورنمنٹ پریس، تروننتاپورم۔ 695001. بلاک نمبر 4 پہلی منزل، گرہ کلپ کمپلیکس، ایم جی روڈ، نامپلی، حیدرآباد۔ 500001. پہلی منزل، ایف ونگ، کیندریہ سدن، کورامنگلا، بنگلور۔ 560034. بہار اسٹیٹ کوآپریٹو بینک بلڈنگ، اشوک راج پتھ، پٹنہ۔ 800004. ہال نمبر 1 دوسری منزل، کیندریہ بھون، سیکٹر 8 علی گنج، لکھنؤ۔ 226024. امبیکا کمپلیکس، پہلی منزل پالدی، احمدآباد۔ 380007. ہاؤس نمبر 07، چینی کوٹھی، نیو کالونی، کے کے بی روڈ، گوہاٹی۔ 781003

Shaheed Bhagat Singh Dastavezon Ke Aaine Mein (Urdu)

Author : Chaman Lal

Ediotorial Co-ordination : Irshad Ali

Translation : Mohd. Sajid

Cover Design : R S Rawat

پرنٹنگ پریس:

فہرست

پیش لفظ: بھگت سنگھ - بے مثال شخصیت 1

باب 1: خط، تار، نوٹس اور پرچے

(الف) اسکول سے لکھے گئے خطوط

1. دادا کے نام خط 21
2. دادا کے نام ایک اور خط 22
3. چچی کے نام خط 22
4. دادا کے نام ایک اور خط 23
5. چچی کے نام ایک اور خط 23

(ب) کالج سے لکھا گیا خط

6. گھر سے الوداع: والد صاحب کے نام خط 24

(ج) انقلابی زندگی کے خطوط

7. دوست امر چند کے نام خط 25
8. 'مہارتھی' میگزین کے ایڈیٹر کے نام خط 26

(د) دھماکوں کی گونج

9. سانڈرس کے قتل پر نوٹس 27
10. انڈین سوشلسٹ ری پبلک آرمی 28
11. اسمبلی ہال میں پھینکا گیا پرچہ 28

(ہ) جیل سے لکھے گئے خصوصی خطوط

12. سکھدیو کے نام 30
13. والد صاحب کے نام خط 31

(و) جیل میں جدوجہد کے دوران لکھے گئے خطوط اور نوٹس

14. انسپکٹر جنرل کے نام خط 32
15. بھوک ہڑتال کا نوٹس 33
16. ہوم ممبر کے نام خط 33
17. پنجاب جیل انکوائری کمیٹی کے صدر کے نام خط 35
18۔ وزیر داخلہ، حکومت ہند کو ٹیلی گرام 36
19۔ وزارت داخلہ، حکومت ہند کو میمورنڈم 37

20۔ اسپیشل مجسٹریٹ لاہور کے نام 41
21۔ 'ٹریبیون' کی ایک دلچسپ رپورٹ 43

(ز) سیاسی طرز کے ٹیلی گرام

22۔ تیسری انٹرنیشنل ماسکو کے صدر کو ٹیلی گرام 43
23۔ کاکوری کیس کے قیدیوں کے نام ٹیلی گرام 44
24۔ ہندوستانی کمیٹی' برلن کے نام ٹیلی گرام 44

(ح) برطانوی عدالتی نظام کی حقیقت عیاں کرنے والے خطوط

25۔ خصوصی ٹربیونل کے قیام پر
26۔ عدالت ایک ڈھکوسلہ ہے 46
27۔ خصوصی ٹربیونل کی تشکیل نو پر 48

(ط) کچھ اور سیاسی خطوط

28۔ طلبا کے نام خط 50
29۔ 'ماڈرن ریویو' کے ایڈیٹر کے نام خط 50
30۔ بھوک ہڑتال کے دوران سکھ دیو کو ایک اور خط 52
31۔ مصائب سے بھاگنا بزدلی ہے 52
32۔ والد کے نام خط 56
33۔ سیاسی معاملات کی پیروی پر 58
34۔ ہمیں گولی سے اڑایا جائے 61
35۔ شہادت سے قبل دوستوں کو آخری خط 63

(ی) جیل سے لکھے گئے ذاتی خطوط

36۔ بچپن کے دوست جے دیو کے نام خط۔1 63
37۔ جے دیو گپت کے نام خط۔2*** 64
38 ۔ جے دیو گپت کے نام خط۔3 65
39۔ جے دیو کے نام خط۔4 65
40۔ بٹوکیشور دت کی بہن پرومیلا کو خط 66
41۔ بٹوکیشور دت کے نام خط 67
42۔ چھوٹے بھائی کلبیر کے نام خط 67
43۔ کلبیر کے نام خط۔2 68
44۔ کلبیر کے نام خط۔3 69
45۔ چھوٹے بھائی کلتار کے نام خط

باب 2۔ عدالتوں میں دیئے گئے بیانات

46۔ بم کانڈ پر سیشن کورٹ میں بیان 70
47۔ بم کانڈ پر ہائی کورٹ میں بیان 75

باب۔3: مضامین

48۔ پنجابی زبان اور رسم الخط کا مسئلہ 86
49۔ عالم دوستی 92

50۔نوجوان 96

51۔آچاریہ شیو پوجن سہائے کی ڈائری کے اقتباسات (صفحہ 28) 96

52۔ہولی کے دن خون کے چھینٹے 98

53۔کاکوری کے بہادروں سے تعارف 102

54۔کاکوری کے شہیدوں کے پھانسی کے حالات 106

55۔کوکا بغاوت۔1 110

55۔تصویروں کا تعارف 119

57۔کوکا بغاوت۔2 120

58۔مدن لال ڈھینگرا 123

59۔نراجیت۔1 128

60۔نراجیت۔2 131

61۔نراجیت۔3 134

62۔روس کے عہد ساز تخریب پسند 138

63۔مذہب اور ہماری جدوجہد آزادی 143

64۔فرقہ وارانہ فسادات اور ان کا تدارک 146

65۔اچھوتوں کا مسئلہ 148

66۔ستیہ گرہ اور ہڑتالیں 152

67۔طلبہ اور سیاست 154

68۔نئے لیڈروں کے منفرد نظریات 156

69۔لالہ لاجپت رائے اور نوجوان 160

70۔بم کا دیدار 163

71۔میں دہریہ کیوں ہوں؟

72۔جنگ آزادی کی تحریک میں پنجاب کی اہمیت 180

73۔'ڈریم لینڈ' کا دیباچہ 186

74۔سیاسی پروگرام کا خاکہ 192

باب۔4: انقلابیوں کا تعارف: چاند کے پھانسی نمبر سے ماخوذ

75۔صوفی امبا پرساد 200

76۔شری بلونت سنگھ 203

77۔ڈاکٹر متھرا سنگھ 208

78۔شہید کرتار سنگھ سرابھا 211

79۔شری امیر چند 215

80۔شری اودھ بہاری 216

81۔شری بھائی بال مکند 217

82۔شری بسنتو کمار وسواس 219

83۔شری بھائی بھاگ سنگھ 220

84۔شری بھائی وطن سنگھ 222

85۔شری میوہ سنگھ 223

86۔شری کاشی رام 226
87۔شری گندھا سنگھ 227
88۔شری جگت سنگھ 229
89۔شری بنتا سنگھ دھامیا 230
90۔شری رنگا سنگھ 232
91۔شری ویر سنگھ 233
92۔شری اتم سنگھ 233
93۔ڈاکٹر ارون سنگھ 234
94۔بابو ہری نام سنگھ 236
95۔شری سوہن لال پاٹھک 238
96۔بھائی رام سنگھ 239
97۔شری بھان سنگھ 240
98۔شری اودھم سنگھ 141
99۔شری خوشی رام 242
100۔بومیلی جنگ کے چار شہداء 243
101۔شری دھنا سنگھ 245
102۔شری وریام سنگھ ڈھگا 246
103۔شری کشن سنگھ گرگج 247
104۔شری سنتا سنگھ 248
105۔شری دلیپ سنگھ 249
106۔شری نند سنگھ 250
107۔شری کرم سنگھ 251
ایک شہید کی جیل نوٹ بک 261
بھگت سنگھ کے متعلق کچھ اور اہم دریافت
108۔انقلاب کی بیدی پر قربان ہونا گا 359
109۔چاند پھانسی نمبر کے کچھ اور اقتباسات 361
110۔برطانوی حکام کے نام بھگت سنگھ کے خطوط 366
بھگت سنگھ کی شخصیت پر چند اہم کتابیں 376

☆☆☆

بھگت سنگھ: بے مثال شخصیت

لفظوں کا استعمال کئی بار خوب صورت انداز میں کسی بات پر زور دینے کے لئے کیا جاتا ہے۔لفظ 'بے مثال' کا استعمال بھی کئی بار تزئین کے طور پر ہی کیا جاتا ہے۔لیکن بھگت سے متعلق جب اس لفظ کا استعمال کیا جائے تو اس کے حقیقی معنی مراد لئے جائیں گے۔بھگت سنگھ کی شخصیت کی جہات ان کی شہادت کے 76 برس گزر جانے پر بھی سامنے آ رہی ہیں اور شاید ان کی شخصیت کی مکمل جہت سامنے آنے میں مزید وقت لگے۔لیکن گزشتہ تقریباً دو برسوں سے بھگت سنگھ کی شخصیت کو ان کے عمل اور کاموں کے توسط سے سمجھنے میں تیزی آئی ہے' جس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان کے اس عظیم تاریخی شخص کا حقیقی تجزیہ جواب کم و بیش درست سمت میں ہونا شروع ہو گیا ہے' چند برسوں میں ختم ہو سکے گا۔اگرچہ جدوجہد آزادی میں ان کی تاریخی کردار کے تعلق سے مثبت تبادلہ خیالات ہوتے رہیں گے جو دیگر تاریخی شخصیات کے حوالے سے ہر ملک اور سماج میں ہمیشہ بدلتے پس منظر میں ہوتے رہتے ہیں اور ہونا بھی چاہئے۔

بھگت سنگھ کے حقیقی تجزیاتی عمل کو تین اہم مرحلوں میں پہچان سکتے ہیں۔پہلا مرحلہ ہے بھگت سنگھ کے دور حیات کے آخری ڈھائی سال اور 23 مارچ 1931 کو ان کی شہادت کے بعد کے کافی سال۔اس مرحلہ میں بھگت نے ہندوستانی عوام کے دلوں میں ایک انتہائی مقبول نوجوان ہیرو کے طور پر جگہ بنائی۔'بہادر نوجوان ہیرو' کے طور پر شناخت بننے میں 17 دسمبر 1928 کے سانڈرس قتل' 8 اپریل 1929 کے دلی اسمبلی بم دھماکہ' اپریل 1929 اور 23 مارچ 1931 میں جیل میں طویل بھوک ہڑتال اور کچہریوں میں مقدمات کے دوران دیئے گئے بیانات اور کارناموں اور 23 مارچ 1931 کی رات شہادت اور لاشوں کو کاٹ کر جلانے کی واردات اور ان وارداتوں کی ہندوستانی اخبارات میں مع تصویر اشاعت کا بڑا اہم رول ہے۔اس وقت بھگت سنگھ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کانگریس پارٹی کی تاریخ لکھنے والے پٹا بھی سیتا رمیا کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ''پورے ملک میں بھگت سنگھ کی مقبولیت مہاتما گاندھی سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے' کہیں کہیں شاید زیادہ بھی ہو سکتی ہے''۔ بھگت سنگھ کی یہ شبیہ جدوجہد آزادی کی بہت بڑی طاقت اور تحریک کا باعث بنی' وہیں اس کا نقصان یہ ہوا کہ اس شبیہ کے پس منظر میں بھگت سنگھ کا ''انقلابی دانشور مفکر'' کا روپ مکمل طور پر ماند پڑ گیا۔حالاں کہ بھگت سنگھ کے جس طرح کے مضامین 1928 اور 1931 کے درمیان ہندی' پنجابی اور انگریزی میں شائع ہوئے' اس سے کسی بھی ملک کا دانشور طبقہ ان کی فکری صلاحیت کا لوہا مانتا اور اس پر فخر کرتا۔بھگت سنگھ کی 'بہادر نوجوان ہیرو' کی یہ شبیہ بہت طویل عرصے تک قائم رہی۔اس دوران ملک کی متعدد زبانوں میں بھگت سنگھ پر نظمیں' کہانیاں' مضامین' خاکے اور روداد زندگی شائع ہوئیں' جن میں سے بیشتر پر پابندی عائد کی گئی۔ان سبھی تخلیقات نے بھی بھگت سنگھ کی شبیہ کو تقویت بخشی۔1938 کے بعد جب بھگت سنگھ قریبی رفقاء شوورما' جے دیو کپور' اجے گھوش' وجے کمار سنہا' بھگوان داس ماہور وغیرہ نے جیلوں سے رہائی پائی اور ان میں سے کچھ نے یادداشتیں لکھنا

شروع کیں تو بھگت سنگھ کی شخصیت کی مخفی جہات سامنے آنا شروع ہو گئیں۔ جتیندر ناتھ سانیال کی تحریر کردہ کتاب بھگت سنگھ کی روداد زندگی جو 1932 میں ہی چھپی ضبط ہوئی اور مصنف اور ناشر کے لئے قید کا فرمان لے کر آئی۔ اس میں بھگت سنگھ کی شخصیت کے دانشورانہ پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی گئی تھی' لیکن یہ سوانح حیات 1946 میں ہی شائع ہو سکی۔

بھگت سنگھ پر 1949 اور 1970 کے درمیان ان کے متعدد دوستوں کی یادداشتیں شائع ہوئیں، جن میں اجے گھوش' شوورما' موہن سنگھ جوش' یش پال' راجا رام شاستری' بھگوان داس ماہور اور ریشپال وغیرہ کی یادداشتیں شامل ہیں۔ ان یادداشتوں میں بھگت سنگھ کے فکری ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بھگت سنگھ نے 8 اور 9 ستمبر 1928 کو فیروز شاہ کوٹلہ میدان' دہلی میں انقلابی جماعت کو 'سوشلزم' سمت فراہم کرنے' مارکسزم کے تئیں ان کی گہری دلچسپی' مطالعہ' ان کی تنظیمی صلاحیت وغیرہ پر بہت تفصیل سے بحث ہوئی۔ بھگت سنگھ کے سبھی قریبی ساتھی رہائی کے بعد کمیونسٹ پارٹی یا آندولن میں شامل ہو گئے تھے' شاید اسی لئے اکیڈمک دنیا نے بھگت سنگھ کے ساتھیوں کی تحریر کردہ بھگت سنگھ کے متعلق یادداشتوں' جن سے ان کی شخصیت کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملتی تھی' کی عزت افزائی کی۔

بھگت سنگھ کی شخصیت کو سمجھنے کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے مشہور مورخ بپن چندر کے ذریعہ اپنے رول کے ساتھ 'میں ناستک کیوں ہوں' اور 'ڈریم لینڈ کی بھومیکا' کی دوبارہ اشاعت سے۔ انگریزی میں 'میں ناستک کیوں ہوں؟' بھگت سنگھ کی شہادت کے چند مہینوں بعد یعنی 27 ستمبر 1931 کے ہفتہ روزہ 'پیوپل' (لاہور) میں شائع ہو گیا لیکن اس میں پنہاں سنجیدگی اور گیرائی سے پُر افکار کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی۔ حالاں کہ جنوبی ہند میں پیریار نے اپنی میگزین ''کوڈری آرسو' میں پی جیوانندن سے اس کا تامل زبان میں ترجمہ کرا کر 1933 میں ہی شائع کر دیا۔ 2005 تک تامل زبان میں اس کے 25 سے زائد ایڈیشن نکل چکے تھے۔ دریں اثنا انگریزی میں کئی برسوں تک یہ مضامین دستیاب نہیں ہوئے اور بپن چندر کے کردار کے ساتھ دوبارہ اشاعت پر پہلی بار اکیڈمک دنیا کی توجہ بھگت سنگھ کی جانب مبذول ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سبھی زبانوں خاص طور پر ہندی' پنجابی اور انگریزی میں بھگت سنگھ کی اکا دکا تخلیقات' خطوط' مضامین اور عدالتی بیانات کی بڑے پیمانے پر اشاعت شروع ہوئی۔ 1977 میں بھگت سنگھ کی بھتیجی ویریندر سندھو کی ادارت میں ہندی زبان میں 'بھگت سنگھ کے خط اور دستاویز' اور 'میرے انقلابی ساتھی' انتخاب شائع ہوئے۔ 1980 کے آس پاس پنجابی زبان میں پہلے امرجیت چندن' بعد ازاں جگموہن سنگھ نے دستاویزات شائع کیں۔ 1986 میں جگموہن سنگھ اور چمن لال کی زیر ادارت ہندی میں 'بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے دستاویز' تقریباً اسی وقت اور ہندی اور انگریزی میں شوورما کی ادارت میں بھگت سنگھ کی منتخب تخلیقات کی اشاعت کے ساتھ اس عمل میں تیزی آئی اور یہ مان لیا گیا کہ بھگت سنگھ اس ملک کی انقلابی تحریک کو مارکسی نظریہ سے مالا مال سوشلزم جہت عطا کرنے والے بنیادی اور اولین متاثر کن مفکر ہیں۔

اسی دوران ملک کی بائیں بازو کی طاقتوں نے بھگت سنگھ کو بھگوا حامی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بھگت سنگھ کے کنبہ کے چند اراکین کی بھارتیہ جن سنگھ پارٹی سے قربت نے بھی اس میں اہم رول ادا کیا۔ خالصتانی تحریک کے دوران بھگت سنگھ کو 'کیسریا' رنگ اور ہاتھ میں پستول کی شبیہ کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا گیا۔ بھگت سنگھ کے انقلابی افکار میں مارکسی نظریات واضح طور پر سامنے آنے کے بعد بھارتیہ جن سنگھ کا نیا روپ بھارتیہ جنتا پارٹی نے کچھ دیر کے لئے بھگت سنگھ کے اس عکس سے خود کو دور رکھا۔

بھگت کی شخصیت کا حقائق پر مبنی تجزیہ کا تیسرا اور اب تک کا سب سے اہم مرحلہ 2006 میں بھگت سنگھ کی شہادت کے 75 برس مکمل ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ اسی دوران بین اقوامی کمیونسٹ تحریک کی پروقار میگزین ''منتھلی ریویو'' کی ویب

سائٹ پر اور میگزین کے ہندوستانی ایڈیشن میں پہلی بار بھگت سنگھ پر ناچیز کا مضمون شائع ہوا' جس میں بھگت سنگھ کا موازنہ لاطینی امریکہ کے انقلابی چے گویرا سے کیا گیا۔ دریں اثنا 28 ستمبر 2006 سے ناچیز اور متعدد تنظیموں کے ذریعہ بھگت سنگھ صدی سالگرہ منانے کی مہم میں بھی شدت آئی۔ متعدد عوامی تنظیموں نے ملک کے مختلف حصوں میں بھگت سنگھ صدی سالگرہ تقریب کمیٹی بنا کر بھگت سنگھ کی یاد میں پروگرام کا آغاز کیا اور حکومت ہند نے بھی آخرکار 2 مئی 2006 کے گزٹ نوٹی فکیشن کے ذریعہ بھگت سنگھ کی شہادت کے 75 برس پورے ہونے اور ان کی صدی سالگرہ کی تقریب کو پانچ قومی سالگرہ میں شامل کرنے کا اعلان کیا۔ دیگر تین تقریبات 1857 کی ڈیڑھ سویں سالگرہ' 'وندے ماترم' کی صدی اور 1974 کی آزادی کے 60 برس پورے ہونے سے مربوط ہیں۔ اس سالگرہ میں 1857 کی پہلی جدوجہد آزادی اور بھگت سنگھ کی شہادت اور صدی سالگرہ سے وابستہ تقریبات میں عوام کی شراکت سب سے زیادہ دیکھنے کو ملی' چاہے یہ سرکاری تقریبات ہوں یا عوامی۔

دریں اثنا بھگت سنگھ کا مزید مضمون شائع ہو کر سامنے آتا ہے جس میں سب سے اہم ان کی 'جیل نوٹ بک' ہے جو 1994 میں بھوپندر ہوجہ کی ادارت میں شائع ہوئی۔ انگریزی میں اس نوٹ بک کی اشاعت سے بھگت سنگھ کے افکار سے متعلق تمام شک وشبہات دور ہو جاتے ہیں اور مارکسزم کے گہرے مطالعہ اور اس نظریہ سے ان کی عمیق وابستگی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ادھر فلم میڈیا میں بھی بھگت سنگھ کی کشش دوبارہ جاگ اٹھتی ہے۔ ممبئی میں بھگت سنگھ پر ایک ساتھ پانچ پانچ فلمیں بننا شروع ہوئیں جن میں تین ہی ریلیز ہو سکیں۔ ان میں سے ایک 'دی لیجنڈ آف بھگت سنگھ'' بھگت سنگھ کے کارناموں اور ان کے افکار و نظریات کی بہت حد تک حقیقی عکاسی کرتی ہے۔ عامر خان کی فلم 'رنگ دے بسنتی' میں بھگت سنگھ محدود طور مگر تکنیکی لحاظ سے موثر طور پر پیش کیے گئے۔

بھگت سنگھ کو حقیقی طور پر سمجھنے کے اس تیسرے مرحلہ میں اکادمک شعبہ میں بھی دلچسپی بڑھی۔ بپن چندر کے ساتھ اب دوسرے معروف مورخوں کے ایم پنکر' عرفان حبیب' مبارک علی (پاکستان)' ایم ایس جنیجہ' کے ایل ٹوٹیجا' جگتار سنگھ گریوال' اندو بنگا' سوبیہ ساچی بھٹا چاریہ وغیرہ بھی گہری دلچسپی لینے لگے۔ 'مین اسٹریم' فرنٹ لائن اور ای پی ڈبلیو جیسی سنجیدہ اور اہم میگزینوں نے بھگت سنگھ پر خصوصی گوشے شائع کیے جس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اب بھگت سنگھ کے افکار اور کارناموں کے توسط سے جو حقائق ہیں' بھگت سنگھ کی شکل میں سامنے آئیں گے۔ اس تجزیہ میں ان کی حیات اور کارناموں' ان کے ساتھیوں کی یادداشتوں یا اس وقت کے اخبار ورسائل میں شائع ہونے والے واقعات کی تفصیلات سے آگاہی ہو سکے گی لیکن ان کی شخصیت کے نظریاتی پہلو کا غیر متنازعہ روپ ان کے دستیاب مضامین سے ہی واضح طور پر ابھرے گا۔ اس لئے زیر نظر ایڈیشن میں بھگت سنگھ کے دستیاب سبھی مضامین کو ایک ہی باب میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ تاریخی اعتبار سے قاری اور اکیڈمک شعبہ کے دانشور بھگت سنگھ کی شخصیت کو ان کی تحریروں کی روشنی میں سمجھ سکیں۔

بھگت سنگھ کی زندگی ساڑھے تیئیس برس سے بھی تھی اور ان کی سیاسی وسماجی زندگی تقریباً آٹھ سال پر محیط تھی۔ خاص طور پر بھگت سنگھ کے دانشورانہ نظریات کا فروغ ان آٹھ برسوں میں نایاب ہے۔ اتنی کم عمر میں اعلیٰ درجہ کے دانشورانہ نظریات کے فروغ کا کلی طور پر موازنہ یا لگ بھگ اتنی ہی عمر پانے والے انقلابی اور روسی فلسفی دوبرولیوبوف سے کیا جاسکتا ہے جنہوں نے 24 سال کی چھوٹی سی عمر میں اپنے مضامین میں جن فلسفیانہ گہرائیوں کا ثبوت پیش کیا' وہ دنیا میں فلسفیانہ روایت کی انفرادی حیثیت رکھتا ہے یا لاطینی امریکی انقلابی چے گویرا سے جن کی حیات و مضامین بھگت سنگھ کی زندگی اور مضامین سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ حالاں کہ چے گویرا کو بھگت سنگھ سے تقریباً 14 سال زیادہ زندگی ملی۔ نتیجتاً انہیں انقلابی تحریکات کے تجربات سے

روشناس ہونے کا زیادہ موقع نصیب ہوا۔ اگر 17 سے 23 سال کے درمیان مارکس کے مضامین اور اسی عمر کے بھگت سنگھ کی تحریروں کا موازنہ کیا جائے تو حیرت انگیز طور پر یکساں دانشورانہ خوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ حالاں کہ مارکس کو جو عظیم دانشورانہ حیثیت یوروپ میں حاصل تھی، اس کا عشر عشیر بھی بھگت سنگھ کو ہندستان میں حاصل نہیں تھا۔ یہاں مختصر طور پر بھگت سنگھ کی دانشورانہ اہلیت کی خوبی اور دوسری طرف ان کی شخصیت کی صلاحیت، استحکام و لگن میں ہی چے گویرا یا مارکس سے ان کا موازنہ ہوتا رہا، نہ کہ وسیع معنوں میں کیوں کہ وسیع معنوں میں ہر تاریخی حیثیت کے حامل فرد کو علاحدہ ملک اور سماج میں مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو کسی شخص یا شخصیت کو تاریخی مرد یا عورت کی شکل عطا کرتا ہے۔

مارکس اور بھگت سنگھ دونوں نے ہی علاحدہ علاحدہ پس منظر میں یہی بات کہی ہے کہ یہ حالات ہی تھے جنہوں نے سماج کو صحیح طور پر سمجھنے میں کسی کو جرمنی میں 'مارکس' بنایا اور بعینہ ہندوستان میں بھگت سنگھ۔ یہ نام کوئی اور بھی ہو سکتے تھے مگر اس کے محرک حالات ہی ہوتے۔ اس وسیع تناظر میں دیکھنے پر مارکس، بھگت سنگھ اور چے گویرا ایک ہی روایت کے حصے نظر آئیں گے۔ مارکس ایک اسلاف کے طور پر اور بھگت سنگھ اور چے گویرا اس راستہ کے سنجیدہ مسافر اور اس پر پوری ایمانداری سے چلنے والے سرگرم کارکن اور ساتھ ہی مفکر کے طور پر۔ بھگت سنگھ کے افکار و نظریات تو اس ایڈیشن میں پیش کردہ ان کی تحریروں سے واضح ہو جائیں گے، یہاں ان کی حیات اور کارروائیوں پر ایک سرسری نظر ڈالنا مناسب ہوگا تا کہ ان کے حیات و افکار کے تجسس سے بھی صحیح طور پر آگاہی ہو سکے۔

بھگت سنگھ 28 ستمبر 1907 کو چک نمبر 105 بنگے، ضلع لائل پور (اب فیصل آباد، پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ جس خاندان میں ان کی ولادت ہوئی، ان کے آباء و اجداد کی جذبہ آزادی کے تئیں عزم کی طویل تاریخ ہے۔ پہلے لاہور اور اب امرتسر ضلع کا نارلی گاؤں اس خاندان کا آبائی گاؤں ہے جہاں ایک زمانہ میں خاندان کا سربراہ داماد بن کر کھٹکڑ کلاں (ضلع نواشہر) میں آ کر بسا۔ کھٹکڑ کلاں سے ہی اس خاندان نے ضلع لائل پور میں زمینیں خریدیں اور 17 ایکڑ پر مشتمل آم کا باغ لگوایا۔ فتح سنگھ اور کھیم سنگھ سندھو وغیرہ آبا و اجداد کے بعد بھگت سنگھ کے دادا ارجن سنگھ قومی تحریک میں سرگرم رہے۔ ارجن سنگھ سکھ عقیدہ کے ساتھ ساتھ آریہ سماج کے بھی معتقد تھے جو داخلی تنازعہ کا غماز تھا۔ ارجن سنگھ قدامت پرستوں کے خلاف تھے، سنسکرت کے حامی اور گھر میں ہون کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کشن سنگھ اور اجیت سنگھ کو سائی داس اسکول، جالندھر میں تعلیم دلائی۔ سورن سنگھ سمیت ان کے تینوں لڑکوں نے قومی تحریک میں انتہائی سرگرم رول ادا کیا۔ سورن سنگھ جیل کی صعوبتوں کے سبب 23 برس کی عمر میں ہی وفات پا گئے۔ اجیت سنگھ 1909 میں جو ملک بدر ہوئے تو 1947 میں ملک آزاد ہونے سے چند برس قبل ہی لوٹ سکے۔ کشن سنگھ نے بھی بطور کانگریس کارکن متعدد بار جیل کا سفر کیا۔ ان تینوں بھائیوں میں اجیت سنگھ سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ وہ لالہ لاجپت رائے کے ساتھ ''بھارت ماتا سوسائٹی' یا 'انجمن محبان وطن' کے ذریعہ پنجاب کے کسانوں کو منظم کر رہے تھے۔ 1907 میں پنجاب کے کسانوں کے حالات بہت خراب تھے۔ وہ مقروض تھے۔ اجیت سنگھ گاؤں گاؤں جا کر انہیں بیدار اور منظم کر رہے تھے۔ اسی بیداری مہم کے سلسلے میں 1907 میں ہی لالہ بانکے دیال کا مشہور گیت 'پگڑی سنبھال جٹا' وجود میں آیا۔ اس گیت کے سبب بانکے دیال کی پولیس ملازمت بھی چھین لی گئی اور انہیں دو برس کی جیل کی سزا ہوئی۔ اتفاق سے جس دن بھگت سنگھ کی ولادت ہوئی، اسی دن تینوں محب وطن بھائیوں کشن سنگھ، اجیت سنگھ اور سورن سنگھ کو جیل سے رہائی ملی۔ دادی جے کور نے نوزائیدہ بچہ کو 'بھاگوں والا' (نصیب والا) کہا تو اس کا نام بھی بھگت سنگھ رکھ دیا گیا۔ بھگت سنگھ اپنے والدین ودیاوتی اور کشن سنگھ کی دوسری اولاد تھے۔ ان کی پہلی اولاد کا نام جگت سنگھ تھا جو 1904 میں پیدا

ہوئے اور 1915 میں کمسنی کے عالم میں چل بسے۔ بھگت سنگھ نو بہن بھائیوں میں دوسرے مقام پر تھے۔ ان کے بعد امر کور' کلبیر سنگھ' کلتار سنگھ' سمترا عرف پرکاش کور (باحیات)' شکنتلا' رنویر سنگھ اور راجندر سنگھ پیدا ہوئے۔ بھگت سنگھ کی بہن پرکاش کور ان دنوں کناڈا میں اپنے کنبہ کے ساتھ مقیم ہیں' بقیہ سبھی بہن بھائیوں کا انتقال ہو چکا ہے۔

بھگت سنگھ کے والد کشن سنگھ نے لاہور میں بھی بیمہ ایجنسی کا کام شروع کر لیا تھا۔ پرائمری تعلیم کے لئے بڑے بھائی جگت سنگھ کے ساتھ بھگت سنگھ کو بھی گاؤں کے نزدیکی اسکول میں داخلہ دلوایا۔ بھگت سنگھ ابھی دو برس کے ہی تھے کہ ان کے چچا اجیت سنگھ کو ملک بدر کر دیا گیا۔ بھگت سنگھ کی اجیت سنگھ سے ملاقات تو نہ ہو پائی لیکن کچھ خط و کتابت ضرور ہو سکی۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ اجیت سنگھ کی بیوی ہرنام کور سے بھگت سنگھ کا رشتہ ماں بیٹے جیسا تھا۔ بھگت سنگھ کے قریبی دوست اور کلاس فیلو جے دیو گپت کے مطابق تو بھگت سنگھ کو بیٹے کے طور پر ہرنام سنگھ کو سونپ دیا گیا تھا۔ بھگت سنگھ ابھی تین ہی سال کے تھے کہ ان کے چھوٹے چچا سورن سنگھ کا جیل میں دمہ کے سبب انتقال ہو گیا۔ چھوٹی چچی حکم کور لاولد بیوہ ہو گئیں۔ اس چچی سے بھی بھگت سنگھ کو بہت محبت تھی۔ بچپن میں چچی حکم کور کو بھگت سنگھ نے پنجابی زبان سیکھ کر خطوط لکھے۔ ان کی بڑی چچی بلے شاہ کے تصوف کے رنگ میں رنگے قصور شہر سے تعلق رکھتی تھیں اور تصوف کا بھی ان پر گہرا اثر تھا۔

مہتہ آنند کشور کانگریس کے کارکن اور کشن سنگھ کے قریبی دوست تھے۔ ان سے ملاقات کی غرض سے گاؤں بھی آنا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ یوں ہی گاؤں کے کھیتوں میں گھومتے ہوئے چار سالہ بھگت سنگھ کو کھیت میں بیج بوتے دیکھ کر مہتہ جی نے مذاقاً ہنستے ہوئے پوچھا کہ "بھگت سنگھ تم کھیت میں کیا بو رہے ہو؟" تو جواب میں بھگت سنگھ نے کہا کہ "بندوق کے بیج بو رہا ہوں"۔ مگر کیوں؟ حیران ہو کر مہتہ جی نے پوچھا۔ "تاکہ بڑا ہو کر اس فصل سے انگریزوں کی قید سے ملک کو آزادی دلا سکوں اور چچا جی (اجیت سنگھ) کو واپس لا سکوں"۔ معصوم بچہ نے مہتہ جی کو یہ جواب دیا۔ بھگت سنگھ جب سات سال کے ہوئے تو غدر پارٹی نے پنجاب میں غدر کی تیاری شروع کر دی۔ شچیندر ناتھ سانیال بھی مہتہ جی کے ساتھ کشن سنگھ سے ملاقات کے لئے آتے تھے۔ غالباً چند بار کرتار سنگھ سرابھا بھی آئے۔ کشن سنگھ نے غدر پارٹی کو ایک ہزار روپے بطور چندہ دیا۔ ان دنوں یہ بہت بڑی رقم تصور کی جاتی تھی' آج کے پچاس ہزار سے بھی زیادہ۔ کشن سنگھ کے دوست مہتہ آنند کشور پہلے لاہور سازش کیس کے اولین ملزم تھے اور یہ مقدمہ' مہتہ آنند کشور بنام بادشاہ" لڑا گیا۔ مہتہ آنند کشور تو ثبوتوں کی کمی کے باعث بری ہو گئے لیکن بیس سالہ کرتار سنگھ سرابھا کو چھ ساتھیوں جن میں وشنو گنیش پنگلے بھی تھے' کے ساتھ پھانسی ملی۔ بعد ازاں یہی کرتار سنگھ سرابھا بھگت سنگھ کے آئیڈیل ہیرو بنے جن کی تصویر وہ ہمیشہ جیب میں رکھتے تھے۔ اس مقدمہ کے فیصلے میں ہی جج نے کشن سنگھ کے ذریعہ غدر پارٹی کو ایک ہزار روپے چندہ دینے کی بات درج کی تھی۔

پرائمری اسکول کی تعلیم کے دوران ہی بھگت سنگھ نے گھر پر رکھی ہوئی اجیت سنگھ صوفی امبا پرساد اور لالہ ہردیال کی تحریر کردہ متعدد کتابیں پڑھ ڈالیں۔ قدیم و جدید اخبار بھی گھر پر ان کے زیر مطالعہ رہے۔ گاؤں میں پرائمری تعلیم کے بعد وہ آگے کی پڑھائی کے لئے والد کے پاس نواں کوٹ چلے گئے۔ وہاں ڈی اے وی اسکول میں ان کا داخلہ کرایا گیا۔ لاہور میں جب وہ اسکول کے طالب علم تھے تو 13 اپریل 1919 کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں انگریزوں نے ہندوستانیوں کا قتل عام کیا تھا۔ بھگت سنگھ کے ذہن و دل پر اس کا گہرا اثر ہوا' ایک دن وہ اسکول نہ جا کر لاہور سے سیدھے امرتسر چلے گئے جو بمشکل 32-30 کلومیٹر دوری پر واقع تھا۔ گھر تاخیر سے پہنچنے کے بارے میں پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ جلیان والا باغ سے وطن پرستوں کے خون سے لت پت مٹی ایک شیشی میں بھر کر لائے ہیں۔ بعد ازاں گھر میں اس شیشی پر بہت دنوں تک گلہائے

عقیدت پیش کرتے رہے۔ 20 فروری 1921 کو ننکانہ صاحب گرودوارہ میں بدعنوان مہنت نے انگریزوں کے تعاون سے تقریباً ڈیڑھ سو سکھ عقیدت مندوں کو شہید کردیا۔ پنجاب میں اس قتل عام اور بربریت کے خلاف سکھوں نے زبردست احتجاج کیا۔ بھگت سنگھ پر ان سارے واقعات کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس وقت انہوں نے پنجابی زبان اور گرومکھی رسم الخط سیکھا جو اسکولوں میں نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ گاؤں میں اکالی جتھے کا استقبال بھی کیا اور جڑاں والا ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ ننکانہ صاحب بھی گئے۔ جب 1922 میں چوری چورا واقعہ پر مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ واپس لے لیا تو بھگت سنگھ کو کافی چوٹ پہنچی اور انہوں نے اپنے والد اور کانگریسی کارکن کشن سنگھ پر اپنے سخت ردعمل کا اظہار کیا۔

دریں اثنا لاہور میں لالہ لاجپت رائے نے نیشنل کالج اور دوارکا داس لائبریری قائم کی۔ کانگریس کی پالیسی کے مطابق ملک کے دیگر شہروں اور قصبوں میں بھی نیشنل کالج، اسکول اور یونیورسٹیاں کھولی جارہی تھیں۔ ولایت سے لوٹے اچاریہ جگل کشور کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ بھائی پرمانند، جے چندرو دالنکار اور چھبیل داس جیسے مجاہد آزادی اور دانشور کالج کے دوسرے سینئر پروفیسر تھے۔ پرنسپل چھبیل داس کالج کے دوسرے پرنسپل بھی بنے۔ راجا رام ساشتری دوارکا داس لائبریری کے انچارج تھے۔ بھگت سنگھ کی ملاقات جے چندرو دالنکار کے گھر غدر پارٹی سے وابستہ شچیندر ناتھ سانیال سے ہوتی رہتی۔

بھگت سنگھ کے کالج میں داخلہ کا واقعہ بھی دلچسپ تھا۔ انہوں نے ڈی اے وی اسکول سے صرف نویں کلاس پاس کی۔ داخلہ جاتی امتحان کے بعد براہ راست انہیں ایف اے میں داخلہ ملا۔ بھگت سنگھ نے 1923 میں ایف اے کا امتحان سولہ سال کی عمر میں پاس کرلیا اور بی اے میں داخلہ لیا۔ اسی وقت خاندان کے لوگوں نے ان پر شادی کے لئے زور ڈالنا شروع کیا' خصوصاً دادی جے کور نے جن کے ذہن میں اپنے پوتے کے تئیں بے پناہ محبت وشفقت تھی۔ غالباً مانان والا گاؤں کا ایک خوش حال خاندان بھگت سنگھ کو دیکھنے آیا اور سگائی کی تاریخ بھی طے کردی گئی۔ یہیں سے بھگت سنگھ کی زندگی میں تلخ موڑ آیا۔ انہوں نے گھربار اور تعلیم چھوڑ کر پوری طرح انقلابی تحریکات کے تئیں اپنی زندگی وقف کرنے کا فیصلہ کیا اور والد کو یہ خط لکھ کر کہ اس کی زندگی "ملک کے لئے وقف" ہے، وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ گھر چھوڑتے وقت وہ جے چندرو دالنکار سے 'پرتاپ' (کانپور) کے ایڈیٹر اور جوائنٹ صوبہ کے کانگریس پارٹی کے صدر گنیش شنکر ودیارتھی کے نام ایک تعارف نامہ لے کر گئے۔

بھگت سنگھ کانپور پہنچے اور 'بندی جیون' کے مصنف شچیندر ناتھ سانیال کے مطابق منی لال اوستھی کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ کانپور میں انقلابی گروہ کا کام کاج یوگیش چندر چٹر جی دیکھ رہے تھے۔ کانپور میں ہی ان کا تعارف سریش چندر بھٹاچاریہ بٹوکیشور دت' اجے گھوش اور وجے کمار سنہا جیسے انقلابیوں سے ہوا۔ پولیس کی نظر سے بچنے کے لئے ودیارتھی جی نے بھگت سنگھ کو 'پرتاپ' کے دفتر میں ادارتی سیکشن کا کام سونپا' جہاں وہ 'بلونت' کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ کچھ دنوں تک انہوں نے کانپور میں اخبارات بھی فروخت کئے۔ دریں اثنا کچھ عرصہ تک ودیارتھی جی نے انہیں علی گڑھ کے نزدیک شادی پور گاؤں میں نیشنل اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا کر بھیج دیا۔ وہاں وہ کانگریس کارکن بھگت سنگھ ٹھاکر ٹوڈر سنگھ (بعد میں وہ یوپی آسمبلی کے ممبر بنے) کے گھر ٹھہرے۔ اسکول کا کام بھی ٹوڈر سنگھ ہی دیکھتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں بھگت سنگھ نے اسکول کا نام روشن کردیا۔ اسی دوران کان پور کے دیہی علاقوں میں سیلاب آنے پر بھگت سنگھ نے سیلاب راحت کاموں میں بھی بٹوکیشور دت کے ساتھ حصہ لیا۔

اس دوران گھر والے پریشان تھے کہ بھگت سنگھ کہاں چلے گئے۔ بھگت سنگھ نے اپنے دوست رام چندر کو خط لکھا مگر گھر والوں کو پتہ نہ بتانے کی درخواست کی۔ بھگت سنگھ کے قریبی دوست جے دیو گپت سے رام دیو کی بات چیت ہوئی۔ اس درمیان بھگت سنگھ کی دادی پوتے کے غم میں سخت بیمار ہوگئیں تو جے چندر گپت درخواست کرکے رام چندر کو ساتھ لے کر بھگت سنگھ کی

قیام گاہ پر پہنچے۔ بھگت سنگھ ان سے نہیں ملے تو انہوں نے ودیارتھی جی سے ملاقات کی۔ دریں اثنا بھگت سنگھ کے والد کشن سنگھ نے لالہ لاجپت رائے کے اخبار "بندے ماترم" میں ان کے گھر واپس لوٹ آنے کا اشتہار بھی شائع کرایا جسے ودیارتھی جی نے بھی پڑھا تھا۔ لیکن ودیارتھی جی کو بھی بھگت سنگھ کی اصلیت کا پتہ نہیں تھا۔ جے دیو گپت اور رام چندر نے لوٹ کر کشن سنگھ کو حالات سے واقف کرایا تو کشن سنگھ نے اپنے دوست اور کان پور کے کانگریسی لیڈر حسرت موہانی کو خط لکھا اور بھگت سنگھ پر شادی کے لئے زور نہ ڈالنے کی یقین دہانی کرائی۔ بعد ازاں کئی مہینوں بعد بھگت سنگھ گھر واپس آئے۔ واپسی کے بعد دادی کی بہت خدمت کی یہاں تک کہ وہ صحت مند ہو گئیں۔

اس مرتبہ بھگت سنگھ ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن (ایچ آر اے) نامی انقلابی تنظیم کے جزء لاینفک بن گئے جس کی تشکیل میں شچیندر ناتھ سانیال کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس تنظیم میں چندر شیکھر آزاد، راج گرو، رام پرساد بسمل، اشفاق اللہ، روشن سنگھ، راجندر لاہری، یوگیش چٹرجی، سریش بھٹاچاریہ وغیرہ شامل تھے۔ اسی تنظیم نے 1925 میں 'دی ریولیوشنری' نامی پرچہ نکالا اور 9 اگست 1925 کو کاکوری ریل ڈکیتی کا ایکشن لیا۔ اس ایکشن کے زیادہ تر کارکن گرفتار کر لئے گئے جن میں سے بسمل، اشفاق، روشن سنگھ اور راجندر سنگھ لاہری کو دسمبر 1927 میں پھانسی دے دی گئی۔ غالباً بھگت سنگھ اس وقت حکومت کے نوٹس میں نہیں آئے تھے۔ چندر شیکھر آزاد نہ تو اس وقت اور نہ زندگی کے آخری ایام تک حکومت کی گرفت میں آسکے۔

1924 میں بھگت سنگھ کچھ وقت لاہور یا گاؤں چک نمبر 105 بنگا میں رہتے تھے۔ اس درمیان جیتو مورچہ میں جانے والے اکالی جتھے کا بھی انہوں نے گاؤں میں خیر مقدم کیا جس کی رپورٹ ان کے رشتے کے چچا دلباغ سنگھ نے سرکار کو دی۔ دلباغ سنگھ مجسٹریٹ تھے اور حکومت برطانیہ کے حامی تھے۔ دریں اثنا لاہور میں وہ نوجوانوں کو منظم بھی کر رہے تھے۔ لاہور میں لالہ لاجپت رائے، جن سے ان کے بہت گہرے گھریلو مراسم تھے اور جن کے نیشنل کالج سے بھگت سنگھ نے دو سال تعلیم حاصل کی تھی، سے ان کا سیاسی ٹکراؤ بھی ہوا۔ لالہ لاجپت رائے اور بھائی پرمانند اپنی قدیم غدر پارٹی سے وابستگی کے باوجود ہندوازم کے نظریات سے متاثر ہو کر فرقہ واریت پر مبنی سیاست کرنے لگے۔ بھگت سنگھ اور دیگر نوجوانوں نے اس پر احتجاج کیا اور کونسل انتخابات میں کانگریس پارٹی کے دیوان چمن لال کی حمایت کی۔ بعد ازاں جب چمن لال نے اسمبلی بم کیس کی مذمت کی تو بھگت سنگھ اور ان کے رفقاء نے ان کو "فرضی سماجوادی" کا درجہ دیا۔

کچھ عرصہ تک بھگت سنگھ نے دہلی میں روزنامہ 'ارجن' کے ادارتی شعبہ میں بھی بلونت کے ہی فرضی نام سے کام کیا۔ اس مرتبہ وہ گھر سے بھاگ کر نہیں بلکہ انقلابی جماعت کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے یہ کام کر رہے تھے۔

1925 میں بھی بھگت سنگھ انتہائی سرگرم رہے۔ اس سال انہوں نے ایک طرف لاہور میں 'نوجوان بھارت سبھا' کی سرگرمیوں میں حصہ لیا تو دوسری طرف کانپور جا کر ایچ آر اے کی سرگرمیوں میں بھی شرکت کی۔ کان پور میں وہ شوورما اور جے دیو کپور کے ساتھ ڈی اے وی کالج کے ہوسٹل میں قیام پذیر رہے۔ اس وقت ان کا پارٹی نام 'رنجیت' تھا۔ شوورما اور جے دیو کپور دونوں نے ہی اپنی یادداشتوں اور انٹرویو میں بھگت سنگھ کی شخصیت سے متعلق تفصیلی بحث کی ہے۔ بھگوان داس ماہور نے بھی اپنی یادداشتوں میں بھگت سنگھ کی مطالعہ کے تئیں زبردست دلچسپی کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ بھگت سنگھ نے انہیں کارل مارکس کے مشہور عالم کلاسک صحیفہ 'داس کیپٹل' کی کاپی پڑھنے کے لئے دی تھی، جو ظاہر ہے کہ سمجھنی بہت مشکل تھی۔

بھگت سنگھ کی مطالعہ کے تئیں لگن کا ذکر ان کے سبھی دوستوں نے کیا ہے۔ ان کے ساتھیوں نے تو ان خاص کتابوں کا بھی

تذکرہ کیا ہے جو وقتاً فوقتاً بھگت سنگھ کے زیر مطالعہ رہیں۔ان میں ادب' سیاست اور تاریخ شامل تھی۔ان کے شفیق استاد اور پرنسپل چھبیل داس نے بھگت سنگھ کی سب سے زیادہ پسندیدہ کتابوں میں ناول 'کرائی فار جسٹس(Cry for Justice) کو شامل کیا ہے۔اس کے علاوہ دو مزید کتابوں کو انہوں نے بھگت سنگھ کی عزیز کتابوں کے زمرہ میں رکھا ہے......ڈان برین کی ''مائی فائٹ فار آئرش فریڈم' جس کا بھگت سنگھ نے ہندی میں ترجمہ بھی کیا تھا اور ''ہیروز اینڈ ہیروئنز آف رشیا''۔روسی ہیروئنوں میں بھگت سنگھ ویرا فگنر سے بہت متاثر تھے۔دوارکا داس لائبریری کے انچارج اور بھگت سنگھ کے دوست راجا رام شاستری کے مطابق بھگت سنگھ کو ویر ساورکر کی کتاب 'ہندوستان کی پہلی جدوجہد آزادی (سوتنترسمر) نے بھی انہیں کافی متاثر کیا۔ان کے مطابق بھگت سنگھ نے باکونن کی کتاب 'ایشور اور راجیہ''(God and the State) کا بہت تفصیلی انداز میں مطالعہ کیا۔اس کتاب نے انہیں دہریہ (ناستک) بننے کی تحریک دی۔ڈان برین کی کتاب کو راجا رام نے بھی بھگت سنگھ کی پسندیدہ کتاب بتایا ہے' ساتھ ہی اٹلی کے انقلاب' میجنی اور گیری بالڈی کی سوانح حیات اور ان کے افکار پر مبنی کرائی فار جسٹس کا ذکر شاستری جی نے بھی کیا ہے۔راجا رام شاستری نے ایک اور کتاب ''انتشار اور دیگر مضامین'' (Anarchism and other Essays) کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک باب تشدد کی نفسیات (The Psychology of Violence) پر تھا۔اسی باب میں فرانسیسی انقلابی ویلیاں (Valliant) کا وہ مشہور بیان شائع ہوا تھا......''بہروں کو سنانے کے لئے دھماکوں کی ضرورت ہوتی ہے''۔ویلیاں نے یہ بیان 1893 میں فرانس کی پارلیمنٹ میں بم پھینک کر دھماکہ کرتے ہوئے دیا تھا۔ویلیاں کو بھی عوام کی زبردست مخالفت کے باوجود 1894 میں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔36/38 سال بعد ایسا ہی واقعہ دہلی اور لاہور میں دوہرایا گیا۔راجا رام نے ''ہیروز اینڈ ہیروئنز آف رشیا'' کا تذکرہ بھی کیا ہے۔اس کے ساتھ جن ناولوں کا انہوں نے ذکر کیا' وہ ہیں گورکی کا ''مدر' وکٹر ہیوگو کے (93) اور لا میزریلبس: ٹیل آف ٹو سیٹیز (ڈی کینس)' اپٹن سنکلیر کے ناول' جنگل' بوسٹن اور کنگ کول۔راجا رام کے مطابق بھگت سنگھ نے بم سازی کا نسخہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے تلاش کیا تھا۔

شوورما کے مطابق ''مجھے کوئی بھی ایسا موقع یاد نہیں آتا جب میں نے بھگت سنگھ کے پاس کوئی کتاب نہ دیکھی ہو''۔شوورما نے ہیوگو کے ناول ''نائنٹی تھری'' پر سکھ دیو اور بھگت سنگھ کے مابین پیدا شدہ تنازعہ کا ذکر کیا ہے جس میں ایک انقلابی اولاً تو پارٹی کے تئیں کیے گئے جرم کے لئے اپنے قریبی دوست کو سزائے موت دیتا ہے پھر اس کی موت کے ساتھ ہی خود بھی خودکشی کر لیتا ہے۔بھگت سنگھ کی ہمدردی خودکشی کرنے والے کردار کے ساتھ ہے جب کہ سکھ دیو خودکشی کرنے والے کردار کے تئیں انتہائی سخت ہے۔بعد ازاں جب جیل میں سکھ دیو طویل سزا کے شبہ میں خودکشی کی بات سوچتا ہے تو بھگت سنگھ سختی کے ساتھ اس کے اپنے خیالات کو یاد دلا کر خودکشی کرنے کے جذبہ کی شدید مذمت کرتے ہیں۔دوران قید زنداں بھگت سنگھ کے زیر مطالعہ کتابوں میں ڈکینس' سنکلیر ' ہالکین' ہیوگو' گورکی' اسٹیپنک' آسکر وائلڈ اور اینڈریو کے ناولوں کا ذکر کرتے ہیں۔خصوصاً لیونائڈ اینڈریو کے مشہور ناول 'سیون دیٹ ور ہینگڈ'(Seven that were hanged) کا تذکرہ کرتے ہیں۔شوورما نے بھگت سنگھ کے اعلیٰ درجہ کے خوب صورتی کا علم' موسیقی کا شوق' شناوری' نوکا وہار کا اور پوری پوری رات ندی کے کنارے دوستوں کے ساتھ تبادلہ خیالات کرتے رہنے میں ان کی دلچسپی کا بھی ذکر کیا ہے۔

پہلی بار بھگت سنگھ کی سوانح حیات لکھنے والے جیتندر ناتھ سانیال نے بھی Seven that were hanged کے جیل میں بھگت سنگھ کے زیر مطالعہ رہنے' بعد ازاں سنکلیر کے جنگل' بوسٹن آئل ناولوں کے ساتھ کرائی فار جسٹس (نثر)' ہال

کین کے تخلیق کردہ اٹرنل' جس کی متعدد تقاریر بھگت سنگھ کو زبانی یاد تھیں' کا ذکر کیا ہے۔جان ریڈ کا روسی انقلاب کا آنکھوں دیکھا حال' دس دن جنہوں نے دنیا بدل دی'(Ten days that shook the word)' روپشک کی' جو کبھی نہیں پیش آیا(What never happend)' گورکی کی مدر' اسٹیپناک کی کیریئر آف اے نہلسٹ (Carrier of a Nihlist)' ان کی روسی جمہوریت کا جنم (Birth of Russia Democrecy) کو بھی روس کی انقلابی تاریخ کی ابتدائی کتابوں میں سب سے اہم مانتے ہیں۔آسکر وائلڈ کی' ویرا دی نہلسٹ' پرنس کروپاٹکن کے ممایرز کا بھی ذکر کیا ہے۔ بھگوان داس ماہور نے بھگت سنگھ کے ذریعہ انہیں بکانن کی گوڈ اینڈ اسٹیس اور مارکس کی داس کیپٹل کتابیں پڑھنے کے لئے دیئے جانے کا ذکر کیا ہے۔

سکھ دیو کے بھائی متھر اداس تھاپر کے مطابق' سکھ دیو اور بھگت سنگھ کبھی کبھار کالج سے سیدھے کمرے پر چلے آتے اور دیر تک کوکا بغاوت' غدر پارٹی' کرتار سنگھ سرابھا' صوفی امبا پرساد اور ببر اکالیوں کے شجاعانہ کارناموں کے ذکر میں الجھے رہتے۔گورکی' مارکس' عمر خیام' اینجلس' آسکر وائلڈ' برناڈ شا' چارلس ڈیکنس' وکٹر ہیوگو' ٹالسٹائے اور دوستوو سکی جیسے عظیم مفکرین اور مصنفوں پر گھنٹوں تبادلہ خیالات کرتے'۔(میرے بھائی سکھدیو۔متھر اداس)۔شورش اور دیگر موضوعات کی کتابوں سے متعلق متھر اداس نے بتایا کہ بھگت سنگھ اس سے بہت متاثر تھے اور سکھ دیو کے ساتھ اس کتاب پر مہینوں الجھے رہتے۔

بھگت سنگھ کے بچپن کے نہایت قریبی دوست جے دیو گپت نے بھگت سنگھ کے زیر مطالعہ یا جیل میں منگوائی گئی کتابوں کا ذکر کیا ہے' ان میں ہیوگو کا ناول 93 ڈی ایل رائے کا ڈرامہ' میواڑ پتن' (سقوط میواڑ) شچند رناتھ سانیال کا' بندی جیون' گورکی کی' ماں' ڈیوما کا' تھری مسکیٹرز (Three Muskeeters)' ہیروز اینڈ ہیرو ئنز آف رشیا' روندر ناتھ ٹیگور کی نظم' لکلا چلورے' بھی شامل ہیں۔ہال کین' ہیوگو وغیرہ کی کتابوں کا ذکر انھوں نے بھی کیا ہے۔ان کتابوں میں' بندی جیون' کا پنجابی زبان میں بھگت سنگھ کا ترجمہ اور' کرتی' میگزین میں اس کی قسط وار اشاعت کا ذکر بھی ملتا ہے۔نیشنل کالج لاہور میں تعلیم کے دوران ڈرامائک کلب کے رکن کے طور پر بھگت سنگھ نے' میواڑ پتن' میں مہارانا پرتاپ کا رول ادا کیا' جسے سروجنی نائیڈو نے دیکھا اور بھگت سنگھ کی تعریف کی۔' بھارت دردشا (ہندوستان کی بدحالی)' سمراٹ چندر گپت وغیرہ ناٹکوں میں بھی بھگت سنگھ کے رول ادا کرنے کا ذکر ملتا ہے۔جے دیو گپت کے ایک خط میں بھگت سنگھ کے 13 کتابیں منگوانے کا تذکرہ ہے تو بھگت سنگھ کی جیل نوٹ بک میں کم سے کم 43 رائٹرز اور 108 کتابوں کے نوٹس درج ہیں۔سہارن پور بم فیکٹری سے جو 125 کتابیں رایڈیشن وغیرہ ضبط کیے گئے' ان میں بھی' گاندھی بہ نام لینن' پرساد کی تخلیق' آنسو' ٹالسٹائے کی تخلیقات' بندی جیون اور سامراجیہ واد وغیرہ کتابیں شامل تھیں۔

بھگت سنگھ کے ایک دیگر قریبی ساتھی جے دیو کپور کے مطابق بھگت سنگھ ڈان برین' کروپاٹکن کے نوجوانوں کے نام اپیل رولٹ رپورٹ' لائف آف میزینی گیری بالڈی اور اٹلی کی تعمیر نو' لینن کی سوانح حیات' روسی انقلاب وغیرہ کتابوں سے متاثر ہوئے۔

ادب میں دلچسپی کے علاوہ فلموں کے شوق سے متعلق ان کے ساتھیوں نے متعدد واقعات کا ذکر کیا ہے۔بھگت سنگھ کے' انکل ٹامس کیبن' ونکس' انار کلی اور چارلی چیپلن کی فلمیں دیکھنے کا ذکر ملتا ہے۔جے دیو کپور کے مطابق انہوں نے سلوچنا والی' انار کلی' فلم بھگت سنگھ کے ساتھ دیکھی' جے دیو کپور کے مطابق بھگت سنگھ دوسرے دن پھر اسی فلم کو دیکھنے گئے۔فلم دیکھنے کے لئے وہ کھانا بھی چھوڑ دیتے تھے اور ٹکٹ لینے کے لئے بھیڑ کی دھکا مکی کا سامنا بھی کر لیتے تھے۔

بھگت سنگھ پانچ فٹ دس انچ کے خوب صورت نوجوان تھے۔ انہیں گانے کا بھی شوق تھا اور وہ بہت اچھے انداز میں گاتے بھی تھے۔ اچھے کھانوں کے بھی وہ شوقین تھے۔ رس گلا' برفی' دودھ' گھی' کیک اور گوشت ان کی مرغوب غذاؤں میں شامل تھے۔ ایک مرتبہ تو وہ گوالے کو ایک روپیہ دے کر دودھ کی پوری بالٹی منہ لگا کر پی گئے۔ ان میں اخلاق مندی اور ہر کسی کو اپنا دوست بنانے کی بے نظیر صلاحیت تھی۔ ان کی شخصیت میں جذبات کے ساتھ ساتھ تدبر کا ایسا سنگم تھا جو بہت کم افراد میں ملتا ہے۔ لیکن کپڑے اور عام کرتا پاجامہ ڈھیلی ڈھالی پگڑی ہی پہنتے تھے۔ صحت اتنی اچھی تھی کہ بقول بھگوان داس ماہور ایک مرتبہ انہوں نے سب سے طاقت ور چندر شیکھر آزاد کو بھی مات کر دیا۔ اتنے خود دار کہ ایک بار والد سے کسی بات پر جھگڑا ہونے پر انہوں نے گھر سے پیسہ لینا بند کر دیا۔ نوجوان بھارت سبھا کے ساتھی اور دوست رام کشن کے ڈھابے پر کھانا کھاتے اور جے دیو گپت انہیں فلم دکھا دیتے۔

کامریڈ رام چندر کے بقول لاہور میں نوجوان بھارت سبھا 1924 سے ہی متحرک اور سرگرم تھی' لیکن کچھ لوگوں کے نزدیک اس کا قیام 1926 میں عمل میں آیا تھا۔ بھگت سنگھ نوجوان بھارت سبھا کے روح رواں تھے۔ بھگوتی چرن وو ہرا سبھا میں ان کے ساتھی تھے۔ نوجوان بھارت سبھا کے کھلے اسٹیج سے وہ ہندوستان میں انقلاب کا پرچار کرتے اور انگریزوں کے شہید کردہ انقلابیوں کے احوال زندگی سلائیڈ کے توسط سے پیش کرتے۔ نوجوان بھارت سبھا کی ہر میٹنگ میں اسٹیج پر سب سے پہلے غدر پارٹی کے شہید نوجوان کرتار سنگھ سرابھا کی تصویر پر گلہائے عقیدت پیش کیے جاتے۔ بھگت سنگھ کی جیب میں ہمیشہ سرابھا کی تصویر ہوتی تھی۔

پنجاب سے 1926 میں پنجابی زبان میں غدر پارٹی بھائی سنتوکھ سنگھ کی ادارت میں 'کرتی' میگزین کی اشاعت شروع ہوگئی۔ بھائی سنتوکھ سنگھ اور دیگر بہت سے غدر پارٹی سے وابستہ لوگ ماسکو سے اشترا کی نظریہ کی تربیت پا کر واپس ہوئے۔

بھگت سنگھ 1925 میں دہلی کے اخبار 'ارجن' سے 'کان پور سینٹر میں 'انڈین سوشلسٹ ری پبلک آرمی' سے اور لاہور میں 'نوجوان بھارت سبھا' کی سرگرمیوں سے وابستہ رہے۔ اکتوبر 1926 میں لاہور میں دسہرہ کے موقع پر بم دھماکہ ہوا۔ اس بم کیس کے سلسلے میں 29 مئی 1927 کو بھگت سنگھ کی پہلی بار گرفتاری عمل میں آئی۔ پانچ ہفتوں تک زیر حراست رہنے کے بعد 4 جولائی 1927 کو 60,000 روپے کی ضمانت پر رہا ہوئے۔ ہاتھ پیروں میں ہتھکڑی زنجیریں اور چارپائی پر بغیر پگڑی کے بھگت سنگھ کی تصویر اسی وقت کی ہے۔ ان کے پاس ہی ڈی ایس پی (سی آئی ڈی) گوپال سنگھ بیٹھ کر تفتیش کر رہا ہے۔ پولیس نے بھگت سنگھ کی گرفتاری دسہرہ بم کیس کے سلسلے میں کی تھی لیکن وہ بھگت سنگھ کو کاکوری ریل ڈکیتی (9 اگست 1925) کیس سے بھی جوڑنا چاہتی تھی جس میں اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اس وقت ساٹھ ہزار کی رقم موجودہ عہد کے چھ لاکھ سے زیادہ ہوگی۔ کشن سنگھ کے دو رفقاء بیرسٹر دولی چند (لاہور) اور دولت رام نے مل کر یہ ضمانت دی تھی۔

ضمانت کے سبب بھگت سنگھ کو لاہور میں ایک طرح سے گھر میں نظر بند ہونا پڑا۔ والد نے خواص ریاں گاؤں میں' جہاں ان کے والد کے نے بہت زمینیں خریدی تھیں' ڈیری فارم کھول دیا۔ بھگت سنگھ ڈیری کا کام دیکھتے رہے۔ ساتھ ہی ڈیری فارم پر انقلابیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ دریں اثنا انہوں نے گھر میں رہ کر خوب لکھا پڑھا' انقلابیوں کی تصاویر تلاش کیں اور ان کے خاکے تحریر کیے جو بعد از اں 'کرتی' اور 'چاند' (پھانسی نمبر) میں شائع ہوئے۔ 1924 میں 'اکالی' (پنجابی) سے ان کی وابستگی رہی۔ 1924 میں انہوں نے والد کے ساتھ بیلگاؤں کانگریس میں حصہ بھی لیا۔ بھگت سنگھ کی بھتیجی ویریندر سندھو کے مطابق 'چاند' کے پھانسی نمبر میں شائع 'وپلو یگیہ کی آہوتیاں' کالم میں انقلابیوں کے 47 خاکوں میں سے بیشتر بھگت

سنگھ کے تحریر کردہ اور چند ایک شوور ما کے تھے۔اس کی تصدیق خصوصی شمارہ کے ایڈیٹر چتر سین شاستری نے بھی کی ہے۔جنوری 1928 میں بھگت سنگھ ضمانت کے شکنجہ سے آزاد ہوئے۔بعد ازاں وہ پورے ہندوستان میں گھوم کر انقلابی تنظیموں کو مستحکم اور مضبوط کرنے میں مصروف ہو گئے۔بھگت سنگھ کا جن شہروں رقصبوں میں جانے کا ذکر ملتا ہے'ان میں پنجاب کے لائل پور'لاہور' راولپنڈی' میاں والی' امرت سر' جالندھر' فیروز پور سے لے کر دہلی' کان پور' آگرہ' الہ آباد' سہارن پور' پٹنہ' بتیا' گوالیار' پرتاپ گڑھ' جھانسی' بیلگاؤں' کلکتہ وغیرہ شہروں میں ان کی سرگرمیاں قابل ذکر ہیں۔یہ فہرست ادھوری ہے۔

1928 میں تین چار ماہ انہوں نے سوہن سنگھ جوش کی ادارت میں امرت سر سے نکلنے والی پنجابی اور اردو میگزین 'کرتی' میں بھی کام کیا۔'کرتی' کو انہوں نے اپنی انتہائی اہم اور قیمتی تحریروں سے نوازا۔بھگت سنگھ کے زیادہ تر مضامین 1928 قلم بند کئے گئے۔'چاند' کے نومبر 1928 کے پھانسی نمبر میں انقلابیوں کے 37 خاکوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے کم از کم 14 مزید مضامین' جن میں 'فرقہ وارانہ فسادات اور ان کا علاج' مذہب اور ہماری جدوجہد آزادی' چھوت چھات مسئلہ جیسے اہم مضامین شامل ہیں' اسی سال 'کرتی' میں شائع ہوئے۔یہی وہ سال ہے جب 8 اور 9 ستمبر کو بھگت سنگھ نے اپنی انقلابی جماعت کو نظریاتی طور پر سماجوادی لبادہ میں تبدیل کیا۔بھگت سنگھ جس لگن اور محنت سے پوری دنیا کی انقلابی تحریکات کا مطالعہ کر رہے تھے اور جس طرح انہیں مارکس کے نظریات نے مائل کیا' اس پس منظر میں بھگت سنگھ کا اپنی جماعت کو سوشلزم کے راستے پر لے کر چلنا فطری تھا۔لیکن ڈسپرس بننے کے بعد ہی سیاسی واقعات کا پہیہ اتنی تیزی سے گھوما کہ اس کا انجام 1931 میں بھگت سنگھ کی شہادت کی شکل میں سامنے آیا۔

30 اکتوبر 1928 کو لاہور میں سائمن کمیشن آیا۔نوجوان بھارت سبھا اور بھگت سنگھ نے لالہ لاجپت رائے سے اختلافات کے باوجود ان سے سائمن کمیشن کے خلاف احتجاج کی نمائندگی کی اپیل کی' جسے لالہ لاجپت رائے نے قبول کرلیا۔25000 سے زائد افراد پر مشتمل ہجوم نے 'سائمن کمیشن' کے خلاف لاہور کے ایس پی اسکاٹ کے حکم پر ڈی ایس پی سانڈرس نے بے رحمی کے ساتھ لاٹھی چارج کیا۔اسی شام ہزاروں لوگوں کے لاٹھی چارج مخالف اجلاس میں لالہ لاجپت رائے نے گرج دار انداز میں کہا...... ''میرے جسم پر پڑی ہر لاٹھی برطانوی سامراج کے کفن کی آخری کیل ثابت ہوگی''۔ 17 نومبر 1928 کو لالہ لاجپت رائے زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔پورے ملک میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔سی آر داس کی بیوہ بسنتی دیوی نے ملک کے نوجوانوں کو للکارا...... ''کیا کوئی نوجوان اتنی بڑی قومی اہانت اور بے عزتی کا انتقام نہیں لے گا؟'' ہسپرس جس نے 9-8 ستمبر 1928 کو دہلی کے فیروز شاہ کوٹلہ میدان میں مزدوروں' کسانوں' نوجوانوں اور طلبا کی تنظیمیں بنا کر اپنی تحریک کو ملکی سطح پر توسیع دینے کا فیصلہ کیا تھا' کے لئے اس چیلنج کو تسلیم نہ کرنا ناممکن تھا۔آزاد اور بھگت سنگھ کا خیال تھا کہ اس قومی بے عزتی اور تحقیر کا بدلہ ضرور لیا جائے۔10-9 دسمبر کو لاہور کے مجنگ بھون میں ہوئی میٹنگ میں لالہ لاجپت رائے پر لاٹھی چارج کرنے والے پولیس افسر کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔چندر شیکھر آزاد کو پوری کارروائی کی دیکھ بھال کا ذمہ سونپا گیا۔لاہور کے ایس پی دفتر پر اسکاٹ کی آمد ورفت پر نظر رکھنے کے لئے جے گوپال کو ذمہ دار بنایا گیا۔چندر شیکھر آزاد کو ہندوستان 'انڈین سوشلسٹ ری پبلک آرمی' کا کمانڈر ان چیف بنایا گیا اور بھگت سنگھ اور وجے کمار سنہا کو پورے ملک کا رابطہ کار۔سکھدیو کو پنجاب تنظیم کا ذمہ دار بنایا گیا۔

17 دسمبر شام چار بجے ہیٹ پہنے ایک پولیس افسر موٹر سائیکل پر ایس پی دفتر لاہور سے نکلا۔جے گوپال اسے پوری طرح پہچان نہیں پایا اور اس نے اشارہ دے دیا۔اس کے اشارے پر بھگت سنگھ کو گولی چلانی تھی لیکن راج گرو ایکشن میں ہمیشہ

آگے رہنا چاہتا تھا' لہٰذا اس نے ٹریگر دبا دیا۔ فوراً بھگت سنگھ نے پہچان کر کہا...... "پنڈت جی یہ اسکاٹ نہیں ہے"۔ سانڈرس کو گولی لگی اور وہ موٹر سائیکل سے نیچے گر پڑا۔ اسی وقت بھگت سنگھ نے ایکشن مکمل کرنے کے لئے تین چار مزید گولیاں اسے ماریں اور سبھی لوگ وہاں سے بحفاظت فرار ہوگئے۔ سپاہی چنن سنگھ نے ان کا پیچھا کیا' آزاد کے روکنے پر وہ نہیں رکا تو آزاد نے اسے گولی ماردی۔ ڈی اے وی کالج میں سائیکل چھوڑ کر انہوں نے لاہور سے باہر نکلنے کا منصوبہ بنایا۔ بھگت سنگھ اس ایکشن سے چند ہفتہ قبل فیروز پور میں اپنے بال داڑھی منڈوا دیئے تھے اور اب وہ صرف مونچھ رکھے ہوئے تھے۔ اس شکل میں انہیں لاہور میں کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ 18 دسمبر کی رات لاہور میں پوسٹر چسپاں کردیئے گئے۔ "لالہ لاجپت رائے کی موت کا بدلہ لے لیا گیا' سانڈرس مارا گیا"۔ پورے شہر' ملک اور دنیا میں اس خبر سے سنسنی پھیل گئی۔ راج گرو سکھدیو اور بھگت سنگھ درگا بھابھی کے گھر پہنچے۔ بھگوتی چرن ووہرا پارٹی کے کام کے سلسلے میں کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ گھر میں رکھے ہوئے پانچ سو روپے درگا بھابھی بے فکر ہوکر سکھ دیو کو دے دیئے۔ کلکتہ کا ریل ٹکٹ خرید کر بھگت سنگھ صاحبی درگا بھابھی کے شوہر کے طور پر' بچہ شچی اور نوکر کے بھیس میں راج گرو کے ساتھ لاہور ریلوے اسٹیشن سے فرسٹ کلاس میں بحفاظت نکل گئے۔ آزاد جی پنڈے کے بھیس میں نکل گئے۔ کلکتہ میں اس وقت کانگریس کا سالانہ اجلاس ہورہا تھا۔ بھگت سنگھ وہاں سوہن سنگھ جوش اور کانگریس کے کچھ دیگر نمائندوں سے ملے۔ ان کی ملاقات ڈسپلن کمیٹی کے ترلوکیہ ناتھ چکرورتی اور پرتل گانگولی وغیرہ سے بھی ہوئی۔ انہوں نے وہیں پرییتندر ناتھ داس کو شمالی ہند میں آکر انقلابیوں کو بم سازی کی تربیت دینے کے لئے راضی کیا۔ کلکتہ میں وہ چھجو رام کے گھر رہے' جہاں سشیلا دیدی اس کی بیٹی کو پڑھاتی تھیں۔ درگا بھابھی کے شوہر بھگوتی چرن ووہرا نے اسٹیشن پر ان کا استقبال کیا اور درگا بھابھی کو مبارکباد دی۔

کلکتہ میں ایک ہفتہ گزارنے کے بعد بھگت سنگھ کلکتہ سے وہ فیلٹ ہیٹ خرید کر لوٹے جو عالم طور پر ان کی شناخت بن گئی۔ دریں اثنا انقلابی جماعت نے لاہور' آگرہ اور سہارن پور میں بم فیکٹریاں قائم کیں اور بم سازی کا کام شروع ہوا۔

اس دوران برطانوی حکومت سنٹرل اسمبلی میں بغیر پاس ہوئے پبلک سیفٹی بل اور ٹریڈ ڈسپیوٹس بل کو آرڈی ننس کے ذریعہ نافذ کررہی تھی۔ پورے ملک میں اس کی شدید مخالفت ہورہی تھی۔ اسمبلی کے زیادہ تر ارکان کی مخالفت کو بھی حکومت نظر انداز کررہی تھی۔ اس وقت پارٹی کی میٹنگ بلاکر فیصلہ کیا گیا کہ اس بل پر عوام کے احتجاج کو فرانسیسی انقلابی ویلیاں کی طرز پر دھماکہ کی شکل میں سنایا جائے۔ مقصد کسی کو مارنا نہیں تھا' اسمبلی میں بم دھماکہ کرکے سرکار کو نیند اور عوامی احتجاج کے تئیں غفلت سے بیدار کرنا تھا۔ پہلی میٹنگ میں سکھدیو سنگھ کی غیر موجودگی میں جن دو ساتھیوں کو اس مقصد کے لئے منتخب کیا گیا' ان میں بھگت سنگھ کو ان کی درخواست کے باوجود نہیں رکھا گیا کیوں کہ انقلابی جماعت ان کی اہمیت کو سمجھتی تھی اور سانڈرس کے قتل میں ان کا نام سامنے آنے پر بھگت سنگھ کو تختہ دار پر چڑھایا جانا یقینی تھا۔ سکھ دیو جب لوٹا تو اس نے بھگت سنگھ پر چھینٹا کشی کی "تم اپنے آپ کو عظیم سمجھنے لگے ہو' تم کسی کی زلفوں کے اسیر ہوکر جان بچانا چاہتے ہو"۔ بھگت سنگھ کی اپیل پر دوبارہ میٹنگ طلب کی گئی اور بھگت سنگھ کی ضد پر اسے اور بٹو کیشور دت کو اس کارروائی کے لئے منتخب کیا گیا۔ آزاد چاہتے تھے کہ بم پھینک کر گرفتاری نہ دی جائے لیکن بھگت سنگھ نے کہا کہ وہ گرفتار ہوکر پوری دنیا کے سامنے اپنے مقاصد رکھیں گے اور دنیا میں برطانوی استعماریت کا بے رحم اور ظالمانہ چہرہ بے نقاب کردیں گے۔

جے دیو کپور کو پاس بنوانے اور انہیں اسمبلی کے اندر بم دھماکہ سے قبل باہر آکر اخباری نمائندوں کو خبر پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ کپور نام کے ایک اہم نام پولیس افسر سے دوستی کرکے جے دیو نے اسمبلی میں داخلہ کا راستہ ہموار کیا۔ کئی دن

آنے جانے کے دوران پنجاب کے ممبر اسمبلی ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے بھگت سنگھ کو پہچان بھی لیا اور ایک طرح سے مدد کی یقین دہانی بھی کرائی۔ ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو پنجاب کانگریس کے سینئر کمیونسٹ لیڈر تھے اور بھگت سنگھ کو بہت چاہتے تھے۔ 8 اپریل 1929 کو دہلی اسمبلی روانہ ہونے سے پہلے بھگت سنگھ نے اپنے نئے جوتے اور گھڑی جے دیو کپور کو تحفتاً دے دی اور جے دیو کپور کے پرانے جوتے خود پہن لئے۔ جو گھڑی انہوں نے جے دیو کو بطور تحفہ پیش کی' وہ انہیں شچیندر ناتھ سانیال نے دی تھی۔ یہ تاریخی گھڑی شچیندر ناتھ سانیا کو دہلی بم کیس کے ملزم راس بہاری بوس نے تحفہ میں دی تھی۔ اسی دن صبح بھگت سنگھ نے کداسیہ باغ میں درگا بھابھی سشیلا دیدی اور یش پال وغیرہ ساتھیوں سے ملاقات کی۔ یہ جوتے اور گھڑی جے دیو کپور کے میوزم ہردوئی (اتر پردیش) میں محفوظ ہیں۔

بم دھماکہ سے چند دن پہلے دہلی کے کشمیری گیٹ پر رام ناتھ فوٹو گرافر کی دکان سے بھگت سنگھ اور دت کے فوٹو کھنچوائے گئے جن کی کاپیاں لینے جب جے دیو کپور دھماکہ کے تین چار روز بعد گئے تو فوٹو گرافر سمجھ گیا کہ یہ تصاویر کس وجہ سے کھنچوائی گئی تھیں۔ انقلابی جماعت نے اپنے منصوبے اس قدر منظم انداز میں بنائے تھے کہ اسمبلی میں دھماکہ کے ساتھ بھیجے گئے پرچوں کو پہلے ہی پریس بیان کی شکل میں ٹائپ کرا لیا گیا تھا اور 'ہندوستان ٹائمس' کے نمائندہ چمن لال نے اسی شام بھگت سنگھ اور جماعت کی تصویر کے ساتھ خصوصی طور پر پورا بیان شائع کر دیا۔ نوجوان بھارت سبھا سے وابستہ 'اسٹیٹس مین' کے نمائندہ درگا داس کھنہ نے اسے کلکتہ نہ بھیج کر 'اسٹیٹس مین' لندن کے دفتر بھیج دیا۔ نتیجہ کے طور پر اگلے دن کے اخباروں میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے متعدد ممالک میں اس دھماکہ کی خبریں شائع ہو گئیں۔ دھماکہ کے وقت اسمبلی میں بلوں پر بحث ہو رہی تھی۔ بم خالی بنچوں پر پھینکے گئے۔ وہ ہلکے تھے جن سے کچھ بنچوں کو نقصان پہنچا اور کچھ ممبران کو خراشیں آئیں لیکن خوف اور دہشت سے برطانوی وزیر داخلہ سمیت ہندوستانی ممبران بھی بنچوں کے نیچے چھپ گئے۔ صرف موتی لعل نہرو' محمد علی جناح وغیرہ ممبران ہی اپنی سیٹوں پر بے خوف بیٹھے رہے۔ بم دھماکہ کے ساتھ ہی بھگت سنگھ اور دت نے 'انقلاب زندہ باد' اور 'سامراجیہ واد کا ناش ہو' کے نعرے اس قدر پر جوش انداز میں لگائے کہ بعد کے برسوں میں یہی نعرے سب سے اہم بن گئے اور 'بندے ماترم' کا مروجہ نعرہ پس منظر میں چلا گیا۔ بھگت سنگھ اور دت نے جب اپنی پستول میز پر رکھ کر پولیس افسران کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تو دہشت زدہ پولیس حکام انہیں گرفتار کرنے آگے بڑھے۔ دونوں نوجوانوں کو گرفتار کر کے 22 اپریل تک پولیس ریمانڈ اور بعد ازاں دہلی جیل میں رکھا گیا۔ دونوں نے کوئی بیان نہیں دیا' پولیس نے بھی انہیں جسمانی اذیتیں نہیں پہنچائیں۔ بعد میں سیشن کورٹ لاہور میں ہی بھگت سنگھ اور بٹو کیشور دت کا تاریخی بیان 6 جون 1929 کو ان کے مشاورتی وکیل آصف علی نے پڑھا۔ اس کیس میں دونوں کو 12 جون 1929 میں عمر قید کی سزا دی گئی جسے ہائی کورٹ نے بحال رکھا۔ ہائی کورٹ میں ایک اور بیان بھگت سنگھ نے دیا جو سیشن کورٹ بیان کی طرح ہی تاریخی ثابت ہوا۔

14 جون 1929 کو میاں والی اور لاہور کی الگ الگ جیلوں میں بھیجے جانے کے وقت بھگت سنگھ اور بٹو کیشور دت نے اپنی تاریخی بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا اور اس طرح بھگت سنگھ قید زنداں کے دوران ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوئے۔ تحریک جدوجہد آزادی کے سلسلے میں گرفتار شدہ قیدیوں کو سیاسی قیدی کا درجہ دینے اور انہیں جیل میں اچھی غذا اور پڑھنے لکھنے کی سہولت کے مطالبہ کے ساتھ یہ بھوک ہڑتال شروع ہوئی۔ جب 10 جولائی کو لاہور سازش کیس کی سماعت شروع ہونے پر بھگت سنگھ کو عدالت میں اسٹریچر پر لا کر پیش کیا گیا تب جا کر لاہور جیل میں قید ساتھیوں کو اس کا علم ہوا۔ سانڈرس کیس کی سماعت کے لئے جب بھگت سنگھ کو بھی لاہور جیل میں ہی رکھ لیا گیا تو ان کے باقی ساتھی بھی بھوک ہڑتال میں شامل ہو گئے۔

بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی یہ بھوک ہڑتال نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی سیاسی تاریخ کا عظیم واقعہ ہے۔ ان کی بھوک ہڑتال سے قبل آئرش مجاہد آزادی میکسونی طویل بھوک ہڑتال کے خلاف بھوک ہڑتال کے سبب شہید ہو چکے تھے۔ غدر پارٹی کے متعدد انقلابی جیسے رام رکھا انڈمان جیل میں بربریت کے خلاف بھوک ہڑتال کر کے شہید ہو گئے۔ آئرلینڈ کی جدوجہد آزادی کے ساتھ ساتھ غدر پارٹی کے انقلابیوں سے بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی بہت متاثر تھے اور اپنے ان آئیڈیل انقلابیوں نقش قدم پر چل کر انہوں نے بھوک ہڑتال کا راستہ اختیار کیا۔ جیل حکام بھوک ہڑتال ختم کرانے کے لئے جبراً ناک سے نلی کے ذریعہ دودھ پلانے کی کوشش کرتے تو 26 جولائی کو بھوک ہڑتال کے تیرہویں دن جتن داس کے احتجاج کے سبب دودھ پھیپھڑوں میں سرایت کر گیا جس سے ان کی حالت ابتر ہو گئی۔ نوجوان انقلابی اور غدر پارٹی کے پہلے صدر بابا سوہن سنگھ بھکنا بھی بھوک ہڑتال میں شامل ہو گئے۔ جیل میں بھگت سنگھ سے ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ بھگت سنگھ نے ان سے بھوک ہڑتال میں نہ شامل ہونے کی درخواست کی کیوں کہ ان کی رہائی نزدیک تھی اور عمر بھی زیادہ تھی لیکن بابا بھکنا جو پہلے بھی انڈمان اور دیگر جیلوں میں متعدد مرتبہ بھوک ہڑتال کر چکے تھے، شمولیت اختیار کی اور اس سے ان کی رہائی میں اڑچن آئی اور کچھ زیادہ دنوں کی قید انہیں جھیلنی پڑی۔

بھگت سنگھ اور ان کے رفقاء کی بھوک ہڑتال نے پورے ملک میں سنسنی خیز حالات پیدا کر دیئے۔ روزانہ اخبارات میں ان کی گرتی صحت کی خبریں شائع ہونے لگیں۔ جن قومی رہنماؤں نے اسمبلی بم کیس کے وقت اسمبلی میں اور باہر بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت کی جم کر مذمت کی تھی، وہی لیڈران ان کی قربانی کو دیکھ کر جیل میں ان سے ملاقات کے لئے آنے لگے اور ان کی حمایت میں بیان دینے لگے۔ موتی لعل نہرو، جواہر لعل نہرو، سبھاش چندر بوس، مدن موہن مالویہ، گنیش شنکر ودیارتھی، چندر بھانو گپت وغیرہ لیڈران سرگرم ہو گئے۔ 2 ستمبر کو سرکار نے 'جیل انکوائری کمیٹی' تشکیل دی۔ کمیٹی کے ارکان نے بھوک ہڑتال کرنے والے انقلابیوں سے اسی روز مل کر کہا کہ اگر وہ بھوک ہڑتال ختم کر دیں تو سرکار جتن داس کو رہا کر دے گی جن کی حالت نہایت نازک ہو چکی تھی۔ 2 ستمبر سے بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت بھوک ہڑتال کے 81 دن مکمل کر چکے تھے اور دیگر انقلابی 53 دن۔ بھگت سنگھ نے اپنے ساتھی جتن داس کی جان بچانے کی امید میں کمیٹی کے وعدے پر بھوک ہڑتال روک دی۔ لیکن سرکار اپنی قول سے انحراف کر گئی اور اس نے جتن داس کو رہا کرنے سے صاف منع کر دیا۔ سرکار کی اس وعدہ خلافی کے ردعمل کے طور پر بھگت سنگھ اور دت نے دو دن بعد ہی 4 ستمبر سے دوبارہ بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ اس بھوک ہڑتال کی گونج پورے ملک کے ساتھ ساتھ مرکزی اسمبلی میں بھی گونجی۔ محمد علی جناح نے 12 اور 14 ستمبر کو انقلابیوں کی خراب ہو رہی صحت کے تعلق سے سرکار کو اپنی تقریر میں خوب لتاڑا۔ موتی لعل نہرو، مدن موہن مالیہ وغیرہ متعدد لیڈروں، یہاں تک کہ دیوان چمن لال نے بھی اسمبلی میں اس مدعے پر سرکار کو کھنچائی کی۔ 13 دسمبر کو جناح کی تقریر کے دوران ہی جتن داس نے جام شہادت نوش کیا۔ سبھاش چندر بوس نے جتن داس کی لاش کو مکمل اعزاز کے ساتھ کلکتہ لانے کا اعلان کیا۔ لاہور میں لاکھوں لوگوں نے ریل گاڑی پر رکھی جتن داس کی لاش کو الوداع کہا اور ہر اسٹیشن پر ہزاروں ہندوستانیوں نے عظیم شہید جتن داس کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کلکتہ اسٹیشن پر پہنچے پانچ لاکھ سے زیادہ عوامی بھیڑ نے اپنے دھرتی پتر کو گود میں لیا۔ آخر کار سرکار کو ان کے چند مطالبات تسلیم کرنے پڑے اور کانگریس پارٹی کی اپیل پر بھوک ہڑتال کے 114 دن پورے کرنے کے بعد 5 اکتوبر 1929 کو انقلابیوں نے اپنی یہ تاریخی بھوک ہڑتال ختم کر دی اور اس بھوک ہڑتال کے دوران اپنے ساتھی جتن داس کی شہادت سے یہ ثابت کر دیا کہ انقلابی محض تشدد کے پجاری نہیں بلکہ وہ عدم تشدد کی شکل میں بھی عظیم قربانی دینے والے محب وطن ہیں۔

ایک طرف انقلابی اپنے ایثار سے پورے ملک میں اپنی جگہ بنا رہے تھے تو دوسری طرف اسی وقت 12 ستمبر 1929 کو مرکزی اسمبلی میں بل پیش کیا' جس میں ملزموں کی غیر حاضری کے دوران مقدمہ جاری رہنے اور سزا دینے کی تجویز تھی۔ موتی لعل نہرو جیسے شعلہ بیان مقررین کے ساتھ حکومت پرست ممبران کو بھی اس بل کی مخالفت کرنی پڑی۔ بل کو لوک مت کے لئے بھیج دیا گیا لیکن بغیر قانون سازی کے آرڈی نینس کے ذریعہ اس قسم کی کارروائی کا حق سرکار نے اپنے پاس ہی رکھا۔

اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں کارروائی کا آغاز ہوا تو بھوک ہڑتال کی اخلاقی جیت سے پرجوش انقلابی عدالت میں 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے اور وطن پرستی پر مبنی گیتوں سے مجسٹریٹ اور پولیس کو غصہ سے لال کر دیتے۔ ملزموں نے عدالت میں ہتھکڑیاں پہن کر آنے کی بھی مخالفت کی۔ عدالت میں انقلابیوں سے ملنے سبھاش چندر بوس' کے ایل نریمن' راجا کالا کانکر' رفیع احمد قدوائی' بابا گرودت سنگھ (کاما گاٹا مارو) موہن لال سکسینہ کے ساتھ موتی لعل نہرو بھی پہنچتے۔ اسی بیچ اکتوبر کے اواخر میں ملزموں کی خوب پٹائی کی گئی جس میں آٹھ ہٹے کٹے پٹھان ان پر ٹوٹ پڑے۔ بھگت سنگھ زخمی ہو گئے۔ اجے گھوش اور شورما پٹائی سے بے ہوش ہو گئے۔ زخمی حالت میں بھی بھگت سنگھ نے مجسٹریٹ کو چیلنج کیا کہ اگر ان کے ساتھیوں کو کچھ ہوا تو حکومت برطانیہ انجام کے لئے تیار رہے۔ مجسٹریٹ کو ملزمین کو ہتھکڑیاں نہ پہنانے کی بات تسلیم کرنی پڑی۔ پولیس نے جیل میں پوری طرح پٹائی کے بعد رپورٹ دی کہ ''انہیں مار ڈالا جا سکتا ہے لیکن عدالت نہیں لایا جا سکتا'۔

اس دوران جیل اصلاح کمیٹی کی سفارشات جو نومبر تک نافذ کی جانی تھیں' دسمبر اور جنوری 1930 تک نافذ نہیں کی گئیں تو 4 فروری 1930 کو بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے ایک ہفتہ کے نوٹس کے بعد دوبارہ بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ اس مرتبہ یہ بھوک ہڑتال دو ہفتہ تک جاری رہی جس کے بعد سرکار نے سیاسی قیدیوں سے متعلق رہنما اصول جاری کئے۔

یکم مئی 1930 کو گورنر نے خصوصی اختیارات کا استعمال کر کے لاہور سازش کیس کی سماعت کے لئے تین ججوں پر مشتمل اسپیشل ٹریبیون بنانے کا آرڈی نینس جاری کیا جس سے حکومت برطانیہ کے قانونی نظم کی قلعی کھل گئی۔ بھگت سنگھ کے تحریر کردہ دو خطوط اس پوری کارروائی کے کھوکھلے پن کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس ٹربیونل کے صدر جج کولڈ اسٹریم' ممبر تھے جی سی ہلٹن اور آغا حیدر۔ ٹربیونل کے سے پیش اٹھارہ ملزمین میں سے چند نے پوری کارروائی کے بائیکاٹ کا' کچھ نے سرکار کے خرچ سے وکیل لینے اور بھگت نیز کچھ دیگر نے اپنا مقدمہ وکیل کے مشورہ سے خود لڑنے کا فیصلہ کیا۔ عدالت میں انقلابی نعرے لگاتے اور انقلابی گیت گاتے جس سے کولڈ اسٹریم چڑھتا تھا۔ 12 مئی 1930 کو عدالت کے اندر ملزموں کو پیروں' گھونسوں اور ڈنڈوں سے ویسے ہی مارا گیا جس طرح اکتوبر 1929 میں اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں مار گرایا تھا۔ ٹربیونل کے ہندوستانی ممبر آغا حیدر نے اخبار سے اپنا منہ چھپا لیا اور بعد ازاں خود کو کولڈ اسٹریم کے فیصلہ سے الگ کر لیا۔ 13 مئی 1930 کے بعد بھگت سنگھ کی رائے کے مطابق سبھی انقلابیوں نے عدالت کا بائیکاٹ کر دیا۔ جسٹس آغا حیدر کو سرکار کی جانب داری نہ کرتے دیکھ کر ٹربیونل کی از سر نو تشکیل کی گئی۔ اس میں کولڈ اسٹریم اور آغا حیدر دونوں کو ہٹا کر جی سی ہلٹن کو صدر کے جے ٹیپ اور عبد القادر کو ممبر نامزد کیا گیا۔ وائسرائے نے ایک تیر سے دو شکار کئے۔ ملزمین سے کہا کہ آپ کی شکایت پر ٹربیونل کی دوبارہ تشکیل کی گئی ہے جب کہ اس نے آغا حیدر جیسے غیر جانب دار جج کو ہٹا کر ملزمین کی سزا کو یقینی بنا دیا تھا۔ بھگت سنگھ سیاسی طور پر لارڈ اروِن سے زیادہ بالغ تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہلٹن جو کہ مار پیٹ کے جرم میں شریک ہے' معافی مانگے تبھی ہم عدالت آئیں گے۔ اس طرح ملزمین کی غیر موجودگی میں یک طرفہ مقدمہ کا ڈرامہ آگے بڑھا۔

ٹربیونل نے 26 اگست 1930 کو اپنی کارروائی مکمل کر کے ملزمین کو بچاؤ کا آخری موقع دینے کی کوشش کی۔ ملزمین نے

صارف انکار کر دیا کیوں کہ وہ ٹربیونل کے دیئے جانے والے فیصلے سے بخوبی واقف تھے۔ بھگت سنگھ نے 5 اکتوبر 1930 کو دوستوں کے ساتھ آخری عشائیہ میں واضح طور پر کہا بھی تھا کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انہیں پھانسی کی ہی سزا ملے گی۔ 5 اکتوبر 1930 کو جیل کے ڈنر میں کچھ حکام بھی شامل تھے۔ اس رنگا رنگ تقریب میں اٹاہاس، چٹکلے، لطیفے، گانے، مستی سبھی کچھ تھا۔ بھگت سنگھ عوام اور عدالت میں ہی نہیں، جیل میں بھی ہیرو تھے۔ جیل حکام بھی انہیں دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ انہوں نے ایسا حسن اخلاق کسی قیدی کا نہیں دیکھا۔

6 اکتوبر 1930 کو جیل کی چاروں طرف مسلح دستے لگا دیئے گئے۔ 7 اکتوبر کو جیل کے اندر ہی ٹربیونل کے پیغام رساں نے ٹربیونل کا 68 صفحہ پر مشتمل فیصلہ ملزمین کو پڑھ کر سنایا۔ فیصلے میں بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی، کمل ناتھ تیواری، وجے کمار سنہا، جے دیو کپور، شِو ورما، گیا پرساد، کشوری لال، (نابالغ) مہاویر سنگھ (انڈمان میں 1933 میں بھوک ہڑتال کے سبب شہید) کو انڈمان میں عمر قید، کندن لال کو 7 سال اور پریم دت کو پانچ سال کی سزا سنائی گئی۔ اجے گھوش، جتندر سانیال، سریندر پانڈے، دیش راج اور ماسٹر آ گیا رام کو رہا کر دیا گیا۔

پانچ وعدہ معاف گواہ جے گوپال، فریندر گھوش (1932 میں بتیا میں بیکنٹھ شکلا کے ذریعہ قتل) منموہن بنرجی، ہنس راج ووہرا اور للت مکھرجی کو مقدمے سے ڈسچارج کر دیا گیا۔

اس دوران بھگت سنگھ کے والد کشن سنگھ نے بیٹے سے بغیر پوچھے، بھگت سنگھ کے سانڈرس قتل کیس کے دن لاہور میں عدم موجودگی سے متعلق، ایک اپیل برطانوی حکومت کو دی جس پر بھگت سنگھ تلملا اٹھے اور انہوں نے والد کو سخت الفاظ میں خط لکھ کر اس خط کو فوری طور پر اخباروں میں چھپوانے کے لئے کہا جوان کی خواہش کے مطابق والد نے ہندی، اردو اور انگریزی کے اخباروں میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔

8 اکتوبر کو 'بھگت سنگھ کی پھانسی کی سزا' کی خبر پورے ملک کے اخباروں میں صفحہ اول کی شہ سرخی بنی تو ہلچل مچ گئی۔ لاہور اور پنجاب کے کئی حصوں میں نوجوان بھارت سبھا اور لاہور اسٹوڈنٹ یونین کی اپیل پر اسکول، کالجوں میں ہڑتال ہوئی۔ 17 خواتین سمیت بہت سے طالب علم گرفتار ہوئے۔ بریڈ ہال میں نوجوان بھارت سبھا کا جلسہ ہوا۔ موری گیٹ میں کانگریس کا جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے۔

نوجوان بھارت سبھا کی پیش قدمی پر پورے ملک میں 'بھگت سنگھ ڈیفنس کمیٹی' اور 'بھگت سنگھ اپیل کمیٹی' تشکیل کی گئی۔ پنجاب میں کماری لجاوتی 'بھگت سنگھ ڈیفنس کمیٹی' کی سکریٹری تھیں اور جیل میں لگاتار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں سے ملتی تھیں۔ بھگت سنگھ اپیل کے حامی نہیں تھے لیکن ان کے وکیل پران ناتھ مہتہ اور آصف علی کے سمجھانے سے تیار تو ہوئے لیکن محض کچھ وقت حاصل کرنے کے لیے عوام کے دل و دماغ میں برطانوی سامراج کے تئیں غصہ بھڑکانے کے لئے انہوں نے اپنے ساتھی وجے کمار سنہا سے اپیل کرتے وقت کہا...... 'بھائی ایسا نہ ہو کہ پھانسی رک جائے''۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ 'انہیں پھانسی اس وقت دی جائے جب ملک کے عوام کا جوش پورے شباب پر ہو اور ان کا ذہن مکمل طور پر پھانسی پر مرکوز ہو۔ نوجوان بھارت سبھا کی تشکیل سے لے کر پھانسی تک بھگت سنگھ کے ذہن میں ایک ہی جذبہ جاگزیں تھا کہ کیسے برطانوی سامراج کا حقیقی چہرہ سامنے لا کر عوام کے دلوں میں غصہ ونفرت بیدار کیا جائے جس سے سیاسی طور پر بیدار ہو کر وہ برطانوی حکومت کو اپنی سرزمین سے اکھاڑ پھینکیں۔ ساتھ ہی وہ اس بات کے بھی خواہاں تھے کہ 'گورے کی جگہ کالے حکمراں' تک ہی یہ تبدیلی نہ رہے ورنہ حقیقی مساوات، انصاف اور محنت کے صحیح اقدار پر مبنی سوویت یونین کی طرح ہمارے ملک میں

سوشلسٹ نظام کی بھی تعمیر ہو سکے۔ اپنی زندگی کو وہ اس عظیم مقصد کی حصولیابی کا بہترین وسیلہ تصورت کرتے تھے اور کچھ نہیں۔ شہادت سے چند دن قبل اپنے ساتھیوں کو تحریر کردہ خطوط میں انہوں نے کہا کہ ''اپنی مختصر سی زندگی میں انہوں نے 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ لاکھوں لوگوں تک پہنچا دیا' یہ اس کی زندگی کا سب سے تسلی بخش لمحہ ہے لیکن بھگت سنگھ صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے ملک میں سامراجی طاقتوں اور سرمایہ کاروں کے خلاف ایسی مشعل جلائی جوان کے جانے کے 76 برس بعد بھی مستحکم انداز میں جل رہی ہے۔

پروی کونسل میں بھگت سنگھ کے مشورہ پر اسپیشل ٹربیونل کے جواز پر سوال اٹھاتے ہوئے اپیل کی گئی جسے خارج ہونا ہی تھا۔ لیکن اسی درمیان چھ ماہ کا جو وقت ملا اس کا انقلابیوں نے ملک کے عوام کو بیدار کرنے میں جم کر استعمال کیا۔ ٹربیونل کے فیصلہ کے بعد پھانسی کی تاریخ 27 اکتوبر مقرر کی گئی۔ اپیل کے بعد پھانسی روک دی گئی۔ اس دوران آرڈی نینس کی مدت ختم ہونے کے سبب 31 اکتوبر کو ٹربیونل خود بخود ختم ہوگیا۔ ٹربیونل کا فیصلہ اس کی مدت کے اندر اندر نافذ نہ ہونے کی صورت میں ٹربیونل کے فیصلے کا عدالتی جواز نہیں رہ گیا۔ پروی کونسل نے اپنی سرمایہ کارانہ پالیسیوں کے تحفظ کے لئے اس عدالتی نکتہ کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کی اور پوری دنیا کی عوامی رائے کو درکنار کرتے ہوئے انقلابیوں کی پھانسی کی سزا برقرار رکھی۔ ان تعلق سے لندن' نیویارک' پیرس' ماسکو' دنیا کے ہر بڑے شہر کے اخباروں میں خبریں اور مضامین شائع ہوئے۔ بین اقوامی کمیونسٹ تحریک نے اس انقلابی نوجوانوں کی تعریف کی۔

12 فروری 1931 کو پروی کونسل نے بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی اپیل خارج کردی۔ اس سے پورے ملک میں ایک بار پھر ہلچل مچ گئی۔ بھگت سنگھ اپیل کمیٹی اور بھگت سنگھ ڈیفنس کمیٹی کی اپیل پر لاہور' دہلی' کانپور اور ملک کے متعدد شہروں اور قصبوں میں ہزاروں' لاکھوں لوگوں پر مشتمل احتجاجی جلسے اس پھانسی کی مخالفت میں ہوئے۔ موتی لعل نہرو' جواہر لعل نہرو' غیتا جی سبھاش چندر' مدن موہن مالویہ وغیرہ قومی لیڈروں نے پھانسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ پورے ملک میں دستخطی مہم شروع ہوگئی۔ صرف پنجاب سے ہی ایک لاکھ اور کانپور شہر سے چالیس ہزار دستخط کردہ خطوط سرکار کو ملے۔ نیشنل آرکائیوز میں دو لاکھ سے زیادہ دستخط شدہ خطوط کے ریکارڈ دستیاب ہیں لیکن سرکار پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس دوران بھگت سنگھ نے جیل میں اپنی زندگی کے بہترین مضامین قلم تحریر کئے۔ 6-5 اکتوبر 1930 کو انہوں نے 'میں ناستک کیوں ہوں؟' لکھا۔ 15 جنوری 1931 کو 'ڈریم لینڈ کی بھومیکا اور 2 فروری 1931 کو 'نوجوان سیاسی کارکنان کے نام خطوط' جیسے تاریخی اہمیت کے حامل دستاویزات کی تخلیق سزائے موت کی کی کال کوٹھری میں بیٹھ کر کی۔ دوران 20 مارچ 1931 کو پنجاب کے گورنر کے نام اور 22 مارچ 1931 کو 'ساتھیوں کے نام آخری خط' بھی سیاسی بالغ نظری کے اعتبار سے تاریخی دستاویز ہیں۔ دو سال جیل کی قید کے دوران تقریباً 108 کتابیں اور 44 رائٹرز کی تخلیقات سے نوٹس لے کر 'جیل نوٹ بک' تیار ہوئی جس میں 'مملکت کا علم' عنوان سے مجوزہ کتاب کا خاکہ بھی شامل ہے۔ شوورما اور کچھ دیگر ساتھیوں کے مطابق انہوں نے چار کتابیں 'آئیڈیل آف سوشلزم' آپ بیتی (Autobiography) 'ہندوستان میں انقلابی تحریکات کی تاریخ' اور 'موت کے دروازے پر' (On the doorsteps of Death) بھی لکھیں۔ بھگت سنگھ نے شہادت سے قبل اپنے تحریر کردہ مواد ایک تھیلے میں رکھ کر کماری لجاوتی کو اس ہدایت کے ساتھ سونپا کہ اسے وجے کمار سنہا کو انڈمان جیل سے رہائی کے بعد سونپ دیں۔ کماری لجاوتی نے یہ مواد 'پیپل' کے مدیر لالہ فیروز چند کو دیکھنے کے لئے دیں' جنہوں نے اس میں سے کچھ مضامین لے کر 'پیوپل' میں 1931 میں یہ شائع کیا۔ 1938 میں بقیہ اشیاء وجے کمار سنہا کو دی گئی جوان کے مطابق 47-1946 میں کسی ربط

کومحفوظ رکھنے کے لئے دیئے جانے کے بعد اسے پولیس کے خوف سے ضائع کردیا گیا۔کلبیر سنگھ کے مطابق اس نے کچھ اشیاء لے لیں جو 1994 میں 'جیل نوٹ بک' کی شکل میں شائع ہوئی۔اگرچہ روسی دانشور رانگوف اور متروخن 1970 کے آس پاس اس کا مطالعہ کر کے اس کے بارے میں لکھ بھی چکے تھے۔

مہاتما گاندھی پر اس بات کے لئے دباؤ بڑھ رہا تھا کہ وہ وائسرائے سے پھانسی رکوانے میں اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کریں۔دریں اثنا 4 مارچ 1931 کو 'گاندھی۔اروِن سمجھوتہ' ہوا جس میں پھانسی کی سزا رکوانا شرط نہیں بنایا گیا۔درگا بھابھی اور سشیلا دیدی نے اس سلسلے میں مہاتما گاندھی سے دہلی میں ملاقات کی۔سبھاش چندر بوس' جواہر لعل نہرو اور مدن موہن مالویہ وغیرہ نے بھی مہاتما گاندھی پر دباؤ ڈالا۔6 فروری 1931 کو موتی لعل نہرو کے انتقال کے بعد بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا ایک زبردست ہمدرد چلا گیا۔لیکن یہ پھانسی کسی بھی صورت میں موخر نہیں ہوسکتی تھی کیوں کہ برطانوی سامراج کے افسران پھانسی ٹالنے کی صورت میں استعفی کی دھمکی دے چکے تھے۔مہاتما گاندھی تشدد' عدم تشدد کے سوال پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتے تھے اور بھگت سنگھ کسی بھی صورت میں نہ اپنی زندگی بچانا چاہتے تھے اور نہ ہی اپنے اصولوں سے مفاہمت۔یہ بات انہوں نے اپنے خط میں واضح کردی تھی۔بھگت سنگھ اپنی شہادت سے عوام کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔یہ ان کا اپنا سیاسی ضمیر تھا۔اس سلسلے میں ان پر کوئی دباؤ تھا نہ کسی طرح کی مجبوری۔اپنی زندگی اور موت کے تعلق سے ایسی واضح فہم ہندوستان کیا' پوری دنیا میں مفقود ہے۔اس سلسلے میں بھگت سنگھ کا موازنہ محض چے گویرا سے ہی کیا جاسکتا ہے جو اپنی زندگی اور موت دونوں کے تعلق سے بالکل کھلے ہوئے تھے۔جب دنیا میں قومی آزادی کے لئے انقلابیوں کی تاریخ لکھی جائے گی تو یقینا ان میں ہندوستان کے بھگت سنگھ کا نام دنیا بھر کے عظیم انقلابی شہیدوں میں شمار کیا جائے گا۔

17 مارچ 1931 کو برطانوی حکومت نے کروڑوں ہندوستانی عوام کے جذبات کو روندتے ہوئے بڑی خاموشی کے ساتھ ان نوجوان انقلابیوں کو 23 مارچ 1931 کی شام تختہ دار پر لٹکانے اور اس خبر کو 24 مارچ کی صبح کو نشر کرنے کا 'انتہائی رازدارانہ' فیصلہ لیا۔لیکن 24 مارچ کی صبح پھانسی دینے کی خبر تقریبا سبھی لوگوں کو تھی۔پھانسی کی مخالفت میں 20 مارچ کو دہلی میں ایک پرجوم اجلاس نیتا سبھاش چندر بوس نے منعقد کیا۔23 مارچ کی صبح کو بھگت سنگھ کے رشتہ داروں کو آخری ملاقات کے لئے بلایا گیا۔سکھدیو کے والد نہیں تھے اور والد جیسے چچا لالہ اچنت رام کو ملاقات کی اجازت نہ ملنے سے تینوں شہیدوں کے کنبوں' جن میں راج گرو کی ماں مہاراشٹر سے آئی تھیں' نے بطور احتجاج ملاقات نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔برطانوی سرکار پر بھگت سنگھ معاملے میں انتہائی غیر انسانی اور ظالمانہ دھبے لگے ہیں کہ صدیوں تک یہ نہیں مٹ سکیں گے۔لاہور میں ہزاروں لوگوں پر مشتمل اجلاس جاری تھا کہ لاہور جیل کے نزدیک رہنے والے کے سناٹے نے اور جیل سے 'انقلاب زندہ باد' فلک شگاف نعروں اور 'بھگت سنگھ' راج گرو' سکھدیو' زندہ باد کے نعروں سے انہوں نے اندازہ لگالیا کہ تینوں نوجوان انقلابیوں کو پھانسی پر لٹکادیا گیا ہے اور یہ خبر جلسہ ختم ہوتے ہوتے پہنچ گئی اور سینکڑوں لوگ گیٹ پر جمع ہوگئے۔بھگت سنگھ کے والد نے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے سبھی لوگوں سے امن بنائے رکھنے کی اپیل کی۔

ادھر بھگت سنگھ سے صبح ملاقات کی غرض سے آئے ان کے وکیل پران ناتھ مہتہ ان کی خواہش کے مطابق لینن کی کتاب لائے تھے جسے اپنے سیل میں بیٹھے بھگت سنگھ پڑھ رہے تھے کہ وارڈر چڑھت سنگھ نے جا کر روتے روتے کہا کہ بھگت سنگھ آخری وقت میں واہے گرو کا نام لے لو' بھگت سنگھ نے ہنس کر کہا کہ 'نظریاتی اعتبار سے میں ناستک (دہریہ) ہوں۔نظریاتی اعتبار سے آزاد رہنے کے سبب تختہ دار کو چوم رہا ہوں۔مرتے وقت اپنے اصولوں سے ہٹ جاؤں گا تو میری کیا حیثیت رہ

جائے گی۔لیکن میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں'۔آخری خواہش کے طور پر انہوں نے 'بے بے' یعنی جیل کے دلت ملازم بودھا کے ہاتھ کی بنی روٹی کھائی اور تیار ہو کر لینن کی کتاب کا مطالعہ کرتے رہے۔تقریباً چھ بجے انہیں لینے آئے جیل وارڈر سے انہوں نے کہا'ذرا انتظار کرو'ایک انقلابی کو دوسرے انقلابیوں سے ملنے دو'۔اس کے بعد کچھ منٹوں میں کتاب کا مطالعہ ختم کیا اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔دوسری کوٹھریوں سے سکھدیو اور راج گرو نکلے۔گلے میں باہیں ڈالے تینوں نوجوان 'رنگ دے بسنتی' گاتے ہوئے تختہ دار کی جانب بڑھ گئے۔(آج کل لاہور میں اس جیل اور پھانسی کی جگہ کو ختم کر کے شادمان کالونی اور چوک کا نام دے دیا گیا ہے جہاں 23 مارچ کو لاہور کے لوگ شام سات بجے موم بتیاں جلا کر بھگت سنگھ کو یاد کرتے ہیں)۔تختہ دار کے قریب پہنچ کر تینوں نے 'انقلاب زندہ باد' اور 'سامراجیہ واد مردآباد' نعرے لگائے۔جیل کے دیگر حصے بھگت سنگھ'راج گرو'سکھ دیو زندہ باد' کے نعروں سے گونج اٹھے۔مجسٹریٹ سے بھگت سنگھ نے کہا۔''مسٹر مجسٹریٹ آپ خوش قسمت ہیں کہ محب وطن ہندوستانیوں کو ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھتے دیکھ رہے ہیں'۔تختہ دار پر بھی راج گرو لٹکنے کے لئے سب سے آگے تھے۔پھانسی پر چڑھنے کے لئے بھگت سنگھ کو جب ڈھکنے کے لئے کپڑا دیا گیا تو اس نے اسے پھینک دیا اور سر اونچا کر کے پھانسی کے پھندے کو گلے میں ڈال کر جھول گئے۔بی ایم کول نے پہلی مرتبہ اپنی کتاب میں اس بات کا خلاصہ کیا کہ بھگت سنگھ نے پھانسی کے وقت منہ پر کالا کپڑا نہیں پہنا اور ننگے منہ پھانسی پر چڑھ گئے۔سات بجے پھانسی دے کر ایک گھنٹہ بعد تینوں لاشوں کو اتارا گیا۔

جیل کے دروازے پر بڑھتی بھیڑ سے گھبرا کر جیل انتظامیہ نے تینوں لاشوں کو بہ عجلت ٹکڑے ٹکڑے کر کے بوریوں میں بھر دیا اور جیل کے عقبی حصہ میں کھڑے ٹرک پر رکھ کر 'قصور' کی جانب بھیج دیا۔جیل کے سامنے جمع عوامی اژدہام کو بھی اس کی خبر مل گئی۔بھگت سنگھ کی بہن امر کور'لالہ لاجپت رائے کی بیٹی پاروتی دیوی سمیت سیکڑوں لوگ پیدل ہی لالٹین لے کر آدھی رات کو قصور کی جانب چل پڑے۔ادھر فیروز پور شہر سے پولیس نے ایک پنڈت اور گرنتھی کو اٹھایا۔کچھ لکڑیاں اور کروسن خریدا اور گنڈا سنگھ والا گاؤں کے نزدیک جنگل میں لاشوں کو جلد بازی میں بغیر رسومات مکمل کئے لکڑی' کروسن ملا کر جلا ڈالا۔لوگوں کے آجانے کے خوف سے نصف جلی ہوئی لاشوں کو چھوڑ کر پولیس اور جیل ملازمین وہاں سے فرار ہو گئے۔رات میں دو ڈھائی بجے جنگل میں تلاش کرتی بھیڑ کو ایک جگہ گرم زمین کی کھدائی پر ادھ جلے اعضا برآمد ہوئے۔انہیں جمع کر کے بھیڑ صبح اسے لے کر لاہور پہنچی۔برطانوی حکومت نے 24 مارچ کی صبح نوٹس جاری کر کے کہا کہ 23 مارچ 1931 کی شام سات بجے بھگت سنگھ' راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی دینے کے بعد مذہبی طور پر ان کی آخری رسومات ادا کر دی گئیں'۔تینوں خاندانوں کو لاش سونپنے کے قانونی اور اخلاقی جواز کی بھی حکومت برطانیہ نے پروا نہیں کی' نہ لاشوں کو مناسب اعزاز دیا گیا۔بھگت سنگھ کا وجود ایک جانب انہیں ایک روشن ستارہ کی مانند پیش کرتا ہے تو دوسری طرف برطانوی سرکار کو بدنما کالے غیر انسانی اور بربریت پر مبنی نظام کے طور پر۔

اخباروں میں یہ خبر 25 مارچ کو شائع ہو سکی۔لاہور کے ٹریبون سے لے کر لندن اور نیویارک کے ڈیلی ورکر' پیرس کے 'لاہیومانیت' ماسکو کے 'پرواد' سمیت ہندوستان کی ہر زبان کے اخباروں میں یہ خبر صفحہ اول پر خاص طور سے شائع ہوئی اور پورے ملک میں اس دن زبردست ہڑتال رہی۔25 مارچ 1931 کو ہڑتال کے دوران ہی کان پور میں افسوس ناک طور پر گنیش شنکر ودیارتھی بھی شہید ہو گئے۔25 مارچ سے شروع ہونے والی کراچی کانگریس پر پھانسی کا گہرا اثر پڑا۔ملک کے ہر چھوٹے بڑے لیڈر نے اس پھانسی پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ساڑھے تیئس برس بھی مکمل نہ کرنے والے بھگت سنگھ ہر

ہندوستانی دل کے بادشاہ اور ہیرو بن گئے۔ پشاور سے کنیا کماری اور ڈھاکہ سے کراچی تک ہر جگہ بھگت سنگھ کی تصاویر دیکھی جاسکتی تھیں۔ ملک کی ہر زبان میں بھگت سنگھ پر کتابیں' مضامین' نظمیں' گیت اور کہانیوں کے انبار لگ گئے اور حکومت برطانیہ نے اس اشاعتوں کو فوری طور پر ضبط کرنا شروع کر دیا۔ 1930 سے 1949 کے درمیان ہندی میں 54' مراٹھی میں 4' تمل میں 19' اردو میں 17' انگریزی میں 9' پنجابی میں 7' بنگلہ' سندھی' گجراتی میں 2-2 اور کنڑ اور تلگو میں ایک ایک کتابیں ضبط کی گئیں۔

بنارس سے 1930 میں بھگت سنگھ کے مقدمہ کے دوران ہی اخباری رپورٹوں پر مبنی کتاب کی اشاعت پر پابندی لگی۔ 'بھوشیہ' میں 1931 میں قسط وار اور 1932 میں کتابی شکل میں شائع جتندر ناتھ سانیال کی تحریر کردہ بھگت سنگھ کو سوانح حیات پر بھی پابندی عائد کرنے کے ساتھ ساتھ مصنف اور ناشر کو دو دو سال کی قید کی سزا ہوئی۔ جتندر سانیال لاہور سازش کیس سے تو بری ہو گئے لیکن بھگت سنگھ کی سوانح حیات لکھنے پر دو سال پھر جیل میں رہے۔ 'کراچی کانگریس' نامی کتاب جس میں بھگت سنگھ پر جواہر لعل نہرو' مدن موہن مالویہ وغیرہ کی تقاریر شامل تھیں' پر پابندی عائد کی گئی۔ بھگت سنگھ' راج گرو اور سکھ دیو کی تصاویر' 'بھوشیہ' اور 'ابھیودے' کے بھگت سنگھ نمبر' نظموں کا مجموعہ 'لاہور کی پھانسی اور مراٹھی زبان کے لوک گیت 'پوواڑا۔ بھگت سنگھ پر لکھے تین پوواڑا پر پابندی عائد کی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندی کے بعد ممنوعہ اشاعتوں میں سب سے زیادہ تعداد تمل کی ہے۔ تمل میں ہی 1934 میں بھگت سنگھ کے مضمون 'میں ناستک کیوں ہوں'' کا پی جیوانندن کے ذریعہ کیا گیا ترجمہ ای پیریار نے شائع کیا اور ای پیریار نے ہی اپنی تمل میگزین ''کڈئی آرسو' میں 29 مارچ کو بھگت سنگھ پر جذبات سے لبریز اداریہ لکھا۔ پنجابی میں بھگت سنگھ پر لکھی گئے لوگ گیت ''گھوڑیاں'' پر پابندی عائد کی گئی۔

اور ان سب کا نتیجہ وہی ہوا جو بھگت نے سوچا تھا۔ ہندوستان کے ہر فرد کے دل میں بھگت سنگھ کی ایسی شبیہ جاگزیں ہوئی کہ وہ بعد از مرگ امر ہو گئے اور بھگت سنگھ کے الفاظ میں 'برطانوی سرمایہ کاروں کے لئے زندہ بھگت سنگھ سے زیادہ خطرناک ہو گئے'۔ حکومت برطانیہ اور بھگت سنگھ کے مابین سیاست کے علاوہ اخلاقی سطح پر بھی جنگ تھی۔ پوری دنیا میں سورج غروب نہ ہونے والی لامحدود طاقت برطانوی سرمایہ کار اور محض سو پچاس نوجوانوں کے ساتھ بھگت سنگھ کے درمیان جو اخلاقی جنگ ہوئی' اس میں بھگت سنگھ اپنی جان نچھاور کر کے فتح یاب ہوئے اور برطانوی سرمایہ کار حکمراں پوری دنیا میں شرمناک اخلاقی شکست سے دوچار ہوئے۔ آج بھگت سنگھ اپنے طرز عمل اور تحریروں کے ذریعہ زندہ ہیں اور برطانوی سرمایہ کار تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیئے گئے ہیں۔

بھگت سنگھ کی حیات پر مبنی یہ مضامین ان کے نکتہ نظر اور شخصیت فہمی کے تناظر میں ہی ہیں۔ آج بھگت سنگھ کے سنجیدہ افکار کو ان کے مضامین کے ذریعہ سمجھنا اور سمجھ کر ملک کی مسائل حل کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ فکر ملک کے نوجوانوں کو تحریک اور مثبت سمت عطا کرنے میں انتہائی معاون و مدد ہے۔ یہ کتاب اسی مقصد کی حصولیابی کی ایک مختصر کوشش ہے۔

ڈاکٹر چمن لال

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی' نئی دہلی

28 ستمبر 2007

باب-1

خط، تار، نوٹس اور پرچے

(الف) اسکول سے لکھے گئے خط

دادا جی کے نام خط

شہید بھگت سنگھ 28 ستمبر 1907 کو پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے چچا سردار اجیت سنگھ کو لالہ لاجپت رائے کے ساتھ کسان تحریک کی نمائندگی کرنے پر انگریز سرکار نے مانڈلے (برما) میں قید کیا تھا۔ عوامی غصے کے سامنے جھکتے ہوئے نومبر 1907 میں انہیں رہا کیا گیا۔ والد کشن سنگھ کو انگریز حکومت نے نیپال سے گرفتار کیا اور چھوڑ دیا۔ سب سے چھوٹے چچا سردار سورن سنگھ پر کئی مقدمے قائم کئے گئے اور وہ ضمانت پر رہا ہوئے۔ اس خوشی میں دادی نے بھگت سنگھ 'بھاگ والا (خوش قسمت) مانا تھا۔

دادا ارجن سنگھ نے اپنے پوتے کی پرورش اپنی دیکھ ریکھ میں کی۔ وہ شروع سے ہی ان میں سماجی بیداری اور استدلال کے فروغ کے لئے کوشاں تھے اور اسے سماجی مساوات اور ترقی نظریات سے واقف کرا رہے تھے۔

بھگت سنگھ کی پہلے چار سال کی تعلیم اپنے گاؤں 'بنگا' چک نمبر 105 گوگیرا برانچ (اب لائل پور، پاکستان) میں ہوئی اور آگے کی پڑھائی کے لئے وہ والد کے پاس لاہور آگئے۔ 17-1916 میں جب بھگت لاہور پہنچے تو چاروں طرف غدر پارٹی کے شہیدوں کی شان میں قصیدے گونج رہے تھے۔

یہ بھگت سنگھ کا پہلا خط ہے جب وہ چھٹی کلاس میں پڑھ رہے تھے۔ ان کا یہ خط دادا ارجن سنگھ کو لکھا گیا ہے جو ان دنوں گاؤں کھٹکڑ کلاں آئے ہوئے تھے۔ اصل خط اردو میں ہے۔

—مدیر

لاہور، 22 جولائی 1918

محترم دادا جی

نمستے!

عرض یہ ہے کہ آپ کا خط ملا، پڑھ کر دل کو خوشی حاصل ہوئی۔ امتحان کی بابت یہ عرض ہے کہ میں نے پہلے سے اس واسطے نہیں لکھا تھا کہ ہمیں بتایا نہیں تھا۔ اب ہمیں انگریزی اور سنسکرت کا بتایا ہے۔ ان میں پاس ہوں۔ سنسکرت میں میرے 150 نمبروں میں سے 110 نمبر ہیں۔ انگریزی میں 150 میں سے 68 نمبر ہیں جو 150 میں سے 50 نمبر لے آئے، وہ

پاس ہوتا ہے۔ نمبر 68 سے میں اچھی طرح پاس ہو گیا ہوں۔ کسی قسم کی فکر نہ کریں۔ باقی نہیں بتایا اور چھٹیاں 8 اگست سے پہلی چھٹی ہوگی۔ آپ کب آئیں گے' لکھنا۔

آپ کا تابع دار
بھگت سنگھ

دادا جی کے نام ایک اور خط

12 برس کی عمر میں دادا ارجن سنگھ کے نام اردو میں تحریر کردہ بھگت سنگھ کا یہ دوسرا دستیاب خط ہے۔ پہلا خط 11 سال کی عمر میں دادا جی کو ہی اردو میں تحریر کیا ہوا ملتا ہے۔ چار زبانوں اردو' ہندی' پنجابی اور انگریزی میں بھگت سنگھ کی دستی تحریریں دستیاب ہیں۔

—مدیر

اوم

لاہور

27/7/1919

شریمان پوجیہ دادا جی' نمستے

عرض ہے کہ خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا رہتا ہوں۔ احوال یہ ہے کہ ہمارے ششماہی امتحانات ہو گئے' جو جولائی سے شروع ہوئے تھے۔ حساب کے پرچے میں بہت لڑکے فیل ہو گئے تھے' اس لئے ہمارا ریاضی کا امتحان 9 اگست کو دوبارہ ہوگا اور سب خیریت ہے۔ آپ کب آئیں گے۔ والد صاحب کو یہ بتائیے کہ ششماہی امتحان میں سبھی مضامین میں پاس ہو گیا ہوں۔ والدہ محترمہ' چاچی جی کو آداب۔ کلتار سنگھ کو 24 جولائی کی رات اور 25 جولائی شام کو بخار تھا۔ اب اسے آرام ہے' کسی قسم کی فکر نہ کریں۔

آپ کا تابع دار
بھگت سنگھ

چچی کے نام خط

چودہ سال کی عمر میں یہ خط بھگت سنگھ نے پنجابی زبان وگرمکھی رسم الخط میں اپنی چھوٹی چچی اور چچا سورن سنگھ کی بیوہ حکم کور کو لکھا' جو چک نمبر 105' ضلع لائل پور پر اردو میں لکھے پتہ کے ساتھ ارسال کیا گیا' جس میں ضلع لائل پور انگریزی لفظوں میں درج ہے۔ اس خط سے بھگت سنگھ کی جلسہ جلوسوں (عوامی مظاہروں) میں شامل ہونے کے تئیں دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔—مدیر

لاہور

24.10.1921

میری پیاری چچی صاحبہ' نمستے

میں جلسہ دیکھنے کے لئے لائل پور گیا تھا۔ مجھے گاؤں آنا تھا، لیکن باپو جی نے منع کر دیا تھا، اس لئے میں نہیں آیا۔ مجھے معاف کرنا اگر کوئی بھول ہوگئی ہو۔ چاچا جی (سورن سنگھ) کی تصویر بن گئی ہے۔ مجھے ساتھ ہی لانا تھا لیکن تب تک وہ پوری نہیں ہوئی تھی، اس لئے معاف کرنا۔ جواب جلد دے دینا۔ بڑی چچی جی کی خدمت میں سلام، والدہ صاحبہ کو بھی دست بستہ سلام (پرنام)، کلبیر اور کلتار (چھوٹے بھائی) کو آداب۔

آپ کا بیٹا
بھگت سنگھ

دادا کو تحریر کردہ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مشہور عدم تعاون تحریک کا اثر کس طرح عوام میں زور مار رہا تھا جس کا اثر بھگت سنگھ پر بھی پڑا۔ وہ اس سے انجان نہ رہ سکے۔ ساتھ ہی دادا کو بھی یہ بتائے بغیر نہ رہ سکے کہ جلد ہی شروع ہونے والی ریل ہڑتال کا بھی انہیں علم ہے۔۔۔مدیر

دادا جی کے نام ایک اور خط

لاہور، 14 نومبر 1921

میرے پوجیہ دادا صاحب جی، نمستے!

عرض یہ ہے کہ اس جگہ خیریت ہے اور آپ کی خیریت شری پرماتما جی سے نیک مطلوب ہوں۔ احوال یہ ہے کہ مدت سے آپ کا شفقت نامہ نہیں ملا۔ کیا سبب ہے؟ کلبیر سنگھ، کلتار سنگھ کی خیریت سے جلد مطلع فرمائیں۔ بے بے صاحبہ ابھی موراں والی سے واپس نہیں آئیں۔ باقی سب خیریت ہے۔

(کارڈ کی دوسری جانب)

ماتا جی کو نمستے۔ چچی صاحبہ کو نمستے۔ منگو چمار تو ابھی تک نہیں آیا۔ میں نے ایک پرانی کتاب خریدی تھی جو کہ بہت سستی مل گئی تھی۔

(کارڈ کی لائنوں کے بیچ الٹے رخ)

آج کل ریلوے والے ہڑتال کی تیاری کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اگلے ہفتے کے بعد جلد شروع ہو جائے گی۔

آپ کا تابع دار
بھگت سنگھ

چچی جی کے نام ایک اور خط

13 اپریل 1919 کو جلیان والا باغ میں انگریزوں نے بڑی بے رحمی سے قتل عام کیا۔ 12 سالہ بھگت سنگھ جب دوسرے روز وہاں پہنچے اور خون میں سنی ہوئی مٹی لے کر گھر واپس آئے تو کئی سوال ان کے ذہن میں تھے۔

21 فروری 1921 کو مہنت نارائن داس نے ننکانہ صاحب میں 140 سکھوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ مار ڈالا۔ بہت سے لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ لاہور سے اپنے گاؤں بنگا جاتے وقت بھگت سنگھ نے ان بھی جائے واردات کو دیکھا اور 5 مارچ

کو ہونے والی عظیم کانفرنس بھی دیکھی۔ وہ ننکانہ صاحب سے اس واقعہ سے متعلق ایک کیلنڈر بھی لے گئے تھے۔ اس حادثہ سے پورے پنجاب کے گاؤوں میں انگریز سرکار کے خلاف' جس نے مہنت کی مدد کی تھی' ایک زبردست تحریک چھڑ گئی۔ ہر گاؤں میں کالی پگڑیاں باندھنے اور پنجابی پڑھنے کا رواج چل پڑا۔ بھگت سنگھ بھی اس سے متاثر ہوئے۔ بھگت سنگھ نے پنجابی پڑھنا اور لکھنا سیکھا۔ یہ خط اسی وقت کا ہے جو 1910 میں جیل کی صعوبتوں کے سبب شہید چچا سورن سنگھ کی بیوہ چچی حکم کور کو لکھا گیا تھا۔ لفظوں کے جوڑ جوں کے توں دیئے جا رہے ہیں۔ گرومکھی رسم الخط میں تحریر کردہ بھگت سنگھ کا یہ پہلا خط ہے۔ بعد میں پنجابی میں بھگت سنگھ نے بہت سے مضامین بھی لکھے۔۔۔مدیر

15 نومبر 1921

میری پرم پیاری چاچی جی

نمستے!

مجھے خط لکھ لکھنے (لکھنے) میں دیری ہوگئی ہے۔ سو امید ہے کہ آپ معاف کرو گے۔ بھیا جی (پتا کشن سنگھ) دہلی گئے ہوئے ہیں۔ بھے بھے (بے بے ماں) موراں والی کو گئی ہوئی ہے۔ باقی سب راضی خوشی ہے۔ بڑی چاچی جی کو متھا ٹیکنا۔ ماتا جی کو متھا ٹیکنا' کلتار' کلبیر سنگھ کو ست شری اکال یا نمستے۔

آپ کا آگیا کار
بھگت سنگھ

(ب) کالج سے خط

گھر سے الوداع: والد صاحب کے نام خط

1923 میں بھگت سنگھ' نیشنل کالج لاہور کے طالب علم تھے۔ عوامی بیداری کے لئے ڈرامہ کلب میں بھی حصہ لیتے تھے۔ انقلابیوں اساتذہ اور ساتھیوں سے وابستگی ہوگئی تھی۔ ہندوستان کو آزادی کیسے ملے' اس تعلق سے تفصیلی مطالعہ اور بحث و مباحثہ جاری تھا۔

گھر میں دادی جی نے اپنے پوتے کی شادی کا ذکر کیا۔ ان کے سامنے اپنی دلیل نہ چلتے دیکھ کر والد صاحب کے نام خط چھوڑا اور کان پور میں گنیش شنکر ودیارتھی کے پاس پہنچ کر 'پرتاپ' میں کام شروع کر دیا۔ وہیں بی کے دت' شودرما' وجے کمار سنہا جیسے انقلابی ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کا کان پور پہنچنا انقلاب کے راستے کا ایک بڑا قدم بنا۔ والد کے نام تحریر کردہ بھگت سنگھ کا یہ خط گھر چھوڑنے سے متعلق ان کے نظریہ کو ظاہر کرتا ہے۔۔۔مدیر

پوجیہ پتا جی
نمستے

میری زندگی مقصد اعلیٰ[1] یعنی آزادی ہند کے اصول[2] کے لئے وقف[3] ہو چکی ہے۔ اس لئے میری زندگی میں آرام اور دنیاوی خواہشات[4] باعث کشش[5] نہیں ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب میں چھوٹا تھا تو باپو جی نے میرے یگوپویت کے وقت اعلان کیا تھا کہ مجھے خدمت وطن کے لئے وقف کر دیا گیا ہے' لہٰذا میں اس وقت کئے گئے وعدے کی تکمیل کر رہا ہوں۔

امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

آپ کا تابع دار
بھگت سنگھ

(ج) انقلابی زندگی کے خط

بھگت سنگھ کے اس خط کو بطور ثبوت خصوصی عدالت کے جج جے کولڈ اسٹریم کے سامنے پیش کیا گیا۔ اصل خط (لیٹر ہیڈ) انگریزی میں ہے۔ لیٹر ہیڈ بھگت سنگھ کے والد آں جہانی کشن سنگھ کا ہے۔ خط ٹائپ شدہ ہے۔ ایک دو لفظ ہاتھ سے لکھے گئے ہیں۔ ایس آئی صادق علی شاہ کے 2 مئی 1929 کے دستخط کے بعد یہ خط عدالت میں بطور ثبوت پیش کیا گیا' جسے پڑھ کر لاہور سازش کیس کی فائل سے جوڑا گیا۔۔مدیر

دی ہمالیہ ایسوسی ایٹس کمپنی لمیٹڈ
پنجاب ایجنسی

فون......

یو پی پنجاب و سرحدی صوبہ (این ڈبلیو ایف پی) کے خاص ایجنٹ
سردار کشن سنگھ' لاہور
حوالہ نمبر......

شریمان جی تاریخ......

مجھے 29 مئی 1927 کو انڈین پینل کوڈ کی دفعہ 302 کے تحت گرفتار کیا گیا اور پانچ ہفتوں تک پولیس حراست میں بند رکھا گیا۔ مجھے 4 جولائی 1927 کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ تب سے مجھے کبھی بھی پولیس یا کسی بھی عدالت نے اس دفعہ کے تحت مقدمہ کا سامنا کرنے کے لئے نہیں بلایا' لہٰذا میں مان رہا ہوں کہ آپ کی انکوائری مکمل ہو گئی ہے اور میرے خلاف کچھ نہیں ملا ہے اور عملاً آپ نے مقدمہ واپس لے لیا ہے۔ ان حالات میں' میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ میری گرفتاری کے وقت میرے پاس سے برآمد سبھی اشیاء لوٹا دیں۔ مجھے اطلاع دیں کہ اس مقصد کے لئے میں آپ سے کب اور کہاں ملوں؟
جلد مہربانی کا ممنون ہوں گا۔

آپ کا وغیرہ

دوست امر چند کے نام خط

پیارے بھائی امر چند جی
نمستے!

عرض ہے کہ اس دفعہ اچانک ماں کے بیمار ہونے پر ادھر آیا اور آپ کی والدہ محترمہ کے دیدار ہوئے۔ آپ کا خط پڑھا۔ ان کے لئے یہ (ساتھ والا) خط لکھا۔ ساتھ ہی دو چار الفاظ لکھنے کا موقع مل گیا۔ کیا لکھوں' کرم سنگھ ولایت گیا ہے' اس کا پتہ بھیجا جا رہا ہے۔ ابھی تو اس نے لکھا ہے کہ لا پڑھے گا مگر کیسے چل رہا ہے' سو خدا جانے' خرچ بہت زیادہ ہو رہا ہے۔

بھائی ہماری بیرون ملک میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش خوب پامال ہوئی۔ اچھا تم ہی لوگوں کو سب مبارک، کبھی موقع ملے تو کوئی اچھی اچھی کتب بھیجنے کی تکلیف اٹھانا۔ آخر امریکہ میں لٹریچر تو بہت ہے۔ خیر ابھی تو اپنی تعلیم میں بری طرح پھنسے ہوئے ہو۔

فرانسسکو وغیرہ کی طرف سے سردار جی (اجیت سنگھ جی) کا شاید کچھ پتہ مل سکے۔ کوشش کرنا۔ کم از کم زندگی کا یقین تو ہو جائے۔ میں ابھی لاہور جا رہا ہوں۔ کبھی موقع ملے تو خط تحریر فرمائیے گا۔ پتہ ستر منڈی لاہور ہوگا۔ اور کیا لکھوں؟ کچھ لکھنے کو نہیں ہے۔ میرا حال بھی خوب ہے۔ بارہا مصائب کا شکار ہونا پڑا۔ آخر کیس واپس لے لیا۔ بعد میں پھر گرفتار ہوا۔ ساٹھ ہزار کی ضمانت پر رہا ہوں۔ ابھی تک کوئی مقدمہ میرے خلاف تیار نہیں ہو سکا اور ایشور نے چاہا تو ہو بھی نہیں سکے گا آج ایک برس ہونے کو آیا، مگر ضمانت واپس نہیں لی گئی۔ جس طرح ایشور کو منظور ہوگا۔ خواہ مخواہ تنگ کرتے ہیں۔ بھائی خوب دل لگا کر تعلیم حاصل کرتے چلے جاؤ۔

آپ فرماں بردار
بھگت سنگھ

اپنے متعلق اور کیا لکھوں، خواہ مخواہ شک کا شکار بنا ہوا ہوں۔ میری ڈاک رکتی ہے۔ خط کھول لئے جاتے ہیں۔ نہ جانے میں کیسے اس قدر شک کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ خیر بھائی آخر سچائی سامنے پر آئے گی اور اسی کی فتح ہوگی۔

(1927)

'مہارتھی' میگزین کے ایڈیٹر کے نام خط

شہنشاہی کٹیا
سوت منڈی، لاہور
27/2/1928

ایڈیٹر جی، ساور وندے!

آپ کا 17/2/1928 کا شفقت نامہ اور 'مہارتھی' کے فروری نمبر کی ایک کاپی بھی وقت پر مل گئی تھی۔ اس کا میں تہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ نے گرو رام سنگھ جی کی سہ رنگی تصویر بنوائی یا نہیں۔ مجھے یہی پتہ لگا کہ فوٹو تو کم سے کم آپ نے ابھی تک شائع نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تصویروں کے بغیر ان مضامین کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ باقی مضامین جو جلد ہی آپ کی خدمت میں بھیجوں گا، مع تصویر چھپنے چاہئیں۔ بہت سے لوگوں کے تو بلاک بنے ہوئے ہی مل سکیں گے۔ ان کا ڈاک خرچ اور کچھ پیسہ ہی دینا ہوگا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو لکھیں، میں انتظام کرا دوں گا۔ ابھی گرو رام سنگھ جی کی ایک اور تصویر بھیج رہا ہوں۔ ایک شخص کہہ رہے تھے کہ بلاک ان کے پاس ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو وہ بھی چھپوا کر بھیج سکتے ہیں۔ مہربانی کر کے یہ لکھیں کہ کتنی تصویروں کی ضرورت ہوگی۔ یہ تو 'مہارتھی' کی مجموعی تعداد پر انحصار کرتا ہے۔

مضامین پر مضامین پڑے ہیں مگر یہاں نیشنل ویک پر شہیدی دیوس منانے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس لئے تب تک اگر مضمون ارسال نہ کر سکا تو برائے مہربانی معاف کر دیجئے گا۔ ہو سکا تو پہلا مضمون ایک ہفتہ تک بھیج دوں گا۔ 'مہارتھی' کا

آئندہ شمارہ کتنے دنوں تک چھپ جائیں گا؟ مضمون اور فوٹو کب تک پہنچ جانے چاہئیں؟ لکھیں ضرور۔ جواب جلد دے کر مشکور کریں۔

درخواست کنندہ
بھگت سنگھ

(د) دھماکوں کی گونج

سانڈرس کے قتل پر نوٹس

نوکر شاہی ہوشیار
جے پی سانڈرس کو موت کے گھاٹ اتار کر
لالہ لاجپت رائے جی کے قتل کا بدلہ لے لیا گیا۔

یہ سوچ کر کتنا افسوس ہوتا ہے کہ جے پی سانڈرس جیسے ایک معمولی پولیس افسر کے کمینے ہاتھوں سے ملک کی تیس کروڑ عوام کے ہر دل عزیز لیڈر پر حملہ کر کے ان کی جان لے لی گئی۔ ملک کی یہ بے عزتی نوجوانوں اور مردوں کے لئے ایک چیلنج تھا۔

آج دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ ہندوستان کے عوام بے جان نہیں ہیں۔ یہاں کے نوجوانوں کا خون جم نہیں گیا ہے۔ وہ اپنے ملک کی آبرو بچانے کے لئے جانوں کی بازی لگا سکتے ہیں اور یہ ثبوت ملک کے ان نوجوانوں نے دیا ہے، جن کی مذمت خود ملک کے لیڈر کرتے ہیں۔

ظالم سرکار ہوشیار!

اس ملک کے دلت اور مصیبت زدہ عوام کے جذبات کو ٹھیس مت پہنچاؤ۔ اپنی شیطانی حرکات بند کرو۔ ہمیں ہتھیار نہ رکھنے دینے کے لئے وضع کردہ تمہارے تمام قوانین اور احتیاط کے باوجود پستول اور ریوالور اس ملک کے عوام کے ہاتھ میں آتے ہی رہیں گے۔ اگر وہ ہتھیار مسلح انقلاب کے لئے کافی نہ ہوئے تو بھی ملک کی بے عزتی کا بدلہ لیتے رہنے کے لئے تو کافی ہوں گے ہی۔ خواہ ہمارے اپنے لوگ اس کی مذمت ہی کیوں نہ کریں۔ غیر ملکی حکومت خواہ ہم پر کتنا بھی ظلم کر لے لیکن ہم قومی وقار کا تحفظ اور غیر ملکی ظالموں کو سبق سکھانے کے لئے ہمیشہ تیار رہیں گے۔ ہم تمام مخالفت اور ظلم کے باوجود صدائے انقلاب بلند رکھیں گے اور پھانسی کے تختوں پر بھی یہ آواز بلند کر کہیں گے:

انقلاب زندہ آباد!

ہمیں ایک آدمی کو قتل کرنے کا افسوس ہے لیکن یہ آدمی اس بے رحم، ذلیل اور اس غیر منصفانہ نظم کا ایک حصہ تھا، جسے ختم کر دینا ضروری ہے۔ اس آدمی کا قتل ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے کارندے کے طور پر کیا گیا ہے۔ یہ حکومت دنیا کی سب سے ظالم حکومت ہے۔

انسان کا خون بہانے پر ہمیں افسوس ہے۔ لیکن انقلاب کی ویدی پر کبھی کبھی خون بہانا لازم ہو جاتا ہے۔ ہمارا مقصد

ایک ایسا انقلاب لانا ہے' جو انسان کے ذریعہ انسان کے استحصال کا خاتمہ کردے گا۔
انقلاب زندہ آباد

دستخط بلراج

18 دسمبر 1928

سونی پت' پنجاب' ہس پرس'

انڈین سوشلسٹ ری پبلک آرمی

نوٹس
17 دسمبر کے واقعہ سے متعلق

اب کوئی راز نہیں رہا! کوئی گمان نہیں!

جے پی سانڈرس مارا گیا!

لالہ لاجپت رائے کا بدلہ لے لیا گیا!

ہسپرس کے قانون (شق 10 بی وسی) کے مطابق اس بات کی اطلاع دی جاتی ہے کہ یہ براہ راست سیاسی نوعیت کی انتقامی کارروائی تھی۔ ہندوستان کے عظیم بزرگ لالہ لاجپت رائے پر کئے گئے انتہائی قابل نفریں حملہ سے ان کی موت ہوئی۔ یہ اس ملک کی قومیت کی سب بڑی تحقیر ہے اور اب اس کا بدلہ لے لیا گیا ہے۔

اس کے بعد سبھی سے درخواست ہے کہ ہمارے دشمن پولیس کو ہمارا ٹھکانہ بتانے میں کسی قسم کا تعاون نہ کریں۔ جو کوئی اس (مشورہ) کے خلاف کام کرے گا' اس پر سخت کارروائی کی جائے گی۔

انقلاب زندہ باد!

دستخط

بلراج

کمانڈر ان چیف

23 دسمبر 1928

اسمبلی ہال میں پھینکا گیا پرچہ

8 اپریل 1929 کو اسمبلی میں بم پھینکنے کے بعد بھگت سنگھ اور دت کے ذریعہ تقسیم کردہ انگریزی پرچہ کا اردو ترجمہ --مدیر

انڈین سوشلسٹ ری پبلک آرمی

نوٹس

"بہروں کو سنانے کے لئے بہت اونچی آواز کی ضرورت پڑتی ہے"، مشہور فرانسیسی انارکسٹ (نراجیت) کے حامی شہید ویلیاں کے یہ لافانی الفاظ ہمارے اس عمل کے نقیب ہیں۔

گزشتہ دس برسوں میں برطانوی سرکار نے حکومتی اصلاح کے نام پر اس ملک کی جو تذلیل کی ہے، اس کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ہندوستانی پارلیمنٹ کے نام سے منسوب کی جانے والی اس مجلس نے ہندوستان کے سر پر پتھر پھینک کر اس کی جو تحقیر کی ہے، اس کو یاد دلانے کی ضرورت ہے۔ یہ سب پر عیاں ہے۔ آج پھر جب عوام 'سائمن کمیشن' سے کچھ اصلاحات کے ٹکڑوں کی امید میں آنکھیں پھیلائے ہوئے ہیں اور ان ٹکڑوں کی آس میں باہم متصادم ہیں، غیر ملکی سرکار پبلک سیفٹی بل اور ٹریڈرس ڈسپیوٹس بل کی شکل میں مزید استحصال کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی آنے والے اجلاس میں اخباروں کے ذریعہ پریس سیڈیشن ایکٹ عوام پر جبراً مسلط کرنے کی دھمکی دی جا رہی ہے۔ عوامی کام کرنے والے مزدور لیڈروں کی اندھادھند گرفتاریاں یہ واضح کر دیتی ہیں کہ حکومت کس رویہ پر عمل پیرا ہے۔

قومی استحصال اور تذلیل پر مبنی اس کشمکش سے پر حالات میں اپنے فرائض کی اہمیت کو محسوس کر کے 'انڈین سوشلسٹ ری پبلک تنظیم نے اپنی فوج کو یہ قدم اٹھانے کا حکم دے دیا ہے۔ اس کام کا مقصد یہ ہے کہ قانون کا یہ تحقیر آمیز طریقہ کار ختم کر دیا جائے۔ غیر ملکی ظالم نوکر شاہی جو چاہے کرے، لیکن اس کے قانونی نقاب کو پھاڑ دینا چاہئے۔

عوامی نمائندوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس پارلیمنٹ کے فریب کو نظر انداز کر کے اپنے اپنے حلقوں میں واپس جائیں اور عوام کو غیر ملکی مظالم اور استحصال کے خلاف انقلاب کے لئے تیار کریں۔ ہم غیر ملکی سرکار کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم 'عوامی تحفظ' اور 'ٹریڈس ڈسپیوٹس' کے ظالمانہ قوانین اور لالہ لاجپت رائے کے قتل کے خلاف ملک کے عوام کی طرف سے یہ قدم اٹھا رہے ہیں۔

ہم اپنے اس یقین کو دوبارہ دہرانا چاہتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ نے متعدد بار اس مبینہ سچائی کا اعلان کیا ہے کہ لوگوں کا قتل کرنا تو آسان ہے، مگر نظریات کا خون نہیں کیا جا سکتا۔

بڑی بڑی سلطنتیں تباہ و برباد ہو گئیں لیکن نظریات آج بھی زندہ ہیں۔ فرانس کے برواں اور روس کے ژار سب چلے گئے، جب کہ انقلابی فتح و کامرانی کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔

ہم انسانی زندگی کو مقدس سمجھتے ہیں۔ ہم ایسے تابناک مستقبل کے تئیں پر اعتماد ہیں، جس میں ہر شخص کو مکمل امن اور آزادی کے مواقع فراہم ہوں۔ ہم انسان کا خون بہانے کی اپنی بے بسی پر غمگین ہیں۔ مگر انقلاب کے ذریعہ سب کو مساوی آزادی دینے اور انسان کے ذریعہ انسان کے استحصال کو ختم کر دینے کے لئے لائے گئے انقلاب میں کچھ نہ کچھ خوں ریزی تو لازمی ہے۔

انقلاب زندہ باد!

دستخط
بلراج
کمانڈر ان چیف
1929

(ہ) جیل سے لکھے گئے خصوصی خط
سکھدیو کے نام

پیارے بھائی

جب تک تمہیں یہ خط ملے گا، میں دور منزل کی جانب جا چکا ہوں گا۔ میرا یقین کرو، آج کل میں بہت خوش و خرم اپنے

آخری سفر کے لئے تیار ہوں۔اپنی زندگی کی ساری خوشیوں اور مدھر یادوں کے باوجود میرے دل میں ایک بات آج تک چبھتی رہی۔وہ یہ کہ مجھے اپنے بھائی نے غلط سمجھا اور مجھ پر کمزوری کا بہت سنگین الزام عائد کیا۔آج میں پہلے سے کہیں زیادہ مطمئن ہوں۔میں آج بھی محسوس کرتا ہوں کہ وہ بات کچھ نہیں' بس غلط فہمی تھی۔غلط شک تھا۔میرے بے تکلف برتاؤ کے سبب مجھے باتونی سمجھا گیا اور میرے سب کچھ تسلیم کرنے کو میری کمزوری سمجھا گیا۔لیکن آج میں محسوس کر رہا ہوں کہ کوئی غلط فہمی نہیں' میں کمزور نہیں' اپنوں میں سے کسی سے بھی کمزور نہیں۔

میرے بھائی' میں صاف دل سے وداعی لوں گا اور تمہارا شک بھی دور کروں گا۔اس میں تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔ دھیان رہے' تمہیں جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہئے۔سوچ سمجھ کر اور خاموشی سے کام کو آگے بڑھانا۔مواقع پانے کی جلد بازی نہ کرنا۔عوام کے تئیں جو تمہارا فرض ہے' اسے نبھاتے ہوئے کام کو ہوشیاری کے ساتھ کرنا۔صلاح کے طور پر میں کہنا چاہتا ہوں کہ شاستری مجھے پہلے سے زیادہ اچھا نظر آ رہا ہے۔میں اسے سامنے لانے کی کوشش کرتا بشرطیکہ وہ صاف گوئی سے اپنے آپ کو ایک تاریک مستقبل کے لئے وقف کرنے کے لئے راضی ہو۔اگر وہ اس جذبہ سے کام کرے گا تو کافی فائدہ مند اور قیمتی ثابت ہوگا۔لیکن جلد بازی نہ کرنا۔تم خود اچھے پرکھنے والے ہو۔جس طرح ٹھیک لگے' دیکھ لینا' آمیرے بھائی' اب ہم خوشیاں منالیں۔

خیر' میں کہہ سکتا ہوں کہ بحث کے معاملے میں مجھ سے اپنے پہلو پیش کئے بغیر نہیں رہا جاتا۔میں پرزور طور پر کہتا ہوں کہ میں امیدوں اور توقعات سے بھری زندگی کی سبھی رنگینیوں سے لبریز ہوں لیکن وقت آنے پر میں سب کچھ قربان کردوں گا۔صحیح معنوں میں یہی ایثار ہے۔یہ چیزیں انسان کے راستے میں کبھی بھی مانع نہیں بنتیں بشرطیکہ وہ انسان ہو۔جلد ہی تمہیں اس کا ثبوت مل جائے گا۔کسی کے کردار کے بارے میں اظہار خیال کرتے وقت ایک بات زیر غور آنی چاہئے کہ کیا پیار کسی انسان کے لئے مددگار ثابت ہوا ہے؟ اس کا جواب میں آج دیتا ہوں۔ہاں وہ میجنی تھا۔تم نے ضرور پڑھا ہوگا کہ اپنی پہلی ناکام بغاوت' ذہنی طور پر پست کرنے والی شکست کا افسوس اور آنجہانی رفیقوں کی یاد' یہ سب وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔وہ پاگل ہوجاتا یا خودکشی کرلیتا۔لیکن محبوبہ کے ایک خط سے وہ دوسروں جیسا ہی نہیں' سب سے زیادہ مضبوط اور طاقت ور بن گیا۔

جہاں تک پیار کا اخلاقی طور پر تعلق ہے' میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اپنے آپ میں ایک جذبہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں اور یہ حیوانی جبلت نہیں بلکہ مدھر انسانی جذبہ ہے۔پیار ہمیشہ انسانی کردار کو عظمت عطا کرتا ہے' کبھی بھی حقیر نہیں بناتا بشرطیکہ پیار پیار ہو۔ان لڑکیوں (محبوباؤں) کو کبھی پاگل نہیں کہا جاسکتا جیسا کہ ہم فلموں میں دیکھتے ہیں۔وہ ہمیشہ وحشیوں اور درندوں کے ہاتھوں میں کھیلتی ہیں۔سچا پیار کبھی پیدا نہیں کیا جاسکتا۔یہ خود بہ خود پیدا ہوتا ہے' کب' کوئی کہہ نہیں سکتا۔

میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں آپس میں پیار کرسکتے ہیں اور وہ اپنے پیار کے سہارے اپنے آویگوں سے اوپر اٹھ سکتے ہیں۔اپنی تقدیس قائم رکھ سکتے ہیں۔میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ جب میں نے پیار کو انسانی کمزوری کہا تھا تو یہ کسی عام فرد کے بارے میں نہیں کہا تھا جہاں تک کہ دانشورانہ طور پر عام شخص ہوتے ہیں لیکن وہ سب سے بڑی آئیڈیل صورت ہوگی جب انسان پیار' نفرت اور دیگر تمام جذبات پر قابو پالے گا۔جب انسان عمل کی بنیاد پر اپنا پہلو اپنائے گا۔ایک شخص کی دوسرے شخص سے پیار کرنے کی میں نے مذمت کی ہے' وہ بھی ایک آئیڈیل حالات میں۔انسان کے اندر پیار کا گہرا جذبہ ہونا چاہئے جسے وہ کسی ایک خاص فرد تک محدود نہ کرتے ہوئے لامحدود بنادے۔

میرے خیال سے میں نے پہلو کو اچھی طرح واضح کردیا ہے۔ہاں' ایک بات میں تمہیں بتادینا چاہتا ہوں کہ باوجود

انقلابی نظریات کے ہم اقتدار سے متعلق سبھی سماجی اصولوں کو نہیں اپنا سکے۔ انقلابی باتیں کر کے اس کمزوری کو بہت آسانی سے چھپایا جاسکتا ہے لیکن حقیقی زندگی میں ہم فوراً تھر تھر کانپنا شروع کر دیتے ہیں۔
میں تم سے عرض کروں گا یہ کمزوری چھوڑ دو۔ اپنے ذہن میں بغیر کوئی غلط جذبہ لائے انتہائی شفقت آمیز انداز میں تم سے درخواست کرسکتا ہے کہ تمہارے اندر جو اعلیٰ آئیڈیل ہے، اسے تھوڑا تھوڑا کم کر دو۔ جو پیچھے رہیں گے اور میری طرح بیماری کا شکار ہو گئے ان سے سوتیلا برتاؤ نہ کرنا، پھٹکار لگا کر ان کے دکھ درد کو نہ بڑھانا کیوں کہ ان کو تمہاری ہمدردی کی ضرورت ہے۔ کیا میں یہ امید رکھوں کہ تم کسی خاص شخص سے جلن حسد رکھنے کے بجائے اس سے ہمدردی رکھو گے۔ ان کو اس کی بہت ضرورت ہے۔ تم تب تک ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ خود اس پر عمل نہ کرو۔ لیکن میں یہ سب کچھ کیوں لکھ رہا ہوں؟ دراصل میں اپنی باتیں واضح کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنا دل کھول دیا ہے۔ تمہاری کامیابیوں اور زندگی کے لئے نیک خواہشات کے ساتھ۔

تمہارا بھگت سنگھ

والد کے نام خط

یہ خط بھگت سنگھ نے اسمبلی ہال میں بم پھینکنے کے بعد دلی جیل سے اپنے والد کو لکھا تھا۔ مدیر

دلی جیل، 26 اپریل 1929

محترم والد صاحب

وندے ماترم

عرض یہ ہے کہ ہم لوگ 22 اپریل کو پولیس حوالات سے دلی جیل میں منتقل کر دیئے گئے اور اس وقت دہلی جیل میں ہی ہیں۔ مقدمہ 7 مئی کو جیل کے اندر ہی شروع ہوگا۔ غالباً ایک ماہ میں سارا ڈرامہ ختم ہو جائے گا۔ زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ یہاں تشریف لائے تھے اور کسی وکیل وغیرہ سے بات چیت کی تھی اور مجھ سے ملنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر تب سب انتظام نہ ہو سکا۔ کپڑے مجھے پرسوں ملے۔ ملاقات آپ جس دن تشریف لائیں، ہو جائے گی۔ وکیل وغیرہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ دو ایک معاملے میں تھوڑا سا مشورہ لینا چاہتا ہوں مگر یہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ آپ خواہ مخواہ زیادہ تکلف نہ کیجئے۔ والدہ صاحبہ کو ساتھ نہ لایئے گا۔ خواہ مخواہ وہ رو دیں گی اور مجھے بھی کچھ تکلیف ضرور ہوگی۔ گھر کے سب حالات آپ سے ملنے پر ہی معلوم ہو سکیں گے۔
ہاں، اگر ہو سکے تو 'گیت رہسیہ' 'نپولین کی آپ بیتی' جو آپ کو میری کتب میں مل جائیں گی، انگریزی کے کچھ عمدہ ناول لیتے آیئے گا۔ والدہ صاحبہ، بھابھی صاحبہ، ماتا جی (دادی جی) چچی صاحبہ کے چرنوں میں نمسکار۔ رن ویر سنگھ اور کلتار سنگھ کو نمستے۔ باپو جی (دادا جی) کے چرنوں میں نمستے عرض کر دیجئے گا۔ اس وقت پولیس حوالات اور جیل میں ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک ہو رہا ہے۔ آپ کسی قسم کی فکر نہ کیجئے گا۔ مجھے آپ کا ایڈریس معلوم نہیں ہے، اس لئے اس پتے (کانگریس دفتر) پر لکھ رہا ہوں۔

آپ کا تابع دار
بھگت سنگھ

(و) جیل میں جدوجہد کے دوران لکھے گئے خط اور نوٹس

انسپکٹر جنرل کے نام خط

12 جون 1929 کو اسمبلی بم کیس کا ڈرامہ ختم ہوا۔ بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ بھگت سنگھ کو دہلی سے پنجاب لے جا کر میاں والی جیل میں اور دت کو لاہور سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ انہوں نے گاڑی میں ہی اگلی کارروائی کا منصوبہ بنا ڈالا کہ جیل میں سیاسی قیدیوں سے برتاؤ میں اصلاح کرائی جائے۔ ان کے مطابق سزا پانے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارے طبقہ کے سیاسی قیدیوں کی حالت بہت خراب تھی۔ 17 جون 1929 کو بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت نے الگ الگ نوٹسوں میں 15 جون سے بھوک ہڑتال شروع کرنے کی اطلاع اور اپنے مطالبات کی فہرست سرکار کو پیش کی۔ بعد ازاں 14 ستمبر 1929 کو یہ دونوں نوٹس پنڈت مدن موہن مالویہ کے توسط سے لیجسلیٹو اسمبلی میں پڑھے گئے۔ ایک دوسرے خط میں بھگت سنگھ نے خود کو لاہور جیل بھیجنے کی بات اٹھائی۔ ۔مدیر

میاں والی جیل

17 جون 1929

بخدمت

انسپکٹر جنرل، جیل

پنجاب (جیل)، لاہور

محترم

اس سچائی کے باوجود کہ سانڈرس شوٹنگ کیس میں گرفتار دوسرے نوجوانوں کے ساتھ ہی مجھ پر بھی مقدمہ چلے گا، مجھے دہلی سے میاں والی جیل منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس کیس کی سماعت 26 جون 1929 سے شروع ہونے والی ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجھے وہاں تبدیل کرنے کے پیچھے کون سا جذبہ کار فرما ہے۔

جو بھی ہو، انصاف کا تقاضہ ہے کہ ہر ایک ملزم (سانڈرس ٹرائل) کو وہ سب سہولیات ملنی چاہئیں، جن سے وہ اپنے مقدمہ کی تیاری کر سکے اور لڑ سکے۔ میں یہاں رہتے ہوئے کیسے اپنا وکیل مقرر کر سکتا ہوں؟ کیوں کہ یہاں رہتے ہوئے مجھے اپنے والد یا دوسرے رشتہ داروں سے رابطہ قائم کرنا دشوار ہے۔ یہ جگہ کافی الگ تھلگ ہے، راستہ دشوار ہے اور لاہور سے کافی دور ہے۔

میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے فوراً لاہور سنٹرل جیل روانہ کرنے کا حکم دیں، جس سے کہ مجھے اپنا کیس لڑنے کی تیاری کرنے کا مناسب موقع ملے۔ امید ہے کہ جلد ہی توجہ دی جائے گی۔

آپ کا

بھگت سنگھ

بھوک ہڑتال کا نوٹس

17 جون 1929

کاپی
انسپکٹر جنرل' جیل
پنجاب' لاہور
17 جون 1929

اسمبلی بم کیس' دہلی کے تعلق سے مجھے عمر قید کی سزا دی گئی ہے' اس طور واضح ہے کہ میں سیاسی قیدی ہوں۔ دہلی جیل میں مجھے خصوصی کھانا ملتا تھا لیکن یہاں پہنچتے پر میرے ساتھ عام قیدیوں جیسا سلوک کیا جارہا ہے۔ اس لئے میں 15 جون 1929 کی صبح سے بھوک ہڑتال پر ہوں۔ ان دو تین دنوں میں میرا وزن دہلی جیل کے مقابلے چھ پونڈ کم ہو گیا ہے۔ میں آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ مجھے ہر حال میں سیاسی قیدی کا خصوصی درجہ ملنا چاہئے۔ میرے مطالبات ہیں...... اچھا کھانا (دودھ' گھی' دال' چاول وغیرہ کے ساتھ)' مشقت نہ کرائی جائے' غسل کی سہولت (صابن' تیل حجامت وغیرہ)' ہر قسم کا ادب (تواریخ' معاشیات' علم سیاسیات' شاعری' ڈرامہ یا ناولیں' اخبار)۔ مجھے امید ہے کہ آپ از روئے کرم میری درخواست پر غور کریں گے اور اپنا فیصلہ لیں گے۔

بھگت سنگھ
تا عمر قیدی نمبر۔ 117
میاں والی جیل

ہوم ممبر کے نام خط

سنٹرل جیل' لاہور
24 جولائی 1929

جناب والا
ہوم ممبر' حکومت ہند

ہمیں (بھگت سنگھ اور بی کے دت) 12 جون 1929 کو دہلی کے اسمبلی بم کیس میں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ جب تک ہم دہلی جیل میں حوالاتی قیدی (انڈر ٹرائل) رہے' ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا گیا' لیکن اس جیل سے ہمارا تبادلہ میاں والی اور لاہور سنٹرل جیل میں ہوا' تب سے ہمارے ساتھ اخلاقی قیدیوں جیسا سلوک کیا جارہا ہے۔ پہلے ہی دن ہم نے اعلیٰ حکام سے اچھی غذا اور کچھ مزید سہولیات کی مانگ کی اور جیل کی روٹی کھانے سے انکار کردیا۔ ہمارے مطالبات اس طرح تھے:

1۔ سیاسی قیدی ہونے کے ناطے ہمیں اچھا کھانا دیا جانا چاہئے' اس لئے ہماری غذا یوروپین قیدیوں جیسی ہونی چاہئے۔ ہم اسی طرح کی خوراک کی مانگ نہیں کرتے' بلکہ اسی قسم کی خوراک چاہتے ہیں۔

2۔ ہمیں مشقت کے نام پر جیلوں میں تحقیر آمیز کام کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا جانا چاہئے۔

3۔ بلا کسی روک ٹوک پہلے سے منظور شدہ (جنہیں جیل حکام تسلیم کرلیں) کتابیں اور لکھنے کا سامان لینے کی سہولت ہونی چاہئے۔

4۔ کم سے کم ایک روزنامہ ہر قیدی کو ملنا چاہئے۔

5۔ ہر ایک جیل میں سیاسی قیدیوں کا ایک خصوصی وارڈ ہونا چاہئے‘ جس میں وہ سبھی ضروری چیزیں مہیا ہونی چاہئے جو یوروپی لوگوں کے لئے ہوتی ہے اور ایک جیل میں رہنے والے سبھی سیاسی قیدی اس وارڈ میں یکجا رہنے چاہئیں۔

6۔ غسل کے لئے سہولیات ملنی چاہئے۔

7۔ اچھے کپڑے ملنے چاہئے۔

ہمارے یہ مطالبات مناسب ہیں لیکن جیل حکام نے ہمیں ایک دن کہا کہ اعلیٰ حکام نے ہمارے مطالبات ماننے سے انکار کردیا ہے۔ مزید برآں یہ کہ زبردستی کھانا دینے والے ہمارے ساتھ بڑا برابرتاؤ کرتے ہیں۔ 11 جون 1929 کو بھگت سنگھ زبردستی کھانا دینے کے پندرہ منٹ بعد تک پوری طرح بے ہوش پڑے رہے۔ آخرش ہم درخواست کرتے ہیں کہ بلا تاخیر یہ بدسلوکی بند کی جانی چاہئے۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں یوپی جیل کمیٹی میں پنڈت جگت نارائن اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین کی سفارش کی طرف اشارہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے یہ سفارش کی ہے کہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ اچھے درجہ کے قیدیوں جیسا سلوک کیا جانا چاہئے۔

ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے مطالبات پر دھیان دیا جائے۔

آپ کے
بھگت سنگھ اور بی کے دت

نوٹ: سیاسی قیدیوں سے ہماری مراد ان لوگوں سے ہے‘ جنہیں اقتدار مخالف کارروائیوں کے سبب سزا ہوئی۔ مثال کے طور پر 17-1915 کے لاہور سازش کیس‘ کاکوری سازش کیس اور دیگر بغاوت کے کیسوں میں سزا یافتہ لوگ۔

پنجاب جیل انکوائری کمیٹی کے صدر کے نام خط

6 ستمبر 1929

صدر‘ پنجاب جیل انکوائری کمیٹی‘
اور بھوک ہڑتال سب کمیٹی کے معزز ممبران‘ شملہ
(بذریعہ: ڈائریکٹر‘ بورسٹل انسٹی ٹیوٹ‘ لاہور)

محترم جناب

درج ذیل باتیں ہم آپ کے زیر غور رکھنے کی اجازت چاہتے ہیں:

1۔ کہ ہم نے بھوک ہڑتال ترک نہیں کی تھی بلکہ صرف حکومت کے فیصلے تک اسے موخر کیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم نے یہ بات آپ کے سامنے واضح کردی تھی اور بار بار پھر آپ سے یہ اپیل کی تھی کہ اسے عوام اور ساتھ ہی حکومت کے سامنے واضح

کر دیا جائے۔

ہمیں بہت حیرانی ہوئی کہ 4 ستمبر 1929 کے 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' میں بھوک ہڑتال سب کمیٹی کے ممبران کی طرف سے دیئے گئے اخباری بیان میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ پھر بھی ہمیں امید ہے کہ آپ جلد از جلد یہ واضح کر دیں گے۔

2۔ ہم نے صرف اس یقین پر بھوک ہڑتال موخر نہیں کی تھی کہ آپ اور جانچ کمیٹی کے باقی ممبران ہمارے خواہش کے مطابق ہمارے سبھی مطالبات منظور کرتے ہوئے اس کی سفارش کر دیں گے۔ ہم میں سے ایک نے تو آپ سے کہا تھا کہ حکومت نے ماضی میں بہت سارے معاملات میں جانچ کمیٹی کی ایسی سفارشیں نہیں مانی تھی کیوں کہ اس سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا' مثال کے طور پر سکین کمیٹی کا حوالہ دیا گیا تھا۔

انہیں شک تھا کہ آپ کی کمیٹی ہماری سفارشات کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔ جواب میں آپ نے کہا تھا کہ ہمارے پاس آنے سے قبل آپ نے مقامی حکومت سے بات کر لی تھی اور آپ ہمیں یقین دلانا چاہتے تھے کہ حکومت اس معاملہ میں ایسا نہیں کرے گی۔

اس وضاحت اور یقین دہانی کے بعد ہی پورے نو گھنٹے کی بحث کے بعد ہم نے بھوک ہڑتال موخر کرنا تسلیم کر لیا تھا۔

علاوہ ازیں آپ نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ ہماری دلی آرزوں اور امنگوں کے مطابق یتیندر ناتھ داس کو ان کی نازک حالت کے پیش نظر رہا کر دیا جائے گا۔

دوسرے یہ کہ زیر سماعت قیدیوں کے طور پر ہمارے مطالبات' جن میں سب سے اہم ہم سبھی کو (بشمول بھگت سنگھ اور ساتھی دت) ایک ساتھ عام بیرک میں رکھنے کا مطالبہ، حکومت ایک یا دو دن میں ہی منظور کر لے گی۔

لیکن ہمارے خدشات صحیح ثابت ہوئے جب سب کمیٹی کی پرزور اور متفقہ سفارشات کے باوجود حکومت نے نہ تو ساتھی داس کو رہا کرنا منظور کیا اور نہ ہی ساتھی بھگت سنگھ اور دت کو ہمارے ساتھ رہنے کی اجازت دی۔

بالآخر اس سچائی کے فوری نتائج یہ برآمد ہوئے ہیں کہ سرکار کو آپ کی سفارشات کی کوئی فکر نہیں اور ہمیں امید ہے کہ آپ ہمیں یہ کہنے کے لئے معاف کریں گے کہ حکومت یہی چاہتی تھی کہ ہماری بھوک ہڑتال ختم کرنے کے لئے عوامی لیڈر ہونے کے ناطے آپ اپنے معزز عہدہ کا استعمال کریں۔ ہم مزید بتادیں کہ بھوک ہڑتال موخر کرنے سے قبل ہم نے بہت توجہ کے ساتھ اس بات پر غور کیا تھا کہ جانچ کمیٹی کے وعدے پر کہاں تک یقین کیا جاسکتا ہے؟ اس تعلق سے ساتھی بھگت سنگھ اور ساتھی دت کی صلاح تھی کہ حالیہ موقع پر اس کا امتحان ہو جائے گا۔ اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ سرکار نے جب کہ آپ کی دو بہت معمولی سفارشات کی طرف بھی توجہ نہیں دی' ہمیں فوری طور پر بھوک ہڑتال شروع کرنے کے لئے مجبور کر دیا گیا ہے۔

3۔ ساتھی داس کی حالت کافی نازک ہے اور اگر حکومت یہ سوچتی ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ہم اپنے فرض سے پیچھے ہٹ جائیں گے تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ ہم سبھی اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ ہم سب انہیں کے راستے پر چلنے کے لئے تیار ہیں۔ پھر بھی مسلسل جدوجہد کو ذہن میں رکھ کر سہولت کے طور پر ہم خود کو دو گروپوں میں تقسیم کر رہے ہیں' جن میں سے پہلا گروپ فوراً بھوک ہڑتال شروع کر رہا ہے۔

یہ یقینی بنایا گیا ہے کہ جب پہلے گروپ کے ممبران کا انتقال ہو جائے تو دوسرے گروپ میں سے ایک ممبر آگے آئے گا۔

ہم نے یہ فیصلہ معاملہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے کیا ہے۔ اپنے ساتھی داس کے نقش قدم پر چلنے کے علاوہ ہمارے سامنے اور کوئی باعزت و آسان راستہ نہیں ہے۔

ہم اپنے کاز کو واجب اور باعزت سمجھتے ہیں، جنھیں ایسے سنگین اقدامات کرنے پر مجبور کرنے کے بجائے کوئی بھی سرکار مان لیتی۔ ہم پھر بتا دیں کہ ہم یہ جدوجہد اس درجہ عزم کے ساتھ کر رہے ہیں کہ اپنے مقاصد کی حصول یابی کے لئے تادم مرگ جدوجہد کے سوائے اور کوئی بھی چیز اس قدر قابل احترام اور عظیم نہیں ہو سکتی۔

آخر میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اپنا فرض پورا نہیں کر رہے ہوں گے اگر حکومت کے سامنے ہمارے مقاصد کی حمایت کے لئے آپ کی دلچسپی اور آپ کو ہونے والی تکلیف کے تئیں آپ کا شکر گزار نہ ہوں۔

سچے دل سے، ہم ہیں آپ کے
لاہور سازش کیس کے بھوک ہڑتال کرنے والے

جمعہ 6 ستمبر 1929
صبح: دس بجے

وزیر داخلہ حکومت ہند کو ٹیلی گرام

برطانوی سامراج کے خلاف انقلابیوں نے جیل میں بھی جدوجہد جاری رکھی۔ جیلوں میں اصلاح کے لئے جو بھوک ہڑتالیں شروع کی گئی، وہ کئی مرحلوں سے گزریں۔ جتیندر ناتھ داس شہید ہوئے، حکومت نے کچھ وعدے کئے۔ ایک بار بھوک ہڑتال ختم کر دی گئی اور پھر شروع کر دی گئی کیوں کہ حکومت کے وعدوں کی سچائی سامنے آ گئی۔ عوام کے سامنے حکومت کی اصلیت کو بے نقاب کرنا اس مہم کا حصہ تھا۔ پھر شروع ہوئی بھوک ہڑتال میں حکومت نے کئی مذموم طریقے اپنائے لیکن انقلابی پورے اعتماد کے ساتھ اپنے مشن پر قائم رہے۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی بھی مصائب خندہ پیشانی سے قبول کرنے کے اپنے اصولوں پر قائم رہے --مدیر

20 جنوری 1930

کاپی

وزیر داخلۂ ہند
بھگت سنگھ اور دیگر قیدیوں کی طرف سے

کمیٹی کی اس یقین دہانی پر کہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کا سوال قابل قبول طرز پر یقینی طور پر جلد ہی حل کر لیا جائے گا، ہم نے اپنی بھوک ہڑتال موخر کر دی تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی بھوک ہڑتال سے متعلق تجاویز کی کاپیاں جیل حکام نے ضبط کر لی ہیں۔ کانگریس نمائندوں کے وفد کو قیدیوں سے ملنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا۔ سازش کیس سے متعلق زیر سماعت افراد پر پولیس حکام کی رضامندی سے 23، 24 اکتوبر 1929 کو بری طرح زدوکوب کیا گیا۔

وزارت داخلہ، حکومت ہند کے نام میمورنڈم

بذریعہ
اسپیشل مجسٹریٹ، لاہور سازش کیس، لاہور

28 جنوری 1930

20 جنوری 1930 کو ہمارے ٹیلی گرام کے تعلق سے جو نیچے دیا جا رہا ہے، ہمیں کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

داخلہ ممبران، حکومت ہند۔ دہلی۔ لاہور سازش کیس کے زیر سماعت (انڈر ٹرائل) قیدیوں نے اس یقین دہانی پر بھوک ہڑتال ترک کر دی تھی کہ حکومت جیل کمیٹی کی سفارشات پر غور و فکر کر رہی ہے۔ آل انڈیا سرکاری کانفرنس ختم ہو گئی لیکن ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ سیاسی قیدیوں کے ساتھ منتقمانہ سلوک ابھی بھی کیا جا رہا ہے۔ اپیل ہے کہ لاہور سازش کیس کے قیدیوں کے بارے میں حکومت ہمیں اپنے حتمی فیصلہ سے ایک ہفتہ کے اندر واقف کرائے۔

جس طرح مذکورہ بالا ٹیلی گرام میں مختصراً بتایا گیا ہے، ہم آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ پنجاب کی جیلوں میں بند لاہور سازش کے قیدیوں اور ہر سیاسی قیدی کو پنجاب جیل جانچ کمیٹی کے ممبران کی اس یقین دہانی پر کہ بہت جلد ہی سیاسی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کا سوال ہماری تسلی کے مطابق حل کیا جا رہا ہے، بھوک ہڑتال موخر کر دی۔ عظیم شہید یتیندر ناتھ داس کی شہادت کے بعد یہ معاملہ لیجسلیٹو اسمبلی میں اٹھا اور سر جیمس کریرنے عوامی طور پر یہ یقین دہانی کرائی کہ اب ارادہ بدل گیا ہے اور تبھی یہ کہا گیا تھا کہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے سوال پر انہیں بہت ہمدردی ہے۔ ایسے سیاسی قیدیوں نے جو ملک کے مختلف حصوں کی جیلوں میں بھوک ہڑتال کر رہے تھے، اس وقت مذکورہ یقین دہانی اور کچھ قیدیوں کی بدتر حالت کو پیش نظر رکھ کر پاس کئے گئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی تجاویز اور اپیل پر اپنی ہڑتال ترک کر دی تھی۔ اس وقت سے سبھی مقامی سرکاروں نے اپنی سفارشات پیش کر دی ہیں۔ الگ الگ ریاستوں کی جیلوں کے انسپکٹر جنرلوں کی میٹنگ لکھنؤ میں ابھی ختم ہوئی ہے۔ آل انڈیا سرکاری کانفرنس کی بیٹھک دہلی میں ہوئی ہے۔ آل انڈیا نفرنس گزشتہ دسمبر کے مہینے میں ہوئی تھی۔ ایک ماہ سے زیادہ گزر گیا لیکن حکومت نے ابھی تک ایک بھی سفارش نافذ نہیں کی۔ اس طرح کے معلقانہ برتاؤ سے دوسروں کی طرح ہمیں بھی اس بات کا خدشہ ہے کہ ممکنہ طور پر اس سوال کو پرے رکھ دیا گیا ہے۔ گزشتہ چار مہینوں میں جس طرح بھوک ہڑتال کرنے والوں اور سیاسی قیدیوں کے ساتھ انتقامانہ سلوک کیا گیا، اس سے ہمارے اندیشہ کو مزید تقویت ملی۔ جو سزائیں سیاسی قیدیوں کو دی جا رہی ہیں، ان سے متعلق مکمل معلومات ہمارے لئے حاصل کرنا بہت مشکل ہے لیکن پھر بھی جیل کی چہار دیواری سے چھن کر جو تھوڑی بہت اطلاعات ہمیں مل سکی ہیں، وہ ہمیں حقیقی صورت حال سے واقف کرانے کے لئے کافی ہیں۔ ایسی ہی کچھ مثالیں ہم نیچے دے رہے ہیں، جن سے ہم متزلزل ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جو سرکاری یقین دہانی سے قطعی مطابقت نہیں رکھتے۔

1۔ مسٹر بی کے بنرجی، جو دکشنیشور بم کیس سے متعلق لاہور سینٹرل جیل میں پانچ برس کی سزا کاٹ رہے ہیں، گزشتہ سال عام بھوک ہڑتال میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کی سزا کے حساب سے ان کی رہائی پچھلے دسمبر کے مہینے میں ہو جانی تھی لیکن اب چار ماہ کے لئے موخر کر دی گئی ہے۔ اس جیل میں لاہور سازش سے متعلق تاحیات قیدی کی سزا کاٹ رہے ستر سالہ ضعیف العمر بابا سوہن سنگھ [1] کو سزا دی گئی ہے۔ اس میں سے متعدد معاملات میں قید بڑھا دی گئی، جب کہ کچھ کو خصوصی درجہ سے بھی ہٹا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر میں میاں والی جیل میں بند سردار کابل سنگھ [2] اور سردار گوپال سنگھ [3] کو عام بھوک ہڑتال میں شامل ہونے کے سبب سزا دی گئی ہے۔ ان میں سے متعدد معاملات میں قید بڑھا دی گئی ہے جب کہ کچھ کے خصوصی درجہ ہٹا دیئے گئے ہیں۔

2۔ اسی الزام میں یعنی بھوک ہڑتال میں شامل ہونے کے سبب آگرہ سنٹرل جیل میں بند مسٹر فنیندر ناتھ سانیال، رام

1۔ بابا سوہن سنگھ بھکنا (1867-1968)، غدر پارٹی کے اولین صدر۔

2۔ کابل سنگھ گوندپوری

3۔ گوپال سنگھ قومی

کرشن کھتری، سریش چندر بھٹاچاریہ، راج کمار سنہا، شچیندر ناتھ بخشی، منمتھ ناتھ گپتا اور کاکوری کیس کے متعدد قیدیوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر سانیال کو بیڑیاں ڈال کر تنہا کوٹھری میں قید رکھا گیا ہے، جس کی وجہ سے ان کی صحت بہت خراب ہوگئی ہے۔ ان کا وزن 18 پونڈ کم ہوگیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ مسٹر بھٹاچاریہ تپ دق کے مریض ہیں۔ بریلی جیل کے تین قیدیوں کو بھی سزائیں دی گئی ہے۔ ان سے مکمل مراعات چھین لی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے رشتہ داروں سے ملاقات اور خط و کتابت کرنے جیسے عام حقوق بھی غصب کر لئے گئے ہیں۔ ان کا وزن بہت کم ہوگیا ہے۔ اس تعلق سے پنڈت جواہر لعل نہرو نے ستمبر 1929 اور جنوری 1930 میں دو پریس بیانات جاری کئے۔

3۔ بھوک ہڑتال کے تعلق سے آل انڈیا کانگریس کی تجویز، منظوری کے بعد بذریعہ ٹیلی گرام الگ الگ ریاستوں کے قیدیوں کو ارسال کی گئی۔ ان کی کاپیاں جیل حکام نے روک لیں۔ پھر اس سلسلہ میں حکومت نے قیدیوں سے ملاقات کے لئے کانگریس نمائندہ وفد کو اجازت نہیں دی۔

4۔ پولیس کے اعلیٰ حکام کے حکم کے مطابق 23 اکتوبر 1929 کو لاہور سازش کیس کے ملزم قیدیوں پر وحشیانہ حملہ کیا گیا، جس کی تفصیلات اخباروں میں شائع ہوئیں۔ اسپیشل مجسٹریٹ پنڈت کرشن نے ہم میں سے ایک شخص کا بیان درج کیا تھا۔ اس بیان کی کاپی آپ کو 16 دسمبر 1929 کو روانہ کی جا چکی ہے۔ لیکن نہ تو حکومتِ پنجاب نے اور نہ ہی حکومت ہند نے جواب دینا ضروری سمجھا اور نہ ہی ہماری طرف سے انکوائری کرانے کی مانگ کو واجب گردانا جب کہ دوسری طرف سے اس واقعہ کے حوالے سے مقامی حکومت نے انتقامی کارروائی کے طور پر ہم پر مقدمہ چلانے کی سخت ضرورت محسوس کی۔

5۔ دسمبر 1929 کے آخری ہفتہ میں لاہور بوسٹرل جیل میں قید مسٹر کرن چندر اور دیگر آٹھ کو جب مجسٹریٹ کی عدالت میں لاکر پیش کیا گیا تو انہیں ہتھکڑیوں اور زنجیروں سے جکڑا گیا تھا۔ یہ پنجاب جیل انکوائری کمیٹی اور پنجاب کی جیلوں کے انسپکٹر جنرل کے معاہدہ کی سراسر خلاف ورزی تھی۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ سبھی قابل ضمانت جرم کے تحت قید تھے۔ اس سے متعلق ڈاکٹر محمد عالم، لالہ دونی چند لاہور والے اور لالہ دونی چند امبالہ والے کے طویل بیانات 'ٹریبون' میں شائع ہوئے ہیں۔

جب ہمیں سیاسی قیدیوں کے تمام آلام و مصائب کا پتہ چلا تو ہم نے بھوک ہڑتال دوبارہ شروع کرنے سے گریز نہیں کیا۔ بھلے ہی اس بات کا انتہائی رنج تھا لیکن ہم نے سوچا کہ مسئلہ جلد ہی حل ہو جائے گا۔ لیکن اب مذکورہ بالا مثالوں کی روشنی میں کیا ہم یہ مانیں کہ بھوک ہڑتال کی ان کہی، خوف ناک سزائیں اور یتیندر ناتھ داس کی عظیم شہادت رائیگاں چلی گئی؟ کیا ہم یہ مانیں کہ زور پکڑ رہی تحریکات کو روکنے اور مشکل آمیز وقت کو ٹالنے کی غرض سے ہی حکومت نے ہمیں یقین دہانی کرائی تھی؟ ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ہم سے غیر متفق نہیں ہوں گے کہ ہم نے کافی عرصہ تک صبر کے ساتھ انتظار کیا ہے۔ لیکن اب ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ حکومت کے غیر یقینی رویہ اور سیاسی قیدیوں کے ساتھ بر اسلوک کے سبب ہمارے پاس دوبارہ جدوجہد شروع کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بھوک ہڑتال کرنا اور اسے جاری رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن ساتھ ہی ہم بتا دیتے ہیں کہ ہندوستان دیگر بہت سے یتیندر اور رام رکھا اور بھگت سنگھ پیدا کر سکتا ہے۔ (آخر دونوں نے 1917 میں جزیرہ انڈمان میں اپنی زندگی قربان کر دی تھی۔ پہلے نے 92 دنوں کی بھوک ہڑتال کے بعد آخری سانس لی اور دسرے نے چھ مہینے تک خاموشی کے ساتھ غیر انسانی مظالم سہتے ہوئے عظیم ہیرو کی طرح جام شہادت نوش کر لیا)۔

سیاسی قیدیوں سے اچھے کی حمایت میں عوام میں سے لوگوں نے اور ہم نے کافی کچھ کہا ہے۔ اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ درجہ بندی کے معاملہ میں سب سے اہم پہلو اور بنیادی مقصد کے قیام کے بارے میں ہم چند لفظ کہنا چاہیں گے۔

درجہ بندی کے پیمانے کے سوال پر ہنگامہ ہوا ہے۔ الگ الگ سرکاروں کے تجویز کردہ پیمانوں کے بنیادی مقصد کو بالکل خارج کردیا گیا ہے۔ حقیقتاً یہ عجیب برتاؤ ہے۔ صرف بنیادی مقصد سے ہی کسی بھی کارروائی کی صحیح قدر کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ سرکار ایک ایسے حملہ آور کو جو اپنے شکار کو جان سے مار ڈالتا ہے اور ایک 'کھڈگ بہادر' کو جو ایک بدمعاش کا قتل کرکے نوجوان لڑکی کی عزت بچاتا ہے اور سماج کو ایک برے اور چاپلوس مجرم سے نجات دلاتا ہے' دونوں کے درمیان فرق کرنے سے قاصر ہیں؟ کیا دونوں افراد میں کوئی فرق نہیں جن میں ایک لالچی ہے اور دوسرا غیر حریص؟ اسی طرح کیا ایک معمولی قاتل اور ایک سیاسی کارکن میں کوئی فرق نہیں؟ بھلے ہی سیاسی کارکن تشدد آمیز رویہ اپنالیں' اس کا یہ عدم مفاد کیا اسے بقیہ مجرموں سے بلند نہیں کردیتا؟ ایسے حالات میں ہمارا خیال یہ ہے کہ درجہ بندی کا پیمانہ وضع کرتے وقت مقصد کو اولیت حاصل ہونی چاہئے۔

گزشتہ سال ہماری بھوک ہڑتال شروع ہونے پر جب اس بات پر غور کرنے کے لئے متعدد عوامی لیڈر' جن میں ڈاکٹر گوپی چندر اور لالہ دونی چند انبالہ والے بھی تھے' جنہوں نے پنجاب جیل میں انکوائری کمیٹی کی سفارشات پر دستخط کئے ہیں' ہمارے پاس آئے اور جب انہوں نے بتایا کہ دہشت گردی کے الزام میں بند قیدیوں میں سے سزا یافتہ سیاسی قیدیوں کو سرکار خاص درجہ کا قیدی تسلیم کرنے پر غور کررہی ہے تو حقیقت میں قتل کے مجرموں کو باہر رکھنے والی حد تک کی سفارش کو معاہدے کے طور پر تسلیم کرلیا گیا' لیکن بعد میں بحث کے دوران دوسرا رویہ اپنالیا گیا اور پنجاب جیل انکوائری کمیٹی کے لئے حوالہ کی شرائط والا مشترکہ بیان اس طرح لکھا گیا' جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بنیادی مقصد کا سوال بالکل ہی الگ کردیا گیا ہے اور پوری درجہ بندی دو چیزوں پر مبنی تھی۔

1۔ جرم کا طریق کار اور

2۔ مجرم کی سماجی حیثیت

اس پیمانے نے مسائل کے تدارک کے بجائے اسے مزید پیچیدہ بنادیا۔

غیر متشددانہ اور تشدد آمیز جرائم والے سیاسی قیدیوں میں دو درجاتی بات ہم سمجھ سکتے تھے۔ لیکن پنجاب جیل انکوائری کمیٹی کی سفارشات میں سماجی حیثیت کا سوال آجاتا ہے۔ جس طرح چودھری افضل الحق نے رپورٹ سے عدم اتفاق کی بنیاد پر نکتہ چینی کرتے ہوئے صحیح ہی کہا ہے کہ آزادی کے کاموں میں منہمک رہنے کے سبب مفلوک الحال ہونے والے سیاسی کارکنوں کا کیا ہوگا؟ کیا انہیں کسی منصف کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے' جو ہر ایک کو معمولی مجرم قرار دے کر اپنی وفاداری کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ یا توقع کی جائے کہ ایک عدم تعاون کرنے والا جیل سے اچھے سلوک کی درخواست کرتے ہوئے ان لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے گا' جن کے خلاف وہ نبرد آزما ہے؟ کیا یہ طریقہ اس بے چینی اور بے قراری کے سبب کو دور کرنے کا ہے یا بڑھانے کا؟ دلیل دی جاسکتی ہے کہ جیلوں کے باہر مفلوک الحالی میں جینے والے لوگوں کو جیلوں کے عیش و آرام کی توقع نہیں کرنی چاہئے' جہاں انہیں سزا کے مقصد سے قیدی بنا کر رکھا گیا ہے۔ لیکن وہ کون سی اصلاحات ہیں' جن کی عیش کے لئے ضرورت ہوتی ہے؟ کیا وہ محض عام زندگی کی ضرورتیں نہیں ہیں؟ مانگی جانے والی سبھی سہولیات کے باوجود جیل ہمیشہ جیل ہی رہے گی۔ باہر کے لوگوں کو راغب کرنے کے لئے جیل کوئی قابل کشش طاقت نہیں ہوتی اور نہ ہی کبھی ہوسکتی ہے۔ صرف جیل جانے کے لئے کوئی بھی جرم نہیں کرتا۔ ہم یہ کہنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ کسی بھی سرکار کی یہ بہت غیر معقول دلیل ہوگی کہ شہری اس درجہ تک محتاج ہوگئے ہیں اور ان کے رہنے کی سطح جیل کے مقابلے ناقص ہوگئی ہے۔ کیا ایسی حجت میں سرکار کے وجود کا کوئی امکان باقی رہ جاتا ہے؟ خیر' اس وقت ہمیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ بے چینی

دور کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ سیاسی قیدیوں کو مختلف درجوں میں رکھا جائے۔ بعد میں اگر ضرورت محسوس ہو تو اس کو دوبارہ دو زمروں' ایک غیر متشدد جرم میں سزا یافتہ ہیں اور دوسرے متشدد جرموں میں سزا یافتہ ہیں' میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس حالت میں مقصد فیصلہ کن پہلو بن جائے گا۔ یہ کہنا کہ سیاسی معاملات میں مقصد کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا' ایک جھوٹا دعویٰ ہے۔ وہ کون سی چیز ہے' جو آج جیل حکام سے جیلوں میں سیاسی افراد کو معمولی مراعات سے محروم کرنے کے لئے کہتی ہے؟ وہ کون سی چیز ہے جو ان کی درجہ بندی چھینتی ہے؟ وہ کون سی چیز ہے جو مجرموں سے یہ کہتی ہے کہ انہیں دیگر قیدیوں سے الگ رکھا جائے؟ یہی چیز درجہ بندی میں بھی مدد کر سکتی ہے۔

جہاں تک خصوصی مراعات کا تعلق ہے' ہم پہلے ہی پنجاب جیل انکوائری کمیٹی سے اپنے میمورنڈم میں پوری بات اچھی طرح کہہ چکے ہیں۔ پھر بھی ہم اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ کسی بھی سیاسی قیدی کا چاہے جو جرم ہو اسے سخت اور توہین آمیز سزا نہیں ملنی چاہئے اور مقامی زبان یا انگریزی کا کم سے کم ایک اخبار انہیں دیا جانا چاہئے۔ مطالعہ کے لئے سبھی لازمی سہولیات دی جانی چاہئیں اور ذاتی وسائل سے خوراک اور کپڑے پر خرچ بڑھانے کی اجازت دی جانی چاہئے۔

ہم ابھی بھی پر امید ہیں کہ سرکار ہمیں اور عوام سے کی گئی یقین دہانی کو بلا تاخیر زیر عمل لائے گی تا کہ بھوک ہڑتال کا پھر موقع نہ آئے۔ آئندہ سات دنوں میں اگر سرکار نے اپنی یقین دہانی پوری نہ کی تو ہم دوبارہ بھوک ہڑتال کرنے پر مجبور ہوں گے۔

آپ کے
بھگت سنگھ' دت اور دیگر قیدی
لاہور سازش کیس

اسپیشل مجسٹریٹ' لاہور کے نام

بذریعہ سپرنٹنڈنٹ' سنٹرل جیل' لاہور
11 فروری 1930
مسٹر مجسٹریٹ

4 فروری 1930 کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع شدہ آپ کے بیان سے متعلق یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے عدالت میں آنے کے اسباب سے آپ کو واقف کرائیں تا کہ کوئی غلط فہمی اور غلط بیانی ممکن نہ ہو۔

پہلے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ ہم نے ابھی تک برطانوی عدالتوں کا بائیکاٹ نہیں کیا ہے۔ ہم مسٹر لوئس کی عدالت میں جا رہے ہیں' جو ہمارے خلاف جیل ایکٹ دفعہ 22 کے تحت مقدمہ کی سماعت کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ 29 جنوری کو آپ کی عدالت میں پیش آیا۔ لاہور سازش کیس کے متعلق یہ قدم اٹھانے کے لئے ہمیں حالات نے مجبور کر دیا ہے۔ ہم شروع سے ہی محسوس کرتے رہے ہیں کہ عدالت کے غلط رویہ یا جیل کے اور دیگر حکام نے ہمارے اختیارات کی حدوں کی خلاف ورزی کر کے ہمیں مسلسل جان بوجھ کر پریشان کیا تا کہ ہماری پیروی میں رخنہ ڈالا جا سکے۔ چند دن قبل ضمانت کی درخواست میں ہم نے اپنی تکالیف آپ کے سامنے رکھی تھیں لیکن اس درخواست کو کچھ قانونی نکتوں کی بنا پر نامنظور کرتے ہوئے آپ نے

قیدیوں کی تکالیف کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا' جن کی بنیاد پر ضمانت کی درخواست دی گئی تھی۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ مجسٹریٹ کا پہلا اور اہم فرض یہ ہوتا ہے کہ اس کا برتاؤ غیر جانب دار اور دونوں فریقوں کے مفاد سے اوپر اٹھ کر ہونا چاہئے۔ یہاں تک کہ اس دن عزت مآب جسٹس کورٹ نے یہ رولنگ دی تھی کہ مجسٹریٹ کو دوسری سب سے اہم بات اپنے سامنے رکھنی چاہئے کہ زیر سماعت قیدیوں کو اپنی پیروی سے متعلق کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اگر کوئی مشکل ہو تو اسے دور کرنا چاہئے۔ ورنہ پورا مقدمہ ایک مذاق بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ایسے اہم مقدمہ میں مجسٹریٹ کا رویہ اس کے برعکس رہا' جس میں اٹھارہ نوجوانوں پر سنگین الزامات جیسے قتل' ڈکیتی اور سازش کے تحت مقدمہ چلایا جارہا ہے' جن سے ممکن ہے کہ انہیں سزائے موت تجویز کی جائے۔ جن اہم مدعوں پر ہم آپ کی عدالت میں نہ آنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں وہ اس طرح ہیں:

زیر سماعت قیدیوں میں سے زیادہ تر دور دراز صوبوں کے ہیں اور سبھی درمیانی طبقہ کے لوگ ہیں۔ ایسی حالت میں ان کے عزیزوں کا ان کی پیروی کے لئے بار بار آنا نہ صرف بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ وہ اپنے کچھ دوستوں سے ملاقات کرنا چاہتے تھے' جنہیں وہ اپنی پیروی کی سبھی ذمہ داریاں سونپ سکتے تھے۔ عقل کا بھی یہ تقاضا ہے کہ انہیں ملاقات کرنے کا حق حاصل ہے' اس مقصد کے لئے بار بار درخواست کی گئی' لیکن سبھی اپیلیں مسترد کر دی گئیں۔

مسٹر بی کے دت بنگال کے رہنے والے ہیں اور مسٹر کمل ناتھ تیواری بہار کے باشندہ ہیں۔ دونوں اپنی اپنی دوست کماری لجاوتی اور مسز پاروتی سے ملاقات کے خواہاں تھے لیکن عدالت نے ان کی درخواست جیل حکام کو بھیج دی اور انہوں نے یہ کہہ کر درخواست رد کر دی کہ ملاقات صرف رشتہ داروں اور وکیلوں سے ہی ہو سکتی ہے۔ یہ معاملہ بار بار آپ کے زیر علم لایا گیا لیکن ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا' جس سے قیدی پیروی کے لئے لازمی انتظامات کر سکتے۔ بعد میں انہیں ان کا وکالت نامہ حاصل کرنے پر بھی ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی' حتیٰ کہ مجسٹریٹ نے جیل حکام کو یہ لکھنے سے بھی منع کر دیا کہ قیدی اس کی جانب سے چلائے جا رہے مقدمات کی پیروی کے تعلق سے ان ملاقاتوں کا مطالبہ کر رہے تھے اور اس طرح قیدی اوپر کی عدالت میں جانے کے اہل نہیں رہے۔ لیکن مقدمہ کی سماعت جاری رہی۔ ان حالات میں قیدی بالکل مجبور تھے اور ان کے لئے مقدمہ مذاق سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ دوسرے قیدیوں میں بھی زیادہ تر کی جانب سے کوئی وکیل پیش نہیں ہو رہا تھا۔

میرا وکیل نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی کو کل وقتی وکیل رکھ سکتا ہوں۔ میں کچھ نکتوں پر قانونی رائے چاہتا ہوں اور خاص مرحلہ پر میں چاہتا تھا کہ وہ (وکیل) کارروائی کو خود دیکھیں تاکہ اپنی رائے قائم کرنے میں وہ بہتر حالت میں ہوں لیکن انہیں عدالت میں بیٹھنے تک کی جگہ نہیں دی گئی۔ ہماری پیروی روکنے کے لئے' ہمیں پریشان کرنے کے لئے کیا متعلقہ حکام کی یہ سوچی سمجھی چال نہیں تھی؟ وکیل اپنے سائلوں (درخواست کنندگان) کے مفاد کو دیکھنے کے لئے عدالت میں آتا ہے جو نہ تو خود موجود ہوتے ہیں اور نہ ان کا کوئی نمائندہ وہاں ہوتا ہے۔ اس مقدمہ کی ایسی کون سی خاص مجبوریاں ہیں' جس سے مجسٹریٹ وکلا کے تئیں ایسا سخت رویہ اپنانے پر مجبور ہوئے؟ اس طرح ہر اس وکیل کی حوصلہ شکنی کی گئی جو قیدیوں کی مدد کے لئے بلایا جا سکتا تھا۔ مسٹر امرداس کو پیروی (ڈیفنس) کی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دینے کی کیا ضرورت تھی جب کہ وہ کسی بھی فریق کی نمائندگی نہیں کر رہے تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی کو قانونی مشورہ دیا۔ اپنے مختاروں سے ملاقات سے متعلق مجھے قانونی صلاح کار سے تبادلہ خیال کرنا تھا اور اسی نکتہ کو لے کر ہائی کورٹ میں اپیل کے لئے ان سے کہنا تھا۔ لیکن ان کے ساتھ اس حوالے سے بات

کرنے کا مجھے کوئی موقع نہیں ملا اور کچھ نہ ہو سکا۔ اس سب کا کیا مطلب ہے؟ یہ دکھا کر کہ مقدمہ قانون کے مطابق چلایا جا رہا ہے' کیا لوگوں کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونکی جا رہی ہے؟ اپنے بچاؤ کا انتظام کرنے کے لئے قیدیوں کو قطعی کوئی موقع نہیں دیا گیا۔ اس بات کے خلاف ہم اظہار برأت کرتے ہیں۔ اگر سب کچھ مناسب طریقہ سے نہیں کیا جاتا تو اس تماشہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انصاف کے نام پر ہم ناانصافی ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ ان حالات میں ہم سبھی نے سوچا کہ یا تو ہمیں اپنی زندگی بچانے کا مناسب موقع ملنا چاہئے اور یا ہماری غیر موجودگی میں چل رہے مقدمات میں ہمیں دی گئی سزاؤں کو بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

تیسری بڑی شکایت اخباروں کی تقسیم سے متعلق ہے۔ زیر سماعت قیدیوں کو کبھی بھی سزا یافتہ قیدی نہیں ماننا چاہئے اور یہ روک ان پر تبھی لگائی جا سکتی ہے جب ایسا ان کی حفاظت کے لئے اشد ضروری ہو۔ اس سے زیادہ اسے موزوں نہیں کہا جا سکتا۔ ضمانت پر رہا نہ ہونے والے قیدیوں کو کبھی بھی سزا کے طور پر تکلیف نہیں دینی چاہئے۔ اس لئے ہر تعلیم یافتہ زیر سماعت قیدی کو کم سے کم ایک اخبار حاصل کرنے کا حق ہے۔ عدالت میں ایگزیکیٹو کچھ اصولوں پر ہمیں ہر روز ایک انگریزی اخبار دینے کے لئے متفق ہوئی ہے۔ لیکن ادھوری چیزیں نہ ہونے سے بھی بری ہوتی ہیں۔ انگریزی نہ جاننے والے قیدیوں کے لئے مقامی اخبار دینے کی درخواست رائیگاں گئی۔ مگر مقامی اخبار نہ دینے کے حکم کے خلاف غصہ ظاہر کرتے ہوئے ہم روزنامہ 'ٹریبون' لوٹاتے رہے ہیں۔

ان تین بنیادوں پر ہم نے 29 جنوری کو عدالت میں آنے سے انکار کرنے کا اعلان کیا تھا۔ جوں ہی یہ مشکلیں دور کر دی جائیں گی' ہم بخوشی عدالت میں حاضر ہو جائیں گے۔

بھگت سنگھ و دیگر

ہندوستان ٹائمس میں 13 فروری 1930 کو شائع شدہ

'ٹریبون' کی ایک دلچسپ رپورٹ

آج عدالت میں بھگت سنگھ نے شکایت کی ہے کہ جب بچاؤ کمیٹی کے لئے ایک ممبر دوپہر میں کھانے کے لئے کچھ چیزیں لا رہے تھے تو کھانے کے لائق اشیاء عدالت میں نہیں لانے دی گئیں۔

دوپہر میں کھانے کے بعد مبینہ مجرم جتن سانیال نے مجسٹریٹ سے شکایت کی کہ ان کے لئے بنگال سے رسگلے کا پارسل آیا تھا لیکن جیل حکام نے ان کو اس طرح کچل ڈالا کہ وہ کھانے کے قابل نہیں رہ گئے۔

سردار بھگت سنگھ (مجسٹریٹ سے) رسگلے باہر پڑے ہیں۔ کیا آپ ان کا معائنہ کرنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ آہا' خوب صورت نظارہ ہے۔ بس ذرا نظارہ کر لیں۔ ان گواہوں کے مقابلے رسگلے زیادہ ضروری ہیں۔

جتن سانیال۔ سبھی چیزیں بہت بیہودہ حالت میں ہیں۔ کیا آپ اسے مدلل کہتے ہیں؟

سردار بھگت سنگھ۔ یہ (مجسٹریٹ) بالکل غیر مدلل ہیں۔

جتن سانیال۔ یہ ہم کسے واپس کریں۔ آپ کو یا جیل حکام کو؟

مجسٹریٹ۔جیل حکام کو

سردار بھگت سنگھ۔لیکن اس کی قیمت کون دے گا؟ ہمارے دوست نے کافی رقم خرچ کی ہے اس پر۔

مجسٹریٹ۔یہ بات جیل حکام سے تعلق رکھتی ہے۔

شائع شدہ: ٹربیون، لاہور 9 اپریل 1930

(ز) سیاسی طرز کے ٹیلی گرام

تیسری انٹرنیشنل، ماسکو کے صدر کو ٹیلی گرام

24 جنوری 1930 کو لینن ڈے کے موقع پر لاہور سازش کیس کے زیر سماعت قیدی اپنی گردنوں میں لال رومال باندھ کر عدالت میں آئے۔وہ کاکوری گیت گا رہے تھے۔مجسٹریٹ کے آنے پر انہوں نے 'سوشلسٹ انقلاب زندہ باد اور' سامراجیہ واد مردہ باد' کے نعرے لگائے۔پھر بھگت سنگھ نے مندرجہ ذیل ٹیلی گرام تیسری انٹرنیشنل' ماسکو کے صدر کے نام ارسال کرنے کے لئے مجسٹریٹ کو دیا۔

لینن ڈے کے موقع پر ہم سوویت روس میں ہونے والے عظیم تجربہ اور کامریڈ لینن کی کامیابی کو فزوں تر کرنے کے لئے اپنی دلی مبارک باد بھیجتے ہیں۔ہم اپنے کو عالمی انقلابی تحریک سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔مزدور راج کی جیت ہو۔سرمایہ داری کا ناش ہو۔

سامراجیہ واد مردہ باد

24 جنوری 1930

زیر سماعت قیدی

لاہور سازش کیس

(ٹربیون' لاہور میں' 26 جنوری 1930 کو شائع شدہ)

کاکوری کیس کے قیدیوں کے نام ٹیلی گرام

بذریعہ اسپیشل مجسٹریٹ' لاہور

برائے مہربانی مندرجہ ذیل ٹیلی گرام فوری طور پر کاکوری قیدیوں کو بھیج دیں جو بریلی جیل میں بھوک ہڑتال پر ہیں' جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نہایت ابتر حالت میں ہیں۔

آپ کے بھگت سنگھ

بی کے دت

ٹیلی گرام
گپت، بخشی، سنہا، مکندی لال
کاکوری قیدی
سینٹرل جیل
بریلی

آپ کی نازک حالت کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ ہمارا پہلا ٹیلی گرام آپ تک نہیں پہنچا۔ ہم آپ سے صمیم قلب سے درخواست کرتے ہیں کہ سرکار کی جانب سے قیدیوں کی درجہ بندی کے آخری نوٹس کو دھیان میں رکھتے ہوئے آپ اپنی جدوجہد ترک کر دیں۔ جہاں تک نئے قوانین کے نفاذ کا سوال ہے، ہم سب کو انتظار کرنا چاہئے۔

بھگت سنگھ اور دت

ہندوستانی کمیٹی، برلن کے نام ٹیلی گرام

برائے مہربانی ہندوستان میں سوشلسٹ انقلابی تحریک کے علم برداروں میں سے ایک کامریڈ کرشنا ورما کے انتقال پر ہماری تعزیت اپنے ساتھیوں تک پہنچائیں۔

ان کی زندگی ہندوستان کی طویل جدوجہد آزادی کے اصولوں میں سے ایک قومی ملکیت ہے، جو آزادی کی جدوجہد میں سرگرم کارکنوں کو ہمیشہ تحریک دیتی رہے گی۔

5 اپریل 1930

زیر سماعت قیدی
لاہور سازش کیس
(ٹریبون، لاہور میں، 8 اپریل 1930 کو شائع شدہ)

(ح) برطانوی عدالتی نظام کی حقیقت عیاں کرنے والے خطوط

خصوصی ٹریبونل کے قیام پر

2 مئی 1930

گورنر جنرل، ہندوستان، شملہ (پنجاب)

محترم

ہمارے مقدمہ کا جلد فیصلہ صادر کرنے کے لئے جاری شدہ آرڈی نینس کی پوری کاپی پڑھ کر سنائی جا چکی ہے۔ اس کے لئے پنجاب ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار میں ایک ٹریبونل کی تشکیل کی گئی ہے۔ اگر اس سلسلہ میں اپنائے گئے طریقۂ کار کا ذکر نہ کیا جاتا اور اس کی ساری جواب دہی ہمارے سر پر نہ ڈالی گئی ہوتی تو ہم شاید اپنی زبان بند رکھتے، لیکن موجودہ حالت میں اس سلسلہ میں، ہم اپنے بیان دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ہمارے علم میں شروع سے ہی یہ بات رہی ہے کہ سرکار دانستہ طور پر ہمارے بارے میں غلط فہمی پیدا کر رہی ہے۔ آخر کار

یہ ایک لڑائی ہے اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے غلط فہمیوں کا جال بُنتا سرکار کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس قابل نفریں کام کو روکنے کے لئے ہمارے پاس کوئی وسیلہ نہیں لیکن کچھ ایسی باتیں ہیں، جنھیں ذہن میں رکھتے ہوئے کچھ کہنے کے لئے مجبور ہیں۔

آپ نے لاہور سازش کیس کے بارے میں جاری آرڈی نینس میں ہماری بھوک ہڑتال کے بارے میں اپنی وضاحت دی ہے۔ آپ نے خود قبول کیا ہے کہ ہم میں سے دو نے اس مقدمہ سے متعلق اسپیشل مجسٹریٹ پنڈت کرشنا کی عدالت میں ہونے والی جانچ پڑتال سے پہلے بھوک ہڑتال شروع کر دی تھی۔ ایک عام فہم رکھنے والے شخص کی سمجھ میں بھی یہ بات آسکتی ہے کہ اس مقدمہ کا بھوک ہڑتال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بھوک ہڑتال شروع کرنے کے کچھ خصوصی اسباب تھے ایسی حالت میں سرکار کو ان اسباب کے بارے میں وضاحت کرنی چاہئے تھی، جس کی بنیاد پر بھوک ہڑتال کی گئی تھی۔ جب سرکار نے اس مسئلہ کو سلجھانے کے لئے کچھ انتظامات کرنے کی منظوری دی اور جیل جانچ کمیٹی قائم کی تو ہم نے بھوک ہڑتال ختم کر دی تھی۔ لیکن سب سے پہلے ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ مسئلہ نومبر تک حل کر لیا جائے گا لیکن اسے دسمبر تک ٹال دیا گیا۔ جنوری بھی گزر گئی لیکن اس بات کا کوئی اشارہ نہیں مل رہا تھا کہ سرکار حقیقت میں اس سلسلہ میں کچھ کرے گی بھی یا نہیں۔ ہمیں محسوس ہوا کہ معاملہ ختم کر دیا گیا ہے۔ ان حالات میں ہم نے پورے ایک ہفتہ کا نوٹس دے کر 4 فروری 1930 سے دوبارہ بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ اس کے بعد ہی سرکار نے اس مسئلہ کو حتمی طور پر حل کرنے کے لئے کچھ اقدامات کئے۔

سرکار نے اس امر کا ایک اشتہار پھر اخباروں میں جاری کیا۔ تب ہم نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ یہاں تک کہ ہم نے اس بات کا انتظار بھی نہیں کیا کہ سرکار اپنے حتمی فیصلہ کو نافذ کرتی ہے یا نہیں؟ لیکن آج ہی ہم نے یہ محسوس کیا کہ سرکار ایسے معمولی معاملات میں بھی جھوٹ اور فریب کا سہارا لینے سے باز نہیں آئی۔ وہ اشتہار خصوصی طور پر فیصلہ اخذ کرنے والی بنیادوں پر مبنی تھا لیکن ہم نے دیکھا کہ اس کے برعکس عمل کیا گیا۔ جو بھی ہوا اس موضوع پر بحث کرنے کا یہ مناسب موقع نہیں۔ اگر یہ معاملہ دوبارہ کبھی اٹھا تو ہم اس کا حتمی فیصلہ کریں گے۔ لیکن ہم زور دے کر کہنا چاہتے ہیں کہ بھوک ہڑتال کا مقصد استغاثہ کی کارروائی کے خلاف کوئی قدم نہیں تھا۔ ایسے معمولی اسباب کی وجہ سے ہم نے اتنی اذیتیں نہیں برداشت کیں۔ یتندر ناتھ داس نے اتنے معمولی سبب کی خاطر اپنی زندگی کی قربانی نہیں دی۔ راج گرو اور سکھ دیو نے بھی اس بچاؤ کے لئے ہی اپنی زندگی مصیبت میں نہیں ڈالی تھی۔

آپ خود ہمارے مقدمہ کے پس منظر میں یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آرڈی نینس جاری کرنے کی وجہ بھوک ہڑتال نہیں تھی۔ لیکن حقیقی وجوہات تو کچھ اور ہیں، جن کے بارے میں سوچ کر آپ کی سرکار کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ نہ تو وہ اس مقدمہ میں تاخیر کا سبب بنے اور نہ ہی کوئی ایسی مشکل صورت حال پیدا ہوئی، جس کے سبب اس بے قانون کے قانون پر دستخط کئے۔ لازمی طور پر اس کے پیچھے مقصد کچھ اور ہے۔

لیکن ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ان آرڈی نینسوں سے ہمارے جذبات کو کچلا نہیں جا سکتا۔ بھلے ہی آپ کچھ انسانوں کو کچل دینے میں کامیابی حاصل کر لیں لیکن یاد رہے، آپ اس ملک و قوم کو نہیں کچل سکتے۔ جہاں تک اس آرڈی نینس کا پس منظر ہے، ہم اسے اپنی شاندار کامیابی مانتے ہیں۔ ہم شروع سے ہی یہ بتانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ آپ کا یہ قانون ایک خوب صورت فریب ہے۔ یہ انصاف نہیں دے سکتا۔ لیکن افسوس ہے کہ جیل میں جو سہولیات قانون اور انصاف کے تحت مجرموں کو ملتی ہیں اور معمولی قیدیوں کو بھی دی جاتی ہیں، وہ سہولیات بھی ہم سیاسی قیدیوں کو نہیں دی جاتیں۔ ہم چاہتے تھے کہ

سرکار اپنے لبادے سے باہر آئے اور واضح طور پر کہے کہ سیاسی قیدیوں کو بچاؤ کا کوئی موقع نہیں دیا جا سکتا۔

ہمیں لگتا ہے کہ سرکار نے یہ بات واضح طور پر منظور کر لی گئی ہے۔ ہم آپ کو اور آپ کی سرکار کو اس صاف گوئی کے لئے مبارک باد دیتے ہیں اور آرڈی نینس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

آپ کے نمائندے اسپیشل مجسٹریٹ اور استغاثہ کے سرکاری وکیل کے ذریعہ لگاتار ہمارے مناسب رویہ کو صاف صاف تسلیم کرنے کے باوجود صرف ہمارے مقدمہ کے وجود کے بارے میں سوچتے ہی آپ کے ذہن میں بھیانک ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ہماری اس جدوجہد کی شاندار کامیابی کا اس سے بڑا ایقان اور کیا ہو سکتا ہے۔

آپ کے.....وغیرہ وغیرہ

بھگت سنگھ

عدالت ایک فریب ہے

چھ ساتھیوں کا اعلان

5 مئی 1930

کمشنر

خصوصی ٹربیونل

لاہور سازش کیس، لاہور

جناب

اپنے چھ ساتھیوں کی طرف سے جن میں، میں بھی شامل ہوں، درج ذیل وضاحت اس سماعت کی ابتدا میں ہی کر دینا ضروری ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے درج کیا جائے۔

ہم مقدمہ کی کارروائی میں کسی بھی طرح حصہ نہیں لینا چاہتے کیوں کہ ہم اس سرکار کو نہ تو مبنی بر انصاف سمجھتے ہیں اور نہ ہی قانونی طور پر قابل تسلیم۔ ہم اپنے یقین کی بنیاد پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ مکمل طاقت کی بنیاد انسان ہے۔ کوئی فرد یا حکومت کسی بھی ایسی طاقت کی حق دار نہیں ہے جو عوام نے اس کو نہ دی ہو کیوں کہ یہ سرکار ان اصولوں کے خلاف ہے اس لئے اس کا وجود ہی مناسب نہیں ہے۔ ایسی سرکاریں جو ملک کو لوٹنے کے لئے مجتمع ہو جاتی ہیں، ان میں تلوار کی طاقت کے علاوہ ان کے قیام کا کوئی جواز نہیں ہوتا، اس لئے وہ اپنی ظالمانہ قوتوں کو بروئے کار لا کر نظریۂ آزادی اور لوگوں کی جائز خواہشات کو کچلتی ہیں۔

ہمارا یقین ہے کہ ایسی سرکاریں، خصوصاً انگریزی سرکار جو مجبور و محکوم ہندوستانیوں پر تھوپی گئی ہے غنڈوں، ڈاکوؤں کا گروہ اور لٹیروں کی ٹولی ہے۔ جس نے قتل عام کرنے اور لوگوں کو اجاڑنے کے لئے ہر طرح کی طاقتیں حاصل کر لی ہیں۔ قیام امن کے نام پر یہ اپنے مخالفین یا ان کے راز منکشف کرنے والوں کو کچل دیتی ہے۔

ہمارا ایقان ہے کہ سامراج واد ایک بڑی ڈاکہ زنی کی سازش کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ استعماریت (سامراجیہ واد) ایک انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کے اور ایک ملک کے ہاتھوں دوسرے ملک کے استحصال کی انتہا ہے۔ استعماریت پسند اپنے مفاد اور لوٹ کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے نہ صرف عدالتوں اور قانون کا قتل کرتے ہیں بلکہ خوف ناک قتل بھی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ استحصال کرنے کے لئے جنگ جیسے خوف ناک جرم بھی کرتے ہیں۔ جہاں کہیں لوگ ان کی نادرشاہی اور استحصال

کو تسلیم نہ کریں یا چپ چاپ ان کی تباہ و برباد کرنے دینے والی اور قابل نفرت سازشوں کو ماننے سے انکار کر دیں تو وہ معصوموں کا خون بہانے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیتے۔ قیام امن کی آڑ میں وہ امن کو غارت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جان بچا کر بھاگتے ہوئے لوگوں کا قتل یعنی وہ ہر ممکن ظلم کرتے ہیں۔

ہم مانتے ہیں کہ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے۔ ہر انسان کو اپنی محنت کا پھل پانے کا حق ہے اور ہر ملک اپنے یہاں موجود فطری وسائل کا مختار کل ہے۔ اگر کوئی سرکار عوام کو اس کے ان بنیادی حقوق سے محروم رکھتی ہے تو عوام کا محض یہ حق ہی نہیں بلکہ ضروری فرض بھی بن جاتا ہے کہ ایسی سرکار کا خاتمہ کر دیں کیوں کہ برطانوی سرکار ان اصولوں' جن کے لئے ہم لڑ رہے ہیں' کے سراسر خلاف ہے' اس لئے ہمارا پختہ یقین ہے کہ جس طریقہ سے بھی ملک میں انقلاب لایا جا سکے اور اس سرکار کا خاتمہ کیا جا سکے' اس کے لئے ہر کوشش کی جائے' اسے ہم اخلاقی بنیاد پر موزوں سمجھتے ہیں۔ ہم حالیہ نظام کے سماجی' معاشی اور سیاسی حلقوں میں انقلابی تبدیلی لانے کے حق میں ہیں۔ ہم موجودہ سماج کو مکمل طور پر ایک نو تشکیل شدہ سماج میں بدلنا چاہتے ہیں تاکہ انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ناممکن بنا کر سبھی کے لئے تمام شعبوں میں پوری آزادی یقینی بنائی جائے۔ جب تک سارا سماجی نظام بدلا نہیں جاتا اور اس کی جگہ سوشلسٹ نظام قائم نہیں ہوتا' ہم محسوس کرتے ہیں کہ پوری دنیا ایک تباہ کن قیامت خیز مصائب میں گرفتار ہے۔

جہاں تک پر امن یا دیگر طریقوں سے انقلابی آدرشوں کے قیام کا تعلق ہے' ہم اعلان کرتے ہیں کہ اس کا انتخاب موجودہ حکمرانوں کی مرضی پر منحصر ہے۔ انقلابی اخوت میں یقین رکھنے کے سبب انسانیت کے پجاری ہیں۔ ہم حقیقی امن کے متلاشی ہیں' جو انصاف اور برابری پر مبنی ہو۔ ہم جھوٹے اور مصنوعی امن کے حامی نہیں' جو بزدلی سے پیدا ہوتا ہے اور بھالے اور بندوقوں کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ انقلابی اگر بم اور پستول کا سہارا لیتا ہے تو یہ اس کی حد درجہ مجبوری ہوتی ہے اور یہ اس کا آخری داؤ ہوتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ امن اور قانون انسان کے لئے ہے' نہ کہ انسان امن اور قانون کے لئے۔

فرانس کے چیف جسٹس کا یہ کہنا مناسب ہے کہ قانون کی روح آزادی ختم کرنا یا پابندی لگانا نہیں بلکہ آزادی کا تحفظ اور اسے آگے بڑھانا ہے۔ سرکار کو قانونی طاقت ان مناسب قوانین سے ملے گی جو صرف مجموعی مفاد کے لئے وضع کئے گئے ہوں اور جو عوام کی خواہشوں اور امنگوں پر مبنی ہوں' جن کے لئے یہ وضع کئے گئے ہوں۔ قانون سازوں سمیت کوئی بھی اس سے اوپر نہیں ہو سکتا۔

قانون کی تقدیس اور بالادستی اسی وقت تک قائم رکھی جا سکتی ہے جب تک وہ عوامی جذبات کے مظہر ہوں۔ جب یہ استحصال کرنے والوں کے ہاتھوں میں ایک پرزہ بن جائے تو وہ اپنا تقدس اور اہمیت کھو دیتا ہے۔ انصاف بہم پہنچانے کے لئے بنیادی بات یہ ہے کہ ہر طرح کے مفاد کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ جیسے ہی قانون سماجی ضروریات کو پورا کرنا بند کر دیتا ہے' ویسے ہی ظلم اور ناانصافی بڑھانے کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ ایسے قوانین کو جاری رکھنا مجموعی مفاد پر خصوصی مفاد کو زبردستی ترجیح دینے کے سوائے کچھ بھی نہیں۔

موجودہ سرکار کے قانون غیر ملکی حکمرانوں کے مفاد کے لئے کام کرتے ہیں اور ہم لوگوں کے مفاد کے برعکس ہیں' اس لئے ان کی ہمارے اوپر کسی بھی طرح کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

بالآخر ہر ہندوستانی کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ان قوانین کو چیلنج کرے اور ان کی خلاف ورزی کرے۔ انگریزی عدالت' جو استحصال کا آلہ کار ہے' انصاف نہیں دے سکتی۔ خاص کر سیاسی حلقوں میں جہاں سرکار اور عوام کے مفاد ٹکراتے ہیں۔ ہم

جانتے ہیں کہ یہ عدالتیں سوائے انصاف کا ڈھکوسلہ کرنے کے اور کچھ نہیں کرتی ہیں۔

انہیں اسباب سے ہم اس میں حصہ دار بننے سے انکار کرتے ہیں اور ہم اس مقدمہ کی کارروائی میں حصہ نہیں لیں گے۔

1۔ بھگت سنگھ'2۔ جتندر ناتھ سانیال'3۔ مہاویر سنگھ'4۔ بٹوکیشور دت'5۔ گیا پرساد اور 6 کندن لال۔

5-5-30

جج نے نوٹ کیا۔ یہ ریکارڈ میں تو رکھا جائے لیکن اس کی کاپی نہ دی جائے کیوں کہ اس میں کچھ نازیبا باتیں درج کی گئی ہیں۔

خصوصی ٹربیونل کی تشکیل نو پر

یکم مئی 1930 کو آرڈی نینس کے ذریعہ قائم کردہ ٹربیونل کے ممبر تھے جسٹس جے کولڈ اسٹریم (صدر)' جسٹس آغا حیدر اور جسٹس جی سی ہلٹن۔5 مئی کو کارروائی شروع ہوئی۔ پونچھ ہاؤس کو عدالت بنایا گیا۔ انقلابی نوجوان عدالت میں انقلابی گیت گاتے اور انقلابی نعرے لگاتے آتے۔ بھگت سنگھ نے مطالبہ کیا کہ انہیں پندرہ دن کا وقت دیا جائے تا کہ وہ ٹربیونل کے غیر قانونی ہونے سے متعلق دلائل پیش کرسکیں۔ لیکن یہ مطالبہ مسترد کردیا گیا۔24 انقلابیوں کے نام مقدمہ کے لئے گئے' جن میں سے سولہ پر مقدمہ چلایا گیا۔ بعد میں بٹوکیشور دت کے خلاف کیس واپس لے لیا گیا۔ جن پر مقدمہ شروع کیا گیا' وہ تھے سکھ دیو' بھگت سنگھ' کشوری لال' دیس راج' پریم دت' جے دیو کپور' شو ورما' مہاویر سنگھ' جتیندر ناتھ داس' اجے کمار تیواری۔ بھگت سنگھ اور ان کے متعدد ساتھیوں نے وکیل کرنے سے انکار کردیا۔12 مئی 1930 کو بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو ہتھ کڑیوں سمیت عدالت میں لایا گیا۔ ہتھ کڑیاں نہ کھولنے کی مخالفت میں انہوں نے بس سے اترنے سے انکار کردیا۔ ٹربیونل کے صدر نے انہیں زبردستی اتارنے کا حکم دیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے عدالت کا بائیکاٹ کردیا۔ اگرچہ ان لوگوں کی ہتھ کڑیاں دوپہر کے کھانے کے لئے کھولی گئیں لیکن کھانے کے بعد پھر ہتھ کڑی لگانے کا حکم دیا گیا' جس کی بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے مخالفت کی۔ صدر نے ہندوستانیوں کو گالی دیتے ہوئے بھگت سنگھ کو لاٹھیوں سے مارنے کا حکم دیا۔

عدالت میں انقلابیوں' خاص کر بھگت سنگھ کو اخباری نمائندوں اور عوام کے سامنے لاٹھیوں اور جوتوں سے مارا گیا۔ بھگت سنگھ نے ہندوستانیوں کو گالی دینے پر اعتراض کرتے ہوئے جسٹس آغا حیدر سے بھی ہندوستانی ہونے سے متعلق سوال کیا اور پوچھا کہ ایسی ذہنیت رکھنے والے جج انصاف کیسے کریں گے؟ جسٹس آغا حیدر نے اس دن کی کارروائی پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ اس واقعہ کی پوری دنیا میں تشہیر ہوئی۔ پورے ہندوستان میں یوم بھگت سنگھ' منایا گیا' جس کے نتیجہ میں جسٹس کولڈ اسٹریم کو طویل تعطیل پر جانا پڑا اور 21 جون کو ٹربیونل ازسرنو تشکیل دیا گیا۔ اب جسٹس جی سی ہلٹن کو صدر اور جسٹس جے کے ٹیپ اور جسٹس عبدالقادر کو ممبر بنایا گیا۔

اس پر بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت نے درج ذیل خط میں اپنے خیالات ظاہر کیے۔ -مدیر

25 جون 1930

کمشنر

خصوصی ٹریبونل

لاہور سازش کیس، لاہور

محترمی

جب کہ ٹریبونل کے دو ججوں کو ہٹا دیا گیا ہے یا وہ ہٹ گئے ہیں اور دو نئے جج ان کی جگہ پر مقرر کر دیئے گئے ہیں، اس لئے ہم اپنی وضاحت درج کرانا لازمی سمجھتے ہیں تاکہ ہم اپنا پہلو واضح کر سکیں اور کسی بھی طرح کے شبہات پیدا ہونے سے بچا جا سکے۔

12 مئی 1930 کو جج کولڈ اسٹریم نے جو کہ صدر بھی ہیں، ایک عدالتی حکم پاس کیا جس کے تحت ہمیں عدالت میں ہتھکڑیاں پہنانے کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کی تعمیل کے لئے پولیس کو طاقت کے استعمال کی اجازت بھی دی گئی۔

اس اچانک اور غیر معمولی حکم کے اسباب جاننے کے لئے ہم نے اس عدالت سے درخواست کی تھی، جسے سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ایسے حالات میں پولیس ہمیں جبراً ہتھکڑیاں لگا کر واپس جیل لے آئی۔ اگلے روز تین میں سے ایک جج آغا حیدر نے صدر کے اس حکم سے اپنے کو علاحدہ کر لیا۔ اس دن سے ہم عدالت میں نہیں پیش ہو رہے ہیں۔

جن شرائط پر ہم عدالت میں پیش ہونے کے لئے تیار ہیں، وہ اگلے دن ہی عدالت کے سامنے رکھی گئی تھیں۔ شرائط تھیں کہ یا تو صدر معافی مانگیں یا پھر ان کا تبادلہ کر دیا جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان کی جگہ ایک ایسے جج کو بٹھا دیا جائے جو یہ حکم صادر کرنے میں شریک تھا۔

پانچ ہفتہ تک تو مجرموں کی شکایت کو قابل غور ہی نہیں سمجھا گیا۔

حالیہ ٹریبونل سازی میں دونوں صدور اور دوسرے جج جو ان سے متفق نہیں تھے، کا تبادلہ کر کے دو نئے جج لائے گئے۔ اس طرح ایک جج کو جو اس حکم کے اجرا میں شریک تھا کیوں کہ حکم اکثریت کی بنیاد پر دیا گیا تھا، ٹریبونل کا صدر بنایا گیا ہے۔ ایسی حالت میں ہم بہ بانگ دہل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جج کولڈ اسٹریم سے ذاتی طور پر ہمیں کوئی شکایت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی شکوہ۔ ہماری مخالفت تو جج کولڈ اسٹریم کی طرف سے پاس کیا گیا اکثریت کا حکم اور اس کے بعد ہمارے ساتھ ہوا برا سلوک تھا۔ جج کولڈ اسٹریم اور جج ہملٹن کا ہم احترام کرتے ہیں جیسا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا کرنا چاہئے۔ ہمارا غصہ ایک خاص حکم کے خلاف تھا، جس کے سبب ٹریبونل جو کہ اس حکم کے لئے ذمہ دار ہے، کے صدر سے معافی مانگنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ صدر کو ہٹا دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ اب جج ہملٹن، جو اس حکم میں شریک تھے، جج کولڈ اسٹریم کی جگہ پر صدارت کے منصب پر فائز ہیں۔ ہم تو محض یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ صورت حال نے زخم پر نمک چھڑکنے کا ہی کام کیا ہے۔

آپ کے

بھگت سنگھ، بی کے دت

25 جون 1930

(و) کچھ اور سیاسی خطوط

طلبا کے نام خط

بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت کی طرف سے ارسال کردہ یہ خط 19 اکتوبر 1929 کو پنجاب اسٹوڈنٹس یونین، لاہور کے دوسرے

اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔صدر جلسہ نیتاجی سبھاش چندر بوس تھے۔مدیر

اس وقت ہم نوجوانوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بم اور پستول اٹھائیں۔آج طالب علموں کے سامنے اس سے بھی زیادہ اہم کام ہے۔آئندہ لاہور اجلاس میں کانگریس ملک کی آزادی کے لئے زبردست لڑائی کا اعلان کرنے والی ہے۔قومی تاریخ کی اس کٹھن گھڑی میں نوجوانوں کے کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری آن پڑے گی۔یہ عام خیال ہے کہ آزادی کی اس لڑائی میں صف اول کے مورچوں پر طالب علموں نے موت سے ٹکر لی ہے۔کیا امتحان کی اس گھڑی میں وہ اسی قسم کے استحکام اور ایقان کے اظہار سے ہچکچائیں گے؟ نوجوانوں کو انقلاب کا یہ پیغام ملک کے گوشے گوشے میں پہنچانا ہے' فیکٹری کارخانوں کے میدان میں' گندی بستیوں اور گاؤں کی جھونپڑیوں میں رہنے والے کروڑوں لوگوں میں اس انقلاب کا صور پھونکنا ہے' جس سے آزادی آئے گی اور تب ایک انسان کا دوسرے انسان سے استحصال ناممکن ہو جائے گا۔پنجاب ویسے ہی سیاسی طور پر پچھڑا ہوا مانا جاتا ہے۔اس کی بھی ذمہ داری نوجوان طبقہ پر ہے۔آج ملک کے تئیں اپنی بے پناہ عقیدت اور شہید یتیندر ناتھ داس کے عظیم ایثار سے تحریک پا کر یہ ثابت کر دیں کہ آزادی کی اس جدوجہد میں وہ عزم محکم کے ساتھ ٹکر لے سکتے ہیں۔

(22 اکتوبر 1929 کے ٹریبیون (لاہور) میں شائع شدہ)

مدیر' ماڈرن ریویو کے نام خط

بھگت سنگھ نے اپنے خیالات کو واضح طور سے ہندوستانی عوام کے سامنے رکھا۔ان کے خیال میں انقلاب کی تلوار نظریات کی دھار سے ہی تیز ہوتی ہے۔یہ نظریات پر مبنی انقلاب کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔اپنے نظریات پر ہوئے تمام حملوں کا انہوں نے مدلل جواب دیا۔یہ حملے انگریز حکومت کی طرف سے کئے گئے یا ملکی لیڈروں کی طرف سے اخباروں میں۔

شہید یتیندر ناتھ داس 63 دن کی بھوک ہڑتال کے بعد شہید ہوئے۔ماڈرن ریویو کے مدیر راما نند چٹوپادھیائے نے ان کی شہادت کے بعد ہندوستانی عوام کے ذریعہ شہیدوں کے تئیں عقیدت اور ان کے 'انقلاب زندہ باد' کے نعروں کی مذمت کی۔بھگت سنگھ اور بی کے دت نے ماڈرن ریویو کے مدیر کو ان کے اداریہ کا درج ذیل جواب دیا تھا۔مدیر

انقلاب زندہ باد کیا ہے؟

مسٹر مدیر

ماڈرن ریویو

آپ نے اپنے خط کے دسمبر 1929 کے شمارہ میں ایک نکتہ چینی 'انقلاب زندہ باد' پر لکھی ہے اور اس نعرے کو فضول قرار دینے کی جرات کی ہے۔آپ جیسے پختہ کار دانشور' تجربہ کار اور مدیر کی تخلیق میں غلطی نکالنا اور اس کی مخالفت کرنا' جسے ہر ہندوستانی احترام کی نظر سے دیکھتا ہے' ہمارے لئے بہت بڑی جسارت ہو گی۔تو بھی اس سوال کا جواب دینا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس نعرے سے ہمارا کیا مقصد ہے؟ یہ

ضروری ہے کیوں کہ اس ملک میں اس وقت اس نعرے کو سب لوگوں تک پہنچانے کا کام ہمارے حصہ میں آیا ہے۔اس

نعرے کی تخلیق ہم نے نہیں کی ہے۔ یہ نعرہ روس کی انقلابی تحریک میں استعمال کیا گیا ہے۔ مشہور سوشلسٹ رائٹر اپٹن سنکلیئر نے اپنے ناولوں 'بوسٹن' اور 'آئل' میں یہی نعرہ نزاجیت برپا کرنے والے انقلابیوں کی زبان سے ادا کرایا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مسلح جدوجہد جاری رہے اور کوئی بھی نظام قلیل مدت کے لئے قائم نہ رہ سکے۔ دوسرے لفظوں میں ملک اور سماج میں نزاجیت پھیلی رہے۔

زمانہ قدیم سے مستعمل ہونے کے سبب اس نعرہ کو ایسا خصوصی درجہ حاصل ہو چکا ہے، جو ممکن ہے لسانی قواعد اور نحو کی بنیاد پر اس کے لفظوں سے مناسب اور منطقی طور پر ثابت نہ ہو پائے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نعرہ سے ان نظریات کو دبایا نہیں جاسکتا جو اس سے وابستہ ہیں۔ ایسے سبھی نعرے ایک خاص مطلب کے غماز ہیں جو کسی حد تک ان میں پیدا ہو گئے ہیں اور ایک حد تک ان میں پوشیدہ بھی ہیں۔

مثال کے طور پر، ہم یتیندر ناتھ زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے عظیم اصولوں اور اس بے پناہ جوش اور ولولے کو ہمیشہ کے لئے برقرار رکھیں، جس نے اس عظیم شہید کو اس اصول کے لئے ناقابل بیان مصیبت جھیلنے اور لامحدود قربانی پیش کرنے کی تحریک دی۔ یہ نعرہ لگانے سے ہمارے اس عزم کا اظہار ہوتا ہے کہ ہم بھی اپنے اصولوں کے لئے اسی طرح کے عزم کو اپنائیں۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی ہم تعریف کرتے ہیں۔ اس طرح ہمیں لفظ 'انقلاب' کا مطلب بھی کورے لفظوں میں نہیں نکالنا چاہئے۔ اس لفظ کا مناسب اور صحیح استعمال کرنے والے لوگوں کے مفاد کی بنیاد پر اس کے ساتھ مختلف مطالب اور مختلف خصوصیات جوڑی جاتی ہیں۔ انقلابیوں کی نظر میں یہ ایک پاکیزہ اور متبرک جملہ ہے۔ ہم نے اس بات کو ٹربیونل کے سامنے اپنے بیان میں واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس بیان میں ہم نے کہا تھا کہ کرانتی (انقلاب) کا مطلب لازمی طور پر مسلح تحریک نہیں۔ بم اور پستول کبھی کبھی انقلاب کو کامیاب بنانے کے محض وسائل ہو سکتے ہیں۔ اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ کچھ تحریکات میں بم اور پستول ایک اہم وسیلہ ثابت ہوئے ہیں لیکن محض اسی سبب سے بم اور پستول انقلاب کے مترادف نہیں ہو جاتے۔ بغاوت کو انقلاب نہیں کہا جاسکتا۔ حالاں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ بغاوت کا حتمی نتیجہ انقلاب ہو۔

اس جملہ میں لفظ 'کرانتی' کا مطلب ہے ترقی کے لئے تبدیلی کا جذبہ اور آرزو۔ عام طور پر لوگ روایتوں سے چپک جاتے ہیں اور صرف تبدیلی کے تصور سے ہی کانپنے لگتے ہیں۔ یہ نکماپن بھرا ایک منفی جذبہ ہے، جس کی جگہ انقلابی جذبہ بیدار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر کہا جاسکتا ہے کہ منفی ماحول بن جاتا ہے اور قدامت پرست طاقتیں سماج کو غلط راستے پر لے جاتی ہیں۔ یہ حالات انسانی سماج کے ارتقاء میں تعطل کا سبب بن جاتے ہیں۔

انقلاب کے اس جذبہ سے نسل انسانی کی روح مستقل طور پر دھڑکتی رہنی چاہئے، جس سے قدامت پرست طاقتیں انسانی سماج کے ارتقاء کی دوڑ میں روکاوٹ پیدا کرنے کے لئے منظم نہ ہو سکیں۔ یہ ضروری ہے کہ قدیم نظام ہمیشہ نہ رہے اور وہ نئے نظام کے لئے جگہ خالی کرتا رہے، جس سے کہ ایک اصولی نظام دنیا کو بگڑنے سے روک سکے۔ یہ ہے ہمارا منشا جس کو دل میں رکھ کر ہم 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

بھگت سنگھ، بی کے دت

22 دسمبر 1929

بھوک ہڑتال کے دوران سکھدیو کو ایک اور خط

1929

بھوک ہڑتال شروع ہونے کے بعد ہندوستانی عوام کے ذہنوں میں بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت جاگزیں ہوگئے۔ بھگت سنگھ کے لفظوں میں 'ہمارا مصیبت جھیلنا ثمر آور ثابت ہوا۔ پورے ملک میں ایک تحریک چھڑ گئی۔ ہم اپنے نصب العین میں کامیاب رہے۔ 13 ستمبر 1929 کو یتیندر ناتھ داس 63 دن کی بھوک ہڑتال کے بعد شہید ہوگئے۔ جب ان کا جسد خاکی لاہور سے کلکتہ لے جایا جا رہا تھا تو ہر بڑے شہر کے اسٹیشن پر لاکھوں کی بھیڑ ان کے آخری دیدار کے لئے امڈ پڑتی تھی۔ کلکتہ میں چار لاکھ لوگ ان کی آخری رسومات میں شامل ہوئے۔

ان دنوں بھگت سنگھ اپنے کن خیالات کے توسط سے اپنی ساری لڑائی لڑ رہے تھے' اس کا صحیح پتہ اس خط سے ملتا ہے' جو انہوں نے سکھدیو کے ساتھ جاری تبادلہ خیال کے پس منظر میں لکھا۔ افسوس ہے کہ سکھدیو کے جس خط کے جواب میں بھگت سنگھ نے یہ اہم خط لکھا تھا' وہ آج دستیاب نہیں ہے۔ پھر بھی زیر بحث آنے والے سبھی نکتے یہاں واضح ہیں۔ -مدیر

مصیبتوں سے فرار بزدلی ہے

برادر عزیز

میں نے آپ کے خط کو کئی بار بغور پڑھا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ بدلے ہوئے حالات نے ہم پر علاحدہ علاحدہ اثرات مرتب کئے ہیں۔ جن باتوں سے آپ جیل کے باہر نفرت کرتے تھے' وہ آپ کے لئے اب لازمی ہو چکی ہیں۔ اسی طرح میں جیل سے باہر جن باتوں کا خصوصی طور پر حامی تھا' وہ اب میرے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ مثال کے طور پر میں ذاتی محبت کا خاص طور پر قائل تھا لیکن اب اس جذبہ کی میرے دل و دماغ میں کوئی خاص جگہ نہیں ہے۔ باہر آپ اس کے سخت مخالف تھے لیکن اس تعلق سے اب آپ کے خیالات میں بھی تبدیلی بلکہ انقلاب آچکا ہے۔ آپ اسے حیات انسانی کا انتہائی ضروری اور لازمی جزو محسوس کرتے ہیں اور اس جذبہ سے آپ کو ایک طرح کا حظ بھی حاصل ہوا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک دن میں نے خودکشی کے بارے میں آپ سے ذکر کیا تھا۔ تب میں نے آپ کو بتایا تھا کہ کئی حالتوں میں خودکشی ہی موزوں ہو سکتی ہے۔ لیکن آپ نے میرے نظریہ کی مخالفت کی تھی۔ مجھے اس ذکر کا وقت اور جگہ بھی اچھی طرح یاد ہے۔ ہماری یہ بات شہنشاہی کٹیا میں شام کے وقت ہوئی تھی۔ آپ نے از راہ مذاق مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ اس قسم کی بزدلانہ حرکت کو کبھی بھی جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ آپ نے کہا تھا کہ اس طرح کا کام بھیانک اور قابل نفرت ہے' لیکن اس موضوع پر بھی میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی رائے بالکل بدل چکی ہے۔ اب آپ اسے چند شکلوں میں نہ صرف مناسب بلکہ لازمی اور ضروری تجربہ کہتے ہیں۔ میری اس بارے میں اب بھی وہی رائے ہے جو پہلے آپ کی تھی یعنی خودکشی ایک قابل نفرت جرم ہے' یہ مکمل طور پر بزدلی کا کام ہے۔ انقلابیوں کا تو کہنا ہی کیا' کوئی بھی شخص ایسے کام کو مناسب نہیں قرار دے سکتا۔

آپ کہتے ہیں کہ آپ یہ نہیں سمجھ سکے کہ محض مصیبت جھیلنے سے آپ اپنے ملک کی خدمت کس طرح کر سکتے ہیں۔ آپ جیسے شخص کی طرف سے ایسا سوال کرنا بڑے تعجب کی بات ہے کیوں کہ نوجوان بھارت سبھا کے مقاصد خدمت کر کے تکالیف برداشت کرنا اور قربانی دینا' کو ہم نے سوچ سمجھ کر کس قدر گلے لگایا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ نے ممکنہ طور پر حتی

المقدور خدمت کی۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ جو کچھ آپ نے کیا ہے' اس کے لئے تکالیف برداشت کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہی وہ موقع ہے جب آپ کو عوام کی قیادت کرنی ہے۔

انسان کسی بھی کام کو جائز سمجھ کر ہی کرتا ہے جیسے کہ ہم نے لیجسلیٹو اسمبلی میں بم پھینکنے کا کام انجام دیا۔ اس عمل کو انجام دینے کے بعد اس کا نتیجہ اور اس کا ثمرہ حاصل کرنے کا نمبر آتا ہے۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ اگر ہم نے رحم کی درخواست کے ساتھ گڑگڑاتے ہوئے سزا سے بچنے کی کوشش کی ہوتی تو ہمارا یہ عمل جائز ہوتا؟ نہیں لوگوں پر منفی اثر ہوتا۔ اب ہم اپنے نصب العین میں حتمی طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔

قید ہوتے وقت ہماری تنظیم کے سیاسی قیدیوں کی حالت انتہائی قابل رحم تھی۔ ہم نے اس میں اصلاح کی کوشش شروع کر دی ہے۔ میں آپ کو پوری سنجیدگی سے بتاتا ہوں کہ ہمیں یہ یقین تھا کہ ہم بہت کم وقت کے اندر مر جائیں گے۔ ہمیں بھوک کی حالت میں مصنوعی طریقہ سے کھانا دیئے جانے کا نہ تو علم ہی تھا نہ ہمیں یہ خیال آیا تھا۔ ہم تو موت کی آغوش میں پناہ لینے کے لئے تیار تھے۔ کیا آپ کا یہ مقصد ہے کہ ہم خودکشی کرنا چاہتے تھے؟ نہیں مجاہد ہونا اور اعلیٰ اصولوں کے لئے زندگی داؤ پر لگا دینا خودکشی نہیں کہی جا سکتی۔ ہمارے دوست (مسٹر یتیندر ناتھ داس) کی موت تو قابل تعریف ہے۔ کیا آپ اسے خودکشی کہیں گے؟ ہمارا مصیبت جھیلنا سودمند ثابت ہوا۔ پورے ملک میں ایک بڑی عظیم الشان تحریک شروع ہو گئی۔ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح جدوجہد کی خاطر مر جانا ایک آئیڈیل موت ہے۔

علاوہ ازیں ہم میں سے جن لوگوں کو یہ یقین ہے کہ ان کو سزائے موت دی جائے گی' ان کو پوری حوصلہ مندی کے ساتھ اس دن کا انتظار کرنا چاہئے جب یہ سزا سنائی جائے گی، بعد ازاں انہیں پھانسی دے دی جائے گی۔ یہ موت بھی حسین ہو گی لیکن خودکشی کرنا صرف تھوڑے مصائب سے بچنے کے لئے اپنی زندگی کو ختم کر دینا تو بزدلی ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مصیبتیں انسان کو استحکام بخشتی ہیں۔ میں اور آپ بلکہ میں کہوں گا کہ ہم میں سے کسی نے بھی بالکل تکلیف برداشت نہیں کی ہے۔ ہماری زندگی کا یہ حصہ تو ابھی شروع ہوا ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ متعدد بار اس موضوع پر ہم نے بات چیت کی ہے کہ روسی ادب میں ہر مقام پر جو حقیقت جھلکتی ہے' وہ ہمارے ادب میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ہم ان کی کہانیوں میں تکالیف اور دکھ بھرے حالات کو بہت پسند کرتے ہیں لیکن تکلیف برداشت کرنے کے جذبہ کو اپنے اندر محسوس نہیں کرتے۔ ہم ان کے جنون اور کردار کی غیر معمولی عظمت کے معترف ہیں لیکن اس کے اسباب پر غور و فکر کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ میں کہوں گا کہ صرف مصیبتیں جھیلنے کے ادب کے ذکر نے ہی ان کہانیوں میں رحم اور درد کی گہری کسک اور ان کے کیریکٹر اور ادب کو رفعت بخشی ہے۔ ہماری حالت اس وقت قابل رحم اور لاچار ہو جاتی ہے جب ہم اپنی زندگی میں بلاوجہ ہی تجسس داخل کر لیتے ہیں۔ اگرچہ اس کی کوئی قدرتی یا ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی۔ ہمارے جیسے لوگوں کو جو ہر نظریہ سے انقلابی ہونے پر نازاں ہیں' ہمیشہ ہر طرح سے ان مصائب' فکر' دکھوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے' جن کو ہم خود کے شروع کردہ جدوجہد کے ذریعہ مدعو کرتے ہیں اور جن کے سبب ہم اپنے آپ کو انقلابی کہتے ہیں۔

میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جیلوں میں اور صرف جیلوں میں ہی کوئی فرد جرم اور گناہ جیسے بڑے سماجی موضوعات کے مطالعہ کا موقع پا سکتا ہے۔ میں نے اس موضوع پر کچھ ادب کا مطالعہ کیا ہے اور جیلیں ہی ایسے موضوعات کے مطالعہ کے لئے سب سے زیادہ موزوں جگہ ہیں۔ مطالعہ کا عظیم حصہ ہے خود مصیبتوں کو جھیلنا۔

آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ روس میں سیاسی قیدیوں کا قید خانہ میں مصیبتیں برداشت کرنا ہی زار شاہی کا تختہ پلٹنے کے بعد ان کے ذریعہ جیلوں کے نظام میں انقلاب لائے جانے کا سب سے بڑا سبب تھا۔ کیا ہندوستان کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے جو اس موضوع سے مکمل طور پر واقف ہوں اور اس مسئلہ کا ذاتی تجربہ رکھتے ہوں۔ محض یہ کہہ دینا کہ دوسرا کوئی اس کام کو کرلے گا یا اس کام کو کرنے کے لئے بہت لوگ ہیں' کسی طرح بھی مناسب نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح جو لوگ انقلابی شعبوں کے کاموں کا بار دوسرے لوگوں پر لادنا غیر پسندیدہ اور قابل نفرت سمجھتے ہیں' انہیں پوری لگن کے ساتھ موجودہ حالت کے خلاف جدو جہد شروع کر دینی چاہئے۔ انہیں چاہئے کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کریں لیکن انہیں اس کی معنویت پر توجہ دینی چاہئے کیوں کہ غیر ضروری اور غیر موزوں کوششوں کو کبھی بھی انصاف نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح کا آندولن انقلاب کی مدت کو بہت حد تک کم کر دے گا۔ جتنی تحریکیں اب تک شروع ہوئی ہیں' ان سب سے الگ تھلگ رہنے کے لئے آپ جو دلیل دیتے ہیں' میں انہیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کچھ دوست ایسے ہیں' جو یا تو بے وقوف ہیں یا نا سمجھ۔ وہ آپ کے اس برتاؤ کو (جسے وہ خود کہتے ہیں کہ ہم بالکل بھی نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ آپ ان سے بہت اونچے اور ان کی سمجھ سے پرے ہیں) انوکھا اور حیرت انگیز سمجھتے ہیں۔

درحقیقت اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ قید خانہ کی زندگی واقعی ذلت آمیز ہے تو آپ اس کے خلاف تحریک چلا کر اسے سدھارنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ ممکنہ طور پر آپ یہ کہیں گے کہ یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن یہ تو وہی دلیل ہے' جس کی آڑ لے کر عام طور پر کمزور لوگ ہر تحریک سے دامن بچانا چاہتے ہیں۔ یہ وہ جواب ہے جسے ہم ان لوگوں سے سنتے رہے ہیں جو جیل سے باہر انقلابی کوششوں میں شمولیت سے جان بچانا چاہتے تھے۔ کیا آج یہی جواب میں آپ کے منہ سے سنوں گا؟ کچھ مٹھی بھر کارکنوں کے دم پر تشکیل شدہ ہماری پارٹی اپنے مقاصد اور اصولوں کے مقابلے میں کیا کر سکتی تھی؟ کیا ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ ہم نے اس کام کے شروع کرنے میں بڑی بھول کی ہے؟ نہیں' اس طرح کا نتیجہ نکالنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس سے تو اس شخص کی داخلی کمزوری ظاہر ہوتی ہے جو اس طرح سوچتے ہیں۔

آگے چل کر آپ لکھتے ہیں کہ چودہ سال تک قید خانہ کے مصائب سے بھرپور زندگی بسر کرنے کے بعد کسی شخص سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس وقت بھی اس کے وہی خیالات ہوں' جو جیل جانے سے قبل تھے کیوں کہ جیل کا ماحول اس کے مکمل خیالات کو روند کر رکھ دے گا۔ کیا میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں کہ کیا جیل سے باہر کا ماحول ہمارے نظریات کے موافق تھا؟ پھر بھی ناکامی کے سبب کیا ہم اسے چھوڑ سکتے تھے؟ کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ اگر اس میدان میں نہ اترے ہوتے تو کوئی بھی انقلابی کام کبھی بھی نہیں ہوا ہوتا؟ اگر ایسا ہے تو آپ غلطی کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم بھی ماحول کو بدلنے میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوئے ہیں پھر بھی ہم تو محض اپنے وقت کی آواز ہیں۔

میں تو یہ بھی کہوں گا کہ اشتراکیت کا بانی مارکس حقیقت میں اس کا نظریہ ساز نہیں تھا۔ درحقیقت یوروپ کے صنعتی انقلاب نے ہی ایک خاص طرح کے خیالات کے حامل افراد پیدا کئے۔ ان میں مارکس بھی ایک تھا۔ ہاں اپنی جگہ پر مارکس بھی بلاشبہ کچھ حد تک گردش دوراں کو ایک خاص طرح سے رفتار عطا کرنے میں ضرور معاون ثابت ہوا۔

میں نے (اور آپ نے بھی) اس ملک میں سوشلزم اور اشتراکیت کی نظریہ سازی نہیں کی۔ ورنہ یہ تو ہمارے اوپر ہمارے وقت اور حالات کے اثر کا نتیجہ ہے۔ بلاشبہ ہم نے ان نظریات کی تشہیر کے لئے چند معمولی کام ضرور کئے ہیں' اس لیے میں کہتا ہوں کہ جب ہم نے اس طرح ایک اور مشکل کام کو ہاتھ میں لے ہی لیا ہے تو ہمیں اسے جاری رکھنا چاہئے اور آگے

بڑھنا چاہئے۔ مصیبتوں سے بچنے کے لئے خودکشی کر لینے سے عوام کی رہنمائی نہیں ہوگی بلکہ یہ تو ایک ری ایکشنری عمل ہوگا۔

جیل کے قوانین کے مطابق زندگی کی نا امیدیوں، دباؤ اور تشدد کے آزمائشی ماحول کی مخالفت کرتے ہوئے ہم کام کرتے رہے۔ جس وقت ہم اپنا کام کرتے تھے، اس وقت متعدد طریقوں سے ہمیں نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جو لوگ اپنے آپ کو عظیم انقلابی کہلانے کا فخریہ احساس رکھتے تھے، وہ بھی ہم کو چھوڑ گئے۔ کیا یہ حالات لامحدود آزمائش سے پر نہیں تھے؟ پھر اپنی تحریک اور کوششوں کو جاری رکھنے کے لئے ہمارے پاس کیا اسباب اور دلائل تھے؟

کیا خود یہی دلیل ہمارے نظریات کو تقویت نہیں بخشتی ہے؟ اور کیا ایسے انقلابی کارکنوں کی مثالیں ہمارے سامنے نہیں ہیں، جو جیل سے سزا پوری کر کے لوٹے اور اب بھی کام میں لگے ہیں؟ اگر بکونن نے آپ کی طرح غور و فکر کیا ہوتا تو وہ ابتدا میں ہی خودکشی کر لیتا۔ آج آپ کو لاتعداد انقلابی دکھائی دیتے ہیں، جو روسی مملکت میں ذمہ دار عہدوں پر براجمان ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ سزا کاٹتے ہوئے جیلوں میں گزارا ہے۔ انسان کو اپنے اعتماد پر اولوالعزمی کے ساتھ ثابت قدم رہنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مستقبل میں کیا وقوع پذیر ہونے والا ہے۔

کیا آپ کو یاد ہے کہ جب ہم اس موضوع پر بات چیت کر رہے تھے کہ ہماری بم فیکٹریوں میں بہت تیز اور اثر دار زہر بھی رکھا جانا چاہئے تو آپ نے پوری شدت سے اس کی مخالفت کی تھی۔ آپ اس نظریہ سے ہی نفرت کرتے تھے۔ آپ کو اس پر اعتماد نہیں تھا۔ پھر اب کیا ہوا؟ یہاں تو ایسے نا موافق اور پیچیدہ حالات بھی نہیں ہیں۔ مجھے تو اس سوال پر غور کرنے سے ہی نفرت ہوتی ہے۔ آپ کو اس ذہنیت سے ہی نفرت تھی جو خودکشی کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ آپ مجھے یہ کہنے کے لئے معاف کریں کہ اگر آپ نے اپنے قیدی بنائے جانے کے وقت ہی ان نظریات کے مطابق کام کیا ہوتا (یعنی آپ نے زہر کھا کر اس وقت خودکشی کر لی ہوتی) تو آپ نے انقلابی عمل کی بہت بڑی خدمت کی ہوتی۔ لیکن اس وقت تو اس عمل کے بارے میں سوچنا بھی ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔

ایک اور خاص بات، جس پر میں آپ کی توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ ہم لوگ خدا، پنر جنم، جنت دوزخ اور حساب کتاب یعنی خدا کے ذریعہ اعمال کا حساب کتاب وغیرہ میں کوئی یقین نہیں رکھتے، لہٰذا ہمیں زندگی اور موت کے بارے میں بھی اسی طرز پر سوچنا چاہئے۔ ایک دن جب میری شناخت کے لئے کسی شخص کو دہلی سے یہاں لایا گیا تھا تو خفیہ محکمہ کے چند حکام نے میرے والد کی موجودگی میں مجھ سے اس بارے میں بات چیت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں کوئی راز افشا کرنے اور اس طرح زندگی بچانے کے لئے تیار نہیں ہوں، اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ میں زندگی سے بہت رنجیدہ ہوں۔ ان کی دلیل تھی کہ میری یہ موت تو خودکشی کے برابر ہوگی، لیکن میں نے ان کو جواب دیا کہ میرے جیسا یقین اور نظریہ رکھنے والا شخص خواہ مخواہ یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ہم تو اپنی زندگی کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ ہم انسانیت کی ہر ممکن زیادہ سے زیادہ خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ خاص کر میرے جیسا بھلا انسان، جس کی زندگی کسی بھی طور پر دکھ یا تفکرات سے نہیں گھری ہے، کسی وقت بھی خودکشی کرنا تو دور، اس کا خیال بھی دل میں لانا اچھا نہیں سمجھتا۔ وہی بات میں اس وقت آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔

امید ہے کہ آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ میں اپنے بارے میں کیا سوچتا ہوں۔ مجھے اپنے لئے سزائے موت سنائے جانے کا پختہ یقین ہے۔ مجھے کسی طرح کی معافی یا نرم برتاؤ کی بالکل امید نہیں ہے۔ اگر کوئی معافی ہوئی بھی تو سب کے لئے نہیں ہوگی بلکہ وہ بھی ہمارے علاوہ دیگر لوگوں کے لئے انتہائی محدود اور متعدد شرائط سے مشروط ہوگی۔

ہمارے لئے نہ تو معافی ہوسکتی ہے اور نہ وہ ہوگی ہی۔ اس پر بھی میری خواہش ہے کہ ہماری نجات کی تجویز مشترکہ طور سے اور عالمی پیمانے پر ہو اور اس کے ساتھ ہی میری دلی آرزو یہ ہے کہ جب یہ تحریک اپنے عروج پر پہنچے تو ہمیں پھانسی دے دی جائے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اگر کوئی قابل احترام اور مناسب معاہدہ ہونا کبھی بھی ممکن ہوجائے تو ہمارے جیسے لوگوں کا معاملہ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ یا مشکلات پیدا کرنے کا سبب نہ بنے۔ جب ملک کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہو تو لوگوں کی قسمت کو پوری طرح فراموش کر دینا چاہئے۔ ہم انقلابی ہونے کے ناطے ماضی کے سبھی تجربات سے مکمل طور پر واقف ہیں۔ اس لئے ہم نہیں مان سکتے کہ ہمارے حکمرانوں اور خاص کر انگریزوں کے جذبات میں اس طرح کی تعجب خیز تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی تبدیلی انقلاب کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ انقلاب تو محض اچھے کام کرنے سے' کوششوں سے' مصیبت برداشت کرنے اور قربانیوں سے ہی لایا جاسکتا ہے اور لایا جائے گا۔

جہاں تک میرے نظریہ کا تعلق ہے' میں تو محض اسی صورت میں سب کے لئے سہولیات اور معافی کا خیر مقدم کرتا ہوں جب اس کا اثر دیرپا ہو اور ملک کے لوگوں کے دلوں پر ہماری پھانسی سے کچھ انمٹ نقوش ثبت ہو جائیں۔ بس یہی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

والد کے نام خط

30 ستمبر 1930 کو بھگت سنگھ کے والد سردار کشن سنگھ نے ٹریبونل کو ایک عرضی دے کر بچاؤ کرنے کا موقع مانگا۔ سردار کشن سنگھ خود محب وطن تھے اور ملکی تحریکات میں جیل جاتے رہتے تھے۔ انہیں اور کچھ دیگر محبان وطن کو لگتا تھا کہ بچاؤ پہلو پیش کر کے بھگت سنگھ کو پھانسی کے پھندے سے بچایا جاسکتا ہے لیکن بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی بالکل علاحدہ پالیسی پر چل رہے تھے۔ ان کے مطابق برطانوی سرکار انتقام لینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے اور انصاف صرف ڈھکوسلہ ہے۔ انہیں کسی بھی طریقہ سے سزا دینے سے روکا نہیں جاسکتا۔ انہیں لگتا تھا کہ اگر اس معاملہ میں کمزوری ظاہر کی گئی تو عوام میں پیدا شدہ انقلاب کی کونپلیں پھوٹ نہیں پائیں گی۔ والد کے ذریعہ دی گئی عرضی سے بھگت سنگھ کے جذبات پر آنچ بھی آئی تھی لیکن اپنے جذبات کو کنٹرول کر کے اپنے اصولوں پر زور دیتے ہوئے انہوں نے 4 اکتوبر 1930 کو یہ خط لکھا' جو ان کے والد کو تاخیر سے ملا۔ 7 اکتوبر 1930 کو مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

سیاسی معاملات کی پیروی کیسے کی جائے' اس کا ذکر بھگت سنگھ نے ایک دیگر خط میں بھی کیا ہے' جسے گزشتہ صفحات پر درج کر دیا گیا ہے۔۔مدیر

4 اکتوبر 1930

محترم والد صاحب

مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ میرے بچاؤ کے لئے اسپیشل ٹریبونل کو آپ نے ایک درخواست بھیجی ہے۔ یہ خبر اتنی تکلیف دہ تھی کہ میں اسے خاموشی کے ساتھ برداشت نہیں کر سکا۔ اس خبر نے میرے اندر ہیجان برپا کر دیا ہے۔ میں یہ نہیں سمجھ سکتا ہوں کہ موجودہ صورت حال میں اس معاملے پر آپ کس طرح کی درخواست دے سکتے ہیں؟

آپ کا بیٹا ہونے کے ناطے آپ کے پدرانہ جذبات اور آرزوؤں کا میں پوری طرح احترام کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے صلاح مشورہ کئے بغیر ایسی درخواست دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ آپ جانتے تھے کہ

سیاسی حلقوں میں میرے نظریات آپ سے کافی مختلف ہیں۔ میں آپ سے اتفاق یا عدم اتفاق کئے بغیر ہمیشہ آزادی سے کام کرتا رہا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کو یہ بات یاد ہوگی کہ آپ شروع سے مجھ سے یہ بات منوانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ میں اپنا مقدمہ سنجیدگی سے لڑوں اور اپنا بچاؤ اچھی طرح پیش کروں لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں ہمیشہ اس کی مخالفت کرتا رہا ہوں۔ میں نے کبھی بھی اپنا بچاؤ کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی اور نہ ہی میں نے کبھی اس پر سنجیدگی سے غور کیا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہم ایک لازمی پالیسی کے مطابق مقدمہ لڑ رہے ہیں۔ میرا ہر قدم اس پالیسی، میرے اصولوں اور ہمارے پروگرام کے مطابق ہونا چاہئے۔ آج حالات بالکل مختلف ہیں۔ لیکن صورت حال اگر اس سے کچھ اور بھی الگ ہوتی تو بھی میں آخری آدمی ہوتا جو بچاؤ پیش کرتا۔ اس پورے مقدمہ میں میرے سامنے ایک ہی نظریہ تھا اور وہ یہ کہ ہمارے خلاف جو سنگین الزامات لگائے گئے ہیں، باوجود اس کے ہم مکمل طور پر اس سلسلہ میں حکم عدولی کا رویہ اختیار کریں۔ میرا نظریہ یہ رہا ہے کہ کسی بھی سیاسی کارکن کو ایسی حالت میں حوصلہ دکھانا چاہئے۔ اس پورے مقدمہ کے دوران ہمارا منصوبہ اس اصول کے مطابق ہی رہا ہے۔ ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے یا نہیں، یہ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں۔ ہم خود غرضی ترک کر کے اپنا کام کر رہے ہیں۔

وائسرائے نے لاہور سازش کیس آرڈی ننس جاری کرتے ہوئے اس کے ساتھ جو بیان دیا تھا، اس میں انہوں نے کہا تھا کہ اس سازش کے مجرم پرامن ماحول کو غارت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے جو حالات پیدا ہوئے، اس نے ہمیں یہ موقع دیا کہ ہم عوام کے سامنے یہ بات پیش کریں کہ وہ خود دیکھ لیں کہ پرامن ماحول اور قانون ختم کرنے کی کوشش ہم کر رہے ہیں یا ہمارے مخالفین؟ اس بات پر اختلاف ہو سکتا ہے۔ شاید آپ بھی ان میں سے ایک ہو جائیں جو اس بات سے اختلاف کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھ سے صلاح کئے بغیر میری طرف سے ایسے اقدامات کریں۔ میری زندگی اتنی قیمتی نہیں، جتنی کہ آپ سوچتے ہیں۔ کم سے کم میرے لئے تو اس زندگی کی اتنی قیمت نہیں کہ اسے اصولوں پر قربان کر کے بچایا جائے۔ میرے علاوہ میرے اور ساتھی بھی ہیں جن کے مقدمے اتنے سنگین ہیں جتنا کہ میرا مقدمہ۔ ہم نے ایک مشترکہ منصوبہ بنایا ہے اور اس منصوبہ پر ہم آخری وقت تک ڈٹے رہیں گے۔ ہمیں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ ہمیں ذاتی طور پر اس بات کے لئے کتنی قیمت چکانی پڑے گی۔

والد صاحب، میں بہت رنج محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ آپ پر غصہ کرتے ہوئے یا اس سے بڑھ کر آپ کے اس کام کی مذمت کرتے ہوئے میں کہیں تہذیب کی حدیں نہ پار کر جاؤں اور میرے لفظ زیادہ سخت نہ ہو جائیں۔ لیکن میں واضح لفظوں میں اپنی بات ضرور کہوں گا۔ اگر کوئی دوسرا شخص مجھ سے ایسا برتاؤ کرتا تو میں اسے غداری سے کم نہیں مانتا۔ لیکن آپ کے تعلق سے میں اتنا ہی کہوں گا کہ یہ ایک کمزوری ہے، ادنیٰ درجہ کی کمزوری۔

یہ ایک ایسا وقت تھا جب ہم سب کا امتحان ہو رہا تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اس امتحان میں ناکام رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ بھی اتنے ہی محب وطن ہیں جتنا کہ کوئی دوسرا شخص ہو سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے اپنی پوری زندگی ہندوستان کی آزادی کے لئے وقف کر دی ہے لیکن اس اہم موڑ پر آپ نے ایسی کمزوری دکھائی، یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔

آخر میں، میں آپ سے، آپ کے دیگر ساتھیوں اور میرے مقدمہ میں دلچسپی لینے والوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے اس قدم کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں آج بھی عدالت میں اپنا بچاؤ کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اگر عدالت ہمارے کچھ

ساتھیوں کی طرف سے وضاحت وغیرہ کے لئے پیش کی گئی درخواستوں کو منظور کر لیتی تو بھی میں کوئی وضاحت نہیں پیش کرتا۔

بھوک ہڑتال کے دنوں میں ٹریبونل کو جو درخواست میں نے دی تھی اور ان دنوں میں نے جو انٹرویو دیا تھا' اس کا غلط مطلب نکالا گیا ہے اور اخباروں میں یہ شائع کر دیا گیا کہ میں اپنی وضاحت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ حالاں کہ میں ہمیشہ وضاحت پیش کرنے کا مخالف رہا۔ آج بھی میرا وہی عقیدہ ہے جو اس وقت تھا۔

بوسٹرل جیل میں قید میرے ساتھی اس بات کو میری غداری اور بے اعتباری سے ہی تعبیر کر رہے ہوں گے۔ مجھے ان کے سامنے اپنی پوزیشن واضح کرنے کا موقع بھی نہیں مل سکتا۔

میں چاہوں گا کہ اس تعلق سے جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں' ان کے بارے میں عوام کو حقائق کا پتہ چل جائے۔ اس لئے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ جلد از جلد یہ خط شائع کرا دیں۔

آپ کا فرماں بردار
بھگت سنگھ

سیاسی معاملات کی پیروی پر

23 دسمبر 1930 کو پنجاب کے گورنر سر جیوفریڈی پر انقلابی نوجوان ہری کرشن نے گولی چلائی اور انہیں زخمی کر دیا۔ ہری کرشن پکڑا گیا اور اس پر کیس چلا۔ لیکن وکیل کی صلاح پر ہری کرشن جس طرح کیس کی پیروی کر رہا تھا' بھگت سنگھ اس کے طریقے سے متفق نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو جیل سے دو خط اس ضمن میں تحریر کئے' جن میں سے پہلا دستیاب نہیں ہے لیکن دوسرا خط جو کہ جون 1931 میں لاہور سے شائع ہونے والے 'پیوپلس' نامی انگریزی ہفتہ وار اخبار میں شائع ہوا تھا' نیچے نقل کیا جا رہا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ ہری کرشن کو 9 جون 1931 کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ -مدیر

1931

مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں میرا پہلا خط وقت پر منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکا اور اس لئے اس سے کوئی فائدہ نہ ہو سکا یا یہ کہ وہ اس مقصد کی تکمیل میں ناکام رہا' جس کے لئے وہ خط تحریر کیا گیا تھا۔ اس لئے میں عام طور پر یہ خط سیاسی مقدموں میں پیروی کے سوال کے بارے میں اور خاص طور پر انقلابی مقدمے کے بارے میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کے لئے تحریر کر رہا ہوں۔ پہلے خط میں پیش کئے گئے خاص نکتوں کے علاوہ اس کا ایک اور مقصد بھی ہوگا اور وہ یہ کہ میں مختلف حادثات سے گزر جانے کے بعد خود کو عقل مند نہیں ثابت کر رہا ہوں۔

خیر' میں نے اس خط میں یہ لکھا تھا کہ وکیل کی پیروی کے لئے وہ جو دلیلیں دے رہا تھا' انہیں تسلیم نہ کیا جائے لیکن آپ اور میری مخالفت کے باوجود انہیں منظور کر لیا گیا ہے۔

باوجود اس کے کہ ہم زیادہ وضاحت کے ساتھ اس بات پر اظہار خیال کر سکتے ہیں اور پیروی سے متعلق آئندہ پالیسی کے بارے میں حتمی رائے دے کر سکتے ہیں۔

آپ یہ جانتے ہیں کہ میں کبھی بھی سیاسی قیدیوں کے بچاؤ کی پیروی کرنے کا حامی نہیں رہا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جائز کوششیں ہی نہ کی جائیں۔ اس پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ لفظ جائز کوششوں' کا استعمال یہاں غیر حقیقی معنوں میں نہیں کیا گیا ہے اور اس کا مقصد سے واسطہ ہے' جس نے ایک خاص کارروائی کے لئے ہری کرشن کو متحرک کیا۔ جب میں یہ

جانتا ہوں کہ کبھی سیاسی قیدیوں کو اپنی پیروی خود کرنی چاہئے تو یہ کچھ خاص مقصد کے تحت کہتا ہوں۔ میرا مطلب صرف ایک بات سے واضح ہو سکتا ہے۔

کوئی انسان کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر کام نہیں کرتا۔ اس کی گرفتاری کے بعد اس کے کام کی سیاسی اہمیت ختم نہیں ہونی چاہئے اور کام کے مقابلے موت کی تیاری ہی زیادہ ضروری نہیں ہو جانی چاہئے۔ ہم اسے مثال دے کر یوں واضح کرتے ہیں۔ ہری کرشن گورنر کو گولی مارنے کے لئے آئے۔ میں اس کارروائی کا اخلاقی پہلو نہیں لینا چاہتا۔ میں صرف اس کیس کے سیاسی پہلو پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ گولی مارنے والا شخص گرفتار کر لیا گیا۔ بدقسمتی سے پولیس ملازم اس کارروائی میں مر گیا۔ اب پیروی کا سوال سامنے آتا ہے۔ جب گورنر بچ گیا تو ہری کرشن کے کیس میں بہت خوب صورت بیان آسکتا تھا۔ یعنی حقائق کا بیان' جیسا کہ ہمارے کیس میں نچلی عدالت میں دیا گیا تھا۔ اس طرح یہ قانونی مقصد کو بھی پورا کر دیتا ہے اور اس عمل کے مقصد کو بھی رفعت عطا کرتا ہے لیکن وکیل کی کوشش اور قابلیت سب انسپکٹر کی موت کے بارے میں دلیلیں دینے میں الجھی رہی۔ اسے یہ کہہ کر کیا ملا کہ ہری کرشن صرف گورنر کو زخمی کرنا چاہتا تھا' مارنا نہیں چاہتا تھا؟ اسی طرح کی دوسری باتیں تھیں۔ کیا کوئی سمجھ دار ایک لمحہ کے لئے بھی ایسی بات کی امید کر سکتا ہے؟ کیا اس دلیل کی کوئی قانونی حیثیت تھی؟ قطعی نہیں؟ تو پھر گورنر پر گولی چلانے کے خاص عمل کی ہی نہیں' بلکہ ساری انقلابی لہر کی معنویت ختم کرنے سے کیا فائدہ تھا؟

ردعمل اور جذبات زیادہ دیر تک نہیں ساتھ دے سکتے۔ انقلابی گروپوں کے ذریعہ سرکار کو کافی پہلے تنبیہہ کی جا چکی تھی۔ اس کے لئے انقلابی گروپوں کو ہندوستان میں حد درجہ عزت و احترام سے نوازا گیا تھا اور انقلاب کی لہر صحیح سمت میں جاری تھی۔ وائسرائے کی گاڑی پر بم پھینکنے کا عمل محض ایک وارننگ نہیں تھی' اگرچہ وہ ناکام رہی۔ چٹگاؤں کی وارداتیں محض وارننگ تھیں اور نہ صرف احتجاج۔ اسی طرح ہری کرشن کا عمل اپنے آپ میں انقلابی جدوجہد کا ایک حصہ تھا' وارننگ بالکل نہیں تھی۔ کارروائی کی ناکامی کے بعد ملزم اس چیز کو کھلاڑی کی طرح لے سکتا ہے۔ مقصد پورا نہ ہونے پر ممکن ہے خوش قسمت گورنر کے بچ جانے سے ہری کرشن خوش ہوا ہو۔ ذاتی طور پر کسی کو مارنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ان اعمال کی سیاسی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ سب ماحول اور سوچنے کے طریقہ میں معاون ہوتے ہیں جو کہ فیصلہ کن جدوجہد کے لئے بہت ضروری ہے۔ اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ ذاتی عمل لوگوں کی ہمدردی جیتنے کے لئے ہوتے ہیں۔ ہم کبھی کبھی ان کو اپنے اعمال کے ذریعہ پروپیگنڈہ کا نام دے دیتے ہیں۔

اس فکر کی روشنی میں انقلابی مقدمے کی پیروی کرنی چاہئے۔ یہ عام فہم قانون ہے کہ جدوجہد میں شامل سبھی پارٹیاں کم کھو کر زیادہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ کوئی بھی جنرل ایسی جنگی حکمت عملی نہیں اپنا سکتا' جس سے اسے طے شدہ فوائد سے زیادہ قربانی دینی پڑے۔ مجھ سے زیادہ کوئی بھی ہری کرشن کی قیمتی زندگی کو بچانے کے لئے بے تاب نہیں ہو گا لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جو چیز اس کی زندگی کو انمول بناتی ہے' اسے آنکھ سے اوجھل نہیں کرنا چاہئے۔ کسی بھی قیمت پر زندگی کو بچانا ہی ہماری پالیسی نہیں ہے۔ یہ کانگریس کی پالیسی ہو سکتی ہے' یہ آرام کرسی والے سیاست دانوں کی پالیسی ہو سکتی ہے لیکن یہ ہماری پالیسی نہیں ہے۔ بچاؤ پالیسی (ڈیفنس پالیسی) زیادہ تر ملزم کے اپنے سوچنے کے طریقے پر مبنی ہوتی ہے۔ لیکن اگر ملزم نہ صرف نڈر ہو بلکہ ہمیشہ کی طرح جو شیلے بھی' تو جس کام کے لئے اس نے اپنی زندگی کا داؤ پر لگائی ہے' اسے بیان میں پہلے درج کیا جانا چاہئے اور ذاتی مسئلوں کو بعد میں۔ اس کے بعد بھی ایک طرح کی کشمکش ہو سکتی ہے کیوں کہ کچھ ایسے کیس ہو سکتے ہیں' جن میں مقامی اہمیت کے حامل ہونے پر بھی کارروائی (ایکشن) کی عام طور پر اہمیت نہ ہو۔ وہاں اپنی ذمہ داری قبول کرنے میں ملزم کو جذباتی نہیں ہونا چاہئے۔ نرمل کانت رائے کا مشہور مقدمہ اس کی سب سے اچھی مثال ہے۔ لیکن اس طرح کی سیاسی اہمیت والے مقدموں میں ذاتی پہلو کو سیاسی پہلو سے زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہئے۔ اگر آپ مقدمہ کے بارے میں میری غیر

جانب دارنہ رائے جاننا چاہتے ہیں تو میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ تاریخی اہمیت کا سیاسی قتل بالکل نہیں ہے۔

یہاں میں ایک بات لازمی طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کیس کا گلا گھونٹنے والے لوگ' جنہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے اوراس کے بعد جو سمجھ دار بن گئے ہیں' لیکن اپنے کندھوں پر ذمہ داریاں لینے کا حوصلہ نہیں کر پارہے ہیں' ہمارے نوجوان ساتھی کے کراماتی کردار کے حسن کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں یہ کہتے سنا ہے کہ ہری کرشن بہادری سے مقابلہ کرنے میں کانپ گیا ہے۔ یہ ایک حد درجہ کا شرمناک جھوٹ ہے۔ مجھے اس جیسا حوصلہ مند انسان کبھی کوئی نہیں ملا۔ لوگوں کو ہمارے اوپر مہربانی کرنی چاہئے۔ حوصلہ پست کرنے اور نیچا دکھانے سے تو اچھا ہے کہ وہ ہماری طرف توجہ ہی نہ دیں۔

وکیلوں کو ان نوجوانوں کی زندگیاں' یہاں تک کہ ان کی مٹی کو خراب کرنے میں اتنا بے ضمیر نہیں ہونا چاہئے جو دکھی عوام کے نجات کے پاکیزہ کام میں خود کو نچھاور کرنے کے لئے آگے آئے ہیں۔ مجھے یہ جان کر سچ مچ بہت افسوس ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ہم سیاسی کارکنوں کی ایک نئی افسر شاہی بنا رہے ہیں۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے تو بھلا ایک وکیل کسی سیاسی مقدمے میں ناقابل یقین فیس کیوں مانگیں' جیسا کہ اس کیس میں فیس دی گئی ہے۔

بغاوت کے مقدموں سے متعلق میں وہ حد بتا سکتا ہوں جس تک ہم پیروی کی اجازت دے سکتے ہیں۔ گزشتہ سال ایک ساتھی پر سوشلزم پر مبنی تقریر کرنے کی پاداش میں مقدمہ چلا اور اسے غلط طریقہ سے لڑا گیا تو ہمیں صرف حیرانی ہی ہوئی تھی۔ ایسے مقدموں میں ہمیں خود کے ذریعے مشتہر کئے گئے خیالات اور اصولوں کو تسلیم کر لینا چاہئے اور آزادی تقریر کا حق مانگنا چاہئے لیکن کہاں یہ بات اور کہا یہ کہنا کہ ہم نے کچھ کہا ہی نہیں۔ ہم اس طرح اپنی تحریک کے حق کے خلاف جاتے ہیں۔ کانگریس کو موجودہ تحریکات میں بغیر مقدمہ کی پیروی کئے جیل سے نقصان ہوا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک غلطی تھی۔

خیر میرا خیال ہے کہ آپ میرا یہ خط پچھلے خط کے ساتھ پڑھیں گے اور سیاسی مقدمات کی پیروی کے بارے میں میرے خیالات سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔ ہری کرشن کے مقدمہ میں میرے خیال میں جلد از جلد ہائی کورٹ میں اپیل کر دینا چاہئے اور اسے بچانے کی پوری کوشش ہونی چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ میرے یہ دونوں خط وہ ہر بات آپ کو بتا دیں گے جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔

آپ کا
بھگت سنگھ

ہمیں گولی سے اڑایا جائے

پھانسی پر چڑھائے جانے سے تین دن قبل 20 مارچ 1931 کو سردار بھگت سنگھ اور ان کے معاونین راج گرو اور مسٹر سکھ دیو نے مندرجہ ذیل خط کے ذریعہ مشترکہ طور پر پنجاب کے گورنر سے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں جنگی قیدی سمجھا جائے اور پھانسی پر لٹکائے جانے کے بجائے گولی سے اڑا دیا جائے۔ یہ خط ان قومی بہادروں کی صلاحیت' سیاسی فہم اور داستان شجاعت کا ایک اہم باب ہے۔--مدیر

20 مارچ 1931

گورنر پنجاب' شملہ

محترم!

نہایت احترام کے ساتھ ہم مندرجہ ذیل باتیں آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں:

ہندوستان کی برطانوی حکومت کے اعلیٰ حکام وائسرائے نے ایک خصوصی آرڈی نینس جاری کر کے لاہور سازش ملزمین کی سماعت کے لئے ایک خصوصی ٹربیونل کی تشکیل کی تھی؛ جس نے 7 اکتوبر 1930 کو ہمیں پھانسی کی سزا سنائی۔ ہمارے خلاف سب سے بڑا الزام یہ لگایا گیا ہے کہ ہم نے کنگ جارج پنجم کے خلاف جنگ چھیڑی ہے۔

عدالت کے اس فیصلہ سے دو باتیں عیاں ہو جاتی ہیں:

پہلی یہ کہ انگریز قوم اور ہندستانی عوام کے درمیان ایک جنگ چل رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم نے لازمی طور پر اس جنگ میں حصہ لیا ہے لہٰذا ہم جنگی قیدی ہیں۔

اگرچہ ان کی وضاحت میں بہت حد تک احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایسا کر کے ہمیں اعزاز بخشا گیا ہے۔ پہلی بات سے متعلق ہم تھوڑی تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ظاہری طور پر ایسی کوئی لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ جنگ چھڑنے سے عدالت کا مقصد کیا ہے؟ لیکن ہم اس وضاحت کو تسلیم کرتے ہیں اور ساتھ ہی اسے اس کے صحیح پس منظر میں سمجھنا چاہتے ہیں۔

جنگ کی صورت حال

ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جنگ چھڑی ہوئی ہے اور یہ لڑائی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک سامراجی طاقتوں نے ہندوستانی عوام اور مزدوروں کی آمدنی کے وسائل پر قبضہ کر رکھا ہے۔ چاہے ایسے افراد انگریز سرمایہ دار اور انگریز یا ہندوستانی ہی کیوں نہ ہوں انہوں نے باہم مل کر ایک لوٹ مچا رکھی ہے۔ چاہے خالص ہندوستانی سرمایہ داروں کے ذریعہ ہی غریبوں کا خون چوسا جا رہا ہو تو بھی ایسی صورت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ کی سرکار کچھ لیڈروں یا ہندوستانی سماج کے اہم لوگوں پر اثر انداز ہونے میں کامیاب ہو جائے، کچھ سہولیات مل جائیں یا مفاہمت ہو جائے، اس سے بھی صورت حال میں تبدیلی نہیں آسکتی اور عوام پر اس کا اثر بہت کم پڑتا ہے۔ ہمیں اس بات کی بھی فکر نہیں کہ نوجوانوں کو ایک بار پھر دھوکہ دیا گیا ہے اور اس بات کا بھی خوف نہیں ہے کہ ہمارے سیاسی لیڈر گمراہ ہو گئے ہیں اور وہ سمجھوتے کی بات چیت میں ان معصوموں اور بے گھروں کے ایثار کو بھول گئے ہیں، جنہیں بدقسمتی سے انقلابی پارٹی کا رکن سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے سیاسی لیڈر انہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں وہ تشدد میں یقین رکھتے ہیں۔ ہماری مجاہدوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے شوہروں کی قربانی دی ہے، بھائی قربان کئے اور جو کچھ بھی ان کے پاس تھا، سب نچھاور کر دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بھی نچھاور کر دیا ہے۔ لیکن آپ کی حکومت انہیں باغی سمجھتی ہے۔ آپ کے ایجنٹ بھلے ہی جھوٹی کہانیاں بنا کر انہیں بدنام کر دیں اور پارٹی کی مقبولیت کو زک پہنچانے کی کوشش کریں، لیکن یہ جنگ جاری رہے گی۔

جنگ کی مختلف شکلیں

ہو سکتا ہے کہ یہ جدوجہد مختلف ممالک میں مختلف شکل اختیار کرے۔ کسی وقت یہ جنگ کی شکل اختیار کر لے، کبھی خفیہ حالت میں چلتی رہے، کبھی خوفناک روپ اختیار کر لے، کبھی کسی اور سطح پر جدوجہد جاری رہے اور کبھی یہ واقعہ اتنا خوفناک ہو جائے کہ زندگی اور موت کی بازی لگ جائے۔ چاہے کوئی بھی صورت حال ہو، اس کا اثر آپ پر پڑے گا۔ یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ جس حالت کو چاہیں منتخب کر لیں، لیکن یہ جدوجہد جاری رہے گی۔ اس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ دی جائے گی۔ بہت ممکن ہے کہ یہ جدوجہد خوفناک شکل اختیار کر لے۔ لیکن لازمی طور پر یہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگی؛ جب

تک کہ سماج کا موجودہ نظام ختم نہیں ہو جاتا' سبھی چیزیں بدل نہیں جاتیں اور کائنات میں ایک نئے عہد کا ظہور نہیں ہو جاتا۔

آخری جنگ

مستقبل قریب میں آخری جنگ لڑی جائے گی اور یہ لڑائی فیصلہ کن ہوگی۔ سامراجیہ واد اور سرمایہ داری کچھ دنوں کے مہمان ہیں۔ یہی وہ لڑائی ہے' جس میں ہم نے کھل کر حصہ لیا ہے اور ہم اس پر نازاں ہیں کہ اس جنگ کو نہ تو ہم نے شروع کیا ہے اور نہ یہ ہماری زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگی۔ ہماری خدمات تاریخ کے اس باب میں لکھی جائیں گی جس کو یتیندر ناتھ داس اور بھگوتی چرن کی قربانیوں نے خاص طور پر روشن کر دیا ہے۔ ان کی قربانیاں عظیم ہیں۔ جہاں تک ہماری قسمت کا سوال ہے' ہم زوردار لفظوں میں آپ سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ہمیں پھانسی پر لٹکانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ ضرور ایسا کریں گے' آپ کے ہاتھوں میں اقتدار ہے اور آپ کو اختیارات بھی حاصل ہیں۔ لیکن اس طرح آپ' جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کا اصول اپنا رہے ہیں اور آپ اسی کے پابند ہیں۔ ہم پر لگائے گئے الزامات کی سماعت اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ہم نے کبھی کوئی اپیل نہیں کی اور اب بھی ہم آپ سے کسی طرح کی رحم کی درخواست نہیں کرتے۔ ہم آپ سے صرف یہ درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی حکومت کی ہی ایک عدالت کے فیصلہ کے مطابق ہمارے خلاف جنگ جاری رکھنے کا الزام ہے۔ اس طرح ہم جنگی قیدی ہیں' لہٰذا اس بنیاد پر ہم آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے تئیں جنگی قیدیوں جیسا سلوک کیا جائے اور ہمیں پھانسی دینے کی بجائے گولی سے اڑا دیا جائے۔

اب یہ ثابت کرنا آپ کا کام ہے کہ آپ کو اس فیصلہ میں یقین ہے جو آپ کی حکومت کی ایک عدالت نے دیا ہے۔ آپ اپنے عمل کے ذریعہ اس بات کا ثبوت دیجئے۔ ہم انکسار اور عاجزی کے ساتھ آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اپنے سروس محکمہ کو حکم دے دیں کہ ہمیں گولی سے اڑانے کے لئے ایک فوجی دستہ بھیجا جائے۔

مشکور

بھگت سنگھ' راج گرو' سکھ دیو

قربانی سے قبل دوستوں کے نام آخری خط

22 مارچ 1931

ساتھیو!

فطری طور پر جینے کی آرزو مجھ میں بھی ہونی چاہئے' میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ لیکن میں ایک شرط پر زندہ رہ سکتا ہوں کہ میں قید ہو کر یا پابند سلاسل ہو کر جینا نہیں چاہتا۔

میرا نام ہندوستانی انقلاب کی علامت بن چکا ہے اور انقلابی گروپ کے اصولوں اور قربانیوں نے مجھے بہت رفعت عطا کر دی ہے' اتنا رفیع کہ زندہ رہنے کی صورت میں اس رفعت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔

آج میری کمزوریاں عوام کے سامنے نہیں ہے۔ اگر میں پھانسی سے بچ گیا تو وہ ظاہر ہو جائیں گی اور انقلاب کا علامتی نشان ماند پڑ جائے گا یا ممکنہ طور پر مٹ ہی جائے گا۔ لیکن دلیرانہ طریقہ سے ہنستے ہنستے میرے پھانسی چڑھنے کی صورت میں ہندوستانی مائیں اپنے بچوں کے بھگت سنگھ بننے کی آرزو کیا کریں گی اور ملک کی آزادی کے لئے قربانی دینے والوں کی تعداد اتنی بڑھ جائے گی

کہ انقلاب کو روکنا استعماریت پسند طاقتوں یا تمام شیطانی قوتوں کے بس کی بات نہیں رہے گی۔

ہاں! ایک خیال آج بھی میرے ذہن میں آتا ہے کہ ملک اور انسانیت کے لئے جو کچھ کرنے کی حسرت میرے دل میں تھی، اس کا ہزارواں حصہ بھی پورا نہیں کرسکا۔ اگر آزاد زندہ رہ سکتا تو غالباً انہیں پورا کرنے کا موقع ملتا اور میں اپنی حسرتوں کی تکمیل کرسکتا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں کبھی کوئی لالچ پھانسی سے نجات پانے کا نہیں آیا۔ مجھ سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا؟ آج کل مجھے خود پر، بہت فخر محسوس ہوتا ہے۔ اب تو بڑی بے تابی سے آخری آزمائش کا منتظر ہوں۔ تمنا ہے کہ یہ مزید قریب ہوجائے۔

آپ کا دوست بھگت سنگھ

(خط یہیں ختم ہوتا ہے اور آخری الفاظ غیر واضح ہیں۔ مدیر)

(ط) جیل سے لکھے گئے ذاتی خطوط

1۔ بچپن کے دوست جے دیو کے نام خط

بے حد ضروری

24 فروری 1930

نمبر 103/ پھانسی کوٹھری

سنٹرل جیل، لاہور

میرے عزیز جے دیو

مجھے امید ہے کہ تم نے 16 دن کے بعد ہماری بھوک ہڑتال* ختم کرنے کی بات تو سن لی ہوگی اور تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس وقت تمہاری مدد کی ہمیں کتنی ضرورت ہے۔ ہمیں کل کچھ سنترے ملے، لیکن ملاقات نہیں ہوئی۔ ہمارا مقدمہ دو ہفتہ کے لئے موخر کردیا گیا ہے۔ اس لئے ایک ٹین گھی اور ایک کریون۔اے سگریٹ کا ڈبہ بھیجنے کی فوری زحمت کریں۔ کچھ رسگلوں کے ساتھ کچھ سنتروں کا بھی سواگت ہے۔ سگریٹ کے بغیر دت کی حالت خراب ہے۔ اب تم ہماری ضرورتوں کی شدت سمجھ سکتے ہو۔

پیشگی شکریہ کے ساتھ

سچے جذبات کے ساتھ تمہارا
بھگت سنگھ

کاپی۔ مسٹر جے دیو پرساد گپتا کے ذریعہ صوبائی کانگریس کمیٹی، بریڈلے ہال، لاہور**

---

* بھوک ہڑتال ختم کرنے کے بعد یہ خط لکھا گیا۔ بہ شکریہ نہرو میموریل لائبریری۔

* لاہور کا بریڈلے ہال پنجاب صوبائی کانگریس کا صدر دفتر تھا۔ بھگت سنگھ اپنے والد اور دوستوں کو زیادہ تر خط اسی پتہ پر ارسال کرتے تھے۔

جے دیو گپت کے نام خط* ۔2

28 مئی 1930

سنٹرل جیل

لاہور

عزیز بھائی جے دیو

آج پھر تمہیں کچھ زحمت دینے کے لئے یہ خط لکھ رہا ہوں' امید ہے کہ تم برا نہیں مانو گے۔ مہربانی کر کے میرے پیروں کا فلیٹ جوتا بھیجنے کا انتظام کریں۔ 9.10 نمبر کا چل جائے گا۔ چپلی (چپل) سے بہت تکلیف ہے۔ برائے مہربانی انہیں جمعہ یا ہفتہ کو کلبیر کے ہاتھوں بھیجنے کی کوشش کرنا' جب وہ مجھ سے ملاقات کے لئے آئے گا۔ سچ میں' میں بہت اداس ہوں کہ مجھے تم سے ملاقات کی ابھی تک اجازت نہیں ملی ہے۔ اگر مقدمہ میں یہ تعطل نہ آتا تو میں حکام سے تمہارے ساتھ ملاقات کی اجازت کے لئے بار بار درخواست کرتا۔ جو بھی ہو'اس مسئلے کے حل ہوتے ہی ملاقات کی اجازت کی خاطر پھر کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ تم جوتے ضرور اور بغیر تاخیر بھیج دو گے۔ ان دنوں میرے پاس ایک ہی کتاب ہے اور وہ بھی بہت غیر دلچسپ۔ دیکھنا اگر حال میں شائع شدہ کچھ دلچسپ ناول بھیج سکو۔ برائے مہربانی دوستوں سے کہنا کہ مجھے ان کی بہت یاد آتی ہے۔

سچے جذبات کے ساتھ تمہارا

بھگت سنگھ

مورخہ: 26.5.30

(لاہور ڈاک خانہ کی مہر 28/5/30)

پتہ: جے دیو پرساد گپت کے ذریعہ سردار کشن سنگھ' بریڈلے ہال' لاہور۔

جے دیو گپت کو تحریر کردہ خط ۔3

3 جون 1930

سنٹرل جیل' لاہور

میرے عزیز مسٹر جے دیو

برائے مہربانی میری دلی مبارکباد قبول کیجئے' کپڑے کے ان جوتوں اور سفید پالش کی شیشی کے لئے جو آپ نے بھیجے ہیں۔ آپ کے الفاظ میں (جیسا کہ مسٹر کلبیر سنگھ نے کہا) میں آپ کو کچھ دیگر چیزیں لانے کے لئے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے

---

*اس خط سے جے دیو گپت کے ساتھ بھگت سنگھ کے ذاتی دوستانہ تعلقات کے ساتھ ہی ساتھ کتابوں میں خاص طور پر ادب میں ان کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔

یقین ہے کہ آپ اسے محسوس نہیں کریں گے۔مہربانی کر کے دیکھ لیں کہ کیا آپ مسٹر بی کے دت کے لئے کپڑے کا ایک اور جوتا بھیجنے کا انتظام کر سکتے ہیں (سائز نمبر 7)، لیکن دکاندار سے واپسی کے شرط پر لینا، شاید ان کے پیر میں فٹ نہ آئے۔یہ بات میں اپنے لئے لکھتے وقت ہی لکھی ہوتی لیکن مسٹر دت اس دن اچھے موڈ میں نہیں تھے۔لیکن میرے لئے اسے اکیلے پہننا بہت مشکل ہے۔اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ ملاقات کے وقت ایک اور جوتا یہاں ہوگا۔

ساتھ ہی برائے مہربانی ایک ٹویل شرٹ (قمیص) جس کا سائز سینہ 34 اور کمر 29 ہو، بھیج دیں۔اس پر شیکسپیرین کالر ہو اور آدھی آستین ہو۔وہ بھی شری دت کے لئے چاہئے۔کیا آپ سوچیں گے کہ ہم جیل میں بھی اپنے رہن سہن کے خرچیلے انداز پر روک نہیں لگا سکے؟ بالآخر یہ ضروریات ہیں، عیش پرستی نہیں۔نہانے اور ورزش کے لئے کسی ملائم کپڑے کے بنے دو لنگوٹ بھی بھیج دیں اور کپڑے دھونے کے صابن کی کچھ ٹکیاں بھی۔ساتھ ہی کچھ بادام اور سوان انک کی ایک شیشی بھی۔

سردار جی (والد صاحب) کے بارے میں کیا خبر ہے؟ کیا وہ لدھیانہ سے واپس آگئے ہیں؟ ان دنوں کچہری بند رہے گی اور مقدمہ آگے نہیں بڑھے گا۔اگر وہ نہیں آئے تو انہیں لانے کے لئے کسی کو بھیج دیں۔جو ہوا ان کے اور میرے مقدمہ کا اختتام قریب ہے۔کہہ نہیں سکتا کہ ہمیں ایک دوسرے کو ملنے کا مزید موقع ملے گا یا نہیں، اس لئے انہیں فوراً بلا لیں تا کہ وہ اس ہفتہ مجھ سے دوبارہ مل سکیں۔اگر وہ جلد ہی نہیں آ پا رہے ہیں تو مہربانی کر کے کلبیر اور بہن جی کو مجھ سے ملاقات کے لئے کل یا پرسوں بھیج دیں۔میرے دوستوں کو میری یاد دلانا۔کیا آپ فارسی کا ایک قاعدہ اردو ترجمہ سمیت بھیجنے کا نظم کر سکیں گے؟ چار آنے کی فہرست بھی بھیج دیں۔

تمہارا بھگت سنگھ

جے دیو کے نام خط۔4

24 جولائی، 1930

سنٹرل جیل، لاہور

میرے عزیز جے دیو

برائے مہربانی میرے نام دوارکا ناتھ لائبریری سے مندرجہ ذیل کتابیں لے کر ہفتہ کو کلبیر کے ہاتھ بھیج دینا۔

ملٹرزم۔کارل لبنیکھ	وہائی مین فائٹ۔بی رسل
سوویتس ایٹ ورک	کولیپس آف سکنڈ انٹرنیشنل
لیف ونگ کمیونزم۔لنن	میوچول ایڈ۔پرنس کروپاٹکن
فلڈس فیکٹریز اینڈ ورکشاپس۔کارل مارکس	سول واران فرانس۔مارکس
لینڈ ریولوشن ان ایشیا اور	آپٹن سنکلیئر کی 'اسپائی'

برائے مہربانی ایک اور کتاب پنجاب پبلک لائبریری سے لے کر ارسال کرنے کی زحمت گوارا کریں: ہسٹوریکل میٹریلزم (بخارن)۔لائبریرین سے یہ بھی پوچھیں کہ بورسٹل جیل میں کچھ کتابیں بھیجی ہیں یا نہیں؟ ان کے پاس کتابوں کی زبردست کمی ہے۔انہوں نے سکھ دیو کے بھائی جے دیو کے ذریعہ کتابوں کی ایک لسٹ بھیجی تھی لیکن ابھی تک کوئی کتاب نہیں ملی۔اگر ان کے پاس کوئی لسٹ نہ ہو تو مہربانی کر کے لالہ فیروز چند سے کہنا کہ وہ اپنی پسند کی کچھ دلچسپ کتابیں بھیج دیں۔اس اتوار جب میں وہاں جاؤں گا تو ان کے پاس کتابیں پہنچی ہوئی ہونی چاہئیں۔برائے مہربانی یہ دھیان رکھنا کہ یہ کام ہر حالت

میں ہو جائے۔

اس کے ساتھ ہی ڈارلنگس کی تحریر کردہ 'پیز ینٹس ان پروپرپٹی اینڈ ڈیبٹ' اور اسی قسم کی دو تین کتابیں ڈاکٹر عالم کے لئے بھی۔ امید ہے کہ آپ اس زحمت کے لئے معاف کریں گے۔ میں مستقبل میں اور زحمت نہیں دوں گا' یہ میرا وعدہ ہے۔ مہربانی کر کے میرے سب ساتھیوں کو میری یاد دلانا۔ لجاوتی جی کو میرا اسلام خلوص دیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر دت کی بہن آئیں تو وہ مجھ سے ملنے کے لئے آنے کی زحمت کریں گی۔

انتہائی ادب کے ساتھ
بھگت سنگھ

بٹوکیشور دت کی بہن پرومیلا کے نام خط

17 جولائی' 1930
سنٹرل جیل' لاہور

پیاری بہن!

کل بٹو نے خود تمہیں ایک خط لکھا تھا' جس میں یہ مطلع کیا گیا تھا کہ جب تک تمہیں ان کا دوسرا خط نہ ملے' یہاں مت آنا۔ کل شب بٹو کو کسی دوسری جیل میں بھیج دیا گیا۔ اس وقت تک ہمیں ان کی جگہ کے بارے میں کوئی بھی علم نہیں۔ جو بھی ہو' میں تم سے درخواست کروں گا کہ تم بنارس سے لاہور کے لئے اس وقت تک نہ روانہ ہونا جب تک کہ تمہیں ان کا خط نہ ملے۔

ان کی جدائی میرے لئے بھی ناقابل برداشت ہے۔ آج یہ پہلا دن ہے جب میں خود کو مضطرب محسوس کر رہا ہوں اور میرے لئے ہر منٹ ایک بوجھ بن گیا ہے۔ سچ مچ ایک دوست سے جدا ہونا' جو مجھے حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز ہے' بہت تکلیف دہ ہے۔ خیر' ہمیں یہ سب کچھ خاموشی کے ساتھ برداشت کرنا ہے۔ میں تم سے حوصلہ رکھنے کی اپیل کرتا ہوں۔ حوصلہ سے کام لینا' گھبرانا نہیں' اسی میں کچھ اچھی بات نکلے گی۔

تمہارا
بھگت سنگھ

بٹوکیشور دت کے نام خط۔1

اکتوبر' 1930
سنٹرل جیل' لاہور

برادر عزیز!

مجھے سزا سنا دی گئی ہے اور پھانسی کا حکم ہوا ہے۔ ان کوٹھریوں میں میرے علاوہ پھانسی کا انتظار کرنے والے بہت سے مجرم ہیں۔ یہ لوگ یہی دعا کر رہے ہیں کہ کسی طرح پھانسی سے بچ جائیں لیکن ان کے درمیان غالباً میں واحد ایسا آدمی ہوں جو بڑی بے قراری اور بے صبری کے ساتھ اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب مجھے اپنے آدرش کے لئے تختہ دار پر معلق ہونے کی سعادت نصیب ہو سکے گی۔

میں خوشی کے ساتھ پھانسی کے تختہ پر چڑھ کر دنیا کو یہ دکھادوں گا کہ انقلابی اپنے اصولوں کے لئے کتنی بہادری سے قربانی دے سکتے ہیں۔

مجھے پھانسی کی سزا ملی ہے مگر تمہیں عمر قید کی سزا ملی ہے۔ تم زندہ رہو گے اور تمہیں زندہ رہ کر دنیا کو یہ دکھانا ہے کہ انقلابی اپنے اصولوں کے لئے صرف مر ہی نہیں سکتے بلکہ زندہ رہ کر ہر مصیبت کا سامنا کر سکتے ہیں۔ موت دنیاوی مصائب سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بننی چاہئے بلکہ جو انقلابی اتفاقیہ طور پر پھانسی کے پھندے سے بچ گئے ہیں انہیں زندہ رہ کر دینا کو یہ دکھانا چاہئے کہ وہ نہ صرف اپنے اصولوں کے لئے پھانسی پر چڑھ سکتے ہیں بلکہ جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں گھل گھل کر اذیت ناک مصائب کو بھی برداشت کر سکتے ہیں۔

تمہارا
بھگت سنگھ

چھوٹے بھائی کلبیر کو خط

16 ستمبر 1930
سنٹرل جیل، لاہور

پیارے بھائی کلبیر جی
ست شری اکال

تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ بموجب احکام افسران بالا میری ملاقاتیں بند کرا دی گئی ہیں۔ اندرون حالات فی الحال ملاقات نہ ہو سکے گی اور میرا خیال ہے کہ عنقریب ہی فیصلہ صادر کر دیا جائے گا۔ اس لئے کسی دن جیل میں آ کر میری کتب، دیگر کاغذات، جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے دفتر کے اندر اندر یا زیادہ سے زیادہ اسی ماہ فیصلہ اور چالان ہو جائے گا۔ ان حالات میں اب تو کسی دوسری جیل میں ملاقات ہو تو ہو یہاں تو امید نہیں۔

وکیل کو بھیج سکو تو بھیجنا۔ میں پروی کونسل کے سلسلے میں ایک ضروری دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ والدہ صاحبہ کو تسلی دینا، گھبرانا نہیں۔

آپ کا بھائی
بھگت سنگھ

کلبیر کو خط۔2

25 ستمبر 1930
سنٹرل جیل، لاہور

پیارے بھائی کلبیر سنگھ جی
ست شری اکال

مجھے یہ معلوم کر کے کہ ایک دن آپ والدہ کو ساتھ لے کر آئے اور ملاقات کی اجازت نہ ملنے پر مایوس لوٹ گئے، بڑا افسوس ہوا۔ آخر تمہیں تو معلوم ہو چکا تھا کہ جیل والے ملاقات کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر والدہ کو ساتھ کیوں لائے؟ میں جانتا

ہوں وہ اس وقت سخت گھبرائی ہوئی ہیں' مگر اس گھبراہٹ اور پریشانی کا کیا فائدہ؟ نقصان ضرور ہے' کیوں کہ جب سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ بہت رو رہی ہیں' مجھے خود بھی بے چینی ہو رہی ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں اور اس سے کچھ حاصل بھی نہیں۔ سب حوصلہ کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔ آخر دنیا میں دوسرے لوگ بھی تو ہزاروں مصائب میں پھنسے ہوئے ہیں اور پھر لگاتار ایک سال ملاقاتیں کر کے طبیعت نہیں بھری تو دیگر مزید ملاقاتوں سے بھی تسلی نہیں ہو سکے گی۔ میرا خیال ہے کہ فیصلے اور چالان کے بعد ملاقاتیں ہونے لگیں گی لیکن اگر فرض کیا جائے کہ پھر بھی ملاقات کی اجازت نہ ملے تو گھبرانے سے کیا فائدہ؟

تمہارا
بھگت سنگھ

کلبیر کو خط۔3

3 مارچ 1931
لاہور سنٹرل جیل

عزیز کلبیر سنگھ

تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا۔ ملاقات کے وقت خط کے جواب میں کچھ لکھ دینے کے لئے کہا۔ کچھ الفاظ لکھ دوں' بس دیکھو' میں نے کسی کے لئے کچھ نہیں کیا' تمہارے لئے بھی کچھ نہیں۔ آج کل بالکل مصیبت میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تمہاری زندگی کا کیا ہوگا؟ گزارہ کیسے کرو گے؟ یہی سب سوچ کر کانپ جاتا ہوں مگر بھائی حوصلہ رکھنا' مصیبت میں بھی کبھی مت گھبرانا۔ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ آہستہ آہستہ محنت سے پڑھتے رہنا۔ اگر کوئی کام سیکھ سکو تو بہتر ہوگا مگر سب کچھ والد صاحب کے مشورہ سے کرنا۔ جہاں تک ہو سکے' محبت سے سب لوگ گزارہ کرنا۔ اس کے سوا کیا کہوں؟

جانتا ہوں کہ آج تمہارے دل کے اندر غم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ بھائی تمہاری بات سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں مگر کیا کیا جائے' حوصلہ رکھنا۔ میرے عزیز' میرے بہت بہت پیارے بھائی' زندگی بڑی سخت ہے اور دنیا بڑی بے مروت۔ سب لوگ بڑے بے رحم ہیں۔ صرف حوصلے اور محبت سے ہی گزارہ ہو سکے گا۔ کلتار کی تعلیم کی فکر بھی تم ہی کرنا۔ بڑی شرم آتی ہے اور افسوس کے سوا میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ ساتھ والا خط ہندی میں لکھا ہوا ہے۔ خط 'کے' کی بہت کو دے دینا۔ اچھا نمسکار' عزیز بھائی الوداع......رخصت۔

تمہارا خیر اندیش
بھگت سنگھ

چھوٹے بھائی کلتار کو خط

3 مارچ 1931
سنٹرل جیل' لاہور

عزیز کلتار

آج تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ آج تمہاری باتوں میں بہت درد تھا' تمہارے آنسو مجھ سے

برداشت نہیں ہوتے۔

برخوردار، ہمت سے تعلیم حاصل کرنا اور صحت کا خیال رکھنا۔ حوصلہ رکھنا اور کیا کہوں۔

اسے یہ فکر ہے کہ نیا طرز جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے
دہر سے کیوں خفا رہیں، چرخ کا کیوں گلہ کریں
سارا جہاں عدو سہی، آؤ مقابلہ کریں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل
چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
ہوا میں رہے گی میرے خیال کی بجلی
یہ مشت خاک ہے فانی، رہے رہے نہ رہے

اچھا رخصت۔ خوش رہو اہل وطن، ہم تو سفر کرتے ہیں۔ ہمت سے رہنا۔ نمستے

تمہارا بھائی
بھگت سنگھ

باب۔2
عدالتوں میں دیئے گئے بیانات

بم کیس پر سیشن کورٹ میں بیان

اسمبلی میں بم پھینکنے کے بعد 6 جون 1929 کو دہلی کے سیشن جج مسٹر لیونائی مڈلٹن کی عدالت میں دیا گیا سردار بھگت سنگھ اور بٹو کیشور دت کا تاریخی بیان۔ اسے عدالت میں آصف علی نے پڑھا۔ مدیر

ہمارے اوپر سنگین الزامات لگائے گئے ہیں' اس لئے یہ لازمی ہے کہ ہم بھی اپنی صفائی میں چند الفاظ کہیں۔ ہمارے مبینہ جرائم سے متعلق میں مندرجہ ذیل سوال اٹھتے ہیں (۱) کیا حقیقت میں اسمبلی میں بم پھینکے گئے تھے' اگر ہاں' تو کیوں؟ (۲) زیریں عدالت میں ہمارے اوپر جو الزامات لگائے گئے ہیں' وہ صحیح ہیں' لیکن مبینہ چشم دید گواہوں نے اس معاملہ میں جو گواہی دی ہے' وہ سراسر جھوٹ ہے۔ چوں کہ ہم بم پھینکنے سے انکار نہیں کرر ہے ہیں' اس لئے یہاں بتلا دینا چاہتے ہیں کہ سارجنٹ ٹیری کا یہ کہنا کہ انہوں نے ہم میں سے ایک کے پاس سے پستول برآمد کی' سراسر سفید جھوٹ ہے کیوں کہ جب ہم نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کیا تو ہم میں سے کسی کے پاس کوئی پستول نہیں تھا۔ جن گواہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے ہمیں بم پھینکتے دیکھا تھا' وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ انصاف اور ایماندارانہ رویہ کو بسر وچشم تسلیم کرنے والوں کو ان جھوٹی باتوں سے ایک سبق لینا چاہئے۔ ساتھ ہی ہم سرکاری وکیل کے مناسب رویہ اور عدالت کے تا حال منصفانہ رویہ کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔

پہلے سوال کے دوسرے حصہ کا جواب دینے کے لئے ہمیں اس بم کیس جیسے تاریخی واقعات کی تفصیل میں جانا پڑے گا۔ ہم نے وہ کام کس مجبوری اور کن حالات میں کیا' اس کی وضاحت ضروری ہے۔

جیل میں ہمارے پاس کچھ پولیس افسر آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ لارڈ ارون نے اس حادثہ کے بعد ہی اسمبلی کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں کہا ہے کہ ''یہ بغاوت کسی خاص فرد کے خلاف نہیں بلکہ پورے حکومتی نظام کے خلاف تھی''۔ یہ سن کر ہم نے فوراً اندازہ لگالیا کہ لوگوں نے ہمارے اس عمل کے مقصد کو صحیح طور پر سمجھ لیا تھا۔

انسانیت سے پیار کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ہمیں کسی سے ذاتی رنجش نہیں ہے اور ہم فرد کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں۔ ہم نہ تو بربریت آمیز فساد کرنے والے ملک کے کلنک ہیں جیسا کہ سوشلسٹ کہلانے والے دیوان چمن لال نے کہا ہے' اور نہ ہی ہم پاگل اور مجنوں ہیں جیسا کہ لاہور کے ٹریبیون اور کچھ اخباروں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم محض اپنے ملک کی تاریخ' اس کے موجودہ حالات اور انسانیت پر مبنی خواہشات کی تکمیل کا صرف عاجزی سے پر دعویٰ ہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں ڈھونگ اور فریب سے نفرت ہے۔

ایک غیر سود مند تنظیم

یہ کام ہم نے کسی ذاتی مفاد یا انتقام کے جذبہ سے نہیں کیا ہے۔ ہمارا مقصد محض اس حکومتی نظام کے خلاف احتجاج ظاہر کرنا تھا جس کے ہر ایک کام سے اس کی نا اہلیت ہی نہیں بلکہ لغو کام کرنے کا اظہار ہوتا ہے۔ اس موضوع پر ہم نے جتنا غور کیا' اتنا ہی ہمیں اس بات کا پختہ یقین ہوتا گیا کہ وہ محض دنیا کے سامنے ہندوستان کی شرمناک اور یہاں کے بدترین نظام کی ڈفلی بجانے کے لئے ہی قائم ہے اور وہ ایک غیر ذمہ دار اور ظالم حکومت کی علامت ہے۔

عوامی نمائندوں نے متعدد مرتبہ قومی مطالبات کو حکومت کے سامنے پیش کیا لیکن اس نے ان مطالبات کے ایماندارانہ رویہ کو سراسر نظر انداز کر کے ہر مرتبہ انہیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ایوان میں پاس کی گئی اہم تجاویز کو ہندوستان کی مبینہ پارلیمنٹ کے سامنے ہی تحقیر آمیز انداز میں پیروں تلے روندا گیا ہے' ظالمانہ قوانین کو ختم کرنے کے مطالبات پر مبنی تجاویز کو ہمیشہ حکم عدولی کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور عوام کے منتخب نمائندوں نے سرکار کے جن قوانین اور تجاویز کو غیر موزوں اور غیر آئینی بتا کر رد کر دیا تھا' انہیں حکومت نے بیک جنبش قلم نافذ کر دیا ہے۔

مختصراً کافی غور و خوض کے بعد بھی اس تنظیم کے قیام کا مقصد ہماری سمجھ میں نہیں آ سکا' جو باوجود اس تمام شان و شوکت کے' جس کی بنیاد ہندوستان کے کروڑوں محنت کشوں کی گاڑھی کمائی ہے' محض ایک دل کو بہلانے والی کھوکھلی' دکھاوٹی اور شرارتوں سے پر تنظیم ہے۔ ہم عوامی لیڈروں کی ذہنیت کو سمجھ پانے سے بھی قاصر ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے سیاست داں ہندوستان کی محکومی اور غلامی کی چنک کرنے والوں کے خلاف اتنے واضح اور منصوبہ بند احتجاج پر عوامی ملکیت اور وقت برباد کرنے میں معاون کیوں بنتے ہیں؟

ہم انہیں سوالوں اور مزدور تحریکات کے لیڈروں کی گرفتاری پر غور کر ہی رہے تھے کہ سرکار ٹریڈ ڈسپیوٹس بل لے کر سامنے آئی۔ ہم اسی حوالے سے اسمبلی کی کارروائی دیکھنے گئے۔ وہاں ہمارا یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ ہندوستان کے لاکھوں محنت کش عوام ایک ایسے نظام سے کسی بات کی توقع نہیں کر سکتے جو ہندوستان کے بے بس محنت کشوں کی غلامی اور ان کا گلا گھونٹنے والی طاقتوں کی زندہ علامت ہے۔

آخر میں وہ قانون' جسے ہم بربریت پر مبنی اور غیر انسانی سمجھتے ہیں' ملک کے نمائندوں کے سروں پر پٹک دیا گیا اور اس طرح کروڑوں مزاحمت کرنے والے مزدوروں کو ابتدائی حقوق سے بھی محروم کر دیا گیا اور ان کے ہاتھوں سے ان کی اقتصادی آزادی کا واحد ہتھیار بھی چھین لیا گیا۔ جس کسی نے بھی کمر توڑ محنت کرنے والے بے زبان محنت کشوں کی حالت پر ہماری طرح سوچا ہے' وہ شاید سکون سے یہ سب نہیں دیکھ سکے گا۔ قربانی کے بکروں کی طرح استحصال کرنے والوں ......اور سب سے بڑی استحصالی مشینری خود سرکار ہے' کی قربان گاہ پر آئے دن ہونے والی مزدوروں کی ان خاموش قربانیوں کو دیکھ کر جس کسی کا دل روتا ہے' وہ اپنے ضمیر کی آواز سے ہرگز منہ نہیں پھیر سکتا۔

گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کے سابق ممبر آں جہانی مسٹر ایس آر داس نے اپنے مشہور اخبار میں لکھا تھا کہ انگلینڈ کی نیند حرام کرنے کے لئے بم کا استعمال لازمی تھا۔ مسٹر داس کے انہیں الفاظ کو سامنے رکھ کر ہم نے اسمبلی بھون میں بم پھینکا تھا۔ ہم نے وہ کام مزدوروں کی جانب سے احتجاج درج کرنے کے لئے کیا تھا۔ ان مجبور مزدوروں کے پاس اپنی اندرونی تکلیفوں کو ظاہر کرنے کا اور کوئی ذریعہ بھی تو نہیں تھا۔ ہمارا واحد مقصد تھا بہروں کو سنانا' اور ان مصیبت زدہ لوگوں کے مطالبات پر توجہ نہ

دینے والی حکومت کو بروقت متنبہ کر دینا۔

ہماری ہی طرح دوسروں کا بھی یہی ماننا ہے کہ ہندوستانیوں کی خاموشی کسی ٹھہرے ہوئے سمندر کی طرح ہے جو کسی بھی وقت پھٹ پڑنے والے ایک بھیانک طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ہم نے تو ان لوگوں کے لئے صرف خطرے کی گھنٹی بجائی ہے جو مستقبل کے بھیانک اور خوف ناک خطرے کو نظر انداز کر کے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو صرف یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ''تخیلاتی 'عدم تشدد'' کا عہد اب ختم ہو چکا ہے اور آج کی نئی نسل کو اس کی عدم معنویت میں کسی بھی طرح کا شبہ نہیں رہ گیا ہے۔

انسانیت کے تئیں آپسی محبت و بھائی چارہ کے سبب نیز بے کار خوں ریزی سے بچانے کے لئے ہم نے انہیں متنبہ کرنے کے اس طریقہ کا سہارا لیا ہے اور آئندہ کی خوں ریزی کو ہم ہی نہیں' لاکھوں آدمی پہلے سے ہی دیکھ رہے ہیں۔

تصوراتی عدم تشدد

اوپر ہم نے 'تصوراتی عدم تشدد' لفظ استعمال کیا ہے۔ یہاں پر اس کی تفصیل بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ جارحانہ مقصد سے جب طاقت کا استعمال ہوتا ہے' اسے 'تشدد' کہتے ہیں اور اخلاقی نظریہ سے اسے صحیح نہیں کہا جا سکتا لیکن جب اس کا استعمال کسی جائز مقصد کے لئے کیا جاتا ہے' تو اس کا اخلاقی جواز بھی ہوتا ہے۔ کسی بھی حالت میں طاقت کا استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ یہ خیال تصوراتی اور غیر یقینی ہے۔ ادھر ملک میں جو نئی تحریکیں تیزی سے اٹھ رہی ہیں اور جس کی اطلاع ہم پہلے دے چکے ہیں' وہ گرو گوبند سنگھ' شواجی' کمال پاشا' رضا خاں' واشنگٹن' گیری بالڈی' لافایٹ اور لینن کے اصول سے ہی ماخوذ ہیں اور انہیں کے نقش قدم پر چل رہے رہیں۔ چوں کہ ہندوستان کی غیر ملکی سرکار اور ہمارے قومی رہنما دونوں ہی اس تحریک سے مایوس لگتے ہیں اور دانستہ اس کی آواز سے اپنے کان بند کرنے کی کوشش کرر ہے ہیں' اس لئے ہم نے اپنی ذمہ داری سمجھی کہ ہم ایک ایسی تنبیہہ کریں' جس کی خلاف ورزی نہ کی جا سکے۔

ہمارا مقصد

ابھی تک ہم نے اس واقعہ کے اصل مقصد پر ہی روشنی ڈالی ہے۔ اب ہم اپنی نیت اور مقصد بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس واقعہ کے سلسلے میں معمولی چوٹیں کھانے والے لوگوں اور اسمبلی کے کسی فرد کے تئیں ہمارے دلوں میں کوئی ذاتی رنجش کا جذبہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس ہم ایک بار پھر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم حیات انسانی کو انتہائی تقدس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور کسی بھی شخص کو چوٹ پہنچانے کے بجائے ہم نسل انسانی کی خدمت میں ہنستے ہنستے اپنی جان نچھاور کر دیں گے۔ ہم طاغوتی طاقتوں کے زر خرید فوجیوں کی طرح نہیں ہیں' جن کا کام ہی قتل و غارت گری ہوتا ہے۔ ہم حیات انسانی کی قدر کرتے ہیں اور برابر اس کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد بھی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے جان بوجھ کر اسمبلی ہال میں بم پھینکا۔

واقعات خود ہمارے ارادوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور ہمارے ارادوں کی آزمائش' ہمارے کام کے نتائج کی بنیاد پر ہونی چاہئے' نہ کہ اندازے اور من گھڑت حالات کی بنیاد پر۔ سرکاری ماہرین کی گواہی کے خلاف ہمیں یہ کہنا ہے کہ اسمبلی ہال میں پھینکے گئے بموں سے وہاں کی ایک خالی بنچ کو ہی کچھ نقصان پہنچا اور تقریباً نصف درجن افراد کو معمولی سی خراشیں آئیں۔ سرکاری سائنس دانوں نے کہا ہے کہ بم بڑے زور دار تھے اور ان سے زیادہ نقصان نہیں ہوا' اسے ایک ناگہانی واقعہ ہی

کہنا چاہئے۔ پہلے تو دونوں بم بنچوں اور ڈیسکوں کے درمیان خالی جگہ پر ہی گرے تھے۔ دوسرے ان کے پھٹنے کی جگہ سے دو فٹ پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی جن میں مسٹر پی آر راؤ، مسٹر شنکر راؤ اور سر جارج شسٹر کے نام قابل ذکر ہیں یا تو بالکل ہی زخمی نہیں ہوئے یا صرف معمولی چوٹ آئی۔ اگر ان بموں میں زوردار پوٹاشیم کلوریٹ اور پکرک ایسڈ بھرا ہوتا جیسا کہ سرکاری ماہرین نے کہا ہے تو ان بموں نے اس لکڑی کے حصار کو توڑ کر چند گز کے فاصلے پر کھڑے لوگوں تک کو اڑا دیا ہوتا اور اگر ان میں کوئی اور بھی طاقت ور آتش گیر مادہ بھرا جاتا تو لازمی طور پر وہ اسمبلی کے اکثر ممبران کو اڑا دینے کا اہل ہوتا۔ یہی نہیں اگر ہم چاہتے تو انہیں سرکاری حصے میں پھینک سکتے تھے جو کہ معزز افراد سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ یا پھر اس سر جان سائمن کو اپنا نشانہ بنا سکتے تھے، جس کے بدقسمت کمیشن نے ہر فکر کے حامل افراد کے دل میں اس کے تئیں سخت نفرت پیدا کر دی تھی اور جو اس وقت اسمبلی کی صدارتی کرسی پر بیٹھا تھا۔ لیکن اس طرح کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا اور ان بموں نے اتنا ہی کام کیا جتنے کے لئے انہیں تیار کیا گیا تھا۔ اگر اس سے کوئی ناگہانی واقعہ ہوا تو یہی کہ وہ مقررہ نشانے پر یعنی خالی جگہ پر گرا۔

ایک تاریخی سبق

بعد ازاں ہم نے اس عمل کی سزا بھگتنے کے لئے اپنے آپ کو جان بوجھ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ ہم طاغوتی استحصال کرنے والوں کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ مٹھی بھر لوگوں کو مار کر کسی اصول کو ختم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی دو افراد کو کچل کر ملک کو دبایا جا سکتا ہے۔ ہم تاریخ کے اس سبق پر زور دینا چاہتے تھے کہ تعارفی خط یا تعارفی خاکہ (Letter de catchet) اور بیسٹائل (فرانس کی مشہور جیل، جہاں سیاسی قیدیوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں......) فرانس کے انقلاب کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے، پھانسی کے پھندے اور سائبیریا کی کانیں روسی انقلاب کی آگ کو بجھا نہیں پائی تھیں تو پھر کیا ایکٹ اور سیفٹی بلس ہندوستان میں آزادی کی لو کو بجھا سکیں گے؟ سازش کا پتہ لگا کر یا مصنوعی سازشوں کے ذریعہ نوجوانوں کو سزا دے کر یا ایک عظیم آدرش کے خوابوں سے تحریک پائے نوجوانوں کو جیلوں میں ٹھونس کر کیا انقلابی مہم کو روکا جا سکتا ہے؟ ہاں، مشترکہ آگاہی سے، بشرطیکہ اس کی امید نہ کی جائے، لوگوں کی جانیں بچائی جا سکتی ہیں اور بے کار کی مصیبتوں سے ان کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ آگاہی دینے کا یہ بوجھ اپنے اوپر لے کر ہم نے اپنی ذمہ داری پوری کی ہے۔

انقلاب کیا ہے؟

بھگت سنگھ سے نچلی عدالت میں پوچھا گیا تھا کہ انقلاب سے ہم لوگوں کا کیا مطلب ہے؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ انقلاب کے لئے خونی لڑائیاں لازمی نہیں ہیں اور نہ ہی اس میں ذاتی تشدد کے لئے کوئی جگہ ہے۔ وہ بم اور پستول کا فرقہ نہیں ہے۔ انقلاب سے ہمارا مقصد ہے...... ناانصافی پر مبنی موجودہ سماجی نظام میں مکمل تبدیلی۔

سماج کا اہم حصہ ہوتے ہوئے بھی آج مزدوروں کو ان کے ابتدائی حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے اور ان کی گاڑھی کمائی کو استحصال کرنے والے سرمایہ دار ہڑپ کر جاتے ہیں۔ دوسروں کو خوراک فراہم کرنے والے کسان آج اپنے کنبہ سمیت دانے دانے کو محتاج ہیں۔ دنیا بھر کے بازار میں کپڑا مہیا کرانے والے بنکر کو اپنے اور اپنے بچوں کا تن چھپانے کے لئے بھی کپڑا میسر نہیں ہے۔ خوب صورت محلوں کی تعمیر کرنے والے راج گیر، لوہار اور بڑھئی خود گندے باڑوں میں رہ کر ہی اپنی زندگی ختم کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس سماج کے جونک استحصالی سرمایہ دار چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے لاکھوں کے وارے نیارے کر دیتے ہیں۔

یہ عدم مساوات اور جبراً لادا گیا امتیاز دنیا کو ایک بہت بڑی اتھل پتھل کی جانب لے جا رہا ہے۔ یہ حالات زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتے۔ ظاہر ہے کہ آج کا دولت مند سماج ایک بھیانک آتش فشاں کے منہ پر بیٹھ کر رنگ رلیاں منا رہا ہے اور استحصال زدہ لوگوں کے معصوم بچے اور کروڑوں استحصال زدہ لوگ ایک بھیانک غار کے دہانے پر چل رہے ہیں۔

مکمل تبدیلی کی ضرورت

ثقافت کا یہ محل اگر بروقت سنبھالا نہیں گیا تو بہت جلد متزلزل ہو کر بیٹھ جائے گا۔ ملک کو ایک مکمل تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اور جو لوگ اس بات کو محسوس کرتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اشتراکی اصولوں پر سماج کی از سر نو تعمیر کریں۔ جب تک یہ نہیں کیا جاتا اور انسان کے ذریعہ انسان اور ملک کے ذریعہ دوسرے ملک کا استحصال' جو استعمار شاہی کے نام سے مشہور ہے' ختم نہیں کر دیا جاتا' تب تک انسانیت کو اس کی تکالیف سے نجات دلانا ناممکن ہے اور تب تک جنگوں کو ختم کر کے امن عالم کی ساری باتیں فریب کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہیں۔ انقلاب سے ہمارا مطلب بالآخر ایک ایسے سماجی نظام کا قیام ہے جو اس طرح کی مشکلوں سے آزاد ہوگا اور جس میں محروم طبقہ کی ہی بالا دستی ہوگی اور جس کے نتیجہ میں قائم ہونے والی عالمی تنظیم مصیبت زدہ انسانیت کو سرمایہ دارانہ بندشوں اور طاغوتی جنگ کی تباہی سے نجات دلانے کی اہل ہو سکے گی۔

مشترکہ آگاہی

یہ ہے ہمارا اصول۔ اور اسی اصول سے تحریک پا کر ہم نے ایک صحیح اور پرزور تنبیہہ کی ہے۔ لیکن اگر ہماری اس تنبیہہ پر توجہ مرکوز نہیں کی گئی اور حالیہ نظام حکومت عوامی طاقت کی راہ میں روڑے اٹکانے سے باز نہیں آئی تو انقلاب کے اس آدرش کی تلافی کے لئے ایک پرزور جنگ کا چھیڑنا لازمی ہے۔ سبھی رکاوٹوں کو روند کر آگے بڑھتے ہوئے اس لڑائی کے نتیجے میں محروم طبقہ کی ڈکٹیٹر حکومت کا قیام عمل میں آئے گا۔ یہ ڈکٹیٹر حکومت انقلاب کے اصولوں کی تلافی کے لئے راہ ہموار کرے گی۔ انقلاب نسل انسانی کا پیدائشی حق ہے' جس پر قدغن نہیں لگایا جا سکتا۔ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ محنت کش طبقہ ہی سماج کو پروان چڑھانے والا ہے' عوام کا مکمل اقتدار محنت کشوں کا آخری ہدف اور نشانہ ہے۔ ان اصولوں کے لئے اور اس اعتماد کے لئے ہمیں جو بھی سزا دی جائے گی' ہم بہ سروچشم قبول کریں گے۔ انقلاب کی دیوی پر ہم اپنا عہدِ جوانی قربان کرنے کی خاطر لائے ہیں کیوں کہ ایسے عظیم آدرشوں کے لئے بڑے سے بڑا ایثار بھی کم ہے۔ ہم مطمئن ہیں اور انقلاب کی آمد کا بڑے جوش و خروش سے انتظار کر رہے ہیں۔

انقلاب زندہ باد!

بم کیس پر ہائی کورٹ میں بیان

دہلی کے سیشن جج نے اسمبلی بم کیس میں بھگت سنگھ کو عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ لاہور ہائی کورٹ میں اس کے خلاف اپیل کی گئی۔ دہلی عدالت کے فیصلہ کی مذمت کرتے ہوئے بھگت سنگھ نے ہائی کورٹ میں یہ دوسرا بیان دیا۔ مدیر

ہمارے مقاصد پر دھیان دیں

مائی لارڈ' ہم نہ وکیل ہیں' نہ انگریزی کے ماہر ہیں اور نہ ہی ہمارے پاس ڈگریاں ہی ہیں' اس لئے ہم سے شاندار تقریر کی امید نہ کی جائے۔ ہماری درخواست ہے کہ ہمارے بیان کی زبان پر دھیان نہ دیتے ہوئے اس کے حقیقی مطالب کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے تمام امور اپنے وکیلوں پر چھوڑتے ہوئے میں خود ایک معاملہ پر اپنے نظریات پیش کروں گا۔ یہ معاملہ اس مقدمہ کا بہت اہم حصہ ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہماری نیت کیا تھی اور ہم کس حد تک مجرم ہیں؟

یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے' اس لئے کوئی بھی شخص آپ کی خدمت میں نظریات کے فروغ کی اس رفعت کو پیش نہیں کر سکتا' جس کے زیر اثر ہم ایک خاص طریقے سے سوچنے اور برتاؤ کرنے لگے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے مدنظر رکھتے ہوئے ہی ہماری نیت اور جرم کا اندازہ لگایا جائے۔ مشہور قانون داں وشار دسالومن کے مطابق کسی بھی شخص کو اس کے جرم کی اس وقت تک سزا نہیں ملنی چاہئے جب تک اس کا مقصد قانون مخالف ثابت نہ ہو جائے۔

سیشن جج کی عدالت میں ہم نے جو تحریری بیان دیا تھا' وہ ہمارے مقاصد کی وضاحت کرتا ہے اور بعینہ ہماری نیت کو بھی ظاہر کرتا تھا لیکن سیشن جج نے اپنے نوک قلم سے یہ کہہ کر کہ "عام طور پر جرم کو برتاؤ میں لانے والی بات قانون کے کام کو متاثر نہیں کرتی اور اس ملک میں قانونی توضیحات میں کبھی کبھار ہی مقصدیت اور نیت پر بحث ہوتی ہے' ہماری تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

مائی لارڈ' ان حالات میں فاضل سیشن جج کے لئے مناسب تھا کہ یا تو جرم کا اندازہ نتیجہ سے لگاتے یا ہمارے بیان کی مدد سے نفسیاتی پہلو کا فیصلہ کرتے لیکن انہوں نے ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں کیا۔

قابل غور امر یہ ہے کہ اسمبلی میں ہم نے جو دو بم پھینکے' ان سے کسی بھی شخص کو جسمانی یا معاشی نقصان نہیں پہنچا۔ اگر دوسرے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو جب تک ملزم کے قلبی جذبات کا پتہ نہ لگایا جائے' اس کے اصلی مقصد کا پتہ ہی نہیں چل سکتا۔ اگر مقصد کو مکمل طور پر فراموش کر دیا جائے تو کسی بھی شخص کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا کیوں کہ مقصد کو نظر انداز کر کے دیکھنے پر دنیا کے بڑے بڑے آرمی چیف قاتل نظر آئیں گے۔ سرکاری ٹیکس وصول کرنے والے افسر چور' جعل ساز دکھائی دیں گے اور ججوں پر بھی قتل کرنے کا الزام لگے گا۔ اس طرح تو سماجی نظام اور تہذیب خون خرابہ' چوری اور جعل سازی بن کر رہ جائے گی۔ اگر مقصد سے روگردانی کی جائے تو کسی حکومت کو کیا حق ہے کہ سماج کے لوگوں سے انصاف کرنے کو کہے؟ مقصد سے روگردانی کی جائے تو ہر مذہبی مبلغ جھوٹ کا مبلغ نظر آئے گا اور ہر ایک پیغمبر پر الزام لگے گا کہ اس نے کروڑوں معصوم اور

انجان لوگوں کو گمراہ کیا۔ اگر مقصد کو بھلا دیا جائے تو حضرت عیسیٰ مسیح گڑبڑ کرانے والے امن میں خلل انداز ہونے والے اور بغاوت کی تشہیر کرنے والے دکھائی دیں گے اور قانون کے لفظوں میں خطرناک شخص تصور کیے جائیں گے لیکن ہم ان کی پرستش کرتے ہیں' ان کا ہمارے دل میں بے حد احترام ہے' ان کی شبیہ ہمارے دلوں میں روحانیت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ کیوں؟ یہ اس لئے ان کی کوششوں کا محرک ایک اعلیٰ مقصد تھا۔ اس عہد کے حکمرانوں نے ان کے مقصد کی شناخت نہیں کی' انہوں نے ان کے سلوک کو ہی دیکھا' لیکن اس وقت سے لے کر آج تک انیس صدیاں گزر چکی ہیں' کیا ہم نے تب سے لے کر اب تک کوئی ترقی نہیں کی؟ کیا ہم ایسی غلطیاں دہرائیں گے؟ اگر ایسا ہو تو ماننا پڑے گا کہ انسانیت کی قربانیاں' بڑے شہیدوں کی کوششیں بے کار رہیں اور آج بھی ہم اسی مقام پر ہیں' جہاں آج سے بیس صدی قبل تھے۔

قانونی نقطۂ نگاہ سے مقصد کا سوال خاصا اہم ہے۔ جنرل ڈائر کی مثال لے لیجئے۔ اس نے گولی چلائی اور سیکڑوں معصوم اور نہتھے لوگوں کو قتل کر ڈالا لیکن فوجی عدالت نے اسے گولی کا نشانہ بنانے کا حکم دینے کی بجائے لاکھوں روپے کے انعام سے نوازا۔ ایک اور مثال پر توجہ دیں۔ شری کھڈگ بہادر سنگھ نے' جو ایک گورکھا نوجوان ہے' کلکتہ میں ایک امیر مارواڑی کو چھرے سے مار ڈالا۔ اگر مقصد کو الگ کر کے دیکھا جائے تو کھڈگ بہادر کو موت کی سزا ملنی چاہئے لیکن اسے چند برسوں کی سزا دی گئی اور اس مدت سے بھی بہت پہلے اسے آزاد کر دیا گیا۔ کیا قانون میں کوئی Loop hole (کمزوری) رکھتا تھا' جو اسے موت کی سزا نہ دی گئی؟ یا اس کے خلاف قتل کا الزام ثابت نہیں ہو سکا؟ اس نے ہماری ہی طرح اپنا جرم قبول کیا تھا لیکن اس کی زندگی بچ گئی اور وہ آزاد ہے۔ میں پوچھتا ہوں' اسے پھانسی کی سزا کیوں نہیں دی گئی؟ اس کا عمل منصوبہ بند تھا۔ اس نے منصوبہ بند طریقہ سے تیاری کی تھی۔ مقصد کے نظریہ سے اس کا عمل (ایکشن) ہمارے عمل کے مقابلے زیادہ خطرناک اور سنگین تھا۔ اسے اس لئے بہت ہی نرم سزا ملی کیوں کہ اس کا مقصد نیک تھا۔ اس نے سماج کو ایک ایسی جونک سے نجات دلائی' جس نے متعدد خوب صورت لڑکیوں کا خون چوس لیا تھا۔ مسٹر کھڈگ بہادر سنگھ کو محض قانون کے وقار کو بچائے رکھنے کے لئے چند برسوں کی سزا دی گئی۔

یہ اصول کس قدر غلط ہے۔ یہ انصاف کے بنیادی اصول کے خلاف ہے' جو کہ اس طرح ہے...... 'قانون لوگوں کے لئے ہے' لوگ قانون کے لئے نہیں'۔ اس حالت میں کیا وجہ ہے کہ وہ رعایتیں نہ دی جائیں' جو شری کھڈگ بہادر سنگھ کو ملی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اسے نرم سزا دیتے وقت اس کا مقصد پیش نظر رکھا گیا ورنہ کوئی بھی شخص' جو کسی دوسرے کو قتل کرتا ہے' پھانسی کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ کیا اس لئے ہمیں عام قانونی حقوق مل رہے ہیں کہ ہمارا عمل خلاف حکومت تھا یا اس لئے کہ اس عمل کی سیاسی اہمیت ہے۔

مائی لارڈ' اس صورت میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ جو حکومت ان کمینی حرکتوں کے لئے جائے پناہ تلاش کرتی ہے' جو حکومت فرد کے فطری حقوق غصب کرتی ہے' اسے قائم رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر یہ قائم ہے تو عارضی طور پر اور ہزاروں بے گناہوں کا خون اس کی گردن پر ہے۔ اگر قانون مقصدیت نہیں دیکھتا تو انصاف نہیں ہو سکتا اور نہ ہی دائمی امن قائم ہو سکتا ہے۔

آٹے میں سنکھیا (زہر) ملانا جرم نہیں بشرطیکہ اس کا مقصد چوہوں کو مارنا ہو لیکن اگر اس سے کسی آدمی کو مار دیا جائے تو قتل کا جرم سرزد ہو جاتا ہے' لہٰذا ایسے قوانین' جو دلیل پر مبنی نہیں اور انصاف کے اصولوں کے خلاف ہیں' انہیں ختم کر دینا چاہئے۔ ایسے ہی انصاف مخالف قوانین کے سبب بڑے بڑے دانشوروں نے بغاوت کے عمل کو اپنایا ہے۔

ہمارے مقدمے کے حقائق بالکل صاف ہیں۔ 8 اپریل 1929 کو ہم نے سنٹرل اسمبلی میں دو بم پھینکے۔ اس کے دھماکوں سے چند افراد کو معمولی خراشیں آئیں۔ چیمبر میں ہنگامہ ہوا' سیکڑوں ناظرین اور ممبران باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد سکوت طاری ہو گیا۔ میں اور ساتھی بی۔ کے۔ دت خاموشی کے ساتھ ناظرین کی گیلری میں بیٹھے رہے اور ہم نے خود اپنے آپ کو حوالے

کر دیا کہ ہمیں گرفتار کرلیا جائے۔ ہمیں گرفتار کرلیا گیا۔ الزامات لگائے گئے اور قتل کی کوشش کے جرم میں ہمیں سزا دی گئی لیکن بموں سے چار پانچ آدمیوں کو معمولی چوٹ آئی اور ایک بنچ کو معمولی نقصان پہنچا اور جنہوں نے یہ جرم کیا' انہوں نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ سیشن جج نے تسلیم کیا کہ اگر ہم بھاگنا چاہتے تو بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے۔ ہم نے جرم قبول کیا اور اپنا موقف واضح کرنے کے لئے بیان دیا۔ ہمیں سزا کا خوف نہیں ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمیں غلط سمجھا جائے۔ ہمارے بیان سے کچھ پیراگراف حذف کر دیئے گئے ہیں' یہ حقیقی صورت حال کو پیش کرنے کے نقطۂ نظر سے غیر سودمند ہے۔

مکمل طور پر ہمارے بیان کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر سے ہمارا ملک ایک نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں کافی بلند آواز میں تنبیہہ کی ضرورت تھی اور ہم نے اپنے خیال کے مطابق یہ تنبیہہ کی ہے۔ ممکن ہے کہ ہم غلطی پر ہوں' ہمارا طرز فکر فاضل ججوں کے طرز فکر سے مختلف ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں اپنے خیالات ظاہر کرنے کی اجازت نہ دی جائے اور غلط باتیں ہم سے منسوب کر دی جائیں۔

انقلاب زندہ باد اور سامراجیہ واد مردہ باد سے متعلق ہم نے جو وضاحت اپنے بیان میں کی ہے' اسے حذف کر دیا گیا ہے: حالاں کہ یہ ہمارے مقصد کا خاص حصہ ہے۔ انقلاب زندہ باد سے ہمارا یہ مقصد نہیں تھا جو عام طور پر غلط معنوں میں لیا جاتا ہے۔ پستول اور بم انقلاب نہیں لاتے بلکہ انقلاب کی تلوار نظریات کی دھار پر تیز ہوتی ہے اور یہی چیز تھی' جسے ہم ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے انقلاب کا مطلب سرمایہ دارانہ جنگوں کے مصائب کا خاتمہ ہے۔ اہم مقصد اور اس سے حاصل کرنے کے عمل کو سمجھے بغیر کسی کے متعلق فیصلہ دینا مناسب نہیں۔ غلط باتیں ہمارے ساتھ منسوب کرنا سراسر ناانصافی ہے۔

اس لئے آگاہ کرنا بہت ضروری تھا۔ بے چینی دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ اگر مناسب علاج نہ کیا گیا تو مرض خطرناک شکل اختیار کرلے گا۔ کوئی بھی انسانی طاقت اس کی روک تھام نہ کر سکے گی۔ اب ہم نے اس طوفان کا رخ بدلنے کے لئے یہ کارروائی کی۔ ہم تاریخ کے سنجیدہ طالب علم ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر برسراقتدار طاقتیں صحیح وقت پر صحیح کارروائیاں کرتیں تو فرانس اور روس کا خوں ریز انقلاب نہ برپا ہوتا۔ دنیا کی کئی عظیم حکومتیں نظریات کے طوفان کو روکتے ہوئے خون خرابے کی فضا میں معدوم ہو گئیں۔ برسراقتدار لوگ حالات کے رخ کو موڑ سکتے ہیں۔ ہم پہلے متنبہ کر دینا چاہتے تھے اور اگر ہم کچھ افراد کے قتل کے خواہش مند ہوتے تو ہم اپنے اہم مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ مائی لارڈ' اس نے نیت (جذبہ) اور مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم نے یہ عمل انجام دیا اور اس عمل کے نتائج ہمارے بیان کی حمایت کرتے ہیں۔ ایک اور نکتہ واضح کر دینا ضروری ہے۔ اگر ہم بموں کی طاقت سے متعلق قطعی لاعلم ہوتے تو ہم پنڈت موتی لال نہرو' مسٹر کیلکر' مسٹر جے کر اور مسٹر جناح جیسے معزز افراد کی موجودگی میں کیوں بم پھینکتے؟ ہم اپنے رہنماؤں کی زندگی کس طرح خطرے میں ڈال سکتے تھے؟ ہم پاگل تو نہیں ہیں؟ اور اگر پاگل ہوتے تو ہمیں جیل میں بند کرنے کے بجائے پاگل خانہ میں بند کیا جاتا۔ بموں سے متعلق ہمیں بخوبی جانکاری تھی۔ اسی وجہ سے ہم نے ایسی ہمت کی۔ جن بنچوں پر لوگ بیٹھے تھے' ان پر بم پھینکنا بہت آسان کام تھا لیکن خالی مقامات پر بموں کو پھینکنا بہت مشکل کام تھا۔ اگر بم پھینکنے والے صحیح دماغ کے نہ ہوتے یا وہ پریشان (غیر متوازن) ہوتے تو بم خالی جگہ کی بجائے بنچوں پر گرتے' تو میں کہوں گا کہ خالی جگہ کے انتخاب کے لئے جو ہمت ہم نے کھائی' اس کے لئے ہمیں انعام ملنا چاہئے۔ ان حالات میں مائی لارڈ ہمارا خیال ہے کہ ہمیں صحیح طرح سے سمجھا نہیں گیا۔ آپ سے گزارش ہے کہ نہ تو ہم سے غیر مناسب سلوک کیا جائے' نہ ہمارے متعلق غیر موزوں رائے دی جائے۔ سزا کا سوال ہمارے لئے بے معنی ہے۔

بھگت کے والد سردار کشن سنگھ اور ماں ودیاوتی

نیچے: لائل پور میں (فیصل آباد پاکستان) میں چک نمبر 105 بنگے گاؤں کا وہ مکان جہاں بھگت سنگھ پیدا ہوئے۔

چچی حکم کور (سورن سنگھ کی بیوی)

گرمکھی میں چچی کے نام بھگت سنگھ کا خط

چچا سورن سنگھ

سردار اجیت سنگھ
سردار ارجن سنگھ (دادا)
چچی ہرنام کور
سردار کشن سنگھ اپنے بیٹے کلبیر سنگھ کے ساتھ

(بائیں سے) حکم کور، ماں ودیاوتی، جے کور (بھگت سنگھ کی دادی) اور ہرنام کور
(بائیں سے) کشن سنگھ، بی بی امر کور، پاروتی بائی (راج گرو کی ماں)
نیچے کلتار سنگھ (بھگت سنگھ کے بھائی) بھگت سنگھ کے بھائی
وریندر سندھو (کلتار سنگھ کی بیٹی)

بھگت سنگھ اپنے ڈرامہ گروپ کے ممبران کے ساتھ (پچھلی صف میں دائیں سے چوتھے نمبر پر)

بھگت سنگھ سی آئی ڈی پولیس کی حراست میں (لاہور، مئی جون 1927)

بھگوتی چرن وو ہرہ اپنی بیوی درگا اور فرزند شچندر کے ساتھ

شچندر وو ہرہ

بھگت سنگھ کی گھڑی اور جوتے جو انہوں نے 1929 میں اپنے دوست جے دیو کو بطور تحفہ دے دیا تھا۔

شہید بھگت سنگھ کی یاد میں جاری کردہ ڈاک ٹکٹ

لاہور میں پولیس سپرنٹنڈنٹ کا دفتر۔ اسی کے ساتھ 17 دسمبر 1928 کو سانڈرس کو گولی ماری گئی تھی۔

لاہور کا بریڈلے ہال؛ جس کا افتتاح 30 اکتوبر 1900 کو سریندر ناتھ بنرجی نے کیا تھا۔ یہاں کے نیشنل کالج میں بھگت سنگھ نے تعلیم پائی تھی۔ یہ تاریخی عمارت ملک کی جدوجہد آزادی کے بڑے مرکزوں میں سے ایک ہے۔

جیل میں بھوک ہڑتال کے دوران (1929) کے دوران انقلابیوں کا پوسٹر

لاہور میں شادمان چوک جہاں پہلے لاہور سنٹرل جیل کا تختہ دار واقع تھا۔ بھگت سنگھ کو اسی مقام پر 23 مارچ 1931 کو تختہ دار پر چڑھایا گیا۔

باب۔3

مضامین

پنجابی زبان اور رسم الخط کا مسئلہ

1924 کا واقعہ ہے پنجاب میں لسانی تنازعہ پیدا ہو گیا تھا۔ پنجابی زبان کا رسم الخط کیا ہو؟ یہ سوال پیدا ہو گیا تھا۔ اردو اور ہندی کے حامی خوب بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔ مختلف قسم کے دلائل دیئے جا رہے تھے۔ بھگت سنگھ بھی اس سلسلے میں اپنی فکر سازی میں منہمک تھے۔ پنجابی زبان اور رسم الخط کے مسئلہ پر یہ مضمون انہوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن کے لئے تحریر کیا تھا اور سمیلن میں اسے اول درجہ ملا اور 50 روپے کا انعام بھی دیا گیا۔
یہ مضمون سمیلن کے صدر نشین مسٹر بھیم سین ودیالنکار نے محفوظ رکھا اور بھگت سنگھ کی قربانی کے بعد 28 فروری 1933 کے 'ہندی سندیش' میں شائع کیا۔ -مدیر

''کسی سماج یا ملک کی اپنی شناخت سازی کے لئے اس سماج یا ملک کے ادب سے واقفیت کی شدید ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ سماج کی بیداری اس وقت کے ادب میں بھی جھلکتی ہے۔
مذکورہ بالا قول کی سچائی کی تاریخ گواہ ہے۔ جس ملک کا ادبی رجحان جس سمت مائل ہوتا ہے' ٹھیک اسی طرف وہ بھی گامزن ہوتا ہے۔ کسی بھی نسل کی ترقی کے لئے ادب عالیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ملک کا ادب بلند ہوتا ہے' ویسے ویسے ملک بھی ترقی کرتا رہتا ہے۔ وطن پرست چاہے وہ محض سماجی مصلح ہوں یا سیاسی لیڈر' سب سے زیادہ توجہ ملک کے ادب کی جانب ہی کرتے ہیں۔ اگر وہ سماجی مسائل اور حالات کے مطابق جدید ادب کی عکاسی نہ کریں تو ساری کوششیں بے کار ہو جائیں اور ان کے کام کا تسلسل برقرار نہ رہے۔
شاید گیری بالڈی کو اتنی فوجیں نہ مل پاتیں اگر میجنی نے 30 سال ملک میں ادب اور ادبی بیداری پیدا کرنے میں نہ لگائے ہوتے۔ آئرلینڈ کی نشاط ثانیہ کے ساتھ گیلک زبان کی از سر نو تشکیل کی کوشش بھی اسی طرز پر کی گئی۔ حکمراں طبقہ آئرش لوگوں کو دبا کر رکھنے کے لئے ان کی زبان کا استحصال اس قدر ضروری سمجھتے تھے کہ گیلک زبان کی ایک آدھ نظمیں رکھنے کے سبب چھوٹے چھوٹے بچوں تک کو سزا دیتے تھے۔ روسو' والٹیئر کے ادب کے بغیر انقلاب فرانس رونما نہیں ہوتا۔ اگر ٹالسٹائے' کارل مارکس اور میکسم گورکی جدید ادب کے لئے برسوں نہ گزارتے تو روس کا انقلاب وجود میں نہ آتا' اشترا کی نظریہ کی تشہیر اور عمل تو دور کی بات ہے۔

یہی صورت حال سماجی اور مذہبی مصلحین میں نظر آتی ہے۔ کبیر کے ادب کے سبب ان کے جذبات کا اثر مستقل طور پر نظر آتا ہے۔ آج تک ان کی شیریں اور پر کیف نظموں کو سن کر لوگ مدہوش ہو جاتے ہیں۔

بالکل یہی بات گرونانک دیو جی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ سکھ گروؤں نے اپنے مذہب کے پرچار کے ساتھ جب نیا فرقہ محدود کرنا شروع کیا' اس وقت انہوں نے نئے ادب کی ضرورت محسوس کی اور اسی نظریہ پر گرو گوند دیو جی نے گرومکھی رسم الخط وضع کیا۔ صدیوں تک مسلسل جنگ اور مسلمانوں کے حملوں کے سبب پنجاب میں ادب کی کمی ہو گئی تھی۔ ہندی زبان کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ اس وقت کسی ہندوستانی رسم الخط کو ہی اپنانے کے لئے انہوں نے کشمیری رسم الخط کو اپنا لیا۔ بعد ازاں گرو ارجن دیو جی اور بھائی گرو داس جی کی کوششوں سے آدی گرنتھ کا وجود عمل میں آیا۔ اپنے رسم الخط اور ادب سازی سے اپنے عزم کو مستحکم شکل دینے میں انہوں نے بہت موثر اور مفید قدم اٹھایا۔

اس کے بعد جیسے جیسے حالات بدلے ادبی رجحان میں بھی تبدیلی آئی۔ گروؤں کے مسلسل ایثار اور مصائب جھیلنے سے حالات بدلتے گئے۔ جہاں ہمیں پہلے گرو کی نصیحت میں بھگتی اور روحانیت کے جذبات سنتے ہیں اور مندرجہ ذیل شعر میں کمال عاجزی کا جذبہ پاتے ہیں:

نانک ننھے ہو رہے' جیسی ننھی دوب
اور گھاس جری جات ہے' دوب خوب کی خوب

وہیں ہم نویں گرو شری تیغ بہادر جی کے پیغامات میں پسماندہ لوگوں سے ہمدردی اور ان کی مدد کا جذبہ پاتے ہیں:

بانہیں جنہاں دی بولیا' دھرتی پے دھرم نہ چھوڑیئے
گرو تیغ بہادر بولیا' دھرتی پہ دھرم نہ چھوڑئے

ان کی قربانی کے بعد ہم یکایک گوبند سنگھ جی کے پیغامات میں طلبہ دھرم کا جذبہ پاتے ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اب محض جذبہ بھگتی سے ہی کام نہیں چلے گا تو انہوں نے چنڈی کی پوجا بھی شروع کی اور بھگتی اور طلبہ دھرم کو مدغم کر کے سکھ فرقہ کو بھگتوں اور مجاہدین کا گروپ بنا دیا۔ ان کی نظم (ادب) میں ہم نیا جذبہ دیکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

جے تو ہی پریم کھیلن کا چاؤ' سر دھر تلی گلی میری آؤ
جے اس مارگ پیر دھر یجے' سر دیجے کان نہ کیجیے

اور پھر

سرا سو پہنچانئے' جو لڑے دین کے ہیت
پور جا پور جا کٹ مرے' کبھو نہ چھانڑے کھیت

اور پھر یکایک کھڈگ کی پوجا شروع ہو جاتی ہے

کھگ کھنڈو ہنڈ' کھل دل کھنڈ اتی رن منڈ پر کھنڈ
بھج دنڈ اکھنڈ' تیج پرچنڈ جوتی اجھنڈ بھانو پر بھ

انہی جذبات کے ساتھ بابا بندہ وغیرہ مسلمانوں کے خلاف مسلسل جنگ کرتے رہے۔ مگر اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جب سکھ فرقہ محض نزاع پسندوں کا ایک گروپ رہ جاتا ہے اور جب اسے غیر قانونی قرار دے دیا جاتا ہے تو انہیں مسلسل جنگلوں میں ہی رہنا پڑتا ہے۔ اب اس وقت جدید ادب کی تخلیق نہیں ہو سکی۔ ان میں جدید جذبہ نہیں بھرے جا سکے۔ ان میں تعلیمی

شغف، شجاعت اور ایثار کا جذبہ تھا اور مسلم حکمرانوں کے خلاف جنگ کرتے رہنے کا جذبہ تھا۔ مگر اس کے بعد کیا کرنا ہوگا، یہ وہ اچھی طرح نہیں سمجھ سکے۔ تبھی تو ان بہادر مجاہدین کے گروپ (مثال کے طور پر) باہم متصادم ہوگئے۔ یہاں مشترکہ جذبوں کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ اگر بعد میں رنجیت سنگھ جیسے بہادر مجاہد اور چالاک حکمراں رونما نہ ہوتا تو سکھوں کو مجتمع کرنے کے لئے کوئی اعلیٰ آئیڈیل یا جذبہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

ان سب کے ساتھ ایک بات اور قابل توجہ ہے۔ سنسکرت کا پورا ادب ہندو سماج کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکا، اس لئے مشترکہ زبان میں جدید ادب تخلیق کیا گیا۔ اس مشترکہ جذبات کے ادب نے اپنا جو اثر دکھایا، وہی ہم آج تک محسوس کرتے ہیں۔ ایک اچھے سمجھ دار فرد کے لئے کلشٹ سنسکرت کے منتر اور قدیم عربی آیات اتنی موثر نہیں ہوسکتیں جتنی ان کی اپنی عام زبان میں عام باتیں۔

اوپر پنجابی زبادن وادب کے فروغ کی مختصر تاریخ لکھی گئی۔ اب ہم موجودہ عقیدہ پر بات کرتے ہیں۔ تقریباً ایک ہی وقت بنگال میں سوامی ویویکا نند اور پنجاب میں سوامی رام تیرتھ پیدا ہوئے۔ دونوں ایک ہی نصب العین کے عظیم فرد تھے۔ دونوں غیر ممالک میں ہندوستانی علوم کا سکہ جما کر خود بھی مشہور عالم ہوگئے لیکن سوامی ویویکا نند کا مشن بنگال میں ایک مستقل ادارہ بن گیا مگر پنجاب میں سوامی رام تیرتھ کی یادگار تک نظر نہیں آتی۔ ان دونوں نظریات میں بڑی خلیج کے باوجود بھی اس کی تہہ میں ہم گہری یکسانیت دیکھتے ہیں۔ جہاں سوامی ویویکا نند عمل کی تبلیغ کر رہے تھے، وہیں سوامی رام تیرتھ بھی مستانہ وار گنگناتے تھے:

ہم روکھے ٹکڑے کھائیں گے، بھارت پر وارے جائیں گے
ہم سوکھے چنے چبائیں گے، بھارت کی بات بنائیں گے
ہم ننگے عمر بتائیں گے، بھارت پر جان مٹائیں گے

وہ کئی بار امریکہ میں سورج غروب ہوتے وقت آنسو بہاتے ہوئے کہا کرتے تھے۔ ''تم اب میرے پیارے ہندوستان میں طلوع ہونے جارہے ہو۔ میرے ان آنسوؤں کو ہندوستان کے حسین خوب صورت کھیتوں میں شبنم کی بوندوں کے طور پر رکھ دینا۔ اتنا عظیم ملک اور خدا کا پرستار ہمارے صوبہ میں پیدا ہوا ہو مگر اس کی یادگار تک دکھائی نہ دے، اس کی وجہ ادبی پھسڈے پن کے علاوہ کیا ہوسکتی ہے۔

اس بات کو ہم قدم قدم پر محسوس کرتے ہیں۔ بنگال کی عظیم شخصیت شری دیویندر ناٹھا کر اور شری کیشو چندر سین کے پایہ کی پنجاب میں کئی عظیم شخصیات پیدا ہوئیں۔ مگر ان کی وہ قدر و منزلت نہیں اور بعد از مرگ انہیں جلد ہی فراموش بھی کر دیا گیا جیسے گرو گیان سنگھ وغیرہ۔ ان سب کی تہہ میں، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی اہم وجہ ہے اور وہ ہے ادب کے تئیں دلچسپی کا چوطرفہ فقدان۔

یہ تو لازمی ہے کہ ادب کے بغیر کوئی ملک یا نسل ترقی نہیں کر سکتی مگر ادب کے لئے سب سے پہلے زبان کی ضرورت ہوتی ہے اور پنجاب میں اس کا فقدان ہے۔ اتنے دنوں سے اس کمی کے تجربہ کے بعد بھی زبان کا کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا۔ بدقسمتی سے اس کی اہم وجہ زبان کو ہمارے صوبہ کا مذہبی مسئلہ بنادینا ہے۔ دیگر صوبوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے صوبائی زبان کو خوب اپنالیا ہے۔ بنگال کے ادبی حلقوں میں شاعر نذرالاسلام ایک روشن ستارے ہیں۔ ہندی شاعروں میں لطیف حسین 'نٹور' قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح گجرات میں بھی ہیں مگر پنجاب اس معاملے میں بدقسمت ہے۔ یہاں مسلمانوں کا سوال تو الگ ہے ہندو سکھ بھی اس بات پر باہم جمع نہیں ہوسکے۔

پنجاب کی زبان دیگر صوبوں کی طرح پنجابی ہونی چاہئے تھی پھر کیوں نہیں ہوئی' یہ سوال ضرور اٹھتا ہے مگر یہاں مسلمانوں نے اردو کو اپنایا۔ مسلمانوں میں ہندوستانیت کا مکمل طور پر فقدان ہے' اس لئے وہ پورے ہندوستان میں ہندوستانیت کو اہمیت نہ دے کر عربی رسم الخط اور فارسی زبان کی تشہیر کرنا چاہتے ہیں۔ پورے ہندوستان کی ایک زبان اور وہ بھی ہندی ہونے کی اہمیت ان کی سمجھ میں نہیں آتی' اس لئے وہ اردو کی رٹ لگاتے رہے اور ایک جانب بیٹھ گئے۔

پھر سکھوں کا نمبر آیا۔ ان کا مکمل ادبی سرمایہ گرمکھی رسم الخط میں ہے۔ اس زبان میں اچھی خاصی ہندی ہے مگر اہم پنجابی زبان ہے، اس لئے سکھوں نے گرمکھی رسم الخط میں لکھی جانے والی پنجابی زبان کو ہی اپنا لیا۔ وہ اس کو کسی بھی طرح ترک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اسے مذہبی بنا کر اس سے چپٹ گئے۔

ادھر آریہ سماج کا ظہور ہوا۔ سوامی دیا نند سرسوتی نے پورے ہندوستان میں ہندی کا جذبہ بیدار کیا۔ ہندی زبان آریہ سماج کا ایک مذہبی حصہ بن گئی اور آریہ سماجیوں کی شدت پسندی سے ہندی زبان نے اپنا مقام بنا لیا۔ آریہ سماج کے ابتدائی دنوں میں سکھوں اور آریہ سماجیوں کے مذہبی اجلاس ایک ہی مقام پر ہوتے تھے۔ اس وقت میں ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا مگر بعد میں 'ستیارتھ پرکاش' کے ایک دو جملوں کے سبب آپس میں اختلافات بڑھے اور دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے۔ اسی دھارا میں بہہ کر سکھ لوگ ہندی زبان کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ دوسرے لوگوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

بعد ازاں کہا جاتا ہے کہ آریہ سماجی لیڈر مہاتما ہنس راج جی نے لوگوں سے کچھ صلاح مشورہ کیا کہ اگر وہ ہندی رسم الخط کو اپنا لیں تو ہندی رسم الخط میں تحریر کی جانے والی پنجابی زبان کو یونیورسٹی میں منظور کرا لیں گے لیکن بدقسمتی سے وہ لوگ عدم رواداری اور ادبی بیداری نہ ہونے کے سبب اس کی اہمیت نہ سمجھ سکے اور یہ نہ ہو سکا۔ خیر! تو اس وقت پنجاب میں تین آراء ہیں۔ اولاً مسلمانوں کا اردو سے متعلق سخت گیر نظریہ' دوسرا آریہ سماجیوں اور کچھ ہندوؤں کا ہندی اور تیسرا پنجابی نظریہ۔

اس وقت ہم ایک ایک زبان کے متعلق کچھ اظہار خیال کریں تو نامناسب ہوگا۔ سب سے پہلے ہم مسلمانوں کے بارے میں بات کریں گے۔ وہ اردو سخت حامی ہیں۔ اس وقت پنجاب میں اسی زبان کا زور بھی ہے۔ عدالتی زبان بھی یہی ہے اور دوسرے مسلم دانشوروں کا خیال ہے کہ اردو رسم الخط میں بڑی بات تھوڑی جگہ میں لکھی جا سکتی ہے۔ یہ سب ٹھیک ہے مگر ہمارے سامنے اس وقت سب سے اہم سوال ہندوستان کو متحد ملک بنانا ہے۔ ایک ملک کے لئے ایک زبان ہونا لازمی ہے مگر یہ سب آن واحد میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے قدم بہ قدم چلنا پڑتا ہے۔ اگر ہم ابھی ہندوستان کی ایک زبان نہیں بنا سکتے تو کم از کم رسم الخط تو ایک کر دینا ہی چاہئے۔ اردو رسم الخط تو پوری طرح مکمل نہیں کہلا سکتا اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ زبان فارسی زبان پر مبنی ہے۔ اردو شاعروں کی پرواز' خواہ وہ ہندی (ہندوستانیت) ہی کیوں نہ ہو' ایران کے ساقی اور عرب کی کھجوروں تک جا پہنچتی ہے۔ قاضی نذرالاسلام کی نظم میں تو دھرجی' وشوامتر اور درواسا کا ذکر بار بار ہوتا ہے۔ مگر ہمارے پنجابی ہندی۔ اردو کے شعرا اس طرف تھوڑی بھی توجہ نہیں دے سکے' کیا یہ دکھ کی بات نہیں ہے؟ اس کی اہم وجہ ہندوستانیت اور ہندوستانی ادب سے ان کی عدم واقفیت ہے۔ ان میں ہندوستانیت سرایت ہی نہیں کر پاتی تو پھر ان کے تخلیق کردہ ادب سے ہم کہاں تک ہندوستانی بن سکتے ہیں۔ محض اردو جیسی ادبی زبان میں ان گرنتھوں کا ترجمہ نہیں ہو سکتا مگر اس میں بالکل ویسا ہی ترجمہ ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک ایرانی کو ہندوستانی ادب سے متعلق علم حاصل کرنے کے لئے لازمی ہو۔

ہم اپنے مذکورہ بالا قول کی حمایت میں صرف اتنا ہی کہیں گے کہ جب معمولی آریہ اور سوراج وغیرہ الفاظ کو آریہ اور

سوراجیہ لکھا اور پڑھا جاتا ہے تو پھر مخفی روحانیت سے متعلق موضوعات کا ذکر ہی کیا؟ ابھی اس دن شری لالہ ہردیال جی ایم اے کی اردو کتاب ''قومیں کس طرح زندہ رہ سکتی ہیں؟ کا ترجمہ کرتے ہوئے سرکاری مترجم نے کرشی نچی کیتا کو اردو میں لکھنے کی وجہ سے نچی کتیا سمجھ کر 'اے بچ آف لو اور یجن' ترجمہ کر دیا۔ اس میں نہ تو لالہ ہردیال جی کا جرم تھا نہ مترجم صاحب کا۔ اس میں قصور تھا اردو رسم الخط کا اور اردو زبان کا ہندی زبان وادب سے انفرادیت کا۔

ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہندوستانی زبان اور رسم الخط رائج ہیں۔ ایسے حالات میں پنجاب میں اردو کو فروغ دے کر کیا ہم ہندوستان سے یک لخت الگ تھلگ ہو جائیں؟ نہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اردو کے کٹر حامی مسلمان مصنفین کی اردو میں فارسی ہی غالب رہتی ہے۔ 'زمین دار' اور 'سیاست' وغیرہ مسلم اخباروں میں تو عربی کا زور رہتا ہے جسے ایک عام آدمی سمجھ بھی نہیں سکتا۔ ایسے حالات میں اس کا پروپیگنڈہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ہم تو چاہتے ہیں کہ مسلم بھائی بھی اپنے مذہب پر اولوالعزمی کے قائم رہتے ہوئے بالکل ویسے ہی ہندوستانی بن جائیں جیسے کہ کمال ترک ہیں۔ ہندوستانیت تبھی قائم ہو سکے گی۔ ہمیں لسانی مسائل کو مذہبی مسائل نہ بنا کر زیادہ وسیع تناظر میں دیکھنا چاہئے۔

اس کے بعد ہم ہندی۔ پنجابی زبانوں کے مسائل پر غور کریں گے۔ بہت سے اصول پسند افراد پوری دنیا کو ایک ملک' عالمی ملک کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ آئیڈیل بہت خوب صورت اور حسین ہے۔ ہم کو بھی اسی آئیڈیل کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ آج اس پر پوری طرح عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا مگر ہمارا ہر قدم' ہمارا ہر عمل کرۂ ارض کی تمام نسلوں' ممالک اور ملکوں کو مضبوط دھاگے میں باندھ کر خوش حالی میں اضافہ کرنے کے مقصد سے ہونا چاہئے۔ اس سے پہلے ہمیں اپنے ملک میں یہی تصور قائم کرنا ہوگا۔ پورے ملک میں ایک زبان' ایک رسم الخط' ایک ادب' ایک آئیڈیل اور ایک ملک بنانا پڑے گا۔ مگر ان سب یکسانیت سے قبل ایک زبان کا وجود ضروری ہے تاکہ ہم ایک دوسرے کو بہ خوبی سمجھ سکیں۔ ایک پنجابی اور ایک مدراسی باہم بیٹھ کر ایک دوسرے کا منہ نہ دیکھیں بلکہ ایک دوسرے کے افکار وجذبات کو جاننے کی کوشش کریں مگر یہ پرائی زبان انگریزی میں نہیں بلکہ ہندوستان کی اپنی زبان ہندی میں۔ یہ آئیڈیل بھی پورا ہونے میں ابھی کئی برس لگیں گے۔ اس کوشش میں ہمیں سب سے پہلے ادبی بیداری پیدا کرنی چاہئے۔ محض گنتی کے چند ایک افراد میں نہیں بلکہ بھی افراد میں۔ سبھی افراد میں ادبی بیداری پیدا کرنے کے لئے ان کی اپنی زبان ہی ضروری ہے۔ اسی دلیل کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب میں پنجابی زبان ہی آپ کو کامیاب بنا سکتی ہے۔

ابھی تک پنجابی ادبی زبان نہیں بن سکی ہے اور وہ پورے پنجاب کی ایک زبان بھی نہیں ہے۔ گرمکھی رسم الخط میں لکھی جانے والی وسطی پنجاب کی بول چال کی زبان کو ہی اس وقت تک پنجابی کہا جاتا ہے۔ وہ نہ تو ابھی تک خاص طور سے رائج ہو پائی ہے اور نہ ہی ادبی اور سائنسی بن پائی ہے۔ اس کی جانب پہلے تو کسی نے توجہ ہی نہیں دی مگر اب جو حضرات اس طرف توجہ دے بھی رہے ہیں' انہیں رسم الخط کی عدم تکمیلیت کھٹکتی ہے۔ مشترکہ حروف کی کمی اور سائلنٹ (ہلنت) نہ لکھنے کے سبب اس میں بھی ٹھیک ٹھیک سبھی الفاظ نہیں لکھے جا سکتے ہیں۔ مزید برآں' مکمل الفاظ بھی نہیں لکھے جا سکتے۔ یہ رسم الخط تو اردو سے بھی زیادہ نامکمل ہے اور جب ہمارے سامنے سائنسی اصولوں پر مبنی مکمل طور پر ہندی رسم الخط موجود ہے پھر اسے اپنانے میں کیسی ہچکچاہٹ؟ گرمکھی رسم الخط تو ہندی حروف کی ہی بگڑی شکل ہے۔ شروع میں ہی اس کا........ کا...... بنا ہوا ہے اور........... وغیرہ تو وہی حرف ہے۔ سبھی قواعد ملتے ہیں پھر بلا تردد اسے اپنانے سے کتنا فائدہ ہو جائے گا؟ مکمل طور پر موجود رسم الخط کو اپناتے ہی پنجابی زبان کی ترقی شروع ہو جائے گی اور اس کی تشہیر میں کیا پریشانی؟ پنجاب کی ہندو خواتین اسی رسم الخط سے واقف ہیں۔

ڈی اے وی اسکولوں اور سناتن دھرم اسکولوں میں ہندی ہی پڑھائی جاتی ہے۔ایسے حالات میں پریشانی ہی کیا ہے؟ ہندی کے حامیوں سے ہم کہیں گے کہ لازمی طور پر ہندی زبان ہی بالآخر پورے ہندوستان کی زبان بنے مگر پہلے سے ہی اس کی تشہیر سے بہت مدد ملے گی۔ ہندی رسم الخط اپنانے سے ہی پنجابی ہندی جیسی بن جاتی ہے پھر تو کوئی اختلاف ہی نہیں رہے گا اور اس کی ضرورت ہے'اس لئے کہ سبھی افراد کو تعلیم یافتہ بنایا جاسکے اور یہ اپنی زبان کے اپنے ادب سے ہی ہوسکتا ہے۔ پنجابی کی یہ نظم ملاحظہ کریں:

اوراہیارا ہے جاندیا' سن جا گل میری
سرتے پگ تیرے ولیت دی'اہنو پھوک مآ تڑالا

اور اس کے مقابلے میں ہندی کی بڑی بڑی خوب صورت نظمیں چنداں متاثر نہیں کرسکیں گی کیوں کہ وہ ابھی تمام افراد کے دلوں میں صحیح طرح سے اپنا مقام نہیں بنا سکی ہیں۔وہ ابھی تھوڑی پرائی نظر آتی ہیں۔وجہ یہ ہے کہ ہندی کی بنیاد سنسکرت ہے۔ پنجاب اس سے کوسوں دور ہو چکا ہے۔ پنجابی میں فارسی کا بہت اثر ہے۔یعنی چیز کی جمع چیزیں نہ ہو کر فارسی کی طرح 'چیزاں'بن گئی ہے۔یہ اصول آخر تک کام کرتا نظر آتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پنجابی کے قریب ہونے پر بھی ہندی ابھی پنجابی قلوب سے کافی دور ہے۔ہاں پنجابی زبان کے ہندی رسم الخط میں لکھے جانے پر اور اس کے ادبی بنانے کی جدوجہد میں یقیناً وہ ہندی کے نزدیک آجائے گی۔

سبھی اہم امور پر دلیل دی جا چکی ہے۔اب محض ایک بات کہیں گے۔ بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ پنجابی زبان میں مٹھاس'زیبائش وخوبصورتی اور جذبات کا فقدان ہے۔یہ سراسر بے بنیاد اور لغویات ہے۔ابھی اس دن ''لچھیے جتھے تو پانی ڈولیا اوتھے اگ گئے صندل دے بوٹے'' گیت کی خوب صورتی نے شاعر رویندر ناتھ کو مسحور کر دیا اور وہ فوراً انگریزی میں ترجمہ کرنے لگے:

O Lachi, where there spilt water, where there spilt water...etc...etc

اس کی مزید مثالیں دی جاسکتی ہیں۔درج ذیل نظم کا مصرعہ کسی دیگر زبان کی شاعری سے کم ہے؟

پہلے دے پتیاں وے کیہی کھڑ کھڑ لائی اے
پتے جھڑے پرانے ہن رت نویاں دی آئی آ

اور پھر جب پنجابی تنہایا گروپ میں بیٹھا ہو تو ''گوہر'' کے یہ اشعار جتنے موثر ہوں گے اتنا کوئی دیگر زبان کیا کرے گی؟

لام لکھاں تے کروڑاں دے شاہ وے کھے نے مسافراں کوئی ادھار دیں دا
دینے راتیں جنہوں دے کوچ ڈیرے نہ انہاں دے تھائیں کوئی اعتبار دیں دا
بھورے بہندے گلاں دی واشنا تے' ناسپا دے مہاں تے کوئی پیار دیں دا
گوہر سے سلوک ہن جیوں دیا دے مویاں گیاں نوں ہر کوئی وسار دیں دا

اور پھر

جیم جیوں دیاں نو کیوں مارنا اے' جے کرنہیں توں مویاں نو جواون جوگا
گھر آئے سوالی نوں کیوں گھورنا اے' جے کرنہیں توں تھی خیر پون جوگا

ملے دلاں نوں کیوں پچھوڑنا ائے' جیکر نہیں تو بچھڑیاں نو ملون جوگا
گوہرا بدیاں رکھ بند کھانے' جیکر نہیں توں نیکیاں کمون جوگا

اور پھر اب تو درد مستانہ دیوانہ بڑے اچھے اچھے شاعر پنجابی شاعری کے ذخیرے میں اضافہ کر رہے ہیں۔
ایسی شیریں ایسی مسحور کن زبان تو پنجابیوں نے ہی نہ اپنائی' یہی افسوس ہے۔ اب بھی نہیں اپناتے' مسئلہ یہی ہے۔ ہر شخص اپنی بات کے پیچھے مذہبی ڈنڈا لئے کھڑا ہے۔ اس تنازعہ کو کس طرح دور کیا جائے' یہی پنجاب کی زبان اور رسم الخط کا موضوعاتی مسئلہ ہے۔ لیکن اتنی امید ہے کہ سکھوں میں اس وقت ادبی بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ ہندوؤں میں بھی ہے۔ سبھی سمجھ دار لوگ مل بیٹھ کر حتمی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ مذہبی افکار سے بالاتر ہو کر اس سوال پر غور کیا جا سکتا ہے' ویسے ہی کیا جائے' اور پھر امرتسر کے 'پریم' جیسے خط کی زبان کو کچھ ادبی بناتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی میں پنجابی زبان کو منظور کرا دینا چاہئے۔ اس طرح تمام تنازعات حل ہو جائیں گے۔ ان اختلافات کے تصفیہ کے بعد پنجاب میں اس قدر حسین و عظیم ادب پیدا ہوگا جس کا شمار ہندوستان کی بہترین زبانوں میں ہوگا۔

عالم دوستی

بلونت سنگھ کے چھدوم نام سے تحریر کردہ بھگت سنگھ کا یہ مضمون کلکتہ سے ہفتہ وار 'متوالا' (سال:2 شمارنمبر 14-13) کے دو شماروں میں شائع ہوا تھا۔ ان شماروں کی تاریخ بالترتیب 15 نومبر 1924 اور 22 نومبر 1924 تھی۔ مدیر

''واسودیو کٹمبکم''، جس عظیم شاعر کا تخیل ہے' جس عالمی محبت کے شیدائی کے دل کی آواز ہے' اس کی عظمت کا تذکرہ انسانی طاقت سے ماورئی ہے۔
'عالمی اخوت' کا مطلب میں دنیا میں مساوات (World wide Equality in the true sense) کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتا۔
کتنا عظیم ہے یہ نظریہ! سبھی اپنے ہوں۔ کوئی بھی غیر نہ ہو۔ کتنا پرسکون اور پرمسرت ہوگا وہ وقت جب دنیا سے بیگانگی اور اجنبیت مکمل طور سے ختم ہو جائے گی۔ جس دن یہ اصول دنیا میں عملی طور پر رائج ہو جائے گا' اس دن دنیا کو ترقی کی بلندی پر کہہ سکیں گے۔ جس دن ہر انسان اس جذبہ کو دل کی گہرائیوں میں بسا لے گا' اس دن......اس دن دنیا کیسی ہوگی؟ ذرا تصور کرو تو!
اس دن اتنی طاقت ہوگی کہ ''امن امن'' کی صدا بھی امن میں دخل انداز نہ ہو سکے گی۔ اس دن بھوک لگنے پر روٹی کے لئے کسی کو بھی شور و غل مچانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تجارت اس دن ترقی کی چوٹیوں پر ہوگی مگر فرانس اور جرمنی میں تجارت کے نام پر گھمسان کی جنگ نہیں ہوگی۔ اس دن امریکہ اور جاپان دونوں ہوں گے مگر ان میں مشرق و مغرب نہ ہوگا۔ کالے گورے اس دن بھی ہوں گے مگر امریکی باشندے وہاں کے کالے لوگوں (Red Indian) کو زندہ جلا نہ سکیں گے۔ امن ہوگا مگر پینل کوڈ کی ضرورت نہ ہوگی۔ انگریز بھی ہوں اور ہندوستانی بھی مگر ان میں غلام اور حاکم کا خیال نہ ہوگا۔ اس دن مہاتما ٹالسٹائے کے Resist not the evil (برائیوں کا علاج مت کرو) کے اصول کی بلند آواز نہ لگانے پر بھی دنیا میں

برائیاں نظر نہ آئیں گی۔ اس وقت ہوگی مکمل آزادی۔ کیسا ہوگا وہ وقت؟ ذرا تصور کرو!

موجودہ حالات کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جس وقت کسی کا بھی خوف نہ ہوگا مگر اپنی دلی تحریک سے انسان گناہ نہیں کریں گے۔ اگر اس دن بھی ہمیں کسی تصوراتی جنت کی خواہش ہوگی تو ہم کہہ دیں گے کہ جنت کوئی چیز ہے ہی نہیں! کیا وہ وقت آ سکتا ہے؟ یہ ہے ایک مسئلہ، ایک بڑا مسئلہ۔ اس کا جواب دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیا لوگ اس وقت کو وجود میں لانا چاہتے ہیں؟ وہ لوگ جو ''عالمی اخوت'' (Universal brotherhood یا Cosmopolitanism) کا شور مچاتے ہیں، کیا حقیقت میں اسے وجود میں لانے کے خواہش مند ہیں؟ ہاں کہہ دینے سے ہی کام نہیں چلے گا۔ کانگریس کی تجویز نہیں ہے۔ سوال سنجیدگی سے غور کرنے کے لائق ہے۔ کیا لوگ اس کے لئے قربانی دینے کے لئے تیار ہیں؟ اس بے نظیر مستقبل کے لئے ہمیں اپنا خستہ حال قربان کرنا ہوگا۔ اس تخیلاتی امن وسکون کے لئے ہمیں بدامنی پھیلانی ہوگی۔ اس ہوائی قلعہ کے لئے ہمیں سب کچھ نچھاور کرنا پڑے گا۔ اس پرامن ریاست کے قیام کے لئے ہمیں بڑی لاقانونیت اور خانہ جنگی پھیلانی ہوگی۔ اس ظلم وستم سے آزاد دنیا کو اپنی جانب کھینچنے کے لئے مظالم کرنے ہوں گے۔ اس سکھ بھری زندگی کے لئے نہیں، نہیں، اس کی امید کے لئے مرمٹنا ہوگا' کیا لوگ اس کے لئے تیار ہیں؟

ہمیں پروپیگنڈہ کرنا ہوگا' مساوات واخوت کا۔ ستم کرنا ہوگا ان پر جو اس کے منکر ہیں۔ لاقانونیت پھیلانی ہوگی ان سامراجیت پسند لوگوں پر جو طاقت کے زعم میں اندھے ہوکر کروڑوں لوگوں کے مصائب کا سبب بن رہے ہیں۔ کیا لوگ اس کے لئے تیار ہیں؟

ہمیں پوری دنیا کو ان اصولوں کے خیر مقدم کے لئے تیار کرنا ہوگا۔ اس پرامید کھیتی کے لئے ہمیں کھیتوں سے سب کچھ اکھاڑ پھینکنا ہوگا۔ خاردار جھاڑیوں کو اکھاڑ کر جوالا کی شانتی کے لئے ملیامیٹ کر دینا ہوگا۔ روڑا' کنکر پیس ڈالنا ہوگا؟ ہمیں سخت محنت کرنی ہوگی۔ گرے ہوئے لوگوں کو اٹھانا ہوگا۔ پسماندہ لوگوں کو ترقی کی راہ دکھانی ہوگی۔ فرضی طاقتوں کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ کھڑے ہونے پر مجبور کرنا ہوگا۔ متکبرین کے غرور کو توڑ کر ان کے ساتھ شفقت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ کمزوروں کو طاقت' غلاموں کو نجات' ناخواندہ کو خواندہ' ناامیدوں کو امید' بھوکوں کو روٹی' بے گھروں کو گھر' لامذہبوں کو یقین' کج عقیدگی کے حامیوں کو اظہار رائے کی آزادی دینی ہوگی۔ کیا لوگ اتنا کام کریں گے۔ اے عالمی اخوت کا نعرہ بلند کرنے والو! کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ اگر نہیں تو آج سے اس فریب کو ترک کر دو۔ ہمیں اس عالم دوست دیوی کے قدموں میں تمہاری بھی قربانی دینی ہوگی کیوں کہ تم واہمہ پسند ہو۔ اگر تیار ہو تو آجاؤ میدان عمل میں' ابھی امتحان ہو جائے گا۔ گھر بیٹھے ہوئے' گوشوں میں دبکے ہوئے 'میدان عمل کے خوف ناک مناظر کے تصور محض سے کانپتے ہوئے سچ کی روشنی سے باز رہنے کے لئے اس عظیم اصول کا سہارا مت لو۔ اگر سچ مچ اس تخیلاتی وقت لانے کا عزم ہے تو آؤ۔ پہلا کام گرے ہوئے ہندوستان کو اوپر اٹھانا ہوگا۔ غلامیوں کی زنجیروں کو کاٹنا ہوگا۔ مظالم کو ختم کرنا ہوگا۔ غلامی کو مٹی میں ملا دنیا ہوگا کیوں کہ اپنی کمزوری کے سبب اس نسل انسانی کو جس کی تخلیق خدائے برتر نے اپنے ہی مطابق کی تھی' انصاف کے راستے سے بھٹکانے کا لالچ ہو رہا ہے۔

اگر مذکورہ بالا قول کو سچ مانتے ہوئے بھی جیل کی ڈر سے یا پھانسی کے خوف سے اس راستے میں آنے سے ہچکچاتے ہو تو آج سے اس دکھاوے کو ترک کر دو۔

اگر اس خوف سے کہ انقلاب کے بعد خانہ جنگی پیدا ہو جائے گی یا قتل وغارت گری ہوگی' یکایک شورش برپا ہو جائے گی تو اس راستے میں نہیں آتے تو بھی تم خائف ہو' کائر ہو' بزدل ہو۔ اس دکھاوے کو چھوڑ دو۔

انتشار پیدا ہوتا ہے تو ہونے دو غلامی بھی تو نہ ہوگی۔ لاقانونیت برپا ہوتی ہے تو ہونے دو غلامی کا بھی تو خاتمہ ہو جائے گا۔ آہا! اس کشمکش میں کمزور پس جائیں گے۔ روز روز کا رونا بند ہو جائے گا۔ کمزور نہیں رہیں گے' طاقت ور لوگوں کے درمیان دوستی ہوگی' بڑی قوت رکھنے والوں میں نزدیکی ہوگی۔ ان میں محبت ہوگی' دنیا میں عالمی محبت کو فروغ ملے گا۔

ہاں! ہاں! کمزوروں کو ایک ہی بار میں پسنا ہوگا۔ وہ پوری دنیا کے مجرم ہیں۔ انہوں نے ہی بری طرح بدامنی پھیلا رکھی ہے۔ سب طاقت ور بنیں' نہیں تو اس چکی میں پس کر ملیدہ ہو جائیں گے۔

آیئے! کون ماں کا لال سچے دل سے عالمی اخوت کا خواہاں ہے۔ کون ہے پوری دنیا کے لئے سکھ چین قربان کرنے والا۔

کسی غلام نسل کو ان اعلیٰ اصولوں کا نام تک لینے کا حق نہیں ہے۔ ایک غلام انسان کے منہ سے نکل کر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ایک بے عزت انسان' ذلت' پیروں تلے روندے جانے والا انسان اگر کہے ''میں عالمی اخوت کا قائل ہوں' یونیورسل برادر ہوڈ کا حامی ہوں' اس لئے ان مظالم کا بدلہ نہیں لیتا تو اس کا کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کون سنے گا اس کے اس بزدلانہ جملے کو؟ ہاں تم طاقت ور ہو' تم مضبوط ہو' چاہو تو بڑے بڑے لوگوں کو پیروں تلے روند سکو' ایک اشارے میں بڑے سے بڑے مغرور لوگوں کو مٹی میں ملا سکو' تخت و تاج والوں کو خاک میں ملا سکو ان کو دھول چٹا سکو اور پھر تم یہ جملہ کہتے ہوئے کہ 'ہم دنیا سے محبت کرنے والے ہیں' ایسا نہ کرو' تو تمہاری بات باوزن اور موثر ہوگی۔ پھر تمہارا ایک ایک جملہ موثر ہوگا۔ پھر واسودھو کٹمبکم بھی معتبر ہو جائے گا۔

آج تم غلام ہو' محکوم ہو' قیدی ہو' تمہاری یہی بات آج ڈھونگ لگتی ہے' ایک دکھاوا لگتی ہے' بکواس معلوم ہوتی ہے۔ کیا تم اس کا پروپیگنڈہ کرنا چاہتے ہو؟ اگر ہاں تو اس پر عمل کرنا ہوگا جو کہتا تھا "He who loveth Humanity loveth God-" "God is love and love is God" جو ملکی بغاوت کے جرم میں تختہ دار پر چڑھا' اس کی طرح بہادری سے عالمی محبت کو فروغ دینے کے لئے تیار ہو؟ جس دن تم سچے مبلغ بنو گے' اس بے مثال اصول کے اس دن تمہیں ماں کے سچے لاڈلے گرو گوبند سنگھ کی طرح میدان عمل میں اترنا ہوگا۔ اس عالمی عبت کے سچے پیروکار۔ حامی کی طرح سب سپوت ہیں ایک باپ کے' کہنے والے اس عظیم انسان کی طرح' اپنے چاروں ...... آنکھوں کے تاروں' لخت جگر کو قوم کے (لئے) قربان کر کے ماں کے پوچھنے پر آسانی سے جواب دینے والے کی طرح تمہیں بہادری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ کیا تم اپنے عزیز سے عزیز شخص کو جس کی یاد سے دل دھڑکنے لگتا ہے' جسے تم ہر وقت اپنے دل میں چھپائے رکھنے کے خواہش مند ہو' کو اپنی آنکھوں کے سامنے قربان گاہ پر چڑھتے' ناقابل ذکر مصائب سے دوچار دیکھ کر صبر و تحمل کا مظاہرہ کر سکو گے؟ کیا اس کے سامنے ہی تم جیتے جی اگنی چتا پر بخوشی چڑھ سکو گے اور ہنستے ہوئے دنیا کی طرف نگاہ کرم سے دیکھتے ہوئے الوداع کہہ سکو گے؟ اگر ہاں تو آ ؤ امتحان ہو جائے گا' وقت آ گیا ہے۔ اگر دل میں تھوڑی بہت شرم ہے تو بخدا اس دکھاوے کو چھوڑ دو۔

جب تک کالا۔ گورا' مہذب۔ غیر مہذب' حکمراں۔ محکوم' غریب۔ امیر' چھوت۔ اچھوت وغیرہ الفاظ کا استعمال ہوتا ہے تب تک کہاں عالمی اخوت اور عالمی محبت؟ یہ نصیحت آزاد قوم میں کر سکتی ہیں۔ ہندوستان جیسی غلام قوم اس کا نام نہیں لے سکتی۔

پھر اس کا فروغ کیسے ہوگا؟ تمہیں طاقت جمع کرنی ہوگی۔ طاقت کے اجتماع کے لئے اپنی مجتمع طاقت صرف کر دینی پڑے گی۔ رانا پرتاپ کی طرح عمر بھر در بدر کی ٹھوکریں کھائی ہوں گی تب کہیں اس امتحان میں کامیاب ہو سکو گے۔ دیکھتے نہیں عالمی اخوت کا سچا مبلغ تھا میجنی جو بیس سال خود ہی ایک جگہ قید رہتا ہے۔ لینن تھا اس کا حامی۔ ناقابل ذکر مصائب برداشت کیا تھا اس نے۔ عالمی اخوت کا پیروکار جارج واشنگٹن تھا۔ امریکہ کا نجات دہندہ۔ فرانس کے انقلابی لیڈر تھے کٹر حامی۔ کتنا لہو

انہوں نے بہادیا تھا۔اصول پسند بروٹوس تھا دنیا سے محبت کرنے والا جس نے مادر وطن کے لئے اپنے عزیز ترسیزر' کو اپنے ہاتھوں قتل کرڈالا' اسے عالم دوست ہونے کا شرف حاصل ہوسکتا ہے۔

عالم دوست وہ بہادر ہے جسے انتشار پھیلانے والا' انتہائی تخریب پسند کہنے میں ہم لوگ ذرا بھی شرم اور جھجک محسوس نہیں کرتے......وہی ویر ساور کر۔عالم دوست ہونے کی ترنگ میں آ کر گھاس پر چلتے چلتے رک جاتے کہ نرم و نازک گھاس قدموں تلے روندی جائے گی۔

75 دن بھوک ہڑتال کے بعد جنت کا رخ کرنے والا میکسوینی اس نقش قدم پر چلنے کا سہرا حاصل کرسکتا ہے جو کہتا تھا:

It is the love ofq the country that inspires us and not the hate of the enemy and the desire for full satisfaction for the past"

عالم دوست دیوی کا پرستار تھا' گیتا رہسیہ' کا مصنف پوجیہ لوک مانیہ تلک۔اور دیکھو گے؟ وہ نحیف و لاغر' لنگوٹ بند' جو سزا کا حکم سنائے جانے پر بہشتی قہقہہ کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ مجھے جو سزا دی گئی وہ انتہائی ہلکی ہے اور میرے ساتھ جیسا نرم برتاؤ کیا گیا ہے' اس سے زیادہ کی امید میں نہیں کرسکتا تھا جس کے دل کو چھو لینے والے قول کا تم سنگ دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔عظیم ہے اس اصول کا حامی۔

ارے! راون اور بالی کو مار گرانے والے رام چندر نے اپنے عالم دوست ہونے کا ثبوت دیا تھا بھیلنی کے جھوٹے ترش بیروں کو کھا کر۔چچیرے بھائیوں میں جنگ کرانے والے' دنیا سے ناانصافی کو مکمل طور پر ختم کردینے والے کرشن نے ثبوت دیا اپنے عالم دوست ہونے کا، سداما کے کچے چاولوں کو پھانک کر۔

تم بھی عالم دوست ہونے کا دم بھرتے ہو! پیروں پر کھڑے ہونا سیکھو۔آزاد قوموں میں فخر کے ساتھ سر اونچا کر کے کھڑے ہونے کے لائق بنو۔جب تک تمہارے ساتھ کاما گاٹا مارو جہاز جیسی بدسلوکیاں ہوتی رہیں گی' جب تک ڈیم کالا مین کہلاؤ گے' جب تک تمہارے ملک میں جلیاں والا باغ جیسے بدترین واقعات ہوتے رہیں گے' جب تک بہادروں کی تحقیر و بے عزتی ہوگی اور تمہاری جانب سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا' تب تک تمہاری یہ روش کوئی معنی نہیں رکھتی۔کیسا امن' کیسی خوش حالی اور کیسی عالم دوستی؟

اگر واقعی چاہتے ہو کہ پوری کائنات میں امن و خوش حالی اور عالم دوستی کا دور دورہ ہوتو پہلے تحقیر آمیز سلوک اور بے عزتی کا بدلہ لینا سیکھو۔مادر وطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے مرمٹو۔قیدی ماں کو آزاد کرانے کے لئے تاحیات کالے پانی میں ٹھوکریں کھانے کو تیار ہوجاؤ۔سسکتی اور دم توڑتی ماں کو زندہ رکھنے کے لئے موت کے لئے تیار ہوجاؤ۔تب ہمارا ملک آزاد ہوگا۔ہم طاقت ور ہوں گے۔ہم سینہ ٹھونک کر عالم دوستی کی تبلیغ کریں گے۔دنیا کو امن کے راستے پر چلنے کو مجبور کرسکیں گے۔

(نومبر 1924)

نوجوان

'یووک' عنوان سے درج ذیل بھگت سنگھ کا یہ مضمون 'ہفتہ وار متوالا' (سال: 2 شمارہ نمبر 38' 16 مئی 1925) میں بلونت سنگھ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا ذکر 'متوالا' کے ادارتی امور سے وابستہ آچاریہ شوپوجن سہائے کی ڈائری میں بھی ملتا ہے۔ مضمون سے قبل یہاں 'آلوچنا' میں شائع ڈائری کے اس حصہ کو بھی دیا جا رہا ہے۔ مدیر

آچاریہ شوپوجن سہائے کی ڈائری کے حصے (صفحہ: 28)

23 مارچ

شام کے وقت کانفرنس ہال کے اسٹیج پر محب وطن بھگت سنگھ کی یاد میں جلسہ منعقد کیا گیا۔ بھگت سنگھ نے 'متوالا' (کلکتہ) میں مضمون لکھا تھا جس کے ڈائیلاگ میں اصلاح کر کے میں نے اسے شائع کیا تھا اور اسے پستک بھنڈار کی شائع کردہ کتاب 'یووک ساہتیہ' میں شامل بھی نے ہی کیا تھا۔ وہ مضمون بلونت سنگھ کے نام سے لکھا گیا تھا۔ انقلابی عام طور پر گمنام ناموں سے مضامین لکھتے تھے۔ یہ راز کسی کو معلوم نہیں۔ وہ مضمون نوجوانوں کو موضوع بنا کر لکھا گیا تھا۔ اسے لاہور سے انہوں نے بھیجا تھا۔ حقیقی نام کی جگہ 'بلونت سنگھ' نام ہی شائع کرنے کو لکھا تھا۔

— آلوچنا۔ 67 / سال 32 / اکتوبر دسمبر 1983

عالم شباب حیات انسانی کا موسم بہار ہے۔ ایسے وقت میں انسان متوالا ہو جاتا ہے۔ ہزاروں بوتل کا نشہ چھا جاتا ہے۔ خالق کی عطا کردہ قوتیں ہزار ہا لہروں میں تبدیل ہو کر پھوٹ پھوٹ پڑتی ہیں۔ مدا ندھ متا تنگ کی طرح بے فکر' ورشا کالین شون بھدر کی طرح دودھرس' پرلے کالین پربل پربھنجن کی طرح پرچنڈ' نو اگت وسنت کی ملکہ اول کالیکا کی طرح نرم و نازک' آتش فشاں کی طرح آزاد اور بھیروی سنگیت کی طرح شیریں نوجوانی کا دور ہے۔ روشن صبح کا حسن' پیار بھری شام کی شرچندریکا کی مادھوری گریشم۔ مدھیہ وبن کا اُتپات اور بھادرپی اماوسیہ کے نصف شب شدت عہد نوجوانی میں پنہاں ہے۔ جس انقلابی کی جیب میں بم گولہ' سازش کرنے والے کی اسٹی میں بھرا ہوا طمنچہ' رن رس رسک کے ہاتھ میں کھڈگ' ویسے ہی انسانی جسم میں عہد شباب۔ سولہ سے پچیس سال تک ہڈی چمڑی کے صندوق میں دنیا بھر کی مصیبتیں سمیٹ کر تقدیر بنانے والا بند کر دیتا ہے۔ دس برس تک یہ جھنجھاری کشتی منجدھار طوفان میں ڈگمگاتی رہتی ہے۔ عہد شباب دیکھنے میں تو شسیہ شیاملا زمین سے بھی خوب صورت ہے مگر اس کے اندر زلزلہ جیسی خوفناکی بھی بھری ہوئی ہے۔ اس لئے عالم جوانی میں انسان کے سامنے محض دو ہی راستے ہیں۔ وہ ترقی کے چڑھ سکتا ہے اعلی پائیدان پر وہ گر سکتا ہے تنزلی کی تاریک خندق میں۔ چاہے تو تیاگی ہو سکتا ہے نوجوان' چاہے تو ولاسی بن سکتا ہے نوجوان۔ وہ دیوتا بن سکتا ہے تو پشاچ بھی بن سکتا ہے۔ وہ دنیا کو ہراساں کر سکتا ہے۔ وہی دنیا میں امن پیدا کر سکتا ہے۔ دنیا میں نوجوانوں کی ہی حکومت ہے۔ نوجوانوں کے ریکارڈ سے دنیاوی تاریخ بھری پڑی ہے۔ نوجوان ہی رن چنڈی کے للاٹ کی لکیر ہے۔ نوجوان اپنے ملک کی لیش ڈنڈوبھی کی خوف ناک آواز ہے۔ نوجوان ہی

اپنے ملک کی وجہ و یکجہتی کا سودرشن چکر ہے۔وہ سمندر کی آوارہ لہروں کی طرح برگشتہ ہے۔وہ مہابھارت کے بھیشم پرو کی پہلی للکار کی مانند ڈراؤنا اور ہیبت ناک ہے' پہلی ملاقات بے تحاشا بوسے کی طرح سرس ہے' راون کے غرور کی طرح زربھیک ہے' پرہلاد کے عہد کی طرح مضبوط اور اٹل ہے۔اگر کسی آتم تیاگی ویر کی خواہش ہو تو نوجوانوں سے مانگو۔ رسِکتا اسی کے حصہ میں آئی ہے۔جذبات پر اسی کا سکہ ہے۔وہ بحر سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی باصلاحیت شاعر ہے۔شاعر بھی اسی ہردے رویندر کا مدھوپ ہے۔وہ رسوں کی تعریف نہیں جانتا مگر وہ مگر شاعری کا سچا مرمگیہ ہے۔کائنات کا ایک موضوعاتی مسئلہ ہے نوجوان۔خدا کی تخلیقی مہارتوں کا ایک بہترین نمونہ ہے نوجوان' شام کے وقت وہ دریا کے کنارے گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔شتج کی جانب بڑھتے جان لیوا رکت رشمی سوریہ دیو کو بنظر تحسین دیکھتا رہ جاتا ہے۔اس پار سے آئی ہوئی موسیقی کی لہر کے تیز بہاؤ میں غرق ہو جاتا ہے۔متنوع ہے اس کی زندگی۔بے مثال ہے اس کی شجاعت' اموددھ ہے اس کا جوش اور ولولہ۔

وہ بے فکر ہے' بیدار ہے۔ارادہ کرلیا تو رات بھر جاگنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے' جیٹھ کی دوپہر چیت کی چاندنی ہے' ساون بھادوں کی جھڑی منگلو تسو کی پشپ ورشتی ہے' شمشان کی خاموشی' ودان کا وِہنگ کل کوجن ہے۔وہ آرزومند ہو تو سماج اور ذات کو اُودبدھ کردے' کی لالی رکھ لے' قوم کو سرخ رو کردے' بڑی بڑی حکومتوں کا تختہ پلٹ دے۔دبے کچلے لوگوں کی فلاح اور دنیا کی گلوخلاصی کی ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے۔وہ اس عظیم جہان کے اسٹیج کا ماہر کھلاڑی ہے۔

اگر لہو کا تحفہ چاہیے تو نواجون کے علاوہ کون دے گا؟ اگر قربانی چاہتے ہو تو تمہیں نوجوانوں کی جانب دیکھنا ہوگا۔ہر نسل کا قسمت ساز نوجوان ہی ہوتا ہے۔ایک مغربی پنڈت نے ٹھیک ہی کہا ہے "It is an established trusm that youngmen of today are the countrymen of tomorrow holding in their hands the high destinies of the land. They are the seeds that spring and berat fruit.۔مطلب یہ ہے کہ آج کے نوجوان ہی کل کے ملک کے قسمت ساز ہیں۔وہی مستقبل کی کامیابی کے بیج ہیں۔

دنیاوی تاریخی کے صفحات کھول کر دیکھ لو نوجوانوں کے خون سے لکھے جاوداں پیغامات بھرے پڑے ہیں۔دنیا کی انقلابی تبدیلی کا ذکر تلاش کرو' ان میں صرف ایسے ہی نوجوان پائے جائیں گے جنہیں دانشوروں نے 'پاگل چھوکرے' یا ''گمراہ'' کہا ہے۔مگر جو سیٹری ہیں' وہ کیا خاک سمجھیں گے کہ جذبہ وطن سے سرشار ہو کر اپنی لاشوں سے قلعہ کی کھائیوں کو بھرنے والے جاپانی نوجوان کس فولاد کے ٹکڑے تھے۔سچا نوجوان تو بلا تامل موت کو گلے لگاتا ہے' تیز سنگینوں کے سامنے ڈٹ جاتا ہے' توپ کے منہ پر بیٹھ کر بھی مسکراتا ہی رہتا ہے زنجیروں کی جھنکار پر قومی ترانہ گنگناتا ہے اور بے خوف وخطر تختہ دار پر چڑھ جاتا ہے۔پھانسی کے دن نوجوان کا ہی وزن بڑھتا ہے' جیل کی چکی پر نوجوان ہی جاگ کر منتر گاتا ہے' کال کوٹھری کی تاریکی میں ڈوب کر ہی ملک کی تاریکی کو ختم کرتا ہے۔امریکا کے نوجوان گروپ کے لیڈر پیٹرک ہینری نے اپنی تقریر میں کہا تھا "Life is a Dearer within the prison-cell, where it is the price paid for the freedom's fight.۔مطلب یہ ہے کہ جیل کی دیواروں کے باہر کی زندگی بڑی مہنگی ہے مگر جیل کی کال کوٹھریوں کی زندگی اور بھی مہنگی ہے کیوں کہ وہاں یہ جدوجہد آزادی کی قیمت کے طور پر چکائی جاتی ہے۔

جب اتنا شاندار قائد ہے تبھی تو امریکا کے نوجوانوں میں بانگ دہل یہ اعلان کرنے کی ہمت بھی ہے کہ " we believe that a Government becomes a destructive of the natural right of man, it

is the man's duty to destroy that Government". مطلب یہ ہے کہ امریکا کے نوجوان یقین کرتے ہیں کہ پیدائشی حقوق کو پامال کرنے والی حکومت کا تختہ پلٹنا انسان کا فرض ہے۔

اے ہندوستانی نوجوان! تو کیوں غلط فہمی کی نیند میں پڑا بے خبر سورہا ہے' اٹھ! آنکھیں کھول' دیکھ' مشرق کا سرخ سندور رنگ گیا۔ اب زیادہ مت سو۔ سونا ہی ہے تو دائمی نیند سوئے۔ بزدلی کی گود میں کیوں سوتا ہے؟ مادی محبت ترک کر کے گرج اٹھ۔

Farewell Farewell My true love

The army is on move

And if I stayed with you Love

A coward I shall prove"

تیری ماں' تیری ہریا' تیری پرم وندنیا' تیری جگدمبا' تیری انا پورن' تیری ترشول دھاری' تیری سنگھواہنی' تیری شسیہ شیام لانچلا آج پھوٹ پھوٹ کر رورہی ہے۔ کیا اس کی پریشانی مجھے ذرا بھی بیقرار اور بے چین نہیں کرتی؟ افسوس ہے تمہاری زندگی پر۔ تیرے آباء بھی شرم سے جھکے ہوئے ہیں اس نامردانگی پر! اگر ابھی تمہارے کسی حصہ میں ہائے باقی ہو تو اٹھ کر ماں کے دودھ کی لاج رکھ' اس کی آزادی کا بیڑہ اٹھا' اس کے آنسوؤں کی ایک ایک بوند کی قسم لے' اس کا بیڑہ پار کر اور بول آزاد ہو کر' وندے ماترم'۔

ہولی کے دن خون کے چھینٹے

گھر سے فرار ہو کر بھگت سنگھ کان پور آ گئے تھے۔ وہاں وہ گنیش شنکر ودیارتھی کے ہفتہ وار 'پرتاپ' کے ادارتی شعبہ میں کام کرتے رہے۔ کان پور میں ہی انقلابی پارٹی سے ان کے گہرے مراسم ہوئے۔ شوورما' جے دیو کپور' بٹو کیشور دت' وجے کمار سنہا اور انقلابی پارٹی کے دیگر ساتھیوں سے ہندوستان کے مستقبل پر طویل غور و خوض ہوا۔ قاضی نذرالاسلام کی بنگالی نظمیں بھی اسی دوران ان کے زیر مطالعہ آئیں۔

پنجاب میں ببر اکالی تحریک چل رہی تھی۔ اس تحریک کے چھ کارکنوں کی پھانسی پر 'ایک پنجابی نوجوان' کے نام سے 15 مارچ 1926 کو 'پرتاپ' میں یہ مضمون ہندی میں شائع ہوا۔ اس تحریک کا علم تو اس مضمون سے ہوتا ہی ہے' ساڑھے اٹھارہ سالہ بھگت سنگھ کی ذہنی بالیدگی بھی اس مضمون سے جھلکتی ہے۔۔۔مدیر

ہولی کے دن 27 فروری کو جب ہم لوگ کھیل کود میں مصروف تھے' اسی وقت اس عظیم ملک کے ایک گوشہ میں بڑا واقعہ رونما ہو رہا تھا۔ سنو گے تو سہم جاؤ گے۔ کانپ اٹھو گے!! لاہور سنٹرل جیل میں عین اسی دن چھ ببر اکالی بہادر پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ شری کشن سنگھ جی گڑگج جی' شری سنتا سنگھ جی' شری دلیپ سنگھ جی' شری نند سنگھ جی' شری کرم سنگھ جی اور شری دھرم سنگھ جی تقریباً دو برس سے اپنے اسی مقدمہ میں جو لاپرواہی دکھا رہے تھے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس دن کا کتنی شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ مہینوں بعد جج صاحب نے فیصلہ سنایا۔ پانچ کو پھانسی' بہتوں کو کالا پانی نیز ملک بدری اور طویل قید۔ بہادر ملزمین

گرج اٹھے۔ آسمان ان کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔ اپیل ہوئی' پانچ کی جگہ چھ کو سزائے موت ہوئی۔ اس دن اخبار میں پڑھا کہ رحم کے لئے اپیل کی گئی ہے' پنجاب سکریٹری نے اعلان کیا ہے کہ ابھی پھانسی نہیں دی جائے گی۔

انتظار تھا مگر یکا یک کیا دیکھتے ہیں کہ ہولی کے دن غم میں ڈوبے ہوئے لوگوں کا ایک چھوٹا گروپ ان بہادروں کی مردہ لاشوں کو شمشان لے جا رہے ہیں۔ خاموشی کے ساتھ ان کی آخری رسومات مکمل کر دی گئیں۔

شہر میں وہی دھوم تھی۔ آنے جانے والوں پر اسی طرح رنگ ڈالا جا رہا تھا۔ بری طرح نظر کیا جا رہا تھا!!! اگر وہ لوگ گمراہ تھے تو ہونے دو' نشے میں چور تھے تو ہونے دو۔ وہ نڈر وطن پرست تو تھے۔ انہوں نے جو کچھ کیا' اس بدقسمت ملک کے لئے ہی کیا۔ وہ ناانصافی برداشت نہ کر سکے' ملک کی خستہ حالت کو نہ دیکھ سکے' ضعیفوں پر ڈھائے جانے والے مظالم تو ان کے لئے ناقابل برداشت تھے' عوام کا استحصال تو ان کے لئے ناقابل برداشت تھا' انہوں نے للکارا اور وہ کود پڑے میدان عمل میں۔ وہ زندہ دل تھے' دور اندیش تھے' میدان عمل بھیشنتے' تو دھنیہ ہے تو!! موت کے بعد دوست دشمن سب ایک ہو جاتے ہیں' یہ اصول ہے مردوں کا۔ اگر انہوں نے کوئی قابل نفریں کام کیا بھی ہو تو اپنے ملک کے لئے جس بہادری اور بے خوفی سے اپنی جان نچھاور کی' اس کے مدنظر وہ لائق پرستش ہیں۔ شری ٹیگارڈ صاحب اپوزیشن سے تعلق رکھنے کے باوجود جتن مکھرجی بنگال کے بہادر انقلابی کی موت پر غم و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ان کی شجاعت' وطن پرستی اور ان کے عملی اقدام کی کھلے دل سے تعریف کر سکتے ہیں' مگر ہم بزدل' حیوان' ایک لمحہ کے لئے بھی آسائش چھوڑ کر بہادروں کی موت پر آہ تک کہنے کی ہمت نہیں کرتے۔

کتنی افسوس ناک بات ہے۔ ان غریبوں کا جو جرم نوکر شاہی کی نظر میں تھا' اس کی انہوں نے پوری سزا ظالم نوکر شاہی کی نظر میں بھی پالی' اس قابل افسوس ڈرامہ کا ایک اور باب ختم ہو گیا۔ ابھی پردہ گرا نہیں ہے۔ ناٹک ابھی کچھ اور دردناک مناظر دکھائے گا۔ کہانی طویل ہے' سننے کے لئے ذرا دور تک پیچھے جانا پڑے گا۔

عدم تعاون تحریک پورے شباب پر تھی۔ پنجاب کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ پنجاب میں سکھ بھی اٹھے' بڑی گہری نیند سے اٹھے اور اٹھے پوری شدت کے ساتھ۔ اکالی تحریک شروع ہوئی۔ قربانی کی جنگ لڑی گئی۔ ماسٹر موتا سنگھ خالصہ مڈل اسکول' ماہل پور' ضلع ہوشیار پور کے سابق ماسٹر صاحب نے ایک تقریر کی۔ ان کے خلاف وارنٹ نکلا۔ مگر مہمان سرکار انہیں قبول نہیں تھی۔ یوں ہی جیلوں میں چلے جانے کے وہ خلاف تھے۔ ان کی تقاریر پھر بھی ہوتی رہیں۔ کوٹ فتوحی نامی گاؤں میں بڑا عام جلسہ ہوا' پولیس نے چاروں طرف گھیر ڈالا پھر بھی ماسٹر موتا سنگھ نے تقریر کی۔ بالآخر پردھان کے حکم سے سبھی ناظرین اٹھ گئے۔ ماسٹر جی نہ جانے کدھر پہنچے۔ بہت دنوں تک یہ آنکھ مچولی کا کھیل ہوتا رہا۔ سرکار بوکھلا اٹھی۔ آخر میں ایک قریبی ساتھی نے دغا کی اور ڈیڑھ سال کے بعد ایک دن ماسٹر صاحب گرفتار کر لئے گئے۔ یہ پہلا منظر تھا اس خوف ناک ڈرامہ کا۔

گرو کا باغ آندولن شروع ہوا۔ نہتے بہادروں پر جس وقت کرایہ کے غنڈے ٹوٹ پڑتے' انہیں مار مار کر بے حال اور نصف جاں کر دیتے' دیکھنے سننے والوں میں سے کون ہوگا جو پسا نہ گیا ہو۔ چاروں طرف گرفتاریوں کا دور دورہ تھا۔ سردار کشن سنگھ گڑ گج کے نام بھی وارنٹ جاری ہوا۔ مگر وہ بھی اسی جماعت کے تھے۔ انہوں نے بھی گرفتار ہونا قبول نہیں کیا۔ پولیس ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی مگر پھر بھی وہ بچتے رہے۔ ان کا ایک منظم انقلابی گروہ تھا۔ نہتوں پر ہونے والے مظالم کو وہ برداشت نہ کر سکے۔ اس پرامن تحریک کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہتھیاروں کا استعمال بھی ضروری سمجھا۔

ایک طرف کتے' شکاری کتے ان کو تلاش کرنے کے لئے سونگھتے پھرتے تھے' دوسری جانب عزم کیا گیا کہ خوشامدیوں (جھولی چکوں) کی اصلاح کی جائے۔ سردار کشن سنگھ جی کہتے تھے' اپنی حفاظت کے لئے ہمیں مسلح رہنا ضروری ہے مگر ابھی کوئی

اور قدم نہیں اٹھانا چاہئے۔ مگر اکثریت دوسری طرف تھی۔ آخر میں فیصلہ ہوا کہ تین شخص اپنے نام کا اعلان کریں اور ساری ذمہ داری اپنے اوپر لیں اور جھولی چکوں کی اصلاح شروع کر دی جائے۔ شری کرم سنگھ شری دھن سنگھ اور شری اودے سنگھ جی آگے بڑھے یہ مناسب تھا یا نا مناسب' اس سے قطع نظر ذرا اس وقت کا تصور کیجئے جب ان نئے بہادروں نے حلف لیا تھا:

''ہم ملک کی خدمت میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دیں گے' ہم عہد کرتے ہیں کہ لڑتے لڑتے مر جائیں گے مگر جیل جانا منظور نہیں کریں گے''۔

جنہوں نے اپنے خاندان کی محبت چھوڑ دی۔ وہ لوگ جس وقت یہ حلف لے رہے تھے' اس وقت کتنا خوب صورت حسین اور پر تقدس نظارہ رہا ہوگا۔ ایثار کا حوصلہ کہاں ہے؟ بہادری اور بے خوفی کی حدود کہاں ہیں؟ آدرش پر ایتا کی چرمتا کا نواس کدھر ہے؟

شیام چراسی' ہوشیار پور برانچ ریلوے لائن کے ایک اسٹیشن کے قریب سب سے پہلے ایک صوبے دار پر ہاتھ صاف کیا گیا۔ بعد ازاں ان تینوں افراد نے اپنے نام بھی ظاہر کر دیئے۔ سرکار نے ان کی گرفتاری کے لئے پوری طاقت جھونک دی مگر کامیابی نہ ملی۔ رڑکی کلاں میں سردار کشن سنگھ گڑگج کو گھیر لیا گیا۔ ان کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی تھا جو وہیں زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ مگر کشن سنگھ وہاں سے بھی اپنے ہتھیاروں کی مدد سے بہ حفاظت بچ نکلے۔ راستے میں انہیں ایک سادھو ملا۔ اس نے انہیں بتایا کہ اس کے پاس ایسی بوٹی ہے جس کی مدد سے من پسند کام بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ اس جال میں پھنس کر ایک دن وہ اپنے ہتھیار رکھ کر اسی سادھو کے پاس چلے گئے۔ کچھ دوا رگڑنے کو دے کر سادھو بوٹی لینے گیا اور پولیس کو لے آیا۔ سردار صاحب پکڑے گئے۔ وہ سادھو سی آئی ڈی محکمہ کا سب انسپکٹر تھا۔ ببر اکالی بہادروں نے اپنا کام بڑی شدت کے ساتھ شروع کیا۔ بہت سے سرکاری معاون مار ڈالے گئے۔ دوآب ویاس اور ستلج کے درمیان جالندھر اور ہوشیار پور کا ضلع پہلے سے ہی ہندوستان کے سیاسی نقشہ پر مشہور تھا۔ 1915 کے شہیدوں کی اکثریت انہیں اضلاع سے تھی۔ اب پھر وہیں پر دھوم مچی۔ پولیس محکمہ نے ساری طاقت جھونک دی مگر کچھ نہ بن پڑا۔ جالندھر سے کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹی سی ندی ہے۔ اس کے کنارے ایک گاؤں میں 'چونتا صاحب' نامی گرودوارہ ہے۔ اس میں شری کرم سنگھ جی' شری دھنا سنگھ جی' شری اودے سنگھ جی اور شری انوپ سنگھ جی دو ایک اور افراد کے ساتھ بیٹھے تھے' چائے بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے شری دھنا سنگھ نے کہا کہ ''بابا کرم سنگھ جی! ہمیں یہاں سے ابھی اسی وقت چل دینا چاہئے۔ مجھے کسی برے واقعہ کے رونما ہونے کی بو آرہی ہے۔ 75 سالہ بوڑھے کرم سنگھ نے اس بات پر تھوڑی بھی توجہ نہیں دی۔ مگر شری دھنا سنگھ اپنے ساتھ 18 سالہ دلیپ سنگھ کو لے کر چلے ہی گئے۔ بیٹھے بیٹھے بابا کرم سنگھ نے شری انوپ سنگھ کی طرف دیکھ کر بڑے غور سے کہا' انوپ سنگھ' تم اچھے آدمی نہیں ہو۔ مگر اس کے بعد انہوں نے خود بھی اس بات پر توجہ نہیں دی۔ باتیں ابھی ہو رہی تھیں کہ بیچ بیچ پولیس آ دھمکی۔ سارے بم شری انوروپ سنگھ کے قبضے میں تھے۔ یہ سب لوگ اٹھ کر گاؤں میں چھپ گئے۔ پولیس نے لاکھ سر مارا' مگر نا کام رہی۔ بالآخر پولیس کی جانب سے ایک اعلان کیا گیا۔ باغیوں کو نکالو ورنہ گاؤں میں آگ لگا دی جائے گی مگر گاؤں والے بے قرار اور پریشان نہیں ہوئے۔

موقع کی نزاکت دیکھ کر وہ لوگ خود ہی باہر آئے۔ سارے بم انوپ سنگھ لے بھاگا اور جا کر خود سپردگی کر دی۔ بقیہ چار افراد وہیں محصور کھڑے تھے۔ پولیس کے انگریز کپتان نے کہا' کرم سنگھ! ہتھیار چھوڑ دو' تمہیں معاف کر دیا جائے گا'۔ بہادر نے للکار کر جواب دیا' ہم اپنے ملک کے لئے سچے انقلابی کی طرح لڑتے لڑتے شہید ہو جائیں گے مگر ہتھیار نہیں ڈال سکتے'۔ انہوں نے تینوں ساتھوں کو للکارا۔ یہ شیر کی مانند گرج اٹھے۔ لڑائی چھڑ گئی۔ دنا دن گولیاں چلیں۔ گولہ بارود ختم ہونے پر وہ بہادر

پانی میں کود پڑے اور گھنٹوں مسلسل گولیوں کی بارش ہونے کے سبب وہ سورگ سدھار گئے۔

شری کرم سنگھ کی عمر 75 سال تھی۔ وہ کناڈا میں رہ چکے تھے۔ وہ اچھے اخلاق اور بہتر کردار کے حامل تھے۔ سرکار نے سمجھا کہ ببر اکالی کا خاتمہ ہو گیا ہے مگر وہ ترقی کر رہے تھے۔ اٹھارہ سالہ دلیپ سنگھ ایک انتہائی خوب رو طاقت ور ہٹے کٹے مگر ناخواندہ نوجوان تھے اور وہ ڈاکوؤں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ دھنا سنگھ جی کی تعلیم نے انہیں ڈاکو سے ایک سچا انقلابی بنا دیا۔ ادھر سردار بنتا سنگھ اور وریام سنگھ اور کئی مشہور ڈاکو ڈاکہ زنی چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو گئے۔

ان میں موت کا خوف نہیں تھا۔ یہ لوگ اپنے پچھلے برے کاموں کی تطہیر اور اس کو دھو ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کی تعداد لگا تار بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دن مان ہانا نامی گاؤں میں دھنا سنگھ بیٹھے تھے، پولیس بلا لی گئی۔ نشے میں چور دھنا سنگھ بیٹھے بٹھائے ہی گرفتار کر لئے گئے۔ ان کا بھرا ہوا پستول چھین کر ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی گئی اور انہیں باہر لایا گیا۔ بارہ عام سپاہی اور دو انگریز افسران ان کی گھیرا بندی کر کے کھڑے ہو گئے۔ عین اسی وقت دھماکہ کی آواز سنائی دی۔ دھنا سنگھ جی نے بم چلا دیا۔ اس سے وہ خود بھی موت کی آغوش میں چلے گئے اور ساتھ ہی ایک انگریز افسر اور دس سپاہی۔ باقی لوگ بری طرح زخمی ہو گئے۔

اسی طرح منڈیر نامی گاؤں میں بیٹھے ہوئے بنتا سنگھ، جوالا سنگھ وغیرہ کئی لوگ محصور ہو گئے۔ یہ سب چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گولی چلی، تھوڑی دیر اچھی جھڑپ ہوتی رہی مگر پولیس نے پمپ سے مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ پھر بھی وریام سنگھ بچ نکلے مگر بنتا سنگھ وہیں مارے گئے۔

اگر اس سے پہلے کے ایک دو واقعات کا ذکر کر دیا جائے تو نامناسب نہیں ہوگا۔ بنتا سنگھ بڑے حوصلہ مند انسان تھے۔ ایک بار شاید جالندھر چھاؤنی میں جا کر رسالے میں پہرے پر کھڑے ہوئے سپاہی کی گھوڑی اور رائفل چھین لائے تھے۔ ان دنوں جب کہ پولیس کے دستے ان کی تلاش میں سرگرداں تھے، کہیں جنگل میں کسی دستے سے ان کی ملاقات ہو گئی سردار بسنت سنگھ نے فوراً چیلنج دیا۔ 'اگر ہمت ہو تو دو دو ہاتھ کر لو'۔ مگر اس طرف تو تھے پیسے کے غلام اور اس جانب ایثار کے خواہاں۔ موازنہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ سپاہیوں کا دستہ چپ چاپ چلا گیا۔

ان لوگوں کی گرفتاری کے لئے خاص طور سے پولیس تعینات کی گئی تھی۔ اور اس کی تھی یہ حالت' خیر۔ گرفتاریوں کی بھرمار تھی۔ گاؤں گاؤں میں پولیس کی تعزیری چوکیاں قائم کی جانے لگیں۔ آہستہ آہستہ ببر اکالی کا زور کم ہونے لگا۔ اب تک تو جیسے انہیں کی حکومت تھی۔ جہاں جاتے' لوگ خوش ہو کر اور کچھ ڈر اور خوف سے خوب عزت افزائی کرتے۔ سرکار کے حامی بالکل پست ہو گئے۔ سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے بعد گھر سے نکلنے کی ہمت ان میں نہیں ہوتی تھی۔ یہ ان دنوں کے ہیرو سمجھے جاتے تھے۔ یہ بہادر تھے اور ان کی پوجا بہادروں کی پوجا سمجھی جاتی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ان کا زور کم ہو رہا تھا۔ سینکڑوں گرفتار ہوئے' مقدمے شروع ہوئے۔ وریام سنگھ تنہا بچے تھے۔ جالندھر' ہوشیار پور میں پولیس کا زیادہ زور دیکھ کر دور افتادہ لائل پور میں جا رہے تھے۔ وہاں ایک دن پوری طرح محصور ہو گئے مگر بڑی بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے بچ نکلے۔ لیکن بہت تھک گئے تھے۔ کوئی ساتھی بھی نہ تھا۔ حالت بڑی خراب تھی۔ ایک دن ڈھیسیا نامی گاؤں میں اپنے ماما کے پاس گئے۔ ہتھیار باہر رکھے تھے۔ شام کو کھانے کے بعد اپنے ہتھیاروں کے پاس جا رہے تھے۔ پولیس آ پہنچی پھر گھر گئے۔ انگریز نے انہیں پیچھے سے جا پکڑا۔ انہوں نے کرپان سے ہی اسے بری طرح زخمی کر دیا۔ پھر وہ نیچے گر گئے۔ ہتھکڑی پہنانے کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ دو سال کے بعد طاقت کے زور پر اکالی جتھے کا خاتمہ ہوا۔ ادھر مقدمہ چلنے لگا جس کا نتیجہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے۔ ابھی اس دن ان لوگوں نے جلد ہی پھانسی دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ان کی یہ تمنا پوری ہو گی۔ وہ خاموش ہو گئے۔

کاکوری کے بہادروں سے تعارف

9 اگست 1925 کو شہید رام پرساد بسمل' اشفاق اللہ اور ان کے دیگر انقلابی ساتھیوں نے انقلابی پارٹیوں کے لئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے لکھنؤ کے نزدیک کاکوری کے قریب ریل گاڑی روک کر سرکاری خزانہ لوٹا۔ بعد ازاں شہید چندر شیکھر آزاد کے علاوہ بقیہ سبھی انقلابی گرفتار ہو گئے۔ بھگت سنگھ بھی اس وقت کان پور رہائش کے وقت ہندوستان ری پبلکن پارٹی میں بھرتی ہو چکے تھے۔ ان کے اپنے الفاظ میں 'پھر ساری ذمہ داری اپنے کاندھوں میں اٹھانے کا وقت آ گیا'۔ بھگت سنگھ نے رومانٹک انقلابی سے ایک بڑا موڑ لیا اور ان کے الفاظ میں 'میں نے مطالعہ شروع کر دیا'۔

'ودروہی' نام سے مئی 1927 میں بھگت سنگھ نے ایک مضمون 'کاکوری کے بہادروں سے تعارف' عنوان سے پنجابی زبان میں شائع کروایا۔ اس مضمون کی اشاعت کے فوری بعد بھگت سنگھ کو گرفتار کر لیا گیا اور چارپائی پر ہتھکڑی پہنے بیٹھے بھگت سنگھ کی مشہور تصویر اسی وقت لی گئی۔ اس سے قبل بھگت سنگھ پنجاب لوٹ کر شچیندر ناتھ سانیال کی کتاب 'بندی جیون' کا پنجابی میں ترجمہ شائع کرا چکے تھے--مدیر

پہلے 'کرتی' (پنجابی میگزین) میں کاکوری سے متعلق چنداں لکھا جا چکا ہے۔ آج ہم کارکوری سازش اور ان بہادروں کے متعلق کچھ تحریر کریں گے جنہیں اس تعلق سے سخت سزائیں دی گئیں۔

9 اگست 1925 کو ایک چھوٹے سے اسٹیشن کاکوری سے ایک پسنجر ٹرین چلی۔ یہ اسٹیشن لکھنؤ سے آٹھ میل کی دوری پر واقع ہے۔ ٹرین میل دو میل چلی ہوگی کہ سکنڈ کلاس میں بیٹھے ہوئے تین نوجوانوں نے گاڑی روک لی اور دوسروں نے مل کر گاڑی میں جانے والا سرکاری خزانہ کو لوٹ لیا۔ انہوں نے پہلے ہی زور سے آواز دے کر سبھی مسافروں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ ڈریں نہیں کیوں کہ ان کا مقصد مسافروں کو تنگ کرنا نہیں' صرف سرکاری خزانہ لوٹنا ہے۔ خیر' وہ گولیاں چلاتے رہے۔ وہ (کوئی مسافر) آدمی گاڑی سے اتر گیا۔ اور گولی لگنے سے اس کی موت ہو گئی

سرکاری افسر ہارٹن سی آئی ڈی اس کی تفتیش میں لگ گیا۔ اس سے قبل ہی یقین ہو گیا تھا کہ یہ ڈاکہ انقلابی گروہ کا کام ہے۔ اس نے سبھی مشتبہ افراد کی چھان بین شروع کر دی۔ اسی اثنا انقلابی گروہ کی صوبائی کونسل کی ایک میٹنگ میرٹھ میں ہونا طے پائی۔ سرکار کو اس کا علم ہو گیا۔ وہاں اچھی طرح چھان بین کی گئی۔

پھر ستمبر کے آخر تک ہارٹن نے گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا اور 26 ستمبر کو بہت سی تلاشیاں لی گئیں اور بہت سے افراد گرفتار ہوئے۔ کچھ گرفتار نہیں ہوئے۔ ان میں سے ایک شری راجندر لاہری دکشنیشور بم کیس میں پکڑے گئے اور وہیں انہیں دس برس کی قید ہو گئی اور شری اشفاق اللہ اور شچیندر بخشی بعد میں گرفتار ہوئے' جن پر علاحدہ مقدمہ چلا۔

جج کے فیصلے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ عدم تعاون تحریک دب جانے سے وطن پرست نوجوانوں کا پر امن تحریک سے یقین اٹھ گیا اور انہوں نے عہد ساز پارٹی (یوگانتر دل) تشکیل کی۔ شری جوگیش چندر چٹوپادھیائے بنگال سے اس پارٹی کی تنظیم سازی کے لئے یوپی آئے اور پختہ کام کر کے ستمبر 1924 میں لوٹ گئے۔ اس وقت بنگال میں آرڈی نینس پاس ہو چکا تھا اور

آپ لوٹتے ہی ہوڑہ پل پر گرفتار ہوئے۔ تلاشی لینے پر ان کی جیب سے ایک کاغذ ملا' جس پر یوپی کی صوبائی کونسل کی کسی میٹنگ اور یوپی میں پارٹی تنظیم کا حال لکھا ہوا تھا۔ خیر' پھر کام چل پڑا اور کام چلانے کی خاطر متعدد ڈاکے ڈالے گئے۔ جج کے خیال میں اس پارٹی کے لیڈر ہیں شری شچیندر ناتھ سانیال۔

شری شچیندر ناتھ سانیال کا نام کسی سے چھپا ہے۔ وہ "بندی جیون" جیسی شاندار کتاب کے مصنف ہیں۔ شری شچیندر ناتھ سانیال بنارس کے باشندہ ہیں۔ 1915 کی غدر تحریک میں انہوں نے خوب کام کیا۔ وہ بنارس سازش کیس کے لیڈر اور شری راس بہاری جی کے دست راست تھے۔ اس وقت عمر قید ہوئی تھی لیکن 1920 میں رہا ہوئے۔ پھر وہ اپنے پہلے کام میں مصروف ہو گئے اور 1925 کے آغاز میں 'دی ریولیوشنری' پرچہ ایک ہی دن میں پورے ہندوستان میں تقسیم کیا۔ اس کی زبان اور اچھے نظریات کی انگریزی اخبارات نے بھی خوب تعریف کی۔ وہ فروری میں گرفتار ہوئے۔ ان پر اسی سلسلے میں مقدمہ چلایا گیا اور دو سال قید کی سزا ملی۔ وہیں سے انہیں کاکوری مقدمہ میں بھی پھنسایا گیا۔ وہ بڑے زندہ دل ہیں۔ کورٹ میں خود خوش رہنا اور دوسروں کو خوش رکھنا ہی ان کا کام تھا۔ انہوں نے اپنا کیس خود لڑا۔ جج انہیں ہی سب کا گرو کہتا تھا۔ 'بندی جیون' کا گجراتی و پنجابی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

وہ انگریزی اور بنگالی کے اعلیٰ پایہ کے مصنف ہیں۔ انہیں دو عمر قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی بھوپندر سانیال کو بھی گھسیٹ لیا گیا۔ وہ غالباً بی اے کا طالب علم تھا۔ پکڑا گیا اور پانچ سال کی قید ہوئی۔ شچیندر کے بعد بہت معروف شجاع شری رام پرساد ہیں۔ آج ان جیسا خوب رو' طاقت ور جوان تلاش کرنے سے بھی ملنا مشکل ہے۔ انتہائی باصلاحیت فرد ہیں۔ ہندی کے بڑے رائٹر ہیں۔ انہوں نے 'کیتھرائن' 'بولشویکوں کے کام' 'من کی لہر وغیرہ تصنیف کیں۔ وہ اردو کے تسلیم شدہ شاعر ہیں۔ ان کی عمر 28 سال ہے۔ پہلے 1919 میں مین پوری سازش کیس میں ان کے نام وارنٹ جاری ہوئے اور وہاں بڑی مشکلوں سے گزارا کیا۔ پورا دن ہل چلانا' کدال چلانا' محنت مشقت کرنا اور رات میں صرف ڈیڑھ آنا پانا جس سے پیٹ بھر روٹی بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ کئی بار تو گھاس تک کھانی پڑی۔ لیکن مزہ یہ' پھر بھی بیٹھ کر نظمیں لکھنا اور بھارت ماتا کی یاد اور اس کی محبت میں آنسو بہانے اور گیت گانے۔ ایسے نوجوان کہاں مل سکتے ہیں۔ وہ جنگی فنون میں ماہر ہیں اور آج انہیں پھانسی کی سزا ملنے کی وجہ بہت حد تک یہی ہے۔ اس بہادر کو پھانسی کی سزا ملی اور وہ مسکرا دیے۔ اتنا بے خوف بہادر' خوب صورت نوجوان' اتنا لائق اور اعلیٰ پایہ کا مصنف اور بے باک مجاہد ملنا بڑا مشکل ہے۔

تیسرے بہادر شری راجندر لاہری ہیں۔ 24 سالہ انتہائی خوب رو جوان ایم اے بنارس ہندو یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ جج کہتا ہے کہ یہ عہد ساز پارٹی کا ایک مضبوط ستون ہے۔ وہ گاڑی روکنے والوں میں تھا۔ باہر سے تھا کمزور دبلا پتلا۔ کلکتہ کے نزدیک دکشنیشور بم فیکٹری میں پکڑا گیا' وہیں دس سال کی قید ہوئی۔ خوشی میں موٹا ہونے لگا۔ کاکوری مقدمہ میں تو جسم خوب بھر گیا تھا اور اب پھانسی کی سزا ہو گئی ہے۔

بہادر روشن سنگھ کو بھی پھانسی کی سزا ہوئی۔ وہ پہلے پولیس کی مدد کرتے تھے اور بہت سے ڈاکوؤں کو انہوں نے گرفتار کرایا تھا۔ وہ بھی پھنس گئے لیکن کوئی ڈاکو تو نہیں ہیں۔ جج نے بھی کہا ہے کہ یہ نوجوان سچے وطن پرست تھے۔ اچھا! اس بہادر کو بھی بار بار سلام۔

اس کے بعد شری منمتھ ناتھ گپت کا نمبر ہے۔ وہ کاشی ودیاپیٹھ کے بی اے کے طالب علم تھے۔ 18 سال عمر ہے۔ انہوں نے بنگالی' گجراتی' مراٹھی' اڑیہ' ہندی' انگریزی اور فرینچ وغیرہ متعدد زبانیں سیکھ لی تھیں۔ جج نے انہیں ڈکیتیوں میں شامل

کر کے 14 سال کی سخت سزا دی ہے۔ وہ بڑے بے باک اور نڈر ہیں' سزا سن کر بھی مسکرا دیے۔ آج کل جیل میں بھوک ہڑتال کیے بیٹھے ہیں۔ ان سے جیل میں ایک غیر سرکاری ممبر نے آکر پوچھا تھا کہ کھانا کیوں نہیں کھاتے تو انہوں نے جواب دیا ہم انسان ہے۔ ہمارے ساتھ انسانوں جیسا برتاؤ ہونا چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس جانوروں جیسے سلوک کو برداشت کر کے میں 14 سال تک کی سزا کاٹ پاؤں گا۔ گھٹ گھٹ کر مرنے سے اچھا ایک بار مرنا ہے۔ وہ پہلے عدم تعاون تحریک کے سلسلے میں بھی جیل جا چکے ہیں۔

اب جب جس نوجوانوں کا تذکرہ ہوگا' اسے اگر ہم عظیم انسان کہہ دیں تو جھوٹ نہیں۔ وہ بہادر جوگیش چندر چٹرجی ہے۔ وہ کوملا (ڈھاکہ) کے رہنے والے ہیں۔ وہ بی اے میں فلسفہ کے طالب علم تھے۔ پروفیسر ان سے بہت خوش تھے اور کہتے تھے کہ لڑکا بڑا ہونہار ہے۔ لیکن انہوں نے کالج تو کیا' پوری دنیا کی فلاسفی پر لات مار دی اور سب کچھ چھوڑ کر عہد ساز پارٹی سے جا ملے۔ انہیں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا اور ناقابل ذکر و ناقابل برداشت تکلیفیں دی گئیں۔ ایک دن ان کے سر پر پاخانہ ڈال دیا گیا اور چار دن تک کوٹھری میں بند رکھا گیا۔ منہ دھونے تک کے لئے پانی نہیں دیا گیا اور بری طرح مار کر پورا جسم زخمی کر دیا گیا۔ لیکن ان کے پاس خاموشی کے سوا کیا چارہ تھا۔

1920 میں رہائی ملی تو ایک معمولی کارکن کی طرح کانگریس میں کام کرتے رہے۔ گھر کے غریب ہیں لیکن اپنا گھر تباہ کر کے بھی دنیا کی خدمت ہوتی ہے۔ وہ 1923 میں یوپی آئے اور عہد ساز پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ 1924 میں بنگال واپس آ گئے اور گرفتار ہوئے۔ پہلے انہیں آرڈی نینس کے تحت گرفتار کیا گیا تھا پھر یہاں کا کوری لایا گیا۔ انہیں دس سال کی قید ہوئی۔ بے حد خوب صورت نوجوان ہیں۔ جج نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔

شری گووند چرن کار عرف ڈی این چودھری لکھنؤ سے پکڑے گئے۔ وہ بہت پرانے انقلابی ہیں۔ 1918 یا 1919 میں ڈھاکہ میں پولیس انہیں گرفتار کرنے آئی۔ انہوں نے گولیوں کا جواب گولیوں سے دیا اور گولیوں میں سے لڑتے لڑاتے بھاگ نکلے۔ لیکن گولیاں ختم ہو چکی تھیں اور وہ زخمی ہو گئے' گرفتار ہوئے' کالا پانی کی سزا ملی۔ 1922 میں شدید بیمار ہونے کے بعد رہائی ملی۔ 1925 میں دوبارہ گرفتار ہوئے اور اب دس سال قید ہو گئی ہے۔

اب شری سریش چندر بھٹاچاریہ کے بارے میں کچھ لکھیں گے۔ وہ بھی بنارس کے رہنے والے تھے۔ بنارس سازش کیس کے وقت ان کی عمر 16 برس کی تھی' گرفتار ہوئے۔ لیکن کوئی ثبوت نہ ہونے کے سبب رہا ہو گئے اور پھر نظر بند کر کے بندیل کھنڈ میں رکھے گئے۔ وہ ہندی کے مشہور مصنف ہیں۔ کان پور کے 'پرتاپ' جیسے موقر اور مشہور اخبار کے معاون مدیر تھے۔ وہ بہت اچھا گاتے تھے۔ جیل میں وہ یوگا کی مشق بھی کرتے تھے۔

شری راج کمار کانپور کے رہنے والے ہیں۔ وہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں بی۔ اے میں پڑھتے تھے' گرفتار ہوئے۔ ان کے کمرے سے دو رائفلیں برآمد ہوئیں' بہت اچھا گانے والے اور دیکھنے میں بھی بہت خوب صورت ہیں۔ جوشیلے بہت ہیں۔ شری دامودر سروپ جب شدید بیماری کے بعد بھی کورٹ میں بلائے گئے تو انہیں جوش آ گیا اور انہوں نے جج کو خوب سنائی۔ جج نے کہا کہ فیصلہ کے وقت تمہیں اس کا مزہ چکھایا جائے گا۔ بہادر نوجوان کو دس سال کی سزا ہوئی۔ زندگی ایک طرح سے برباد ہو گئی لیکن وہ مسکرا دیے۔ لائق مبارک باد ہیں یہ بہادر اور انہیں جنم دینے والی مائیں۔

شری وشنو شرن دوبلس میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ میرٹھ کے ویشیا یتیم خانہ کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ بی۔ اے میں عدم تعاون کر دیا اور میرٹھ کو انہوں نے دوسرا باردولی بنا دیا۔ سول نافرمانی کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ بہت خوب صورت مقرر تھے۔

ان کے گھر 'عہد سازوں' کی میٹنگ ہوئی۔ انہیں سات سال کی سزا ملی۔

شری رام دلارے کو بھی سات سال کی سزا ملی۔ وہ کان پور کے رہنے والے تھے۔ اسکاؤٹ ماسٹر' کانگریس کے جوشیلے کارکن تھے۔

6 اپریل کو فیصلہ سنایا گیا' اس دن سبھی بہادر گاتے ہوئے آئے تھے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

سزائیں لاپروائی سے سنیں اور ہنس پڑے۔ اس کے بعد مصیبت کا وقت آیا۔ جن بہادروں نے ایک ساتھ سمندر میں کشتیاں ڈالی تھیں' ان کی علاحدگی کا وقت آ گیا۔ "انقلابی افراد کے مابین جو بے پناہ محبت اور پیار ہوتا ہے' اس کا احساس عام دنیادار آدمی نہیں سمجھ سکتا"۔ شری راس بہاری کے اس جملہ کا مطلب ہم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ جن لوگوں نے 'سر رکھ تلی پریم کی گلی' میں قدم رکھ دیا ہو' ان کی عظمت کو ہم جیسے حقیر آدمی کیا سمجھ سکتے ہیں؟ ان کا باہم پیار کتنا گہرا اور عمیق ہوتا ہے' اسے ہم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے۔ ڈیڑھ سال سے اپنی حیات کے تاریک مستقبل کے انتظار میں مل کر بیٹھے تھے۔ وہ لمحہ آ گیا' تین کو پھانسی' ایک کو عمر قید' ایک کو چودہ برس قید' چار کو دس برس کی قید اور بقیہ لوگوں کو پانچ سے دس سال کی قید کی سزا سنا کر جج انہیں نصیحت کرنے لگا۔ آپ سچے خدمت گار اور ایثار پسند ہو۔ لیکن غلط راستے پر چل رہے ہو' غریب ہندوستان میں ہی سچے وطن پرست کا یہ حال ہوتا ہے۔ جج انہیں اپنے کاموں پر از سر نو غور کرنے کی بات کہہ کر چلا گیا اور پھر ...... پھر کیا ہوا؟ کیا پوچھتے ہیں؟ جدائی کا لمحہ بڑا برا ہوتا ہے۔ جنہیں پھانسی کی سزا مل گئی' جنہیں عمر بھر کے لئے جیل میں قید کر دیا گیا' ان کے دلوں کا حال ہم نہیں سمجھ سکتے۔ قدم قدم پر رونے والے ہندوستانی' یوں ہی تھر تھر کانپنے والے بزدل ہندوستانی' انہیں کیا سمجھ سکتے ہیں؟ چھوٹوں نے بڑوں کے پیروں کی قدم بوسی کی۔ انہوں نے چھوٹوں کو دعائیں دیں' زور سے گلے ملے اور آہ بھر کر رہ گئے۔ دعوت دی گئی۔ جاتے ہوئے شری رام پرساد جی نے بڑے درد آمیز لہجہ میں کہا:

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

یہ کہہ وہ طویل' بہت دور کے سفر پر چل پڑے۔ دروازے سے نکلتے وقت اس عدالت کے بہت بڑے رینکن تھیٹر ہال کے خوفناک سکوت کو ایک آہ بھر کر توڑتے ہوئے انہوں نے پھر کہا:

ہائے' ہم جس پر بھی تیار تھے مر جانے کو
جیتے جی ہم سے چھڑایا اسی کاشانے کو

ہم لوگ ایک آہ بھر کر سمجھ لیتے ہیں کہ فرض پورا ہو گیا۔ ہمیں آگ نہیں لگ اٹھتی' ہم تڑپ نہیں اٹھتے' ہم اتنے مردہ ہو گئے ہیں۔ آج وہ بھوک ہڑتال کر بیٹھے ہیں اور تڑپ رہے ہیں اور ہم خاموشی سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ خدا انہیں طاقت دے کہ وہ بہادری سے اپنے دن پورے کریں اور ان بہادروں کی قربانی رنگ لائے۔

— رائٹر و درو ہی

کاکوری کے شہیدوں کے پھانسی کے حالات

جنوری 1928 کے 'کرتی' میں بھگت سنگھ نے ایک اور مضمون کاکوری کے شہیدوں کے بارے میں 'وِدروہی' کے نام سے تحریر کیا۔ مدیر

'کرتی' کے قارئین کو پہلے ہی کسی شمارہ میں ہم کاکوری کے مقدمہ کے حالات بتا چکے ہیں۔ اب ان چار بہادروں کی پھانسی دیئے جانے کا حال بتاتے ہیں:

17 دسمبر 1927 کو شری راجندر ناتھ لاہری کو گونڈہ جیل میں پھانسی دی گئی اور 19 دسمبر 1927 کو شری رام پرساد 'بسمل' کو گورکھپور جیل میں' جناب اشفاق اللہ کو فیض آباد جیل میں اور شری روشن سنگھ جی کو الہ آباد جیل میں پھانسی پر چڑھایا گیا۔

اس مقدمہ کے سیشن جج مسٹر ہیملٹن نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا تھا کہ نوجوان وطن پرست ہیں اور انہوں نے اپنے کسی فائدہ کے لئے کچھ بھی نہیں کیا اور اگر یہ نوجوان اپنے کیے پر پچھتاوا ظاہر کریں تو ان کی سزا میں رعایت دی جا سکتی ہے۔ ان چاروں بہادروں نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا لیکن انہیں پھانسی دیئے بغیر ڈائن نوکر شاہی کو قرار کیسے آتا۔ اپیل میں بہت سے لوگوں کی سزائیں بڑھا دی گئیں۔ بعد ازاں نہ تو گورنر اور نہ ہی وائسرائے نے ان کی جوانی کی طرف توجہ دی اور پروی کونسل نے ان کی اپیل سننے سے قبل ہی خارج کر دی۔ یوپی کونسل کے بہت سے اراکین' اسمبلی اور کونسل اور اسٹیٹ کے بہت سے ممبروں نے وائسرائے کو ان کی جوانی پر رحم کی درخواست کی لیکن ہونا کیا تھا؟ ان کے اتنے ہاتھ پاؤں مارنے کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ یوپی کونسل کے سوراج پارٹی کے لیڈر شری گووند ولبھ پنت ان کے معاملہ پر بحث کے لئے اپنی رائے وائسرائے اور لاٹ صاحب کو بھیجنے کے لئے شور مچا رہے تھے۔ پہلے تو صدر صاحب ہی اجازت نہیں دے رہے تھے لیکن بہت سے ممبران نے مل کر کہا تو پیر کو بحث کے لئے اجازت ملی لیکن پھر چھوٹے انگریز صدر نے جو اس وقت صدر کا کام کر رہا تھا' پیر کو کونسل کی چھٹی ہی کر دی۔ ہوم ممبر نواب چھتاری کے پاس جا کر چلائے لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی اور کونسل میں ان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا جا سکا اور انہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اسی غصہ میں حقارت کے ساتھ روسی زار اور فرانسیسی لوئس بادشاہ ہونہار نوجوانوں کو پھانسی پر لٹکا لٹکا کر دلوں کی بھڑاس نکالتے رہے لیکن ان کے اسٹیٹ کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں اور ان کے تختے پلٹ گئے۔ اسی غلط طریقے کا آج دوبارہ استعمال ہو رہا ہے۔ دیکھیں اگر اس بار ان کی مرادیں پوری ہوں۔ درج ذیل سطور میں ہم ان چاروں بہادروں کے حالات مختصراً لکھتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ یہ بیش قیمت رتن موت کے سامنے کھڑے ہو کر بھی کتنی شجاعت اور بہادری کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔

شری راجندر لاہری

آپ بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایم اے کے طالب علم تھے۔ 1925 میں کلکتہ کے نزدیک دکشنیشور بم فیکٹری پکڑی گئی تھی' اس میں وہ بھی گرفتار ہوئے اور انہیں سات برس کی قید ہوئی۔ وہاں سے انہیں لکھنؤ لایا گیا اور کاکوری کیس میں انہیں پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ انہیں بارہ بنکی اور گونڈہ جیلوں میں رکھا گیا۔ وہ موت کو سامنے دیکھ کر پریشان نہیں ہوتے تھے بلکہ ہمیشہ مسکراتے رہتے۔ وہ خوش مزاج اور بے باک فطرت کے حامل تھے۔ وہ موت کا مذاق اڑاتے رہتے تھے۔ ان کے دو خطوط ہمارے سامنے ہیں۔ ایک 6 اکتوبر کو اس وقت تحریر کیا جب وائسرائے نے رحم کی درخواست نامنظور کر دی۔ وہ لکھتے ہیں:

''چھ مہینے بارہ بنکی اور گونڈہ کی کال کوٹھریوں میں رہنے کے بعد آج مجھے بتایا گیا کہ ایک ہفتہ کے اندر پھانسی دے دی جائے گی کیوں کہ وائسرائے نے درخواست نامنظور کردی ہے۔اب میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے ان دوستوں کا (یہاں ان کے نام ہیں) شکریہ ادا کروں جنہوں نے میرے لئے بہت کوششیں کیں۔آپ میرا آخری سلام قبول کریں۔ہمارے لئے مرنا جینا پرانے کپڑے بدلنے سے زیادہ کچھ بھی نہیں (یہاں جیل والوں نے کچھ کاٹ چھانٹ کی ہے جو بالکل پڑھا نہیں جاتا) موت آرہی ہے' ہنستے ہنستے بڑی رغبت اور بخوشی اسے زور سے گلے لگالوں گا۔جیل کے قانون کے مطابق اور کچھ نہیں لکھا جاسکتا۔آپ کو سلام' ملک کے دردمندوں کو سلام' وندے ماترم''۔

آپ کا

راجندر ناتھ لاہڑی

پھر اس خط کے بعد پھانسی نہیں ہوسکی کیوں کہ پروی کونسل میں اپیل کی گئی تھی۔دوسرا خط انہوں نے 14 دسمبر کو ایک دوست کے نام تحریر کیا تھا:

کل مجھے معلوم ہوا کہ پروی کونسل نے میری اپیل خارج کردی ہے۔آپ لوگوں نے ہمیں بچانے کی بہت کوشش کی لیکن لگتا ہے کہ ملک کی قربانی کی چوکھٹ پر ہماری جانوں کی قربانی کی ضرورت ہے۔موت کیا ہے؟ زندگی کی دوسری سمت کے سوا کچھ نہیں۔زندگی کیا ہے؟ موت کی دوسری جہت کا نام ہے۔پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔یہ تو فطری بات ہے' اتنی ہی فطری جتنا صبح میں سورج کا طلوع ہونا اگر ہماری یہ بات سچ ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہماری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔

میرا سلام سب کو۔آخری سلام

آپ کا

راجندر ناتھ لاہڑی

کتنا معصوم' کتنا حسین اور بے باکی سے بھرا خط ہے اور ان کی تحریر کتنی معصوم ہے پھر ان کو دیگر لوگوں سے دو دن قبل ہی پھانسی دے دی گئی۔پھانسی کے وقت انہیں ہتھکڑی پہنانے کا انتظام کیا جانے لگا تو انہوں نے کہا کہ کیا ضرورت ہے۔آپ مجھے راستہ بتاتے جاؤ' میں خود ہی ادھر چل پڑتا ہوں۔ارتھی کا جلوس نکالا گیا اور بڑے جوش کے ساتھ آخری رسومات ادا کی گئیں۔وہیں یادگار بنانے کی صلاح کی جارہی ہے۔

شری روشن سنگھ جی

آپ کو 19 دسمبر کو الہ آباد میں پھانسی دے دی گئی۔ان کا ایک آخری خط 13 دسمبر کا تحریر کردہ ہے۔وہ لکھتے ہیں:

اس ہفتہ پھانسی ہوجائے گی۔خدا سے دعا ہے کہ آپ کے پیار و محبت کا آپ کو صلہ ملے۔آپ میرے لئے کوئی غم نہ کرنا۔میری موت تو خوشی والی ہے۔چاہئے تو یہ کہ کوئی بدفعلی کرکے بدنام ہو کر نہ مرے اور آخری وقت خدا یاد رہے۔یہی دو باتیں ہیں۔اس لئے کوئی غم نہیں کرنا چاہئے۔دو سال اہل و عیال سے جدا رہا ہوں۔خدا کی یاد کا خوب موقع ملا' اس لئے دنیاوی محبت سے دل اچاٹ ہوگیا۔اب کوئی چاہت باقی نہ رہی۔مجھے یقین ہے کہ زندگی کا دکھ بھرا سفر ختم کرکے سکھ کی جگہ جارہا ہوں۔شاستروں میں تحریر ہے۔''جنگ مرنے والوں کی رشیوں جیسی رہت (درجہ) ہوتی ہے۔(آگے واضح نہیں ہے)۔

'زندگی زندہ دلی کو جانیئے روشن! ورنہ کتنے مرے اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ آخری سلام۔
شری روشن سنگھ رائے بریلی کے کام کرنے والوں میں تھے۔ کسان تحریک میں جیل جا چکے تھے۔ سب کو یقین تھا کہ ہائی کورٹ سے آپ کی موت کی سزا ختم ہو جائے گی کیوں کہ آپ کے خلاف کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی وہ انگریز شاہی کا شکار ہو ہی گئے اور پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ تختہ دار پر کھڑے ہونے کے بعد ان کے منہ سے جو آواز نکلی وہ یہ تھی...... 'بندے ماترم'!
آپ کی میت کے جلوس کی اجازت نہیں دی گئی۔ لاش کی تصویر لے کر دوپہر میں آخری رسومات ادا کر دی گئیں۔

شری اشفاق اللہ

یہ مستانہ شاعر بھی حیران کن مسرت کے ساتھ تختہ دار پر چڑھا۔ بڑا خوب صورت، حسین اور لمبا چوڑا جوان تھا، طاقت ور بہت تھا۔ جیل میں کچھ کمزور ہو گیا تھا۔ انہوں نے ملاقات کے وقت بتایا کہ کمزوری کا سبب غم نہیں، بلکہ خدا کی یاد میں غرق رہنے کے سبب کھانا بہت کم کھانا ہے۔ پھانسی سے ایک دن قبل ملاقات ہوئی۔ وہ خوب سجے سنورے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے کڑھے ہوئے بال خوب سجتے تھے۔ بہت ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے کہا 'کل میری شادی ہونے والی ہے۔
دوسرے دن صبح چھ بجے انہیں پھانسی دی گئی۔ قرآن شریف کا بستہ لٹکا کر حاجیوں کی طرح وظیفہ پڑھتے ہوئے بڑے حوصلہ کے ساتھ چل پڑے۔ آگے جا کر تختہ دار کی رسی کو چوم لیا۔ وہیں انہوں نے کہا:
''میں نے کبھی کسی آدمی کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے اور میرا انصاف خدا کے سامنے ہوگا۔ میرے اوپر لگائے گئے سبھی الزامات غلط ہیں''۔ خدا کا نام لیتے ہی رسی کھینچ دی گئی اور وہ دار فانی کو کوچ کر گئے۔ ان کے رشتہ داروں نے بڑی منت خوشامد کے بعد ان کی لاش حاصل کی اور انہیں شاہ جہاں پور لے آئے۔ لکھنؤ اسٹیشن پر مال گاڑی کے ایک ڈبے میں ان کی لاش دیکھنے کا موقع کچھ لوگوں کو ملا۔ پھانسی کے دس گھنٹوں بعد بھی چہرے پر ویسی ہی رونق تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابھی سوئے ہیں۔ لیکن اشفاق تو ایسی نیند سو گئے تھے جہاں سے وہ کبھی بیدار نہیں ہوں گے۔ اشفاق شاعر تھے اور ان کا لقب حسرت تھا۔
مرنے سے قبل انہوں نے اپنے یہ دو شعر کہے تھے:

فنا ہیں ہم سب کے لئے، ہم پہ کچھ نہیں موقوف
بقا ہے ایک فقط جانے کی بریا کے لئے
(فنا تو سبھی ہوں گے، کوئی ہم تنہا تو نہیں ہوں گے۔ نہ مرنے والا تو صرف خدائے واحد ہے)

اور۔

تنگ آ کر ہم ان کے ظلم سے بیداد سے
چل دیئے سوئے عدم زندان فیض آباد سے

مسٹر اشفاق کی جانب سے ایک معافی نامہ شائع ہوا تھا۔ اس کے متعلق شری رام پرساد نے اپنے آخری بیان میں صورت حال واضح کر دی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اشفاق معافی نامہ تو کیا، اپیل کے لئے بھی راضی نہیں تھے۔ انہوں نے کہا ''میں خدا کے سوائے کسی کے آگے سجدہ ریز نہیں ہونا چاہتا۔ مگر رام پرساد کے کہنے کے بعد انہوں نے وہ سب کچھ لکھا تھا۔ ورنہ موت کا انہیں کوئی ڈر نہیں تھا۔ مذکورہ حالات پڑھ کر قارئین بھی یہ بات سمجھ سکتے ہیں۔ وہ شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے اور رام پرساد بسمل کے دست راست تھے۔ مسلمان ہونے کے باوجود انہیں سخت گیر آریہ سماج سے حد درجہ پیار تھا۔ دونوں عاشق

ایک عظیم مقصد کے لئے اپنی جانیں نچھاور کر کے زندہ وجاوید ہو گئے۔

شری رام پرساد بسمل

شری رام پرساد بسمل' بہت ہونہار نوجوان تھے۔غضب کے شاعر تھے۔ دیکھنے میں بھی بہت حسین اور خوب صورت تھے۔ بہت لائق تھے۔شناسا کہتے ہیں کہ اگر کسی اور جگہ یا کسی دیگر ملک یا کسی اور وقت پیدا ہوئے ہوتے تو آرمی چیف بنتے۔انہیں پوری سازش کا لیڈر مانا گیا ہے۔اگر چہ وہ بہت زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن پھر بھی پنڈت جگت نارائن جیسے سرکاری وکیل کے ہوش حواس باختہ کر دیتے تھے۔چیف کورٹ میں اپنی اپیل خود ہی لکھی جس پر ججوں کو کہنا پڑ کہ اسے لکھنے میں یقینی طور پر کسی بڑے دانشور یا با صلاحیت شخص کا ہاتھ ہے۔

19 تاریخ کی شام آپ کو پھانسی دی گئی۔12 کی شام کو جب آپ کو دودھ دیا تو آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اب میں ماں کا دودھ ہی پیوں گا۔18 کو آپ کی ملاقات ہوئی۔ ماں سے ملتے وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ ماں بہت حوصلہ مند دیوی تھیں۔ان سے کہنے لگیں۔''ہریش چندر' ددھیچی وغیرہ بزرگوں کی طرح بہادری' مذہب اور ملک کے لئے جان دے' فکر کرنے اور پچھتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔وہ ہنس پڑے۔کہا' ماں مجھے کیا فکر اور کیا پچھتاوا' میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔میں موت سے نہیں ڈرتا۔لیکن ماں! آگ کے پاس رکھا ہوا گھی پگھل ہی جاتا ہے۔تیرا میرا تعلق ہی کچھ ایسا ہے کہ قریب آتے ہی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں' ورنہ تو میں بہت خوش ہوں۔پھانسی پر لے جاتے وقت انہوں بہ آواز بلند کہا' بندے ماترم' بھارت ماتا کی جے اور پرسکون انداز میں چلتے ہوئے کہا:

مالک تری رضا رہے اور تو ہی تو رہے
باقی نہ میں رہوں' نہ میری آرزو رہے
جب تک کہ تن میں جان رگوں میں لہو رہے
تیرا ہی ذکر یار تیری جستجو رہے

پھانسی کے تختہ پر کھڑے ہو کر انہوں نے کہا۔

I wish the downfall of the British Empire

(میں حکومت برطانیہ کا خاتمہ چاہتا ہوں)

پھر یہ شعر پڑھا۔

اب نہ اہل ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
ایک مٹ جانے کی حسرت' اب دل بسمل میں ہے

پھر خدا کے حضور میں دعا کی اور ایک منتر پڑھنا شروع کیا۔رسی کھینچی گئی۔رام پرساد جی پھانسی پر لٹک گئے۔آج وہ بہادر اس دنیا میں نہیں ہے۔اسے انگریزی حکومت نے اپنا خوف ناک دشمن سمجھا۔عام خیال یہ ہے کہ اس کا قصور تھا کہ وہ اس غلام ملک میں پیدا ہو کر بھی ایک بڑا بوجھ بن گیا تھا اور جنگی علوم سے بخوبی واقف تھا۔انہیں مین پوری سازش کے لیڈر شری گیندا لال دکشت جیسے شجیع نے خصوصی طور پر تربیت دے کر تیار کیا تھا۔مین پوری کے مقدمہ کے وقت وہ بھاگ کر نیپال چلے گئے۔اب تعلیم و تربیت آپ کی موت کی بڑی وجہ بن گئی۔7 بجے ان کی لاش ملی اور بہت بڑا جلوس نکلا۔وطن کی محبت میں آپ

کی ماں نے کہا ''میں اپنے لڑکے کی اس موت پر مسرور ہوں' مغموم نہیں۔ میں شری رام چندر جیسا ہی لڑکا چاہتی تھی۔ بولو شری رام چندر کی جے۔

عطر اور پھولوں کی بارش کے بیچ ان کی لاش کا جلوس جا رہا تھا۔ دکان داروں نے ان کے اوپر پیسے پھینکے۔ گیارہ بجے ان کی لاش شمشان گھاٹ پہنچی اور آخری رسومات ادا کی گئیں۔

ان کے خط کا آخری حصہ آپ کی خدمت میں پیش ہے:

'میں بخیریت ہوں۔ 19 تاریخ کو صبح جو ہونا ہے' اس کے لئے تیار ہوں۔ پرماتما خوب طاقت دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ میں لوگوں کی خدمت کے لئے دوبارہ جلد ہی جنم لوں گا۔ سبھی کو میرا نمسکار کہیں۔ مہربانی کر کے اتنا کام اور کرنا کہ میری جانب سے پنڈت جگت نارائن (سرکاری وکیل جس نے پھانسی کے لئے بہت زور لگایا تھا) کو آخری سلام کہہ دینا۔ انہیں ہمارے خون سے لت پت روپیوں سے چین کی نیند آئے۔ بڑھاپے میں ایشور انہیں عقل سلیم دے۔

رام پرساد جی کی حسرتیں دل ہی دل میں رہ گئیں۔ انہوں نے ایک طویل اعلان کیا ہے جسے اختصار میں ہم دوسری جگہ دے رہے ہیں۔ پھانسی سے دو دن قبل سی آئی ڈی کے مسٹر ہیملٹن آپ لوگوں سے منتیں کرتے رہے کہ آپ زبانی طور پر سبھی باتیں بتادیں' آپ کو پانچ ہزار روپے کا نقد انعام دیا جائے گا اور بیرسٹر کی تعلیم کے لئے سرکاری خرچ پر ولایت بھیجا جائے گا۔ لیکن آپ کب ان باتوں کی پرواکرتے تھے۔ وہ حکومتوں کو ٹھکرانے والے اور کبھی کبھار جنم لینے والے بہادروں میں سے تھے۔ مقدمہ کے دنوں میں جج نے آپ سے پوچھا ''آپ کے پاس کیا ڈگری ہے؟''۔ تو انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔ ''سمراٹ بنانے والوں کو ڈگری کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی' کلائیو کے پاس بھی ڈگری نہیں تھی''۔ آج وہ بہادر ہمارے درمیان نہیں ہے۔ آہ!

کوکا بغاوت — 1

فروری 1928 کو دہلی سے شائع ہونے والے 'مہارتھی' میں کوکا بغاوت کی تاریخی تفصیلات فراہم کرنے والا بھگت سنگھ کا تحریر کردہ یہ مضمون بی ایس سندھو کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مدیر۔

سکھوں میں ایک ذیلی فرقہ ہے جو 'نامدھاری' یا کوکا کہلاتا ہے۔ اس کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ گزشتہ صدی کے نصف میں اس کا ظہور ہوا۔ آج وہ ایک متفکر مذہبی فرقہ نظر آتا ہے مگر اس کے بانی شری گرو رام سنگھ ایک کٹر استقلال پسند آدمی تھے۔ ایک معروف خدا پرست' سماجی خرابیوں کے سبب ایک باغی سماجی مصلح بن گیا اور ایک سچے سماجی مصلح کی مانند جب وہ میدان عمل پر گامزن ہوا تو اس نے دیکھا کہ ملک کی ترقی کے لئے غلامی کی زنجیروں کو کاٹنا اولین ضرورت ہے۔ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی تیاری کا عظیم پروگرام بنایا گیا۔ اس کی تیاری میں ہی جو لڑائی جھگڑے ہوئے اسی سے حکمراں طبقہ کو اس تحریک کو کچل ڈالنے کا سنہری موقع فراہم ہو گیا اور ان کوششوں کی ناکامی کے علاوہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

کوکا آندولن کی تاریخ آج تک لوگوں کے سامنے نہیں آئی۔ کسی نے اسے اہمیت نہیں دی۔ کوکا لوگوں کو گمراہ اور بیوقوف کہہ کر ہم اپنے فرض سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ لالچ یا فائدہ کے لئے اگر ان لوگوں نے جان دی تو ہم ان دیکھی تو کر سکتے تھے مگر

ان کی 'بیوقوفی' میں بھی وطن پرستی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ توتوپ کے منہ سے بندھتے وقت ہنس پڑتے تھے۔ وہ تو مزے سے 'ست شری اکال' کے فلک شگاف نعروں سے زمین آسمان کو ایک کر دیتے تھے۔ ان کی پیشانی پر تشویش' فکر یا پشیمانی کی لکیر تک نہیں نظر آتی تھی۔ کیا وہ قابل فراموش ہیں؟ ان کا بڑا جرم غالباً ناکامی کے لئے علاوہ کچھ نہیں تھا مگر اسکاٹ ویر ولیم والس بھی تو ناکام ہوکر سزائے موت کا مستحق بنا تھا اس کی تو آج پورا انگلینڈ پرستش کرتا ہے۔ پھر ہمارے ناکامیاب وطن پرستوں کو ہی اس طرح فراموش کر کے کیوں عمیق تاریکی میں پھینک دیا جائے؟ نامناسب

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے لئے' ملک کے لئے' بے لوث جذبہ کے ساتھ مرنے والے لوگوں کو بھول جانا بڑی احسان فراموشی ہوگی۔ ہم ان کی یاد میں کوئی بڑا اسٹوپ نہیں قائم کر سکتے تو کیا اپنے دل میں بھی تھوڑی جگہ دینے سے ہچکچائیں۔ اسی نظریہ سے تحریک پا کر آج ان 'بیوقوف' اور جلد باز امید پسندوں کی مختصر تاریخ لکھنے کی ہمت کی ہے۔ اس سے اگر لوگوں کو ان کے بارے صحیح واقفیت ہو جائے اور زیادہ جاننے کی خواہش بیدار ہو جائے تو یہ کوشش کامیاب سمجھوں گا۔

ان کی اس مختصر تاریخ کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1۔ گرو جی کا ذاتی کردار

2۔ کوکا بغاوت

3۔ بغاوت کے بعد

گرو رام سنگھ جی کی حیات

شری رام سنگھ جی 1824 میں بھینی نامی گاؤں' ضلع لدھیانہ (پنجاب) میں ایک بڑھئی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ گرو گووند سنگھ جی نے کبھی کہا تھا کہ "میں بارہویں سال میں رام سنگھ نام سے مشہور یا ظہور پذیر ہوں گا"۔ اس لئے ان کے معتقدین انہیں ان ہی دس گروؤں کا اوتار مانتے ہیں۔ مگر باقی سکھ سماج کا یقین ہے کہ گرو گووند سنگھ جی نے گرو کے سبھی حقوق گرو گرنتھ صاحب کو ہی دے دیئے اور گرو روایت بند کر دی۔ اگرچہ گرو رام سنگھ گرو نہیں ہو سکتے۔

ہمیں ان تنازعات سے کچھ لینا دینا نہیں۔ گرو رام سنگھ عہد شباب میں پنجاب کیسری مہاراجا رنجیت سنگھ کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ وہ پہلے سے ہی خدا پرست تھے اور زیادہ وقت خدا کی عبادت میں ہی بسر کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ جلد ہی فوج میں مقبول عام ہو گئے۔ وہ ایشور بھگتی میں اغراق کے سبب فوجی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے قاصر رہتے' انہیں سبھی ذمہ داریوں سے چھٹی دے دینے کے بعد بھی فوج میں برقرار رکھا گیا۔ ایک دن' کہا جاتا ہے' انہیں خواب میں شری گرو گووند سنگھ جی کا دیدار ہوا۔ انہوں نے ان سے ہزارا (سرحدی صوبہ) نشیں بابا بالک ناتھ سے گرو گدی کے حقوق لینے کو کہا۔ دوسرے ہی دن انہوں نے دیگر بیس پچیس بھگتوں کے ساتھ ادھر روانہ کر دیا۔ بابا بالک ناتھ جی نے ان کا خوب خیر مقدم کیا اور تعلیم دی۔ وہاں سے لوٹ کر انہوں نے نوکری چھوڑ دی اور گاؤں میں جا کر خاموش زندگی بسر کرنے لگے۔

برسوں گزر گئے۔ متعدد تبدیلیاں آئیں۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی موت کے بعد تخت کے لئے تنازعہ شروع ہوا۔ انگریزوں نے پنجاب فتح کر لیا اور اسے بھی بقیہ ہندوستان کی مانند غلامیوں کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ یہ سب کچھ ہو گیا اور ساتھ

1۔ بھائی پرمانند کے ایک مضمون کی بنیاد پر۔

ہی 1857 کی پولیس بغاوت بھی وجود میں آئی اور انگریز پرامن طریقے پر ہندستان پر حکمرانی کرنے لگے مگر گرو رام سنگھ جی وہیں اپنی خاموش زندگی بسر کرتے رہے۔ ہاں! ایشور بھگتی کے سبب آپ دور دور تک مشہور ہو گئے۔ پورے صوبے سے لوگ ان کے دیدار کے لئے جوق در جوق تشریف لاتے تھے۔

پہلے تو آپ محض ایشور بھگتی کا ہی پیغام دیتے تھے مگر بعد میں سماجی اصلاح سے متعلق پیغام دینے لگے۔ آپ نے لڑکیوں کی خرید و فروخت' نشہ اور گوشت خوری وغیرہ بہت سی برائیوں کی پوری شدت سے مخالفت کی۔ آپ کے بھگت بھی سادہ زندگی بسر کرتے اور ایشور کی عبادت میں غرق رہتے۔ آپ نے اپنے گاؤں میں ایک بھنڈارا کھول رکھا تھا جہاں سبھی لوگوں کو مفت کھانا ملتا تھا۔ مگر جلد ہی ایک تبدیلی آئی۔

کہا جاتا ہے کہ رام داس نامی کسی نامعلوم سنیاسی نے آ کر ان سے کہا۔ ''اس وقت ملک کو غیر ملکی حکمرانوں سے نجات دلانا ہی اولین ذمہ داری ہے''۔ اور اسی وقت سے آپ نے اپنا پروگرام سیاسی بنالیا۔ سنیاسی والی بات محض سنی سنائی ہے۔ ممکن ہے ایسا کوئی واقعہ نہ ہوا ہو مگر اتنا تو طے ہے کہ اس وقت گرو رام سنگھ جی کو ملک کی غلامی بری طرح کھٹک رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ باہری آزادی کے ساتھ ہی ساتھ ملک کے لوگوں کا ضمیر بھی مردہ ہوتا جارہا ہے۔ لوگ جد و جہد آزادی کا خیال تک ترک کر بیٹھے ہیں۔ ابھی کل انہوں نے سپاہیوں کی بغاوت اور اس کی ناکامی کے بعد کیئے گئے ناقابل ذکر مظالم دیکھے سنے تھے۔ اس سے بھی یقیناً انہیں کچھ ٹھیس لگی ہوگی۔ جو بھی ہو' انہوں نے غیر ملکی حکمرانی کا کھوکھلاپن اچھی طرح دیکھ کر ایک پروگرام کے تحت کام کرنا شروع کیا۔ اب تک محض علم کی باتیں ہوتی تھیں اب تعلیم اور تنظیم کی بھی ابتدا ہوئی۔

انہوں نے اس وقت عین وہی عدم تعاون کی تشہیر شروع کی جو 1920 میں مہاتما گاندھی جی نے کی۔ ان کا عدم تعاون مہاتما جی کی عدم تعاون تحریک سے بھی کئی باتوں میں مقدم تھا۔ عدالتوں کا بائیکاٹ' اپنی پنچایتوں کا قیام' سرکاری تعلیم کا بائیکاٹ' غیر ملکی سرکار کے مکمل بائیکاٹ کے ساتھ ہی ساتھ ریل' تار اور ڈاک کے بائیکاٹ کا بھی پرچار ہوا۔ اس وقت ملک آج کی طرح بے جان ہو کر ان اشیاء پر اتنا منحصر نہیں تھا کہ اس کے بائیکاٹ کا تصور بھی نہ کر پاتا بلکہ انہوں نے ڈاک کا اپنا نظم اس قدر بہتر بنالیا تھا کہ ان کی ڈاک سرکاری ڈاک سے بھی جلد پہنچ جاتی تھی۔ ان سب کے ساتھ ہمیشہ سادہ لباس اور سودیشی کپڑا پہننے کی پرزور ہدایت ہوتی۔ پرچار کا کام بہت دنوں تک نہیں ہو پایا تھا کہ سرکار کی تیز نظریں اس آندولن پر پڑیں۔ انہیں اس ابھرتی تحریک کو دبانے کی فکر ہوئی۔

ٹی ڈی فورسِتھ (T.D Forsith) جو کہ 1863 میں پنجاب حکومت کے چیف سکریٹری تھے اور بعد میں 1872 میں کوکا بغاوت کے وقت امبالہ ڈویژن کے کمشنر کے عہدہ پر مامور تھے' اپنی آٹو بایوگرافی میں رقم طراز ہیں:

''1863 میں ہی میں اس تحریک کی تہہ تک پہنچ گیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ اس کا خوف ناک انجام ہو سکتا ہے۔ بالآخر میں نے ان کے پرچار پر بہت سی پابندیاں عائد کردیں جس سے ان کے تشہیری کام کی رفتار کچھ حد تک رک گئی۔

جب حکومت نے بڑی تعداد میں لوگوں کی بھینی آمد و رفت اور ان کا زیادہ دیر تک ٹھہرنا بھی بند کر دیا تو گرو رام سنگھ جی نے اپنا کام جاری رکھنے کے لئے ایک تدبیر سوچی۔ پورے ملک کو 22 حصوں میں تقسیم کر کے 22 باصلاحیت افراد ان کی تنظیم سازی کے لئے مقرر کر دیئے گئے۔ وہ بھی 'صوبے' کہلاتے تھے۔ کام بڑی مہارت کے ساتھ چلتا رہا۔ سبھی نامدھاری سکھ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ گرو جی کو بطور عطیہ دیتے۔ وہ سب بھینی بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ سب تو ہوتا ہی تھا اور ساتھ ہی ساتھ خفیہ طور پر بغاوت کی تشہیر بھی ہوتی رہی۔ خارجی جوش میں بہت حد تک کمی کر دی گئی۔ یہاں تک کہ سرکار کے شک و شبہات بہت حد تک

دور ہو گئے اور سبھی پابندیاں 1869 میں ختم کر دی گئیں۔

پابندیوں سے آزادی ہوتے ہی لوگوں کے جوش وخروش میں اضافہ ہوا۔ اس میں اتنا اضافہ ہوا کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اسی سے 1872 میں ادھوری بغاوت شروع ہوگئی جس کی زد میں آ کر عظیم تحریک بری طرح کچل دی گئی۔ مگر اس اہم واقعہ پر کچھ لکھنے سے پہلے شری گرو جی کے ذاتی کردار سے متعلق چند دلچسپ باتوں کا ذکر نا مناسب نہیں ہوگا۔

گرورام سنگھ بڑے اثر ورسوخ والے فرد تھے۔ ان کی غیر معمولی روحانی طاقت کے متعلق بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ جس کے کان میں تعلیم کا منتر پھونک دیتے تھے وہی ان کا پرم بھگت اور شاگرد بن جاتا تھا۔ جب اس بات کی زیادہ شہرت ہوئی تو دو بدمعاش انگریز ان کے پاس ان کا امتحان لینے آئے۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''دیکھیں گے ہم پر گرو جی کا کیا اثر پڑتا ہے؟'' مگر تعلیم کے بعد ان کے بڑے معتقد ہو گئے اور اس وقت سے ان کے ذاتی عیب بھی مٹ گئے۔ اسی طرح ڈاکٹر گو لک چند پی ایچ ڈی اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں کہ ان کی دادی کا بھائی بدکردار شخص تھا اور وہ حقہ کا دلدادہ تھا۔ محض ایک بار ہی گرو جی کے دیدار نے ان کی زندگی بدل دی۔ حقہ کی عادت تو بالکل چھوٹ گئی، علاوہ ازیں پوری زندگی خدا کی عبادت میں بسر کی۔ اسی طرح ایک اور شخص جس نے کبھی کوئی قتل کر دیا تھا، اس نے بھی گرو جی سے تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں اس نے عدالت میں خود سپردگی کر دی اور اقبال جرم کر لیا۔ جب جج نے انتہائی تعجب کے ساتھ پوچھا 'تمہیں تو کوئی جانتا بھی نہ تھا اور قتل کا تم پر شبہ بھی نہیں تھا، پھر تم نے یکا یک اقبال جرم کر کے موت کا عزم کیوں کیا'؟ تو اس نے جواباً کہا۔ 'میرے گرو جی کی ایسی ہی ہدایت تھی''۔

سرکار نے بھی امتحان لینا چاہا۔ ایک سب انسپکٹر کو بھیجا۔ وہ بھی مسرور اور خوش تھا۔ اسے امید تھی کہ بھی راز افشا کر کے کچھ انعام حاصل کرے گا۔ گرو جی کے دیدار کے بعد واپس آ گیا۔ لوٹتے ہی مستعفی ہو گیا۔ افسروں نے پوچھا۔ ''رام سنگھ کیا کہتے ہیں''؟ کہا 'بتانے کی ہدایت نہیں''۔ پوچھا گیا۔ 'استعفا کیوں دے رہے ہو؟''۔ جواب دیا۔ ''گرو جی کا یہی حکم ہے۔ وہ کہتے ہیں 'غیر ملکی حکمرانوں کی نوکری مت کرو''۔

اس قسم کے متعدد واقعات رونما ہوئے۔ جو بھی ہو، اتنا تو ماننا ہوگا کہ گرو جی ایشور بھگتی اور اعلیٰ کردار کے سبب ایک عظیم طاقت ور شخص تھے۔ اگر چہ مذکورہ بالا واقعات ممکن نہیں مگر سرکار یہ بات دیکھ کر گھبرا گئی اور مکمل تحریک کو دبانے کے لئے فکر مند ہوئی۔ یہ بھی فطری ہی تھا۔

عدم استقلال کا آغاز

1869 میں ساری پابندیاں ختم کر دی گئیں۔ لوگ جوق در جوق بڑی تعداد میں بھینی آنے لگے۔ 1871 میں چند کوکا ویر امرت سر سے گزر رہے تھے۔ سنا مسلمان قصائی لاتعداد گایوں کو ہندوؤں کو چوھانے کے لئے روزانہ ان کے سامنے ذبح کرتے ہیں۔ ہندو سماج کو کافی تکلیف پہنچتی ہے۔ گایوں کے تئیں انتہائی عقیدت رکھنے والے 'کوکے' یہ سب برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے قصاب خانہ پر حملہ کر دیا اور تمام قصائیوں کو موقع پر ہی ڈھیر کر دیا اور بھینی کی جانب چل پڑے۔ امرتسر کے سبھی اہم ہندو حضرات گرفتار ہو گئے۔ ادھر گرو جی کو ان سب واقعات کی علم ہو چکا تھا۔ کوکوں نے جاتے ہی ساری کہانی سنائی۔ گرو جی نے حکم دیا۔ ''جاؤ' جا کر اپنا جرم قبول کرو اور بے گناہ لوگوں کو مصیبت سے بچاؤ''۔ حکم کی تعمیل ہوئی'۔ بے گناہ افراد رہا ہو گئے اور یہ بہادر انتہائی جوش اور ولولہ کے ساتھ بخوشی پھانسی پر لٹک گئے۔ ایسا ہی ایک واقعہ رائے کوٹ میں بھی رونما ہوا۔

وہاں بھی کئی کوکوں کو تختہ دار پر معلق کر دیا گیا۔ مگر وہاں باقی سکھوں نے محسوس کیا کہ ان کے بے گناہ ساتھی پھانسی پر لٹکائے گئے ہیں۔ فساد کی آگ بھڑک اٹھی مگر کوئی خاص حادثہ نہیں ہوا۔ 13 جنوری 1872 کو بھینی میں ماگھی کا میلہ ہونے والا تھا۔ دور دراز سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں آنے لگے۔ ایک کوکا نامدھاری بہادر مالیر کوٹلہ نامی مسلم ریاست کی اسی نام کی راجدھانی سے گزر رہا تھا' وہاں اس نے ایک مسلمان کو دیکھا جو ایک بیل پر زیادہ بوجھ لادے' خود اس پر بیٹھا ہوا اسے مارتا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کوکے نے اس مسلمان سے کہا: ''بھائی اتنا ظلم نہ کرو' بوجھ پہلے ہی زیادہ ہے' تم نیچے اتر جاؤ تو کیا حرج ہے؟'' مگر اس مسلمان نے فوراً اسے دو چار گالیاں دے دیں۔ کوکا سکھ کوئی بزدل انسان تو تھا نہیں' اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ مسلم ریاست کے مدمست مسلم ملازمین اسے گرفتار کر کے کوتوالی لے گئے جہاں اس بیل کو اس کی نظروں کے سامنے ذبح کر دیا گیا۔ یہ ناقابل برداشت تھا۔ رہا ہوتے ہی وہ بہادر بھینی پہنچا۔ اس نے بھری مجلس میں دردناک اور بربر مظالم کی کہانی اور اپنی داستان سنائی۔ لوگ تو رائے پور کے واقعہ سے پہلے سے ہی مشتعل تھے' مزید برآں یہ واقعہ ہو گیا۔ جلتی پر تیل پڑا اور آگ بھڑک اٹھی۔ اپنی طاقت کے بل بوتے پر انتقام لینے کا عزم کیا گیا۔ جوش بڑھتا دیکھ کر گرو جی تھوڑا گھبرائے۔ گلے میں کپڑا ڈال کر پرارتھنا کی: ''خالصہ جی! کیا انہونی کرنے جا رہے ہو۔ ذرا صبر اور برداشت سے کام لیجئے۔ ذرا تصور کرو' اس سب کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ سارا بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔ اس طرح گرو جی کے سمجھانے پر لوگوں کا غصہ تھوڑا سرد ہوا مگر 150 افراد تشدد کی بھڑکتی ہوئی تصویر بن گئے۔ ان کا جوش کم نہیں ہوا۔ گرو جی نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی مگر ایک ساتھی کے بے عزتی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

بہت دھماکہ خیز صورت حال تھی۔ کام نامکمل تھا اور کوئی تیاری بھی نہیں کی گئی تھی۔ ایسے حالات میں ان 150 مشتعل لوگوں کا ساتھ دینے سے پوری تحریک کے کچل جانے کا امکان تھا۔ کیا کیا جائے؟ سبھی متذبذب اور استعجاب سے دیکھ رہے تھے اور گرو جی بھی۔ اور کوئی دوسرا شخص ایسے وقت میں کیا کرتا؟ یا ایسے وقت میں لوگ کیا کرنے کا مشورہ دے سکتے ہیں؟ اس بات کا ہمیں پتہ نہیں' اس کی فکر بھی نہیں۔ دور اندیش گرو رام سنگھ نے اس وقت یہی سوچا کہ یہ مشتعل افراد تو پر امن نہیں ہو رہے ہیں' ان کی خواہش کے مطابق ابھی بغاوت کرنے کی تیاری نہیں کی گئی اور ابھی تو حسب منشا سبھی منظم بھی نہیں ہوئے۔ اس وقت اگر یہ جائیں اور ہم سرکار پر یہ ظاہر کر دیں کہ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں تو تحریک محفوظ رہے گی۔ بات تو اچھی لگتی ہے مگر سیاسی چالوں کی اہمیت اس کی کامیابی پر منحصر ہے۔ گرو جی نے یہ چال چلی تھی' وہ بے کار ہوئی۔ داؤ الٹا پڑا۔ یہی ان کے گرو کا جرم تھا۔ انہوں نے اسی وقت پولیس کو اطلاع دے دی کہ یہ لوگ مشتعل ہو کر ان کے حکم کی تعمیل اور درخواست کو نظر انداز کر کے جھگڑا فساد کرنے جا رہے ہیں۔ میں ابھی سے پولیس کو اطلاع دے کر باخبر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ان سے نمٹ لے۔ میں اس ناگہانی کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔

لدھیانہ کے موجودہ ڈپٹی کمشنر مسٹر کان اپنے 15 جنوری کے خط میں انبالہ کمشنر کو ان واقعات کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

1۔ گرو رام سنگھ کے معتقدین نامدھاری اور کوکا کہلاتے تھے۔ نامدھاری اس لئے کہ گرو جی کی تعلیمات کا بنیادی ستون 'ایشور کا نام' تھا۔ اس حصول تعلیم کے بعد ہر انسان 'نامدھاری' یعنی 'ایشور نام' کو دل میں بسائے ہوئے' کہلاتا تھا۔ کوکا اس لئے کہ وہ بھگود بھجن میں غرق ہو کر خوب شور مچاتے تھے لہٰذا کوکنے والے' کوکا' کہلاتے تھے۔

"He (a police reporter) stated to me that Ram Singh, the leader of the kookas, went to those men, with a turban around his neck, and entreated them not to create a disturbance, and they would not listen to him; and that Ram Singh then came to the Deputy Inspector and reported to him that these men were upto mischiesf, and that had no control over them.

مگر اس وقت سرکار یا پولیس دانستہ خاموش رہی۔ خاموشی کے ساتھ ان کو انگریز اسٹیٹ سے ریاست میں داخل ہونے دیا۔ اسی وقت ان سب کو گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟ کچھ دنوں کے بعد ان کا جوش ٹھنڈا ہو ہی جاتا مگر نہیں' سرکار تو خود چاہتی تھی کہ اسے کوئی موقع ہاتھ آئے جس سے اس تحریک کو کچلا جا سکے۔ اس وقت حسب منشا سنہرا موقع مل گیا۔ لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ ان لوگوں کو اشتعال دلانے میں بھی سرکاری آدمیوں کا عمل دخل تھا۔ خیر' اس کے بارے میں کچھ نہ کہنے پر بھی ہم سرکار پر دانستہ خاموش رہنے کا الزام لگا سکتے ہیں۔ بالآخر وہ 150 کوکے بہادر پٹیالہ کی سرحد پر واقع ربو گاؤں کے باہر مقیم ہو گئے۔ رات بھر وہیں آرام کیا۔ اگلے دن بھی وہیں رہے۔ غالباً دوسرے ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

14 جنوری 1872 کو شام کے وقت انہوں نے کچھ سرداروں کے ملودھ نامی قلعہ پر حملہ کر دیا۔ اس قلعہ پر حملہ کیوں کیا گیا؟ اس بارے میں ڈسٹرکٹ گزیٹر میں تحریر ہے کہ انہیں امید تھی کہ یہ سردار بغاوت میں ان کی قیادت لیں گے۔ ممکن ہے' پہلی بڑی تحریک میں ایسی ہی تیاری ہو رہی ہو اور اس وقت انہوں نے ناقص بغاوت دیکھ کر مدد دینے یا قیادت سے انکار کر دیا ہو۔ خیر' کوکوں نے وہاں حملہ کر دیا اور کچھ اسلحہ' کچھ گھوڑے اور توپ لے کر فرار ہو گئے۔ وہاں طرفین کے دو دو لوگ ہلاک اور چند زخمی ہوئے۔

اگلے دن صبح سات بجے وہ مالیرکوٹلہ پہنچ گئے۔ سرکار نے پٹیالہ اور مالیرکوٹلہ دنوں ریاستوں کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ مالیرکوٹلہ کی حفاظت کے لئے خاص طور پر تیاری کی گئی تھی مگر ان بہادروں نے اس انداز سے حملہ کیا کہ شہر تو کیا' محل تک میں جا گھسے۔ خزانہ لوٹنے کی کوشش ہونے لگی۔ لوٹ ہی تو لیا ہوتا مگر بدقسمتی سے ایک اور دروازہ توڑنے میں کافی وقت برباد ہو گیا جہاں کچھ بے کار کاغذات کے علاوہ ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا اور انہیں جلد ہی وہاں سے بھاگنا پڑا۔ آٹھ کو ہلاک' پندرہ کو زخمی کر کے کچھ اسلحے اور گھوڑے لے کر وہاں سے نکل پڑے۔ ان کے سات ساتھی ہلاک ہوئے اور پانچ گرفتار یا زخمی ہوئے۔ کوٹلہ کے مسلح فوجیوں نے ان کا تعاقب کیا اور *A sort of running fight was kept along, shots fired, and man more kookas were wounded, till both parties reached the village of Ruir in the patiala State; the Kookas carrying most of the wounded with them.*

رڑ گاؤں کے قریبی جنگل میں روپوش ہو گئے۔ شو پور کے نائب نظام نے ان پر پھر حملہ کیا۔ پھر جنگ ہوئی مگر کوکے تھکان سے چور تھے' بھوکے پیاسے تھے اور یہ زخمی بغیر مرہم پٹی کے۔ وہ گرفتار ہوئے۔ 68 افراد پکڑے گئے تھے جن میں سے 28 زخمی ہو چکے تھے۔

یہی واقعہ 'بغاوت' کہلاتا ہے۔ مسٹر کوان اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں:

"It looks like the commencement of an insurrection..."

اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

I propose to execute at once all who were engaged in attacks on Malodh and Malarkotla, I am sensible of great responsibility in exercising an authority which is not vested in me, but the case in an exceptional one. These men are not ordinary criminals. They are rebels, having for their immediate object the acquisition of plunder, and ulteriosly the subversion of order. It is certain that had their first attempts been crowned with success, had they succeeded in arming themselves with horses and treasures,they would have been joined by all abondoned charities in the country and their extinction would not be effected without much trouble.

یہ 68 افراد 17 جنوری کو مالیر کوٹلہ لائے گئے۔ ان میں دو خواتین بھی تھیں۔ وہ پٹیالہ اسٹیٹ کی شہری تھیں۔ انہیں تو اسٹیٹ کے حوالے کر دیا گیا اور بقیہ 66 میں سے 50 کو وہیں توپ سے اڑا دینے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اپنی اپنی باری سے خوشی خوشی ست شری اکال وغیرہ جے بولتے ہوئے توپ کے منہ سے بندھ جاتے۔ ایک بار دھماکے کی آواز ہوتی اور وہ کوکا ویر اس دنیا سے نہ جانے کدھر چلا جاتا۔ ان Fanatics کو موت کا خوف نہیں ہوا وہ ہم 'سمجھ دار' لوگوں کی طرح موت کے تصور محض سے تھر تھر کانپ نہیں اٹھے۔ ایسے ہی 'بیوقوف' اور کہاں کتنی تعداد میں مل سکتے ہیں؟ اس وقت مطلب کے لئے جان دینے والے لوگ اسی طرح خوش وخرم رہ سکتے' اسی طرح ہنستے ہوئے موت کو گلے لگاتے' یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ عزت نفس' ملکی حقوق اور آزادی کی حصولیابی وغیرہ نہ جانے کن کن اعلیٰ احساسات کی تحریک سے وہ امر ہو پائے تھے۔ اسی سے ہم ان کے اس اشتعال اور جلد بازی کو فراموش کر کے انجام سمجھنے کے پابند ہوتے ہیں۔ ایک ایک کر کے 49 کو توپ سے اڑا دیا گیا مگر پچاسویں نے جو کہ تیرہ سال کا لڑکا تھا' وہاں ہنگامہ برپا کر دیا۔ مسٹر کاون اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں:

It wsa my intention to have had 50 men blown away, and to have sent the remaining 16 rebels to Malodh to be executed there tomorrow, but one escaped from the guards and made a furious attack on me, seizing me by the beard and endeavouring to strangle me; and as he was a very powerful man, I had considerable difficulty in releasing myself...The official whom he attacked drew hteir sword and cut him down.

اس واقعہ کے بارے میں جو بات سنی جاتی ہے وہ یوں ہے کہ 50واں شخص ایک تیرہ سالہ لڑکا تھا۔ اسے دیکھ کر مسز کاون کو رحم آیا۔ اس نے اپنے خاوند سے اسے چھوڑ دینے کے لئے کہا۔ بیوی سے ترغیب پا کر مسٹر کاون نے جھک کر اس بچہ سے کہا "ارے پاجی رام سنگھ کا ساتھ چھوڑ دو اور کہہ دو میں اس کا معتقد نہیں ہوں' تمہیں رہا کر دیا جائے گا"۔ بہادر بچہ اپنے گرو کے لئے یہ تحقیر آمیز الفاظ برداشت نہ کر سکا۔ غضب ناک شیر کی طرح وہ جھپٹا اور اس نے کاون کی داڑھی پکڑ لی اور اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ اس کے دونوں ہاتھ نہ کاٹ دیئے گئے اور تلواروں سے اسے قتل نہ کر دیا گیا۔ اس طرح اس افسوس

ناک ناٹک کا ایک اور باب ختم ہوگیا۔

بغیر مقدمہ چلائے 50 افراد کو توپ سے اڑا دینا' summary execution کردینا بالکل نامناسب نظر آتا ہے۔ ادھر مسٹر فارسِتھ انبالہ کمشنر نے انہیں ایک خط میں لکھ دیا تھا کہ بغیر مقدمہ چلائے کسی کو سزائے موت نہیں دینا' مگر مسٹر کاون نے من مانی کی اور جب مسٹر کاون پر بعد میں مقدمہ چلا تو انہوں نے کمشنر صاحب کو اگلے دن کا خط جس میں ان کے اس کام کی تعریف کی گئی تھی' پیش کیا گیا۔ مگر اس کے بارے میں مسٹر فارسِتھ کا کہنا ہے کہ میں نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے یہ مناسب سمجھا کہ لوگوں کو ذرہ برابر بھی شک نہ ہو کہ افسران کے مابین کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ بالآخر اس کے گزشتہ کام کی تعریف کر کے اور Summary exceution کرنے سے منع کر دیا تھا۔ مگر بقیہ سولہ افراد کو بھی تو اگلے روز پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

ان بہادروں کی موت کے تئیں رغبت اور انتظار نے افسروں کو بھی متاثر کیا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر ای پارکنسن 17 جنوری کی رپورٹ میں دو افراد کے بارے میں لکھتے ہیں:

Both Hira Singh and Lehna Singh the leaders taken. They are generally well dressed and well to do men;but heve the appearance bold and determined looking fellows.

ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا' ادھر ڈپٹی کمشنر نے گرو رام سنگھ جی کو بلایا اور گھر لوٹا دیا کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ بے گناہ ہیں' کیوں کہ انہوں نے ان بھڑکے ہوئے اور مشتعل کوکوں کی خبر دے کر پولیس کو ہوشیار کر دیا تھا۔ گرو رام سنگھ کی بے گناہی کے بارے میں پنجاب سرکار نے حکومت ہند کو یہ لکھا:

"No Direct evidence against Ram Singh in this case is sufficient to put him on this trial.

مگر 17 جنوری کو بحکم کمشنر گھڑسوار اور دوسری پولیس نے کرنل بایلی (Baille) کی صدارت میں اچانک بھینی نگر کا محاصرہ کر لیا۔ سبھی لوگوں کو یہ دیکھ بہت تعجب ہوا مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ سرکار انہیں گرفتار کرنا چاہتی ہے تو انہوں نے خاموشی سے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس وقت گرو رام سنگھ کے ساتھ چار آدمی' چار مختلف مقامات کے صوبوں کے شری صاحب سنگھ' شری جواہر سنگھ' شری گرودت سنگھ اور شری تنو سنگھ بھی تھے۔ انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے انہیں الہ آباد اور بعد میں رنگون بھیج دیا گیا۔ یہ گرفتاری ریگولیشن 1818 کے مطابق ہوئی تھی۔ یہیں پر گرو رام سنگھ جی کی وہ چال الٹی پڑی۔ اگر اس وقت وہ بچے رہتے تو بہت جلد حالات سنبھل جاتے۔

ادھر جیسے جیسے پورے صوبہ میں بغاوت کی خبر پھیلنے لگی' ویسے ویسے یہ لوگ بھینی کی جانب کوچ کرنے لگے۔ سبھی کا خیال تھا کہ جس دن کا انتظار تھا' وہ لمحہ آ گیا۔ ادھر پولیس بھی ہوشیار تھی۔ جہاں کوئی کوکا ملتا' وہیں اسے گرفتار کر لیا جاتا۔ اسی طرح 172 کوکوں کے ایک گروپ کا کرنل بایلی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ان میں سے چار تو متعدد مقامات کے صوبے شری برہم سنگھ' شری کاہن سنگھ' شری پہاڑ سنگھ اور شری حکم سنگھ تو فوراً پہلے لدھیانہ اور پھر گرو جی کے پاس الہ آباد بھیج دیئے گئے اور 120 کو گھر بھیج دیا گیا اور بقیہ پچاس -Having no homes and ostensible means of living, being in fact, a dangerous clan of this sort who having sold all they possessed hold

themselves in readiness to perform any act that their leaders may order- کو جیل میں بند کردیا گیا۔ اس طرح کچھ ہی دنوں میں حالات نارمل ہوگئے۔

اس کے بعد سب کچھ ہو چکا۔ ڈرامہ کا اہم واقعہ رونما ہو چکا۔ اب تو محض داستان تتمہ باقی ہے۔ مسٹر کاون اور مسٹر فارستھ پر summary execution کا مقدمہ چلا۔ انہوں نے پنجاب کی سنگین صورت حال کو دلچسپ انداز میں متشکل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور انعام کی امید ظاہر کی۔ مسٹر کاون کا تو پروموشن کرکے انگلینڈ بھیج دیا گیا اور مسٹر فارستھ کو پنجاب سے اودھ اسی عہدہ پر تبادلہ کردیا گیا۔ پچاس کو توپ سے اڑانے اور سولہ کو پھانسی دینے اور وہ بھی بغیر مقدمہ چلائے اور صفائی کا موقع دیئے بغیر ان کو یہ سزا دی گئی۔ سر ہینری کاٹن کے بقول ''تو یہ سزا بالکل نامناسب اور ناکافی تھی۔ مگر اینگلو۔ انڈین اخباروں نے اتنی بھی سزا دینے کے خلاف بہت واویلا مچایا تھا۔

ادھر بقیہ کوکا سماج پر انتہائی ظلم وستم ہونے لگے۔ گورو رام سنگھ جی کے بعد شری ہری سنگھ گرو بنے۔ انہیں بھینی میں نظر بند کردیا گیا۔ گرودوارے کے باہر پولیس چوکی قائم کردی گئی۔ چھ برسوں تک بھینی کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جیسے دشمنوں نے اسے حصار میں لیا ہو۔ نہ کوئی باہر سے اندر جاسکتا تھا اور نہ ہی کوئی اندر سے باہر۔ پھر آہستہ آہستہ لوگوں کی آمد ورفت شروع ہوئی۔ اس وقت بھی رام سنگھ باہر نہیں آسکتے تھے۔ اس کے باوجود آمد ورفت کی اجازت مل گئی تھی۔ آنے والے مسافروں کو بہت تنگ کیا جاتا' بری طرح بے عزتی کی جاتی' مشکیں کس کر دھوپ میں ڈال دیا جاتا جہاں ان بیچاروں کو گھنٹوں جھلسنا پڑتا۔ چارپائی کے نیچے ہاتھ باندھ کر کئی آدمی چارپائی پر بیٹھ جاتے۔ ان پر حقہ کا گندہ بدبودار پانی ڈالا جاتا۔ یہ سب مظالم کرنے والے اسی ملک کے باشندے ہوتے تھے اور ان مصائب کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرنے والے بھی اسی ملک کے باشندے اور اب تو یہ محض مذہبی فرقہ رہ گیا۔ مگر صوبہ پنجاب کی تاریخ انتہائی دلچسپ ہے۔ مکمل سماج آؤٹ لا قرار دیا گیا تو پنجاب میں' کسی فرقہ کے تمام افراد سنگین مظالم کا شکار ہوئے تو پنجاب میں' اور پھر ہزاروں افراد کی مکمل تحریک Unlawful قرار دے دی گئی تو پنجاب میں۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ ہر کوکا اپنے اپنے گھر میں نظر بند تھا۔ بغیر پولیس کی اجازت کے کہیں باہر نہ جاسکتا۔ اجازت لینے کا مطلب ہوتا پولیس کے ناقابل ذکر مظالم اور بے عزتی برداشت کرنا اور کئی دنوں تک بھوکے پیاسے تڑپتے رہ باہر جانے کی اجازت حاصل کئے بغیر چپ چاپ گھر آکر بیٹھ جانا۔ ایسے حالات بہت دنوں تک رہے اور بندشیں تو اب 1920 میں عدم تعاون تحریک کے دنوں میں ہٹائی گئیں۔ خیر جو بھی ہو۔

گورو رام سنگھ جی برما میں ہی نظر بند رہے۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر میں لکھا ہے۔ "...Finallly he died in Burma in 1885"- مگر 1920 میں ڈاسکا کے رہنے والے مسٹر عالم سنگھ انجینئر نے ایک مضمون میں مذکورہ بات کو مسترد کیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ دو اور ساتھیوں سمیت Lower Burma کی کسی پورٹ سے لاسٹ جزیرہ جارہے تھے۔ اس پورٹ کا نام بھولمین تھا۔ وہاں ایک دن ایک بڑے اثرورسوخ رکھنے والے شخص کو پولیس کی نگرانی میں سیر کرتے دیکھ کر ان کے بارے میں پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کوکا گورو رام سنگھ جی ہیں۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کا ایک صوبہ لکھی سنگھ بھی تھا۔ ان سے مل کر خوب بات چیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ انہیں پانچ میل تک باہر سیر کرنے کی اجازت تھی۔ خیر! سرکار نے اس مضمون پر کسی قسم کا ردعمل بھی ظاہر نہیں کیا۔ جو بھی ہو' معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گرو جی اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر کوکا لوگوں کو یقین ہے کہ وہ ابھی بھی باحیات ہیں! خیر

آج بھی پنجاب میں کوکا فرقہ موجود ہے۔ ان میں ایشور بھکتی ابھی تک غالب ہے۔ علی الصباح بیدار ہوکر غسل کرکے

گھنٹوں بھگوڈ بھجن میں غرق رہنا ان کا روزانہ کا معمول اور محبوب مشغلہ ہے۔ شراب و کباب جیسی اشیاء کی سخت ممانعت ہے۔ ایک سیدھی پگڑی' ایک لمبا کرتا اور ایک کچھا' یہی ان کی پوشاک ہے۔ ایک لمبا اور ایک ڈولکا سا بنا ہوا بڑا سا لوٹا اور ٹکوا جسے وہ صفاجنگ کہتے ہیں' یہی ان کا سامان ہے۔ گلے میں سوت کی بنی ہوئی ایک خوب صورت مالا رہتی ہے۔ ان میں بھی ایک خاص مستانہ دَل ہوتا ہے۔ وہ شبد۔ کیرتن کرتے کرتے بالکل نڈھال ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے کیرتن سے بھی لوگ مسرور و مسحور ہو جاتے ہیں۔ خون میں ابال آنے لگتا ہے' آنکھوں میں پریم اور بھگتی کے آنسو بھی آتے ہیں۔

گیارہویں اور بارہویں گرو میں یقین رکھنے کے سبب اور شراب و کباب سے دوری اختیار کرنے کی وجہ سے وہ بقیہ سکھ فرقہ سے الگ ہیں۔ ان میں مساوات کا جذبہ غالب رہتا ہے۔ ہولی وغیرہ کے موقع پر ان کا میلہ لگتا ہے جہاں خوب ہوم یگیہ ہوتا ہے۔ دوسرے سکھ اس کے مخالف ہیں۔ کوکے اپنے کو ہندو مانتے ہیں' دوسرے سکھ نہیں۔ گزشتہ اکالی آندولن کے دنوں میں انہوں نے اکالیوں کی تھوڑی مخالفت کی تھی جس سے ان کی پوزیشن کچھ خراب ہوگئی۔ مگر اپنے طرز کے وہ نرالے لوگ ہیں۔ انہیں دیکھ کر ایک ادھ کھلے پھول کی یاد آتی ہے جو کھلتے ہی مسل ڈالا گیا ہو۔ گرو رام سنگھ جی کی حسرتیں دل میں ہی رہ گئیں۔ ان کے باقی تمام معتقدین کا ایثار بھی رائیگاں گیا۔ ان نا معلوم لوگوں کی قربانی کا کیا نتیجہ نکلا' خدا جانے۔ مگر ہم تو ان کی کامیابی' ناکامی کے بارے غور و فکر چھوڑ کر ان کے پرخلوص ایثار کی یاد میں ایک بار نمسکار کرتے ہیں۔

تصویروں کا تعارف

فروری 1928 کے 'مہارتھی' میں کوکا آندولن پر ایک مضمون شائع ہوا۔ اسی کے ساتھ دو تصاویر کا تعارف بھگت سنگھ نے لکھا۔ یہ تعارف بھی 'مہارتھی' سے ماخوذ ہے۔۔مدیر

اس بار کثیر رنگی تصویر گرو رام سنگھ جی کی ہے۔ ان کا تفصیلی تعارف گزشتہ اور اس شمارہ میں دیا جا چکا ہے' وہی کافی ہے۔ ہاں' خصوصی طور پر قابل ذکر دو تصاویر ہیں۔ ایک تو اٹلی کے نوجوانوں کا ہر بچہ مسولینی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی چار دن کے لئے اسکاؤٹ دل' مہاویر دل اور سویم سوک دل بنے تھے' اکھاڑے قائم ہوئے مگر وہ سب دودھ کا ابال تھا۔ لیڈروں کو چاہئے کہ کونسلوں میں تقاریر کرنے کی بجائے ان مستقبل کے لیڈروں کو کچھ بنائیں۔

دوسری تصویر ہنر نگری کی ہے جو ایک خاص (انعقاد کے) طور پر بمبئی میں ہوا تھا۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے جب ہم اس عظیم ہنر نگری کی اور غریب' جاہل کاریگروں کی حالت کا موازنہ کرتے ہیں۔ ان ہنر نمائشوں پر جتنا پیسہ برباد کیا جاتا ہے' اس کا عشر عشیر بھی تو کاریگروں کی اصل ترقی میں نہیں لگایا جاتا۔ ہم پوچھتے ہیں کتنے کاریگروں کو پیسہ اور حقوق کی مدد سے سماج یا سرکار اپنا کام بڑھانے کا موقع دیتی ہے؟ کتنے محلوں' بازاروں' قصبوں یا شہروں میں ہنر مراکز کھولے جا رہے ہیں؟ کتنے کاریگروں کا کمپٹیشن کرایا جاتا ہے؟ اور کتنے نوجوانوں کو مختلف قسم کے ہنر سیکھنے کے لئے وظیفہ دے کر ہنر سیکھنے کی تحریک دی جاتی ہے؟ ہندو اجلاس اور کانگریس ڈویژن کھولنے کے بجائے ٹیلنٹ سنٹر قائم کرنے میں ہمیں اپنی تمام طاقتیں صرف کر دینی چاہئیں۔ دست کاری ہم کو بیکاری' غلامی اور غربت سے بچا جا سکتی ہے۔

کوکا بغاوت۔2

اکتوبر 1928 میں 'ماہانہ میگزین' کیرتی' میں بھگت سنگھ نے 'پھر' عہد پلٹنے کا اگنی کنڈ' عنوان سے پنجاب کی تختہ پلٹنے والی تحریک کی تاریخ کی شکل میں مضامین لکھے۔ یہ مضمون انہوں 'ودروہی' کے نام سے لکھا تھا۔مدیر

آج ہم پنجاب کے تختہ پلٹنے کی تحریک اور پولیٹکل بیداری کی تاریخ قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ پنجاب میں سب سے پہلی پولیٹکل ہلچل کوکا آندولن سے شروع ہوتی ہے۔ویسے تو یہ آندولن فرقہ پرست نظر آتا ہے' لیکن ذرا غور سے دیکھیں تو وہ بہت بڑی پولیٹکل تحریک تھی' جس میں مذہب کا بھی اتصال تھا جس طرح سکھ آندولن میں پہلے مذہب اور سیاست مشترک تھی۔ خیر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری باہمی فرقہ پرستی اور تنگ دلی کا یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم اپنی بڑی بڑی عظیم شخصیات کو اس طرح فراموش کر دیتے ہیں جیسے ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ یہی صورت حال عظیم شخصیت 'گرو رام سنگھ' کے بارے میں نظر آتی ہے۔ہم ''گرو' نہیں کہہ سکتے' وہ ''گرو'' کہتے ہیں' اس لئے ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں وغیرہ باتیں کہہ کر ہم نے انہیں دور پھینک دیا ہے۔ یہی پنجاب کا سب سے بڑا خسارہ ہے۔ بنگال کے جتنی بھی عظیم شخصیات ہیں' ان کی ہر سال سالگرہ منائی جاتی ہے۔ سبھی اخباروں میں ان پر مضامین شائع ہوتے ہیں' یہ سمجھا جاتا ہے کہ موقع ملا تو اس پر پھر غور کریں گے اور جو مواد مہیا ہوا' وہ قارئین کے سامنے پیش کریں گے۔

پنجاب کو سوئے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے لیکن نیند بہت گہری آئی۔ حالاں کہ اب پھر ہوش آنے لگا ہے۔ بہت بڑی تحریک چلی' اسے دبانے کی کوشش کی گئی۔ خدا نے حالات ہی کچھ ایسے پیدا کر دیئے۔وہ تحریک بھی کچل دی گئی۔ اس تحریک کا نام تھا'' کوکا تحریک''۔ کچھ مذہبی' کچھ سماجی رنگ وروپ رکھتے ہوئے بھی وہ تحریک تختہ پلٹنے کے لئے نہیں' عہد سازی کے لئے تھی۔

چوں کہ اب ان سبھی تحریکات کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ آزادی کے لئے لڑنے والے لوگوں کا ایک الگ ہی طبقہ بن جاتا ہے' جن میں نہ دنیا کی محبت ہوتی ہے اور نہ فریبی سادھوؤں کی طرح دنیا کا تیاگ۔ جو سپاہی تو ہوتے تھے لیکن کرائے کے لئے لڑنے والے نہیں بلکہ صرف اپنے فرض کے لئے یا کسی کام کے لئے کبھی' وہ پرخلوص طور پر لڑتے اور مرتے تھے۔ سکھ تاریخ بھی کچھ تھی۔ مراٹھوں کی تحریک بھی یہی کچھ بتاتی۔ رانا پرتاپ کے ساتھی راجپوت بھی اسی طرح کے مجاہد تھے۔ بندیل کھنڈ کے بہادر چھترسال کے ساتھی بھی ایسے ہی تھے۔

ایسے ہی لوگوں کا ایک طبقہ پیدا کرنے والے بابا رام سنگھ نے پرچار اور تنظیم شروع کی۔ بابا رام سنگھ کا جنم 1824 میں لدھیانہ ضلع کے بھینی گاؤں میں ہوا۔ ان کا جنم بڑھئی گھرانے میں ہوا۔ جوانی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں ملازمت اختیار کرلی۔ خدا پرستی زیادہ ہونے کے سبب ملازمت ترک کر کے گاؤں چلے گئے۔ 'نام' کا پرچار شروع کر دیا۔

1857 کے غدر میں جو مظالم ڈھائے گئے' وہ سب دیکھ کر اور پنجاب کی غداری دیکھ کر کچھ اثر ضرور ہوا ہوگا۔ قصہ مختصر یہ کہ بابا رام سنگھ جی نے اپدیش شروع کروادیا۔ ساتھ ہی ساتھ بتاتے گئے کہ ''فرنگیوں'' سے پنجاب کی آزادی بہت ضروری ہے۔ انہوں نے اس وقت عدم تعاون تحریک کا پرچار کیا' جس طرح برسوں بعد 1920 میں مہاتما گاندھی جی نے کیا۔ ان کے

پروگرام میں انگریزی حکومت کی تعلیم' ملازمت' عدالتوں وغیرہ کا اور غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ تو تھا ہی' ساتھ میں ریل اور تار کا بھی بائیکاٹ کیا گیا تھا۔

اولاً صرف 'نام' کی ہی تبلیغ ہوتی تھی' ہاں' یہ ضرور کہا جاتا تھا کہ شراب' گوشت کا استعمال بالکل بند کر دیا جائے۔لڑکیاں وغیرہ فروخت کرنے جیسی سماجی برائیوں کے خلاف بھی پرچار ہوتا تھا لیکن بعد میں اس کا پرچار سیاسی شکل اختیار کر گیا۔

پنجاب حکومت کے قدیم کاغذات میں ایک سوامی رام داس کا ذکر ملتا ہے جسے انگریز حکومت ایک سیاسی فرد سمجھتی تھی اور جس پر نظر رکھی جاتی تھی۔ 1857 کے بعد جلد ہی ان کی روس روانگی کا علم ہوتا ہے۔بعد ازاں کوئی خبر نہیں ملتی۔اسی آدمی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک دن بابا رام سنگھ سے کہا کہ اب پنجاب کے سیاسی پروگرام اور پرچار کی اشد ضرورت ہے۔اس وقت ملک کو آزاد کرانا انتہائی ضروری ہے۔اس وقت سے آپ نے واضح طور پر اپنی تبلیغ میں اس عدم تعاون کو شامل کر لیا۔

1863 میں پنجاب حکوت کے چیف سکریٹری ٹی ڈی فارستھ نے اپنی آپ بیتی میں تحریر کیا ہے کہ 1863 میں ہی میں سمجھ گیا کہ مذہب نما نظر آنے والا آندولن کسی دن بڑا غدر ثابت ہوگا۔اسی لئے میں نے بھینی کے اس گرودوارے میں بڑی تعداد میں لوگوں کی آمد و رفت اور اجتماع پر پابندی لگا دی۔اس پر بابا جی نے بھی اپنے کام کا طریقہ تبدیل کر دیا۔پنجاب صوبہ کو 22 اضلاع میں تقسیم کر دیا۔ہر ضلع میں ایک ایک شخص کو چیف مقرر کیا گیا جسے 'صوبہ' کہا جاتا تھا۔اب انہوں نے 'صوبوں' میں پرچار اور تنظیم کا کام شروع کر دیا۔خفیہ طریقوں سے آزادی کی بھی تشہیر جاری رکھی گئی۔ تنظیم وسعت اختیار کرتی گئی' ہر نامدھاری سکھ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ اپنے مذہب کے لئے عطیہ کرنے لگا۔خارجی ہنگامے بند ہو جانے کی وجہ سے سرکار کا شک دور ہو گیا۔اور 1869 میں سبھی پابندیاں ختم کر دی گئیں۔پابندیاں ہٹتے ہی جوش و خروش میں اضافہ ہونے لگا۔

ایک دن کچھ کوکے امرت سر سے جا رہے تھے۔معلوم ہوا کہ کچھ قصائی ہندوؤں کو تنگ کرنے کے لئے ان کی آنکھوں کے سامنے گایوں کو ذبح کرتے ہیں۔گایوں کے وہ بہت بڑے پرستار تھے۔راتوں رات تمام قصائیوں کو ہلاک کر ڈالا اور بھینی کا راستہ اختیار کیا۔ بہت سے ہندو گرفتار کیے گئے۔گرو جی نے پوری کہانی سنی۔سب کو واپس کر دیا کہ بے گناہ افراد کو رہا کرائیں اور اپنا جرم قبول کریں۔یہی ہوا اور وہ لوگ پھانسی پر چڑھ گئے۔اسی قسم کا واقعہ فیروز پور میں بھی رونما ہوا۔پھانسی سے جوش میں مزید اضافہ ہوا۔اس وقت ان لوگوں کے سامنے مقصد تھا' پنجاب میں سکھ حکومت کا قیام اور گایوں کا تحفظ جسے وہ اپنا سب سے بڑا دھرم مانتے تھے۔اسی مقصد کی تکمیل کے لئے وہ جدوجہد کرتے رہے۔

13 جنوری 1872 کو ماگھ کا میلہ لگنے والا تھا۔دور دور سے لوگ آ رہے تھے۔ایک کوکا مالیر کوٹلہ سے گزر رہا تھا۔ایک مسلمان سے جھگڑا ہو گیا۔(وہ) اسے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے گئے اور اس کے ساتھ خوب مار پیٹ کی اور ایک بیل کو اس کے سامنے مار ڈالا گیا۔وہ بیچارہ رنجیدہ ہوا اور بھینی پہنچا۔وہاں جا کر اس نے اپنی کہانی سنائی۔لوگوں کو بہت جوش آیا۔انتقام کا خیال شدت اختیار کرنے لگا۔جس بغاوت کا اندر ہی اندر پرچار کیا گیا تھا' اسے عملی شکل دینے کا نظریہ زور پکڑنے لگا۔لیکن ابھی پوری تیاری نہیں ہوئی تھی۔بابا رام سنگھ ایسے حالات میں کیا کرتے؟ اگر انہیں منع کرتے ہیں تو مانتے نہیں اور اگر ان کا ساتھ دیتے ہیں تو سارے منصوبہ پر پانی پھر جاتا۔کیا کریں؟ آخر جب 150 افراد چل ہی پڑے تو آپ نے پولیس کو اطلاع دے دی کہ یہ لوگ ہنگامہ کر رہے ہیں اور شاید کچھ خرابی پیدا کریں' میں ذمہ دار نہیں ہوں۔خیال تھا کہ ہزاروں افراد کی تنظیم میں سے سو ڈیڑھ سو آدمی مارے گئے (جائیں) اور باقی تنظیم بچی رہی تو یہ کمی تو پھر پوری ہو جائے گی اور جلد ہی دوبارہ پوری

تیاری ہونے کے بعد بغاوت ہو سکے گی۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں "End justifies the means" (نتیجہ سے ہی طے ہوتا ہے کہ طریقے جائز تھے یا ناجائز) کا اصول سیاست کے میدان میں اکثر لاگو ہوتا ہے۔ یعنی اگر کامیابی مل جائے تو چال نیک نیتی سے بھری اور سوچ سمجھ کر چلنے والی چال کہی جاتی ہے اور اگر کبھی ملے ناکامی تو پھر کچھ بھی نہیں۔ لیڈروں کو بیوقوف، بدنیت وغیرہ کا خطاب ملتا ہے۔ یہی بات ہم یہاں دیکھتے ہیں۔ جو چال بابا رام سنگھ نے اپنے آندولن کو بچانے کے لئے چلی، چوں کہ وہ ناکام ہوگئی، اس لئے اب کوئی انہیں بزدل کہتا ہے اور کوئی بدنیت و کمزور بتاتا ہے۔ خیر!

ہم تو جانتے ہیں کہ وہ ایک سیاسی چال تھی۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی تاکہ وہ کوئی ایسا حل تلاش کریں جس سے کوئی بڑا انتشار پیدا نہ ہو، لیکن سرکار ان کے اس بڑے آندولن سے بہت خائف تھی اور اسے کچل دینے کا موقع تلاش رہی تھی۔ اس نے کوئی خاص کارروائی نہیں کی اور انہیں حسب منشا کام کرنے دیا۔

لیکن 11 جنوری کے خط میں ڈپٹی کمشنر لدھیانہ مسٹر کاون نے یہ بات کمشنر کو تحریری شکل میں بھیجی کہ رام سنگھ نے ان لوگوں سے خود لاتعلق ہونے کی بات ظاہر کی ہے اور ان کے بارے میں ہمیں ہوشیار کر دیا ہے۔ خیر! وہ 150 نامدھاری سنگھ بڑے جوش و خروش میں چل پڑے۔

جب وہ 150 افراد وہاں سے بدلہ لینے کے خیال سے چل پڑے تو پولیس کو پہلے سے خبر دی جا چکی تھی لیکن سرکار نے کوئی انتظام نہیں کیا۔ کیوں؟ کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ کوئی تھوڑی بہت گڑبڑ ہو جائے اور بہانہ مل جائے جس سے کہ وہ اس آندولن کو کچل دیں، لہٰذا وہ اب مل گیا۔

وہ کوکے ویر اس دن تو پٹیالہ اسٹیٹ کی سرحد پر ایک گاؤں ربّے میں پڑے رہے۔ اگلے دن بھی وہ وہیں رُکے۔ 14 جنوری 1872 کی شام کو انہوں نے ملودھ کے قلعہ پر دھاوا بول دیا۔ یہ قلعہ کچھ سکھ سرداروں کا تھا لیکن انہوں نے اس پر حملہ کیوں کیا؟ اس بارے میں ڈسٹرکٹ گیزیٹر میں تحریر ہے کہ انہیں امید تھی کہ ملودھ سرکار ان کی بغاوت کی قیادت کرے گی۔ لیکن انہوں نے منع کر دیا اور انہوں نے حملہ کر دیا۔ بہت ممکن ہے کہ بابا رام سنگھ کی بڑی تیاری میں ملودھ سرکار نے مدد دینے کا وعدہ کیا ہو لیکن اب انہوں نے دیکھا کہ بغاوت تو پہلے ہی ہو گئی ہے اور بابا رام سنگھ بھی ساتھ نہیں ہیں اور پوری سنگت بھی نہیں بلائی گئی ہے تو انہوں نے منع کر دیا ہوگا۔ خیر! جو بھی ہو، وہاں لڑائی ہوئی۔ کچھ گھوڑے، ہتھیار اور توپ لے کر وہاں سے چلے گئے۔ طرفین سے دو دو آدمی ہلاک اور چند زخمی ہوئے۔

اگلے دن صبح سات بجے وہ مالیر کوٹلہ پہنچ گئے۔ انگریز حکومت نے مالیر کوٹلہ سرکار کو پہلے ہی باخبر کر دیا تھا۔ ادھر بہت ساری تیاریاں کی گئیں۔ فوج ہتھیاروں کے ساتھ کھڑی تھی لیکن ان لوگوں نے اتنے شجاعانہ انداز میں حملہ کیا کہ فوج اور پولیس کے اختیار میں کچھ نہ رہا۔ حملہ کے بعد وہ شہر میں گھس گئے اور جا کر محل پر حملہ کر دیا۔ وہاں بھی فوج انہیں روک نہ سکی۔ وہ خزانہ لوٹنے کی کوشش کرنے لگے۔ لوٹ ہی لیا جاتا لیکن بدقسمتی سے وہ ایک دوسرا دروازہ توڑتے رہے جس سے ان کا بہت سارا وقت برباد ہو گیا اور اندر کچھ بھی نہیں ملا۔ ادھر سے فوج نے زوردار حملہ کیا۔ آخر لڑتے لڑتے وہاں سے لوٹنا پڑا۔ اس لڑائی میں انہوں نے 8 سپاہی مارے اور 15 کو زخمی کیا۔ ان کے سات آدمی مارے گئے۔ وہاں سے بھی کچھ ہتھیار اور گھوڑے لے کر فرار ہو گئے۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے مالیر کوٹلہ کی فوج اور......

"A sort of running fight kept along. Shots fired and many more Kooks were wounded till both the parties reached the village of Rur in the Patiala State, the

Kookas carrying most of the wounded with them"-

یعنی بھاگتے جارہے تھے اور لڑ رہے تھے۔ ان کے مزید متعدد آدمی زخمی ہوگئے اور وہ انہیں بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ آخر کار پٹیالہ اسٹیٹ کے رڑ گاؤں میں یہ پہنچے اور جنگل میں چھپ گئے۔ چند گھنٹوں کے بعد شوپور کے نظام نے پھر حملہ بول دیا۔ لڑائی چھڑ گئی۔ مگر بیچارے کوکے تھکے ہارے تھے۔ آخر کار 68 افراد گرفتار ہوئے۔ ان میں دو عورتیں تھیں۔ وہ پٹیالہ ریاست کو دے دی گئیں۔

اسی بات کو بغاوت کہا جاتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر لدھیانہ مسٹر کاون نے ایک خط میں کہا تھا:

"It looks like the commencement of an insurrenction..."

یعنی یہ ایک بغاوت کی مانند نظر آتا ہے۔

اگلے دن مالیر کوٹلہ لا کر توپ نصب کر دی گئی اور ایک ایک کر کے پچاس کوکے ویر توپ کے آگے باندھ کر اڑا دیئے گئے۔ ہر شخص بڑی بہادری سے اپنی باری آنے پر توپ کے آگے جھک جاتا اور ست شری اکال کہتا ہوا توپ سے اڑ جاتا۔ بعد میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس دنیا میں گیا۔ اس طرح 49 افراد اڑا دیئے گئے۔ پچاسواں ایک تیرہ سالہ لڑکا تھا۔ اس کے پاس جھک کر ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ بیوقوف رام سنگھ کا ساتھ چھوڑ دے، تمہیں معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن یہ طفل اس بات کو برداشت نہ کر سکا اور اچھل کر اس نے کاون کی داڑھی پکڑ لی اور اس وقت تک نہیں چھوڑی جب تک کہ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ نہ دیئے گئے۔ ادھر بابا رام سنگھ جی کو ان کے چار صوبوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ یہ گرفتاری ریگولیشن 1818 کے تحت عمل میں آئی۔

جب یہ خبر ملک میں پھیلی تو دیگر لوگ بھی حیران ہوئے کہ یہ کیا ہوا۔ بغاوت شروع کر کے بابا جی نے ہمیں بھی کیوں نہیں بلایا اور سینکڑوں لوگ گھر بار چھوڑ کر بھینی کی جانب روانہ ہو گئے۔ ایک گروہ جس میں کہ 172 آدمی تھے' کرنل وائلی سے ملا۔ وہ سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اس نے فوراً انہیں گرفتار کر لیا۔ ان میں سے 120 کو تو گھروں کو لوٹا دیا گیا لیکن 50 ایسے تھے کہ ان کا کوئی گھر بار نہیں تھا۔ وہ سبھی جائیداد فروخت کر کے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو کر نکلے تھے۔ انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس طرح وہ آندولن دبا دیا گیا اور بابا رام سنگھ کی پوری جدوجہد بے نتیجہ رہی۔ بعد میں ملک میں جتنے کوکے تھے' وہ سبھی ایک طرح سے نظر بند کر دیئے گئے۔ ان کی حاضری لی جاتی تھی۔ بھینی صاحب میں عام لوگوں کی آمد و رفت بند کر دی گئی۔ یہ پابندی 1920 میں ہٹائی گئی۔

یہی پنجاب کی آزادی کے لئے دی گئی سب سے پہلی کوشش کی مختصر تاریخ ہے۔

مدن لال ڈھینگرا

شہید بھگت سنگھ نے 'آزادی کی بھینٹ شہادتیں' عنوان سے ایک سیریز 'کرتی' میں مارچ 1928 سے اکتوبر 1928 تک لکھی۔ ان مضامین کے توسط سے جہاں پنجاب کے لوگوں کو ہندوستانی شہداء کی قربانیوں سے واقف کرایا گیا' وہیں بھگت سنگھ اور ان کے رفقاء کے دلوں میں اٹھ رہے سوال بھی ان میں پڑھے جاسکتے ہیں۔ سیریز 'ودروہی' نام سے تحریر کی گئی تھی۔

اگست 1928 کے 'کرتی' میں اس سیریز کا مقصد اس طرح بتایا گیا ہے: ''ہمارا ارادہ ہے کہ ان سوانح حیات بعینہ شائع کرتے ہوئے بھی ان کی تحریکوں کی بالترتیب صورت حال لکھیں تا کہ ہمارے قارئین یہ سمجھ سکیں کہ پنجاب میں بیداری کیسے پیدا ہوئی' پھر کام کیسے ہوتا رہا اور کن کاموں کے لئے' کن نظریات کے لئے ان شہیدوں نے اپنے جان نچھاور کردیئے''۔ اس مضمون کا اختصار 'چاند' کے پھانسی نمبر (نومبر 1928) میں شائع ہوا ہے ۔ مدیر

اب دوبارہ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جتنی قربانیاں صوبہ پنجاب نے دی ہیں' اتنی کسی اور صوبہ نے نہیں ۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان میں ایک بار نئی بدامنی کی لہر دوڑ گئی جس کا نتیجہ سودیشی تحریک کی شکل میں رونما ہوا۔ اس وقت بھی پنجاب ہی بنگال کا ساتھ دے سکا تھا۔ غلامی کی زنجیر روز بہ روز جکڑتی دیکھ کر جب درد شروع ہوا تو بہت سے نوجوان اپنے وطن کی محبت میں پاگل ہوئے دلوں کو لیکچر بازی اور تجویز سازی محض سے اطمینان نہیں ہوسکا اور کچھ دل جلے لوگوں نے عہد پلٹنے کی تحریک چلائی۔ یہ آندولن ان محبِّ وطن نوجوانوں کو اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہوگیا اور ان پروانوں نے آزادی کی دیوی کے قدموں میں اپنی زندگی قربان کردی اور مردہ ملک کو دوبارہ موت کے تئیں بے خوفی ظاہر کرکے اپنے قدیم بزرگوں کی یاد تازہ کردی۔

یہ عہد ساز یا باغی لوگ کیسے متنوع اور انوکھے ہیں' اس کا مختصر ذکر بنگال کے باغی شاعر نظر الاسلام نے اپنی 'باغی' نظم میں کیا ہے۔ موت کی باہوں میں باہیں ڈال کر کھیل کرنے والے' غریبوں کے معاون' آزادی کے محافظ' غلامی کے دشمن' ظالموں' ستم کرنے والوں اور من مانی کرنے والے حکمرانوں کے دشمن ان باغی بہادروں کے دل کا 'من کا' اخلاق کا' خواہش کا بڑا خوب صورت منظر انہوں نے اپنی نظم میں کھینچا ہے۔ پہلے ہی وہ کہتے ہیں:

بو لو و یر ۔ چہ انت من شیر
شر نیہاری آ ماری نت شر اوئی شکھر ہمادریر

یعنی اے باغی ویر! تم یکا یک یہ کہتے ہو کہ میں کب سے سر اٹھا کر کھڑا ہوں ۔ میرا اونچا سر دیکھ کر ہمالیہ نے بھی اپنا سر شرم سے خم کردیا۔

آگے جا کر اس کی سختی اور نرمی کا ذکر کیا ہے۔ کہیں وہ موت سے (کے ساتھ) رقصاں ہے' کہیں وہ دنیا کو آن واحد میں برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ برق کی مانند چمکتا ہے۔ وہ موسیقی کی طرح شیریں ہے۔ بیوہ' غلام' مظلوم' غریب' بھوکے اور مصیبت زدہ لوگوں کے درمیان بیٹھ کر وہ مسلسل روتا رہتا ہے۔ ایسے متنوع شخص کی تصویر کشی کرتے ہوئے آخر میں وہ باغی کے منہ سے کہلواتے ہیں:

مہابدروہی رنگلانت آمی شیئی دن ہو شانت
جبے اتپیڑترے کرندن ۔رول آکاشے باتاسے دھونی بے نا
اتیاچاریر کھڑگ کرپان بھیم رن بھومی رنی بے نا
بدروہی رنگلانت آمی شیئی دن ہو شانت

مطلب یہ ہے کہ میں باغی اب لڑائی سے تھک گیا ہوں اور میں ابھی اسی دن خاموش ہوجاؤں گا جس دن کسی غمزدہ کی آہ و بکا آسمان میں جا کر آگ نہ لگا سکے گی' یعنی کوئی غمزدہ نہ رہے گا اور جب ظالموں' ستم کرنے والوں کی بھیانک شمشیر میدان

میں چلنی بند ہو جائے گی یعنی باقی ہی نہ رہیں گی' تب' اور تبھی میں خاموش ہو سکوں گا اور ہو بھی جاؤں گا۔

ایسے انوکھے باغی لوگ پوری دنیا سے ٹکرا جاتے ہیں اور خود کو جلتی آگ میں جھونک دیتے ہیں' اپنا عیش و آرام سب بھول جاتے ہیں اور دنیا کی خوب صورتی' تزئین میں تھوڑا اضافہ کر دیتے ہیں اور ان کی قربانی سے ہی دنیا میں کچھ ترقی ہوتی ہے۔ایسے ہی بہادر ہر ملک میں ہر عہد میں پیدا ہوتے ہیں۔ہندوستان میں بھی یہی لائق پرستش لوگ جنم لیتے رہے ہیں' لے رہے ہیں اور لیتے رہیں گے۔ہندوستان میں پنجاب نے بھی ایسے رتن زیادہ دیئے ہیں' بیسوی صدی کے ایسے ہی سب سے پہلے شہید مدن لال جی دھینگرا ہیں۔

وہ کوئی لیڈر تو تھے نہیں کہ باحیات رہتے ان کی زندگی کے کوائف شائع ہو کر دو دو آنے میں فروخت ہو جاتے۔وہ اوتار بھی نہیں تھے کہ نجومی سے بتا کر شور مچا دیا جاتا کہ ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ان کی کسی ایسی باتوں کا بھی ہمیں پتہ نہیں کہ ہم لکھ سکیں کہ 'ہونہار بروان کے ہوت چکنے پات''۔

وہ غریب اور ایک بد قسمت باغی تھا۔اس کے والد نے اسے اپنا بیٹا ماننے سے انکار کر دیا تھا۔وطن پرست اور خوشامدی سبھی اخباروں میں اور اس وقت کے پر جوش لیڈر وپن چندر پال تک نے انہیں کوس کوس کر گالیاں دیں۔تو پھر بتاؤ ان حالات میں آج بیس سال بعد ان کے بارے میں حقائق کو از سر نو جمع کرنے کی کوشش میں کسی کو کتنی کامیابی مل پائے گی؟

ان پریشانیوں میں ہم آج ان کی سوانح لکھنے بیٹھ گئے ہیں۔آہستہ آہستہ ہم لوگ ان کا نام بھی نہ بھول جائیں۔یہی سوچ کر آج ان کے بارے میں جتنے بھی حقائق مل سکتے ہیں' وہ قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

آپ شاید امرتسر کے رہنے والے تھے۔اچھے گھرانے کے تھے۔بی اے پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ روانہ ہو گئے۔کہا جاتا ہے کہ وہاں آپ عیاشی کا شکار ہو گئے۔یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی لیکن یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ان کا دل بڑا رقیق اور جذباتی تھا' اس کا ثبوت بھی ملتا ہے۔انگلینڈ کی خفیہ ایجنسی (اسکاٹ لینڈ یارڈ) کے ایک معروف جاسوس شری ای ٹی وڈہال نے یونین جیک (Union Jack) نامی ویکلی اخبار میں اپنی ڈائری شائع کی تھی۔مارچ 1925 کے شمارہ میں انہوں نے شری مدن لال دھینگرا کے حالات تحریر کئے ہیں۔یہ جاسوس ان کے تعاقب کے لئے لگایا گیا تھا۔وہ لکھتا ہے:

"Dhingra was an extraordinary man. Dhingra's passion for flowers was remarkable".

یعنی دھینگرا ایک عام آدمی تھے۔دھینگرا کو پھولوں سے کافی لگاؤ تھا۔آگے انہوں نے لکھا ہے کہ وہ باغ کے کسی خوب صورت گوشہ میں جا کر بیٹھ جاتے تھے اور گھنٹوں تک پھولوں کو ایک شاعر کی مانند مست ہو کر دیکھتے اور ان کی آنکھیں چمک پڑتی تھیں۔اسی چمک کو دیکھ کر ای ٹی وڈہال استاد سکلابن آگے لکھتے ہیں:

There is a man to keep an eye on. He will do something desperate someday."

یعنی اس شخص پر نظر رکھنی چاہئے۔کسی نہ کسی دن وہ کچھ دھماکہ کرے گا۔خیر!

ہم بات کر رہے تھے کہ وہ شاید عیاشی کے جال میں پھنس گئے۔اس کہانی کے آگے یوں کہ پھر سودیشی تحریک کا اثر انگلینڈ تک بھی پہنچا اور جاتے ہی شری ساورکر نے انڈین ہاؤس نامی سبھا قائم کی۔مدن لال دھینگرا بھی اس کے ممبر بنے۔

ادھر ہندوستان میں کھلے آندولن کو دبانے کے سبب عہد پلٹنے والے لوگوں نے خفیہ سوسائٹیاں قائم کرلیں۔ یہاں تک کہ 1908 میں علی پور سازش کا مقدمہ بن گیا۔ شری کنہائی اور شری ستندر ناتھ کو پھانسی مل گئی۔ دھیریندر اور الاسکار دت کو بھی اسی وقت پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ یہ خبریں انگلینڈ میں بھی پہنچیں اور یہ پر جوش نوجوان آگ بگولہ ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن رات کو شری ساورکر اور مدن لال ڈھینگرا بہت دیر تک صلاح مشورہ کرتے رہے۔ اپنی جاں تک دینے کی ہمت دکھانے کے امتحان میں مدن لال کو زمین پر ہاتھ رکھنے کے لئے کہہ کر ساورکر نے ہاتھ پر سوا گاڑ دیا لیکن پنجابی بہادر نے آہ تک نہیں کی۔ سوا نکال لیا گیا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ آہا' وہ کتنا حسین لمحہ تھا۔ وہ لمحات کتنے بیش قیمت اور نادر تھے۔ وہ ملن کتنا خوب صورت' کتنا عظیم تھا' ہم دنیا دار کیا جانیں' موت کے خیال تک سے ڈرنے والے ہم بزدل لوگ کیا جانیں کہ ملک کی خاطر قوم کے لئے جان نچھاور کرنے والے وہ لوگ کتنے عظیم' کتنے مقدس اور کتنے لائق پرستش ہیں۔

اگلے دن سے ڈھینگرا دوبارہ انڈین ہاؤس ساورکر کے اجلاس میں نہیں آئے اور انڈین اسٹوڈنٹ اور اسپیشل خفیہ پولیس کا نظم کرنے والے اور ان کی مختصر آزادی کو کچلنے والے سر کرزن وائلی جو کہ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے اے ڈی کیمپ (Aidde-camp) تھے' کے ذریعہ چلائی جانے والی انڈین اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن میں شامل ہوئے۔ یہ دیکھ کر انڈین ہاؤس والے لڑکوں میں کافی جوش وخروش پیدا ہوا اور انہوں نے ملک فریبی' ملک باغی تک کہنا شروع کر دیا۔ لیکن ان کا غصہ بھی تو ساورکر نے یہ کہہ کر ٹھنڈا کیا کہ آخر انہوں نے ہماری آرگنائزیشن کو چلانے کے لئے بھی تو جی توڑ کوشش کی تھی اور اسی محنت کا ثمرہ ہے کہ ہماری آرگنائزیشن چل رہی ہے' اس لئے ہمیں ان کا مشکور ہونا چاہئے۔ خیر کچھ دن تو خاموشی سے گزر گئے۔

یکم جولائی 1909 کو امپیریل انسٹی ٹیوٹ کے جہاں گیر ہال میں ایک میٹنگ منعقد ہوئی۔ سر کرزن وائلی نے بھی اس میں شرکت کی۔ وہ دور دیگر لوگوں سے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ڈھینگرا نے پستول نکال کر ان کے منہ کی طرف تان دی۔ کرزن صاحب کی ڈر سے چیخ نکل گئی لیکن کوئی انتظام ہونے سے پہلے مدن لال نے دو گولیاں ان کے سینے میں مار کر انہیں ابدی نیند سلا دیا۔ بعد ازاں تھوڑی کوشش کے بعد وہ پکڑے گئے۔ پھر کیا تھا' دنیا بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ سب لوگ انہیں جی بھر کر گالیاں دینے لگے۔ ان کے والد نے پنجاب سے تار بھیج کر کہا کہ ایسے باغی اور قاتل شخص کو میں اپنا بیٹا ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ ہندوستانیوں نے کئی میٹنگیں کیں۔ بڑی بڑی تقاریر ہوئیں۔ بڑی بڑی تجاویز پاس ہوئیں' سب نے ان کی مذمت میں۔ لیکن اس وقت بھی ایک ساورکر ویر تھے جنہوں نے کھلم کھلا ان کی حمایت کی۔ پہلے تو ان کے خلاف تجاویز نہ پاس ہونے کے لئے یہ بہانہ بنایا کہ ابھی ان پر مقدمہ چل رہا ہے اور ہم انہیں گناہ گار نہیں کہہ سکتے۔ آخر میں جب اس تجویز پر ووٹ لینے لگے تو اجلاس کے صدر شری وپن چندر پال یہ کہہ ہی رہے تھے کہ کیا یہ اتفاق رائے سے پاس سمجھا جائے تو ساورکر صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے تقریر شروع کر دی۔ اتنے میں ہی ایک انگریز نے ان کے منہ پر گھونسا مار دیا اور کہا "Look! how straight the English first goes" (یعنی) دیکھو! انگریزی گھونسا کیسے نشانہ پر پڑتا ہے! ابھی وہ کہہ ہی رہا تھا کہ (ایک) ہندوستانی نوجوان نے اس انگریز کے سر پر لاٹھی سے حملہ کر دیا اور کہا "Look,how straight the Indians Club goes" (یعنی) دیکھو! یاروں کا ہندوستانی ڈنڈا کتنے نشانے پر لگتا ہے! شوروغل مچ گیا۔ میٹنگ درمیان میں ہی ختم ہو گئی۔ تجاویز بھی ایسے ہی رہ گئیں۔ خیر!

مقدمہ چل رہا تھا۔ مدن لال بڑے خوش تھے۔ بڑے چپ تھے۔ سامنے دروازے پر موت کھڑی دیکھ کر بھی وہ مسکرا رہے

تھے۔وہ بے خوف اور بے باک تھے۔آہا!وہ بہادر باغی تھے۔آپ نے آخر میں جو بیان دیا وہ آپ کی نیک دلی وطن پرستی اور اہلیت کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ہم لفظ بہ لفظ یہاں اسے دے رہے ہیں۔یہ 12 اگست کے ڈیلی نیوز میں شائع ہوا تھا:

"I admit the other day, I attempted to shed blood as an humble revenge for the inhuman hangings and deportation of partiotic Indian Yoth. in the attempt I have consulted none bu my own conscience, I have conspired with none but my duty."

"I believe that a nation held down b foreign baynot is in a perpetual state of war. Since open battle is rendered impossible to disarmed races, I attacked by surprise, since guns were denied to me I drew forth my pistol and fired"

"As as Hindu, I fell that wrong to my country is insult to God. Her cause is the cause of Shri Rama, her service is the service of Shri Krishana. Poor in wealth and intellect, a son like myself has nothing else to offer but his own blood, and so I have sacrificed the same on her alter"

"The only lesson required in India at present is to learn how to die, and the only way to reach is by dying ourselves. Therefor I die and I glory in my martyrdom."

My only prayer to God is- "May I be reborn of the same mother and may I redie in the same sacred cause, till the cause is successful, and she stands free for the good of humanity and to the glory of God-- Bande Matram."

یعنی میں مانتا ہوں کہ میں نے اس دن ایک انگریز کا خون کیا اور کہتا ہوں کہ یہ ان بربریت آمیز سزاؤں کا معمولی سا بدلہ ہے جو کہ ہندوستانی اور محبِ وطن نوجوانوں کو پھانسی اور کالے پانی کی دی گئی۔میں نے اس کام میں اپنے ضمیر کے علاوہ کسی دیگر کی صلاح نہیں لی۔اپنے فرض کے سوا کوئی سازش نہیں کی۔

مجھے یقین ہے کہ ایک ملک، جسے غیر ملکی لوگوں نے بندوقوں سے دبایا ہو وہ ہمیشہ حالت جنگ میں رہتا ہے اور چوں کہ ہتھیار چھین کر کھلی جنگ ممکن بنا دی جاتی ہے، میں نے چھپ کر بغیر بتائے حملہ کیا ہے کیوں کہ ہمیں بندوق رکھنے سے منع کیا جاتا ہے،اس لئے میں نے پستول کھینچ لی اور چلا دی۔

میں ایک ہندو کے طور پر سمجھتا ہوں کہ ملک کے ساتھ کیا گیا تحقیر آمیز برتاؤ ایشور کی تحقیر ہے کیوں کہ ملک کی پوجا شری رام چندر جی کی پوجا ہے اور ملک کی خدمت شری کرشن جی کی خدمت ہے۔

ایک غریب اور بیوقوف، میرے جیسے نوجوان کے پاس اپنی ماں کے قدموں میں اپنا خون دینے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ میں نے اپنا خون ماں کے قدموں میں چڑھایا ہے۔

اس وقت اگر ہندوستان کو کسی سبق کی ضرورت ہے تو یہ کہ مرنا کیسے چاہئے اور اسے سیکھنے کا طریقہ ہے کہ ہم خود مر کر دکھائیں۔اس لئے میں مر رہا ہوں۔اس لئے مبارک ہو شہیدانہ موت۔

یہ لڑائی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہندوستانی اور انگریز دو قوم رہیں گی اور ان کا یہ غیر فطری معاہدہ قائم رہے

گا۔میری خدا سے یہی دعا ہے کہ میں پھر اسی ماں کی گود میں جنم لوں اور جب تک وہ آزاد نہ ہو جائے اور انسانی سماج کی مکمل خدمت اور ترقی کے قابل نہ جائے' میں یہیں جنم لیتا رہوں اور مرتا رہوں۔ وندے ماترم

16 اگست 1909 کا دن تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔اس دن انگلینڈ میں ہندوستانی عہد ساز پارٹی کی آواز دھینگوا بہادر اپنی متوالی چال چلتا ہوا تختہ دار پر جا چڑھا۔مسز ایگنس اسمیڈ لے ایک جگہ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"He walked to the scaffoled with his head high and shook of hands of those who offered to support him, saying that he was not afraid of death."

آہا! سہارا دے کر لے جانے والے افراد کے ہاتھ پیچھے کر کے وہ کہنے لگا' میں موت سے نہیں ڈرتا' آہا۔قسمت والے ہیں مرتے!

"As he stood on the scaffoled he waw asked if he had a last word to say. He anwered, Bande Matram."

ماں سے اتنا پیار! پھانسی کے تختہ پر کھڑے ہوئے لوگوں سے پوچھا جاتا ہے...... کچھ کہنا چاہتے ہو؟ تو جواب ملتا ہے' بندے ماترم! ماں! بھارت ماں تمہیں سلام۔ وہ بہادر پھانسی پر لٹک گیا اور ان کی لاش بھی اندر ہی دفن کر دی گئی اور ہندوستانیوں کو ان کی آخری رسومات ادا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔قسمت والا تھا وہ بہادر! دھنیہ ہے اس کی یاد! مردہ ملک کے انمول ہیرے کو بار بار نمسکار۔

-مارچ 1928 'کرتی'

نراجیت --1

ہندوستانی انقلابی تحریکوں کے مطالعات کے ساتھ ساتھ بھگت سنگھ نے بین اقوامی انقلابی تحریک کا بھی وسیع مطالعہ کیا اور اس پر غور و خوض کیا۔اسی سلسلے کی کڑی کے طور پر 'کرتی' میں نراجیت کیا ہے؟' وغیرہ مضامین اور کچھ تراجم شائع ہوئے تھے۔مئی 1928 سے 'کرتی' میں بھگت سنگھ نے نراجیت کے موضوع پر یہ مضمون قسط وار لکھنا شروع کیا جو اگست تک جاری رہا—مدیر

دنیا میں آج بہت انتشار برپا ہے۔دنیا میں قیام امن کے لئے مشہور دانشور کوشاں ہیں لیکن جس امن کے لئے کوششیں کی جا رہی ہیں' وہ پائیدار ہے اور نہ ہی ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔اس تک رسائی کے لئے عظیم شخصیات اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکی ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے لیکن آج ہم غلام ہیں۔ہماری نگاہیں کمزور ہیں' ہمارے ذہن کند ہیں۔ہمارا دل کمزور ہو رہا ہے۔ہم دنیا میں قیام امن کے لئے کیا سوچیں؟ اپنے ملک کے لئے کچھ نہیں کر پا رہے ہیں! اسے اپنی بدقسمتی ہی کہیں۔ہم تو اپنے دقیانوسی خیالات ہی تباہ کر رہے ہیں۔ہم بھگوان اور جنت کے لئے آتما پرتما سے فریاد کرنے میں پھنسے ہیں۔یوروپ کو ہم فوراً ہی مادیت پرست کہہ دیتے ہیں۔ان کے جو نظریات ہیں' ان کی طرف توجہ نہیں دیتے! ہم روحانی رجحان والے جو ہیں۔ہم بڑے تیاگی جو ہیں' ہمیں اس دنیا جہان کی باتیں نہیں کرنی چاہئے! ہماری ایسی بدترین حالت ہو گئی ہے کہ رونے کو دل چاہتا ہے۔بیسویں صدی میں حالات سدھر رہے ہیں۔نوجوانوں کی طرز غور و فکر پر یوروپی افکار کا کچھ کچھ

اثر پڑ رہا ہے اور جو نوجوان دنیا میں کچھ ترقی کرنا چاہتے ہیں، انہیں موجودہ عہد میں بلند اور معیاری نظریات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

آج سماج میں ہونے والی ناانصافی کے خلاف کون سی آواز اٹھ رہی ہے اور دائمی قیام امن کے لئے کیسے خیالات اٹھ رہے ہیں، انہیں ٹھیک سے سمجھے بغیر انسان کا علم ادھورا رہ جاتا ہے۔ آج ہم مختصراً کمیونزم اور سماج وادوغیرہ کے مختلف نظریات کے بارے میں سن رہے ہیں۔ ان اعلیٰ اصولوں کو لاقانونیت (نراجیت) ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ مضمون اسی نراجیت کے متعلق لکھا جارہا ہے۔

عوام 'نراجیت' لفظ سے بہت ڈرتے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنی آزادی کے لئے کہیں سے پستول یا بم لے کر نکلتا ہے تو سبھی نوکر شاہ اور ان کے پٹھو 'انارکسٹ انارکسٹ' کہہ کر دنیا کو ڈراتے ہیں۔ انارکسٹ ایک بڑا خوں خوار شخص مانا جاتا ہے، جس کے دل میں ذرا بھی رحم نہ ہو، جو خون کا پیاسا ہو، جو تباہی و بربادی دیکھ کر جھوم اٹھتا ہو۔ 'انارکسٹ' لفظ اتنا بدنام کیا جاچکا ہے کہ ہندوستان میں تبدیلی حکومت چاہنے والوں کو بھی، عوام میں نفرت پیدا کرنے کے لئے 'انارکسٹ' کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بھوپندر ناتھ دت نے بنگلہ میں لکھی کتاب 'اپرکاشت راجنیتک اتہاس' کی پہلی جلد میں اس کا ذکر کیا ہے کہ ہمیں بدنام کرنے کے لئے سرکار بھلے ہی 'انارکسٹ انارکسٹ' کہتی رہے، حقیقت میں وہ تبدیلی اقتدار کی ٹولی تھی اور نراجیت تو ایک بہت اعلیٰ اصول ہے۔ اس اعلیٰ اصول کے تعلق سے ہمارے سادہ لوح عوام کیا سوچتے ہیں کیوں کہ وہ تو حکومت تبدیل کرنے والوں سے آگے عہد ساز بھی نہیں تھے۔ وہ لوگ صرف اقتدار تبدیل کرنے والے ہی تھے۔ خیر۔

ہم ذکر کررہے تھے کہ نراجیت' لفظ بہت بدنام کیا گیا ہے اور خود غرض سرمایہ داروں نے جس طرح 'بولشیوک' 'سوشلسٹ وغیرہ لفظ بدنام کئے ہیں، اسی طرح اس لفظ کو بھی بدنام کیا۔ حالاں کہ نراجیت کے حامی سب سے زیادہ سنجیدہ، متوالے اور ساری دنیا کی بھلائی کے خواہاں تھے۔ ان کے خیالات کے ساتھ اختلاف رکھتے ہوئے بھی ان کی سنجیدگی، عوام سے شفقت، تیاگ اور ان کی سچائی وغیرہ پر کسی طرح کا شک نہیں کیا جاسکتا۔

'انارکسٹ' جس کے لئے ہندی میں 'اراجکتاوادی' لفظ ہی استعمال میں لایا جاتا ہے، یونانی زبان کا لفظ ہے، جس کا لفظی مطلب ہے 'این۔ ناٹ' آرکی = رول' یعنی (لاقانونیت)۔ کسی بھی طرح کی حکومت نہ ہونا۔ انسان میں پہلے سے ہی زیادہ سے زیادہ آزادی پانے کی طلب رہی ہے اور بیچ بیچ میں مکمل آزادی جو کہ نراجیت کا اصول ہے، سے ملتا جلتا نظریہ ظاہر ہوا ہے۔ مثال کے طور پر، بہت پہلے ایک یونانی سیاح نے کہا تھا:

"We wish neither to belong to the governing class nor to the governed."

یعنی ہم حکمراں بننا چاہتے ہیں اور نہ ہی رعایا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں مشہور عالمی بھائی چارہ اور سنسکرت کے جملے 'واسودیو کٹمبکم' وغیرہ میں بھی یہی جذبہ پنہاں ہے۔ اگر ہم بہت قدیم نقطۂ نظر سے کسی خاص نتیجہ تک نہ بھی پہنچ سکیں تو بھی یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ خیال انیسویں صدی یعنی پچھلی صدی کے آغاز میں ایک فرانسیسی سیاح پرودھون نے واضح الفاظ میں عوام کے سامنے پیش کیا اور اس کی کھلے عام تشہیر کی۔ اس لئے انہیں 'نراجیت' کا بانی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اس کی تشہیر شروع کی۔ بعد میں جان ماسٹ پرنس کروپاٹکن جیسے متعدد 'خانہ جنگی' پر یقین رکھنے والوں نے جنم لیا۔ آج کل امریکہ میں مسز ایما گولڈ مین اور الیگو ٹڈر بریک مین وغیرہ اس کے مبلغ ہیں۔ نراجیت کے پس منظر میں مسز گولڈ مین نے لکھا ہے:

Anarchism— The philosophy of a new social order based on liberty unrestricted by man-made law. The theory that all forms of Government rest on voilence, and are therefore wrong and harmful, as well as unnecessary.

یعنی نراجیت ایک نیا فلسفہ ہے، جس کے مطابق ایک نئے سماج کی تشکیل ہوگی۔ عوام کا رہن سہن، طرز حیات اور تہذیب ایسی ہوگی جس میں انسان کے بنائے قانون کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کریں گے۔ ان کے مطابق کسی بھی حکومت کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کیوں کہ ہر حکومت زور زبردستی یا استحصال پر مرکوز ہوتی ہے، اس لئے یہ لازمی ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ نراجیت کے حامی کسی بھی طرح کی سرکار نہیں چاہتے اور یہ بات سچ ہے لیکن یہ سن کر ہم خوف زدہ ہوجاتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں کئی طرح کے وسوسے پیدا کیے جاتے ہیں۔ ہم انگریز حکومت کے بعد اپنی حکومت بنا کر بھی بھوت دیکھ دیکھ کر ڈریں اور ہمیشہ تھر تھر کانپتے رہیں، یہی ہمارے حکمرانوں کی نیت ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کیسے ایک منٹ کے لئے بھی سوچ سکتے ہیں کہ ایسا بھی کوئی وقت آئے گا کہ جب حکومت کے بغیر بھی ہم خوش اور آزاد رہ سکیں گے۔ لیکن اس میں ہماری خود کی کمزوریاں ہیں۔ آدرش یا احساس کا کوئی قصور نہیں ہے۔

نراجیت کے مطابق جس مثالی آزادی کا تصور کیا جاتا ہے، وہ مکمل آزادی ہے، جس کے مطابق نہ تو ذہن پر بھگوان یا دھرم کا بھوت سوار ہو نہ مایا یا سرکاری زنجیریں جکڑی ہوئی ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ (درج ذیل) تینوں موٹی موٹی باتوں کو دنیا سے پوری طرح ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

1۔ چرچ، بھگوان اور مذہب 2۔ اسٹیٹ (حکومت)، 3۔ پرائیویٹ پراپرٹی (نجی جائیداد) یوں تو یہ موضوع بہت دلچسپ اور وسیع ہے، جس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن اب مضمون اور زیادہ بڑھا نہیں سکتے کیوں کہ جگہ کی کمی ہے، اس لئے ہم موٹی موٹی باتوں کا ہی ذکر کر رہے ہیں۔

خدا اور مذہب

سب سے پہلے ہم خدا اور مذہب کو لیتے ہیں۔ ہندوستان میں اب ان دونوں بھوتوں کے خلاف آواز بلند ہو رہی ہے۔ لیکن یوروپ میں تو پچھلی صدی سے ہی اس کے خلاف بغاوت ہوگئی تھی۔ وہ تو شروع ہی اس عہد سے کرتے ہیں جب کہ عوام کا علم بہت ہی کم تھا۔ اس وقت وہ ہر چیز سے، خاص کر دیوی شکتیوں سے ڈرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب اور دیوی شکتیاں خدا اور جہالت کا نتیجہ ہیں، اسی لئے ان کے وجود کا بھرم مٹا دینا چاہئے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ہم عہد طفولیت سے بچوں کو یہ بتانا شروع کر دیتے ہیں کہ سب کچھ بھگوان ہیں، انسان تو کچھ بھی نہیں یعنی مٹی کا پتلا ہے۔ اس طرح کے خیالات دل میں آنے سے انسان میں اعتماد کا جذبہ مر جاتا ہے۔ اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ بہت کمزور ہے۔ اس طرح وہ خوف زدہ رہتا ہے۔ جتنے وقت یہ خوف موجود رہے گا، اتنی دیر مکمل سکھ اور چین نہیں ہوسکتا۔

ہندوستان میں مہاتما بودھ نے پہلے بھگوان کے وجود سے انکار کیا تھا۔ ان کا خدا میں یقین نہیں تھا۔ اب بھی کچھ سادھو ایسے ہیں، جو بھگوان کے وجود کو نہیں مانتے۔ بنگال کے سوہما سوامی بھی ان ہی میں سے ہیں۔ آج کل نرالمبا سوامی، سوہما سوامی کی ایک کتاب 'کامن سینس' انگریزی میں شائع ہوئی ہے۔ انہوں نے بھگوان کے وجود کے خلاف خوب جم کر لکھتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ نراجیت کے قائل نہیں ہوگئے ہیں۔ 'تیاگ' اور 'یوگ' کے بہانے وہ اب یوں ہی نہیں بھٹکتے۔ اس طرح سائنسی عہد میں خدا کے وجود کو ختم کیا جا رہا ہے، جس سے دھرم کا بھی نام و نشان مٹ جائے گا۔ حقیقت میں

نراجیت کے رہنما بکونن نے اپنی کتاب' گاڈ اینڈ اسٹیٹ' میں خدا کو خوب لتاڑا ہے۔ انہوں نے انجیل کی کہانی سامنے رکھی اور کہا کہ خدا نے دنیا بنائی اور انسان کو اپنے جیسا بنایا۔ بہت مہربانی کی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ دیکھو' عقل کے درخت کا پھل مت کھانا۔ دراصل خدا نے اپنے دل کو بہلانے کے لئے انسان اور ہوا کو بنا تو دیا مگر وہ چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کے غلام بنے رہیں اور اس کے خلاف سر او نچا نہ کرسکیں۔ اس لئے انہیں دنیا کے تمام پھل تو دیئے لیکن عقل نہیں دی۔ یہ حالت دیکھ کر شیطان آگے بڑھا۔ But here steps in satan, the eternal rebel , the first free thinker and the emancipator of the world. یعنی دنیا کے کٹر مخالف' آزادی کی پہلی مشعل جلانے والا اور دنیا کو آزاد کرنے والا شیطان آگے بڑھا' آدمی کو بغاوت سکھائی اور عقل کا پھل کھلا دیا۔ بس پھر سب سے زیادہ طاقت رکھنے والا' سب کچھ جاننے والا پر ماتما کسی نچلے درجہ کی کمینی ذہنیت کی طرح آگ بگولہ ہو گیا اور خود بنائی دنیا کو خود ہی بد دعائیں دینے لگا۔ خوب

سوال اٹھتا ہے کہ خدا نے یہ دکھ بھری دنیا کیوں بنائی؟ کیا تماشا دیکھنے کے لئے؟ تب تو وہ روم کے ظالم شہنشاہ نیرو سے بھی زیادہ ظالم ہوا۔ کیا یہ اس کا کرشمہ ہے؟ اس کرشاتی خدا کی کیا ضرورت ہے؟ بحث طویل ہو رہی ہے' اسی لئے یہیں ختم کرتے ہوئے اتنا ہی کہیں گے کہ ہمیشہ سے خود غرضوں نے' سرمایہ داروں نے دھرم کو اپنے اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔ حوصلہ رکھو' اپنے کاموں کو دیکھو۔ ایسے فلسفہ نے جو تکالیف پہنچائی ہیں' یہ سب کو معلوم ہی ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ خدا کے وجود کو اگر مسترد کر دیا جائے تو کیا ہوگا؟ دنیا میں پاپ بڑھ جائے گا۔ ظلم و نا انصافی بڑھ جائے گی لیکن نراجیت کے حامی کہتے ہیں' اس وقت انسان اتنا زیادہ بلند و بالا ہو جائے گا کہ جنت کی حرص اور جہنم کا خوف بتائے بغیر ہی وہ برے کاموں سے دور ہو جائے گا اور نیک کام کرنے لگے گا۔ حقیقت میں بات یہ ہے کہ ہندوستان میں شری کرشن خلوص کے ساتھ عمل کی ترغیب دیتے ہوئے بھی ارجن کو بعد از مرگ جنت اور فتح حاصل کرنے کے بعد اقتدار کا لالچ دینے سے پیچھے نہ رہے۔ لیکن آج ہم نراجیوں کی قربانیوں کو دیکھتے ہیں تو دل میں خیال آتا ہے کہ ان کے پیر چوم لیں۔ ساکو اور وینجری کی کہانیاں ہمارے قارئین پڑھ ہی چکے ہیں۔ نہ خدا کو خوش کرنے کا کوئی لالچ ہے اور نہ جنت میں جا کر موج مستی کرنے والوں کی تمنا' نہ پنر جنم میں سکھ ملنے کی امید۔ لیکن پھر بھی ہنستے ہنستے لوگوں کے لئے' سچ کے لئے زندگی نچھاور کر دینا کیا کوئی معمولی بات ہے۔ نراجیت کے حامی تو کہتے ہیں کہ ایک بار انسان خود آزاد ہوا تو اس کی زندگی بہت معیاری ہو جائے گی۔ خیر' ایک ایک سوال پر طویل بحث ہو سکتی ہے لیکن یہاں جگہ کی قلت ہے۔

نراجیت–2

اسٹیٹ یا سرکار

اس سے آگے کی بات جو وہ سامنے نہیں لانا چاہتے' وہ ہے اقتدار۔ اگر ہم اقتدار کی بنیاد تلاش کرلیں تو دو نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جنگلی انسان کی عقل ترقی پاتی رہی اور لوگوں نے مل جل کر رہنا شروع کر دیا۔ اس طرح اقتدار کا جنم ہوا۔ اسے 'ادو بھو' کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ لوگوں کو جنگلی جانوروں سے مقابلے کے لئے اور دیگر ضروریات کی تکمیل کے لئے مجتمع ہونا پڑا۔ پھر گروپوں میں لڑائیاں ہوئیں اور ہر ایک کو طاقت ور دشمن کا ڈر ستانے لگا۔ اس طرح مل جل کر

حکومت بنائی گئی۔ اس کے بعد ضرورت یا یوٹیلی ٹیرین تھیوری بھی ہے۔ ہم چاہے دونوں کو ہی لیں۔ 'ادبھو' کے حامیوں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اب ہی کیوں 'ادبھو' رک گیا؟ پنچایتی راج کے بعد نراجیت ہی آتی ہے اور دوسروں کو یہ جواب ہے کہ اب اقتدار کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بحث تو پہلے ہو چکی ہے اگر اس یا اس جیسی باتوں کی طرف توجہ بھی دیں تو بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ لوگوں نے حقیقت میں سودا کیا تھا' جسے فرانس کے مشہور عہد ساز روسو نے سماجی سودا کہا ہے۔ سودا یہ کہ انسان اپنی آزادی کا ایک خصوصی حصہ یعنی اپنی آمدنی کا ایک حصہ قربان کرے گا' جس کے عوض اسے تحفظ اور امن مہیا کرایا جائے گا۔ اس سب کے بعد قابل غور ہے کہ کیا وہ سودا پوری طرح ٹھیک رہا ہے؟ اقتدار قائم ہو جانے کے بعد حکومت اور خدا نے سازش رچی۔ لوگوں سے کہا کہ ہم خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ لوگ خدا سے خوف زدہ رہے اور حاکم من مانے مظالم کرتے رہے۔ زار (روس) اور لوئی (فرانس) کی مثالیں بہت اچھی طرح سے سب ڈھول کی پول کھول دیتی ہیں کیوں کہ وہ سازش زیادہ دنوں تک نہیں چل سکی' پوپ گیگوری اور کنگ ہینری میں اختلافات ہو گئے۔ پوپ نے لوگوں کو ہینری حکومت کے خلاف بھڑکایا۔ کہنے کا مطلب ہے کہ خود غرض لوگ لڑے اور وہ خیال خام چکنا چور ہو گیا۔ خیر' دوبارہ لوگ اٹھے اور ظالم لوئی کو مار ڈالا۔ دنیا میں افراتفری مچ گئی۔ پنچایتی راج کا قیام عمل میں آیا لیکن مکمل آزادی تب بھی نہیں ملی۔ ادھر جس وقت آسٹیریا کا وزیر میٹرنک اقتدار کے زعم میں ظلم کر کے لوگوں کو اس کا مخالف بنا رہا تھا' ادھر امریکہ کے پنچایتی راج میں بے چارے غلاموں کی بری حالت ہو گئی تھی۔ تب فرانس کے غریب لوگ بھی متعدد مرتبہ سر اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ آج بھی فرانس میں پنچایتی راج ہے لیکن لوگ پوری طرح آزاد نہیں ہیں۔ اس لئے نراجیت پھیلانے والے کہتے ہیں کہ کوئی بھی حکومت نہیں چاہئے۔ باقی سب باتوں میں وہ کمیونسٹوں کے مساوی ہیں لیکن ان دونوں باتوں میں فرق ہے۔ مشہور کمیونسٹ کارل مارکس کے معروف دوست فریڈرک اینگلس نے بھی اپنے اور مارکس کے کمیونزم کے تعلق سے لکھا ہے کہ ہمارا بھی یہی اصول ہے Communism also looks forward to a period in the evolution of the society when the State will become superfuous and having no longer any function perform, will die away. یعنی ان کا بھی خیال ہے کہ آخر میں حکومت کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔

خیر' ماحصل تو یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ حکومت نہ رہے اور لوگ بھائی چارے سے رہیں۔ میک یاولی اٹلی کا سیاست داں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حکومت کوئی نہ کوئی ضرور ہونی چاہئے' خواہ وہ پنچایتی ہو یا ایک بادشاہ کی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ حکومت ہو اور مضبوط لوہے کے ہاتھ جیسی ہو لیکن نراجیت پھیلانے والے کہتے ہیں کہ نرم اور گرم کیا؟ ہمیں نہ پنچایتی راج چاہئے اور نہ کوئی دوسرا۔ وہ کہتے ہیں "Undermine the whole conception of a State and then and then only we have liberty, worth having."

یعنی کہ حکومت کا خیال بھی دنیا سے ختم کیا جائے تبھی کوئی آزادی حاصل کریں گی۔

لوگ کہیں گے کہ بھلا یہ کوئی بات ہوئی' حکومت نہ ہوگی' قانون نہ ہوگا' قانون کا نفاذ کرنے والی پولیس نہیں ہوگی تو افراتفری مچ جائے گی۔ مشہور سیاسی رہنما ڈیوڈ تھیوریئن نے کہا ہے کہ "Law never made a white more just, and by means of their respect for it even the well disposed are daily made gents of injustice."

اس میں تو کوئی جھوٹ نظر نہیں آتا۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں قانون سخت ہوتا ہے' ظلم و ناانصافی اور رشوت

خوری بڑھتی جاتی ہے۔ یہ تو عام شکایت ہے کہ پہلے کسی طرح کے حساب کتاب کے بغیر ہزاروں روپے کا لین دین ہوتا تھا اور کوئی بے ایمانی نہیں کرتا تھا۔ اب دستخط، انگوٹھے، گواہ اور رجسٹریاں ہوتی ہیں۔ لیکن بے ایمانی بڑھ رہی ہے۔ پھر وہ تو اس کا مداوا یہی سمجھتے ہیں کہ ہر انسان کی ضرورتوں کی تکمیل ہوتی رہے، سبھی کام اس کی خواہشات اور امنگوں کے مطابق ہوتے رہیں، تب کوئی گناہ یا جرم نہیں ہوگا۔

"Crime is naught but misdirected energy. So long as every institution of today, economic, plolitical, social and moral conspires to misdirect human energy into wrong channels, so long as most people are out of place doing the things they want to do, living a life they want to live, crime will be ineviable and all the laws on the statues can also increase but never do away with crime."

یعنی اگر انسان کو مکمل آزادی مل جائے تو وہ اپنی خواہشات اور امنگوں کے مطابق کام کاج کر سکے۔ نا انصافی نہ ہو۔ اگر اسی طرح سرمایہ داروں کا استحصال جاری رہا تو بڑے بڑے قانون بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ بغیر حکومت کے رہ ہی نہیں سکتا۔ بے لگام ہوگا تو بہت نقصان پہنچائے گا۔ اس انسانی فطرت کے تعلق سے لارڈ نے اپنی کتاب 'پرنسپلس آف پالی ٹیکس' میں لکھا ہے کہ چیونٹیاں جمع ہو سکتی ہیں، جانور مجتمع رہ سکتے ہیں لیکن انسان نہیں رہ سکتے۔ انسان خدا کی طرف سے ہی حریص، غیر انسانی اور سست بنا ہے۔ ایسی باتیں سن کر ایما گولڈ مین غصہ ہو گئیں اور انہوں نے 'انارکزم اینڈ اور ایسیز' نامی کتاب میں لکھا ہے: "Every fool from king to policeman, from the flat headed person to the visionless dausier in science presumes to speak authoriatatively of human nature." یعنی جو بھی گدھا اٹھتا ہے، وہی بڑھ کر انسانی فطرت پر زیادہ زوردار رائے دیتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ جو جتنا بڑا بیوقوف ہو، اتنا ہی وہ اس تعلق سے اپنی رائے کو قیمتی سمجھتا ہے۔ آج تک کسی انسان کو مکمل آزادی دے کر بھی دیکھی ہے جو ہمیشہ اس کی برائیوں کا رونا رویا جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ چھوٹی پنچایتیں بنیں اور آزادی سے کام ہو۔

ذاتی ملکیت

تیسری سب سے ضروری اور اہم بات ہے ذاتی ملکیت۔ حقیقت میں دنیا کو پیٹ کا سوال ہی چلا رہا ہے۔ اس کے لئے ہی صبر، اطمینان وغیرہ نصیحتیں گڑھی گئیں۔ سبھی کچھ اس کے لئے کیا جاتا رہا۔ اب نراجیت کے حامی، کمیونزم کے حامی اور سوشلزم کے حامی سبھی جائیداد مخالف ہو گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "Property is robbery. "(Proudhon) but without risk or danger to the robber- Emma Goldman.

ملکیت سازی کا نظریہ انسانوں کو لالچی اور حریص بنا دیتا ہے۔ وہ پھر سنگ دل ہوتا چلا جاتا ہے۔ رحم دلی اور انسانیت اس کے ذہن سے ختم ہو جاتی ہیں۔ ملکیت کی حفاظت کے لئے حکومت اور اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے پھر لالچ بڑھتا ہے اور آخر کار نتیجہ پہلے سامراجیہ واد، پھر جنگ ہوتی ہے۔ خون خرابہ اور دیگر بہت سارے نقصانات ہوتے ہیں۔ اگر

سب کچھ مشترک ہو جائے تو کوئی لالچ نہ رہے' مل جل کر سبھی کام کرنے لگیں۔ چوری' ڈکیتی کی فکر نہ رہے۔ پولیس' جیل' کچہری اور فوج کی ضرورت نہ رہے اور موٹے پیٹ والے' حرام خوری کرنے والے بھی کام کریں۔ کم وقت میں پیداوار زیادہ ہونے لگے۔ سبھی لوگ آرام سے پڑھ لکھ بھی سکیں۔ اپنے آپ امن اور خوش حالی آئے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سنسار سے جہالت دور کرنا بہت ضروری ہے۔

دراصل ملکیت سب سے بڑا سوال ہے' اس لئے اس پر غور و فکر کے لئے ایک دوسرا مضمون ضروری ہے۔ اسی حقیقی سوال پر کارل میتگ نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا "Ask for work and if they don't give you work ask for bread and if they do not give you work or bread, then take bread" یعنی کام بھی نہ ملے اور روٹی بھی حاصل نہ ہو تو روٹی چھین کر کھا لو کیوں کہ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ کیک کھاتے ہوئے موج مستی کرے جب کہ دوسرے کو روٹی کے خشک ٹکڑے بھی نہ ملیں۔ اسی معاملہ پر انہوں نے کہا کہ مفلوک الحال کے گھر پیدا ہونے سے کوئی پوری عمر بھر گھسٹتے ہوئے گزارے اور خوش حال کے گھر پیدا ہونے سے ہی کسی کو حرام کی کھانے کا موقع کیوں فراہم ہو؟ 'مایا سے مایا ملے' والی بات بھی روکی جائے۔ انہیں اسباب کی بنا پر سبھی کے لئے مساوی مواقع والے اصول کی طرح انہوں نے ذاتی ملکیت کے تقدس کا بھرم بھی توڑا۔ وہ کہتے ہیں کہ ملکیت بدعنوانی سے جمع ہوتی ہے اور اس کی حفاظت کے لئے قانون کی ضرورت پڑتی ہے جس سے کہ حکومت کی ضرورت پڑتی ہے۔ دراصل یہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسے ختم کرتے ہی سبھی خرابیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ آخر کار وہ کیا چاہتے ہیں' کام کیسے چلے گا؟ کافی پھیلا ہوا سوال ہے۔

مضمون میں اوپر بتایا گیا ہے کہ نراجیت کے حامی پہلے تو خدا اور مذہب کے مخالف ہیں کیوں کہ وہ ذہنی غلامی کے سبب ہیں۔ دوسرے حکومت کے مخالف ہیں کیوں کہ یہ جسمانی غلامی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کو جنت کا لالچ' جہنم کا خوف یا قانون کا ڈنڈا دکھا کر اچھے کام کی تحریک دینا غلط ہے۔ ویسے بھی انسان جیسے اعلیٰ درجہ کے جانور کی یہ بے عزتی ہے۔ آزادی سے علم حاصل کر کے اپنی خواہشات کے مطابق کام کریں اور مسرت آمیز ماحول میں زندگی بسر کریں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اسے پہلے کی جنگلی حالت میں رکھنا چاہتے ہیں' جس طرح ہم ابتدا میں تھے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اس وقت جہالت تھی۔ انسان زیادہ دور تک نہیں جا سکتا تھا لیکن اب مکمل علم سے دنیا میں تعلقات قائم کرتے ہوئے بھی وہ آزاد رہے۔ دولت کا لالچ نہ ہو اور دولت کا سوال بھی ختم کر دیا جائے۔

آئندہ مضمون میں ہم اس فلسفہ سے متعلق کچھ دیگر باتیں' مختلف نوعیت کے نظریات' تواریخ اور اس کے بدنام ہونے کے اسباب اور اس میں تشدد بھی شامل ہونے کے بارے میں لکھیں گے۔

– جون 1928

نراجیت۔3

گزشتہ دو مضامین میں ہم نے نراجیت سے متعلق عام حقائق بیان کئے تھے۔ ایسے اہم موضوع پر جو کہ دنیا کے قدیم خیالات اور روایات کے خلاف نیا نیا ہی سامنے آیا' اتنے مختصر مضمون سے قارئین کے تجسس کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح متعدد شبہات جنم لیتے ہیں۔ پھر بھی ہم موٹے موٹے اصول قارئین کے سامنے رکھ رہے ہیں' جن سے کہ وہ ان کی موٹی موٹی باتیں سمجھ چکے ہوں گے۔ اب ہم اسی طرح کمیونزم' سوشلزم اور ناش واد جیسے اصولوں پر لکھیں گے تاکہ ہندوستان بھی سمجھ سکے کہ غیر

ممالک میں کون کون سے نظریات رائج ہیں مگر دیگر کسی موضوع پر لکھنے سے قبل نراجیت کے تعلق سے بہت سی اہم اور دلچسپ باتیں لکھنے کا خیال ہے جس میں ناش واد کی تاریخ بھی ہے یعنی نراجیت پھیلانے والوں نے اب تک کیا کیا؟ وہ کس طرح بدنام کیئے گیئے؟

اوپر ہم نے ان کے خیالات بتائے ہیں۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے ان نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کیا کیا اور کس طرح وہ طاقت کا استعمال کر کے بہت مضبوط حکومتوں سے ٹکرا جاتے تھے۔ اور اس تصادم میں جان تک کی بازی لگا دیتے تھے۔

دراصل جب ظلم و استحصال حد سے زیادہ ہو جائے' جب پر امن اور کھلے کام کو کچل دیا جائے تب کچھ کرنے والے ہمیشہ خفیہ طور پر کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ظلم و استحصال دیکھتے ہی انتقام کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ یوروپ میں جب غریب مزدوروں کے ساتھ ظلم و ناانصافی ہو رہی تھی' ان کے ہر قسم کے کاموں کو کچل دیا گیا تھا یا کچلا جا رہا تھا' اس وقت روس کے خوش حال کنبہ کے مائیکل بکینن کو جو روس کے توپ خانہ میں ایک بڑے آفیسر تھے' پولینڈ کی بغاوت سے نپٹنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وہاں باغیوں کو جس طرح ظلم کر کے دبایا جا رہا تھا' اسے دیکھ کر ان کا دل ایک دم بدل گیا اور وہ عہد ساز بن گئے۔ بالآخر ان کے نظریات مائل بہ نراجیت ہو گئے۔ انہوں نے 1834 میں نوکری چھوڑ دی۔ بعد ازاں برلن اور سوئٹزرلینڈ کے راستے پیرس پہنچے۔ اس وقت عام طور پر حکومتیں ان کے خیالات کے سبب ان کی مخالف تھیں۔ 1864 تک وہ اپنے خیالات پختہ کرتے رہے اور مزدوروں میں پرچار کرتے رہے۔

بعد میں انہوں نے قومی مزدور کانگریس پر قبضہ کر لیا اور 1860 سے 1870 تک وہ اپنے گروپ کو منظم کرتے رہے۔ 4 ستمبر 1870 میں پیرس میں تیسری پنچایتی رائے قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ فرانس میں کئی مقامات پر سرمایہ دار سرکار کے خلاف لڑائیاں اور بغاوت ہوئی۔ لیون شہر میں بغاوت بھڑکی' اس میں بکینن شامل ہوئے۔ ان کا پلڑا ہی بھاری رہا۔ کچھ دنوں بعد وہاں ان کی ہار ہو گئی اور وہ وہاں سے لوٹ آئے۔

1873 میں ہسپانیہ میں بغاوت ہو گئی۔ اس میں شامل ہو کر یہ لڑے۔ کچھ دن تک تو معاملہ خوب گرم رہا لیکن آخر میں وہاں بھی ہار ہوئی۔ وہاں سے لوٹے تو اٹلی میں بغاوت جاری تھی۔ وہاں جا کر انہوں نے جنگ کی باگ ڈور ہاتھ میں لے لی۔ گیری بالڈی بھی کچھ اختلاف کے بعد ان کے ساتھ مل گئے تھے۔ کچھ دنوں کے فساد کے بعد وہاں بھی ہار ہو گئی۔ اس طرح ان کی ساری زندگی لڑائی جھگڑے میں گزر گئی۔ آخر میں جب وہ بوڑھے ہو گئے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو خط لکھے کہ اب میں اپنے ہاتھوں سے قیادت کی باگ دوڑ چھوڑتا ہوں تا کہ کام میں رکاوٹ نہ پڑے۔ آخر میں جولائی 1876 میں بیماری کی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔

بعد میں بہت طاقت ور چار لوگ اس کام کے لئے کمر کس کر تیار ہوئے۔ وہ تھے کارلو کیفیئرس' اٹلی کے رہنے والے بہت خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسرے مالاٹیسٹا۔ وہ بڑے دانشور ڈاکٹر تھے۔ لیکن آپ سب کچھ چھوڑ کر عہد ساز بن گئے۔ تیسرے پال برسی بھی بہت مشہور ڈاکٹر تھے۔ آپ بھی اسی کام میں منہمک ہو گئے۔ چوتھے تھے پیٹر کروپاٹکن۔ آپ روسی خاندان سے تھے۔ کئی بار مذاق میں کہا جاتا تھا کہ اصل میں آپ کو ہی 'زار' بننا تھا۔ آپ بھی بکینن کے معتقد تھے۔ آپ نے کہا کہ ہم زبان سے بہت پرچار کر چکے لیکن کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نئے نئے نظریات سن کر تھک گئے ہیں۔ عوام پر کچھ بھی اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے اب عملی طور پر پروپیگنڈہ شروع کیا جائے۔ کروپاٹکن نے کہا:

" A single deed makes more propaganda in a few days than a thousand pamphlets. The Government defends itself. It rages pitilessly, but by this it only caused further deeds to be. committed by one or more persons and drives the insurgents to hoeroism. One deed bringsforth another, opponents join the mutiny, the Government splits into fractions, harshness intensifies the conflict, concessions come too late, the revolution breaks out."

یعنی ایک ہی عملی کام ہزاروں کتابوں اور میگزینوں سے زیادہ شہرت دلا دیتا ہے۔ حکومت خود اپنی حفاظت کرتی ہے۔ اسے غصہ آتا ہے' حسد ہوتا ہے اور وہ مظالم کرتی ہے۔ کئی لوگ تھک ہار کر انتقام کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ پھر کبھی ٹھیک اسی طرح کے کام ہوتے ہیں تو انہیں شہید کر دیا جاتا ہے۔ مخالفین بھی آ کر شامل ہوجاتے ہیں۔ حکومت تڑپتی ہے۔ آپس میں ان کی نوک جھونک ہونے لگتی ہے۔ عوام کی شرائط تسلیم کرنے میں بلاوجہ تاخیر ہوجاتی ہے اور انقلاب کی جنگ شروع ہوجاتی ہے۔ یہ خیالات کا منظر آپ کے سامنے رکھا گیا ہے۔ پیٹر کروپاٹکن روسی عہد سازوں میں سے تھے۔ گرفتاری کے بعد پیٹر پال نامی قلعہ میں قیدی بنا دیئے گئے تھے۔ اس سخت جیل سے یہ فرار ہوگئے اور یوروپ میں جا کر اپنے نظریات کی تبلیغ کرنے لگے۔ مذکورہ بالا باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ان کی ذہنی حالت کیا تھی۔

سب سے پہلے انہوں نے برن نامی شہر میں (فرانس میں) مزدوروں کے اقتدار کے قیام والے دن کی سالگرہ منائی۔ یہ بات 18 مارچ 1876 کی ہے۔ اس دن انہوں نے مزدوروں کا جلوس نکالا اور بازار میں پولیس سے ہاتھا پائی بھی کر بیٹھے۔ جب سپاہیوں نے ان کے لال جھنڈے کو اکھاڑنے کی کوشش کی تب بہت بڑا فساد ہوگیا۔ متعدد سپاہی بہت بری طرح زخمی ہوئے۔ بالآخر یہ بھی گرفتار ہوئے اور دس سے چالیس دنوں تک قید کی سزا ہوئی۔

ادھر اپریل ماہ میں اٹلی میں کسانوں کو اکسا کر متعدد مقامات پر بغاوتیں کر دی گئیں۔ وہاں بھی ان کے ساتھی گرفتار ہوئے' جس میں سے اکثر بری ہوگئے۔ اب اسی طرح سے پروپیگنڈہ کرنے کا ان کا خیال تھا' اس لئے وہ کہا کرتے تھے۔

Neither money nor organisations nor literature was needed any longer (for their propaganda work). One human being in revolt with torch or dynamite was off to instruct the world."

یعنی پروپیگنڈہ کے لئے نہ تو دولت کی ضرورت ہے' نہ بڑی بڑی کتابوں کی اور نہ ہی بہت بڑی تنظیم کی۔ کوئی بھی ایک آدمی' جس نے ہاتھ میں مشعل پکڑ رکھی ہو' جس سے وہ آگ لگا سکے یا ڈائنامائٹ ہو' جس سے وہ ایک بار مکانوں اور ایسے انسانوں کو اڑا سکے' ساری دنیا کو اپنی حسب منشا تعلیم دے سکتا ہے۔

آئندہ برس 1868 سے بس ایسے کاموں نے زور پکڑلیا۔ برلن میں اٹلی کا بادشاہ ہمبرٹ جب اپنی بیٹی کے ساتھ موٹر کار میں جا رہا تھا' تب اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ شہنشاہ ولیم کو ایک عام نوجوان نے گولی ماردی۔ تین ہفتہ بعد ڈاکٹر کارل نوولنگ نے ایک بار کھڑکی میں سے شہنشاہ پر گولی چلادی۔ جرمنی میں اس وقت غریب مزدوروں کی تقریروں کو بڑی بے دردی کے ساتھ کچلا جا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک دن میٹنگ کر کے فیصلہ کیا گیا کہ جیسے بھی ہو' اس ناانصاف سرمایہ دار طبقہ اور اس کی معاون حکومت اور پولیس وغیرہ کو خوف زدہ کیا جائے۔

15 دسمبر 1883 میں ولیریڈ فلوڈسورف میں الہیق نامی ایک بدنام زمانہ پولیس افسر کو قتل کر دیا گیا۔ 23 جون

1884 میں روجیٹ کو اسی الزام میں پھانسی دے دی گئی۔ اگلے ہی دن اس کے بدلے بلیبک' پولیس آفیسر کا قتل کر دیا گیا۔ آسٹریلیا کی حکومت غصہ میں آ گئی اور ویانا میں پولیس نے زبردست گھیرابندی کر کے ان کے کئی افراد کو گرفتار کر لیا اور دو کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ ادھر لیون میں ہڑتالیں ہوئیں۔ ایک ہڑتالی فرنیئر نے اپنے سرمایہ دار مالک کو گولی مار دی۔ اس کی استقبالیہ تقریب میں ایک پستول بطور تحفہ دی گئی۔ 1888 میں وہاں بڑی افراتفری مچی تھی اور ریشم کے مزدور بھوکوں مر رہے تھے۔ سرمایہ داروں کے اخبار مالکان اور ان کے دیگر صاحب ثروت رفقاء ایک جگہ عیش کرنے میں مصروف تھے۔ وہیں ایک بم پھینک دیا گیا۔ امیر لوگ کانپ گئے۔ 60 نراجیت حامی گرفتار ہوئے۔ ان میں سے محض تین ہی بری کیے گئے لیکن پھر بھی اصلی بم پھینکنے والے کو کافی تلاش کیا جاتا رہا۔ آخر میں وہ پکڑا گیا اور تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ بس اسی طرح ان کے خیالات کو نقش راہ بنا کر کام چل پڑا۔ پھر تو جہاں بھی ہڑتالیں ہوتیں' وہیں قتل بھی ہو جاتا۔ ان باتوں کا ذمہ دار بھی نراجیت کے حامیوں کو ہی قرار دیا جاتا' اس لئے اس نام سے ہی لوگ تھر تھر کانپنے لگے۔

ادھر نراجیت کا حامی ایک جرمن جان موسٹ' جو پہلے دفتری کا کام کرتا تھا' 1882 میں امریکہ جا پہنچا۔ اس نے بھی یہ خیال عوام کے سامنے رکھنا شروع کیا۔ وہ بہت عمدہ تقریر کرتا تھا۔ اس کا امریکہ میں بہت اثر پڑا۔ 1886 میں شکاگو وغیرہ میں بہت سی ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ ایک کاغذ کارخانہ کے مزدوروں میں ایک نراجی اسپائز وعظ کر رہا تھا۔ کارخانہ مالکوں نے اسے بند کرنے کی کوشش کی۔ وہاں لڑائی ہو گئی۔ پولیس بلائی گئی' جس نے آتے ہی گولی چلا دی۔ چھ آدمی مارے گئے اور متعدد زخمی ہوئے۔ اسپائز کو غصہ آیا۔ اس نے خود جا کر ایک نوٹس کمپوز کر کے شائع کر دیا کہ مزدوروں کو مل کر اپنے معصوم بھائیوں کے خون کا بدلہ لینا چاہئے۔ اگلے دن 4 مئی 1886 میں 'ہے مارکیٹ' میں جلسہ تھا۔ صدر شہر اسے دیکھنے آیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں کوئی قابل اعتراض باتیں نہیں ہو رہی ہیں۔ وہ چلا گیا۔ بعد میں پولیس نے آ کر آگے پیچھے دیکھے بغیر مار پیٹ شروع کر دی اور کہا کہ جلسہ بند کرو۔ تبھی ایک بم پولیس والوں پر پھینکا گیا جس کے ساتھ ہی بہت سے پولیس والے مارے گئے۔ کئی لوگوں کو گرفتار کر کے پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ جاتے جاتے ان میں سے ایک شخص نے کہا 'میں پھر کہتا ہوں' میں حالیہ نظام کا سخت مخالف ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اس حکومت کو نیست و نابود کر دیں اور خود حکومت کا استعمال کریں۔ آپ شاید ہنسیں کہ میں اب بم نہیں پھینک سکوں گا لیکن میں بتاتا ہوں کہ تمہارے مظالم نے سبھی مزدوروں کو بم رکھنے اور چلانے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ جان لو کہ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ مجھے پھانسی ہونے پر اور بھی کئی آدمی پیدا ہو جائیں گے۔ میں تمہیں نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں اور تمہاری حکومت کو نیست و نابود کر دینا چاہتا ہوں۔ مجھے پھانسی پر چڑھا دو'۔ خیر اس طرح کے بہت سے واقعات ہوتے رہے لیکن ایک دو مشہور واقعہ اور ہوئے۔ امریکہ کے صدر میکنل پر گولی چلائی گئی اور پھر اسٹیل کمپنی میں ہڑتال ہوئی۔ یہاں مزدوروں پر ظلم ڈھائے جا رہے تھے۔ اس کے مالک ہینری سی فریکو کو الیگزینڈر نامی نراجی نے گولی مار کر زخمی کر دیا' جسے تاحیات قید کی سزا دی گئی۔ خیر' اسی طرح امریکہ میں بھی نراجیت کا پرچار اور اس پر عمل ہونے لگا۔

ادھر یوروپ میں بھی اندھیر مچی ہوئی تھی۔ پولیس اور سرکار کے ساتھ ان نراج حامیوں کا تنازعہ بڑھ گیا۔ بالآخر ایک دن ویلیاں نامی نوجوان نے اسمبلی میں بم پھینک دیا لیکن ایک عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا' نتیجتاً کچھ ڈپٹیوں کے زخمی ہونے کے علاوہ کچھ خاص نہیں ہوا۔ اس نے بہت بلند آواز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا "It takes a loud vioce to make the deaf hear." یعنی بہروں کو سنانے کے لئے بلند آواز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب تم مجھے سزا دو گے' لیکن مجھے اس کا کوئی خوف نہیں کیوں کہ میں نے تمہارے دل کو چوٹ پہنچائی ہے۔ تم جو کہ غریبوں پر مظالم کرتے ہو اور محنت

کرنے والے بھوکوں مرتے ہیں اور تم ان کا خون چوس چوس کر عیش کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں چوٹ ماری ہے۔ اب تمہاری باری ہے۔

اس کے لئے بہت سی اپیلیں کی گئیں۔ سب سے زیادہ زخم خوردہ اسمبلی کے ممبر نے بھی جیوری سے کہا کہ اس پر رحم کیا جائے' لیکن کارنیٹ نامی صدر کی جیوری نے ان کی باتوں کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اسے پھانسی کی سزا دے دی۔ بعد میں ایک اطالوی لڑکے نے ایک چھری کارنیٹ کے پار کر دی' جس پر ویلیعٹ کا نام لکھا ہوا تھا۔

اسی طرح انتہائی مظالم سے تنگ آ کر اسپین میں بھی بم چلے اور آخر کار ایک اطالوی نے وزیر کو مار ڈالا۔ اسی طرح یونان کے بادشاہ' آسٹریا کی ملکہ پر بھی حملے کئے گئے۔ 1900 میں گیعانے بریسی نے اٹلی کے بادشاہ ہربرٹ کو مار ڈالا۔ اسی طرح وہ لوگ غریبوں کی خاطر اپنی زندگی کو ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھاتے رہے۔..... اس لئے ان کے مخالفین بھی ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کے آخری شہیدوں ساکو اور وینجٹی کو بھی گزشتہ سال پھانسی ہوئی۔ وہ جس دلیری اور بہادری سے تختہ دار پر لٹکے سب جانتے ہیں۔ بس یہی مختصر تاریخ ہے نراجیت اور اس کے کاموں کی۔ اگلی بار کمیونزم کے بارے میں لکھیں گے۔

جولائی 1928–

روس کے عہد ساز تخریب پسند

1928

روس میں ایک بہت بڑے تخریب پسند گزرے ہیں ایوان ترگنیو۔ انہوں نے 1862 میں ایک ناول لکھا' باپ اور بیٹا'۔ اس ناول کی اشاعت پر بہت واویلا مچا کیوں کہ اس میں نوجوانوں کے جدید خیالات کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ سب سے پہلے ترگنیو نے ہی' تخریب پسند' لفظ کا استعمال کیا۔ تخریب پسند کا مطلب ہے کچھ بھی نہ ماننے والا۔ (بالکل کچھ بھی نہیں)' لفظی مفہوم ہے' جو کچھ بھی نہ مانے۔ لیکن حقیقت میں یہ لوگ عوام کے قدیم رسم و رواج اور بدعتوں کے مخالف تھے۔ یہ لوگ ملک کی ذہنی غلامی سے تھک گئے تھے' اس لئے انہوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ انہوں نے صرف کہا ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی کر دکھایا۔ ترگنیو کہتے ہیں کہ میرے ناول کا ہیرو کوئی تصوراتی جانور نہیں ہے مگر وہ واقعی ایسے خیالات کا تھا اور ایسے خیالات کا پروپیگنڈہ عام طور پر ہونے لگا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن مجھے غسل آفتابی (دھوپ سینکتے ہوئے) کرتے وقت اس ناول کا خیال آیا اور اس کی تھوڑی سی توسیع کر کے ناول لکھ ڈالا۔ اس کا ہیرو بجاروف ہے۔ وہ مرتدوں جیسا ہے' قدیم باتوں کا بہت مخالف ہے۔ اسے منہ دیکھی جی حضوری نہیں بھاتی۔ وہ بہت منہ زور ہے اور جو کہتا ہے' وہ کرتا ہے۔ وہ ہر بات منہ پر صاف صاف کہہ دیتا ہے' اسی لئے کئی بار وہ بڑا اکھڑ سا لگتا ہے۔ وہ شاعری کا مخالف ہے۔ موسیقی تک کو ناپسند کرتا ہے۔ لیکن وہ آزادی سے پیار کرنے والا ہے۔ عام لوگوں کی آزادی کا بہت بڑا حامی ہے۔ وہ جوان دنوں انسانی فطرت بنی ہوئی تھی' اس کے برعکس لڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

حقیقی تخریب پسندی اس تصویر سے ذرا مختلف ہے یعنی ان میں ذرا سا فرق ہے کیوں کہ ناول کا ہیرو تھوڑی سی حقیقت کے ساتھ تصوراتی ہے۔ حقیقی تخریب پسندی کی تصویر کچھ مختلف طرح کی ابھرتی ہے۔

"The Nihilism of 1861- aphilosophical system especially dealing with

what Mr. Herbert Spencer would call religious, governmental and social fetishism."

روسی عہد ساز پرنس کروپاٹکن نے 1861 میں مذکورہ تحریر کردہ الفاظ میں تخریب پسندی کا ذکر کیا گیا ہے' جس کا مطلب ہے کہ تخریب پسندی اس وقت محض ایک فلسفہ تھا جو کہ مذہبی کج عقیدگی' سماجی ناانصافی' نفرت اور حکومت کی غنڈہ گردی کے پس منظر میں تھا اور ان اشیاء کے لئے جو اندھ وشواس پیدا ہو گیا تھا' اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا تھا۔ اصل میں اس وقت کے حالات سے تنگ آ کر وہ نوجوان میدان میں کود پڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں پچھلی تمام باتوں کو مکمل طور پر مسترد کر دینا چاہئے۔ آگے کیا ہونا چاہئے یا کیا ہوگا' اس کا صحیح صحیح جواب نہ دیتے ہوئے بھی وہ یقین کرتے تھے کہ وہ ایک بڑی خوب صورت دنیا کی تعمیر کر سکیں گے۔

"Nihilism was destrutive because it wanted a wholesale destruction but with a pleasure of building up."

یعنی تخریب پسند تباہی و بربادی یا تخریبی خیالات رکھتے تھے کیوں کہ وہ پچھلی یا پرانی باتوں کے مخالف اور ان کی بربادی کے خواہاں تھے۔ لیکن پھر بھی اس تخریب کے بعد بہت خوب صورت چیزوں کی تعمیر کی امید تھی۔

آہستہ آہستہ ان باتوں کا پروپیگنڈہ بڑھتا گیا اور عام نوجوانوں میں بھی یہ نظریہ گھر کرنے لگا۔ وہ چاہتے تھے...... To liberate the people from the chains of tradition and autocracy of the Czar." یعنی عوام کو پرانے رسم و رواج اور زار کی بادشاہت سے نجات دلائی جائے۔

ان دنوں ان کا پروگرام ان باتوں کی تشہیر ہی تھی۔ حالات بدل گئے۔ انہیں دنوں غلام بھی آزاد کئے گئے تھے' لیکن ان میں سے زیادہ تر کو زمینیں نہیں دی گئی تھیں' جس پر وہ محنت کر کے کچھ فائدہ اٹھا سکتے تھے یا کم سے کم بھکمری سے بچ سکتے۔ جو تھوڑی بہت زمین انہیں ملی تھی' اسی پر محصول اتنا زیادہ لگا کہ لوگ بھوکوں مرنے لگے اور 1867 میں بہت بھیانک قحط پڑا۔ اس وقت حکومت کا انتظام بہت زیادہ خراب تھا۔ اتنے مظالم ہوتے تھے کہ عوام تنگ آ گئے تھے۔ دستسکی اور کی آڈٹ کو وسکی' جنہیں 1880 میں پھانسی دے دی گئی تھی' اولین سرکاری ملازم تھے۔ اس طرح دوسرے متعدد جانے مانے اور مشہور حکام یہاں تک کہ جج بھی تنگ آ کر عہد ساز بن گئے۔

ادھر ان پر مظالم کی انتہا ہو گئی۔ لڑکوں میں اچھی اچھی باتوں کا پروپیگنڈہ نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ کچھ ایسی کمیٹیاں بنی ہوئی تھیں جو کہ سبھی اچھی اچھی کتابیں ناشروں سے لے کر مفت تقسیم کر دیتے یا محض لاگت کی قیمت پر فروخت کر دیتے۔ یہ سبھی کتابیں سرکاری ممبران سے منظور شدہ ہوتی تھیں۔ لیکن جب حکومت نے دیکھا کہ یہ تو پروپیگنڈہ کے لئے استعمال ہوتی ہیں تو انہوں نے ان کتابوں کے ناشر اور تقسیم کار کو تباہ کرنے کا عزم کیا اور ان پر ہر قسم کے ظلم کرنے شروع کر دیئے۔ 1861 سے 1870 تک ہر ممکن اور جائز طریقہ سے عوام کے حالات سدھارنے اور سرکار کو صحیح راستے پر لانے کی کوشش کی گئی لیکن کچھ بھی اثر نہ پڑا۔

ایسے حالات میں کافی لوگ تو ہاتھ پر ہاتھ رکھے کسی ایسے وقت کے منتظر تھے کہ خود ہی حالات بہتر ہوں گے۔ کیسے بہتر ہوں گے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ خدا کا ہی بھروسہ کئے بیٹھے رہے۔ لیکن نوجوانوں کے دلوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ ان کے دلوں میں خدا کا یقین مزید نہیں بچا تھا۔ چپ چاپ' بغیر کچھ کئے خالی بیٹھنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔

پرنس کروپاٹکن اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

Thereare periods when some generations are penetrated with the noblest feelings of altruism and self -sacrifice, when life becomes utterly impossible- morally and physically impossible...... for the man and woman who feels that he is not doing duty, and and so it was with the youth in Russia."

یعنی کبھی کبھی ایسا وقت آ جاتا ہے کہ جب عام لوگوں میں عوامی خدمات کا جذبہ زور پکڑتا ہے۔ تب ان مرد و خواتین کا زندہ رہنا دشوار ہو جاتا ہے جو یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ اپنے فرائض پورے نہیں کر رہے ہیں۔ یہی حالت اس وقت روس کی ہو گئی تھی۔ ضعیف العمر تو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے لیکن نوجوانوں کے دلوں میں شعلہ بھڑک اٹھا۔

1871 میں بہت سے نوجوان اور لڑکیاں مغربی یوروپ بھاگ گئے تھے۔ وہاں وہ علم حاصل کرتے تھے۔ زیادہ تر سوئٹزر لینڈ میں۔ انہیں اپنے ملک آنے کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ لوگ نئے کمیونزم یا اشتراکیت کے نظریات لے کر آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی جو پروپیگنڈہ شروع کیا' تو زار نے فوراً سب کو گرفتار کر لیا اور انہیں زبردستی سائبریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ کام نے خفیہ شکل اختیار کر لی۔

اس وقت تین پارٹیاں کام کر رہی تھیں۔ ان کے لیڈر چیرنیشوسکی' ہمشوٹن اور نیچائف تھے۔ پہلے آواز سنائی دیتی تھی کہ عوام کے ساتھ ہونا چاہئے یعنی عوام سے ہمدردی رکھنی چاہئے اور انہیں اوپر اٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن اب نئی آواز اٹھی کہ عوام بن جاؤ' عوام کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ اس آواز کے بلند ہوتے ہی قربانیوں کی ایسی ایسی نظیریں ملتی ہیں کہ ابھی تک کرۂ ارض پر اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

لیکن پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ آواز آخر کیوں اٹھی؟ پرنس کروپاٹکن نے لکھا ہے: -"Until of late however the peasant has always regarded the man wears broad cloth and neither ploughs nor hewss nor hammers not digs side by side with him as an enemy. We wanted faith and love from him; and to obtain them it was necessary to live their life."

یعنی اس وقت تک روسی کسان کبھی ایسے آدمی کو' جس نے ڈھیلا ڈھالا کپڑا پہنا ہو اور جنہیں نہ تو ہل چلانا آتا ہو اور نہ کلہاڑی جن کے ہاتھوں میں ہتھوڑا چلانے سے کبھی چھالے نہ پڑے ہوں اور جس نے کبھی فصل اگائی اور کاٹی نہ ہو' اسے اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ لیکن ہمیں ان کی ہمدردی اور اعتماد چاہئے تھا۔ اس لئے ان کے پاس آنے کی ضرورت تھی۔ ان کے ساتھ محنت کرنے اور رہنے کی ضرورت تھی۔

آہا! آج ہم ہندوستان کو آزاد کرانے کی بہت لمبی چوڑی باتیں کرتے ہیں لیکن کتنے آدمی اس طرح قربانی دینے کو تیار ہیں؟ کتنے اپنے شہروں کو چھوڑ کر گاؤں میں کسانوں کی طرح گندگی میں زندگی گزارنے کے لئے تیار ہوں گے؟ وہاں تو عجیب حالات بن گئے ہیں۔

نوجوان اپنے کالج' اسکول' اپنی پلاٹون اور کرسیوں کو چھوڑ کر آئے اور کسان لوہار کا کام سیکھ کر گاؤں کی جانب چل پڑے۔ یہ کتنا بڑا تیاگ ہے۔ بڑے بڑے خوش حال خاندانوں کی نازوں سے پلی نازک لڑکیاں کارخانوں میں مزدوری

کرنے کے لئے چل پڑیں۔ دیگر مزدوروں کی طرح اندھیری کوٹھریوں میں سوتیں' سولہ سولہ گھنٹے مشین پر کام کرتیں' ننگے پیر ندی سے گھر میں پانی لاتیں۔

بس' ایک ہی لگن' ایک ہی دھن میں مست۔ ان غریب مزدوروں کو ان کے برے حالات سے واقف کرانا اور اس کا علاج بتانا ہے۔ یہ کتنی بڑی قربانی ہے۔ لڑکیوں نے تو حد درجہ کا کام کیا۔ روسی عہد سازوں کی دادی اماں کہلانے والی مسز کیتھرائن ایک خوش حال اور خوب صورت خاتون تھیں۔ وہ بھی ان میں شامل ہوگئیں۔ پہلے اپنی خوب صورتی کو تیزاب ڈال کر جلا ڈالا اور داغ دار چہرہ بنا کر بدصورت بن گئیں تاکہ خوب صورتی عوام کے کام میں رکاوٹ نہ بنے۔ اوہ! آج ایسی قربانی کرنے کا حوصلہ کتنے ہندوستانیوں میں موجود ہے۔ روس میں نوجوان لڑکے لڑکیاں گھروں سے بھاگ جاتے ہیں اور انہی کاموں میں زندگی گزار دیتے تھے۔ لیکن آج ہندوستان میں کتنے نوجوان ہیں جو ملک کو آزاد کرانے کے مقصد کے تئیں دیوانہ وار پھر رہے ہوں؟ چاروں طرف بہت عقل مند لوگ نظر آتے ہیں لیکن ہر ایک کو اپنی زندگی پرامن گزارنے کی فکر ہے۔ تب ہم اپنے حالات' ملک کے حالات میں اصلاح کی کیا امید رکھیں؟ پچھلی صدی کے آخری دور میں روسی نوجوانوں نے اس طرح پروپیگنڈہ کے کاموں میں زندگی گزاری۔ لڑکیوں کو گھروں سے نکال لانے کی خوب صورت داستانیں مشہور ہیں۔

سونیا ایک پادری کی لڑکی تھی۔ اس کے اسکول میں عہد ساز خواتین پڑھانے والوں میں حال ہی میں شامل ہوئی تھی۔ ان کا مقصد سن کر سونیا کے دل میں بھی ملک کی خدمت کا جذبہ زور پکڑنے لگا۔ ایک دن وہ گھر سے بھاگ گئی۔ لیکن کچھ دنوں بعد والد نے آکر پکڑ لیا۔ تب پادری نے گھر سے نجات دلانے کا بندوبست کیا۔ ایک نوجوان اس کا عاشق بن کر اس کے گھر گیا اور اس کے والد کو منا کر اس سے شادی کرلی۔ کہانی بہت دلچسپ ہے اور 'روس کے ہیرو اور ہیروئن' کتاب میں شائع ہوئی ہے۔ کبھی موقع ملا تو وہ کہانی بھی قارئین کے سامنے رکھیں گے۔ خیر' فی الحال قارئین مختصراً سمجھ لیں کہ کس طرح روس میں کام ہو رہے تھے۔

پہلے تو کام کھلے طور پر شروع کیا گیا۔ لیکن پھر سرکار نے مظالم ڈھا کر پکڑ دھکڑ کر کے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو سائبیریائی جیل بھیج دیا۔ بغیر وارنٹ ہزاروں لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ چار پانچ برس تک وہ تاریک کوٹھریوں میں بند رکھے گئے۔ ہزاروں مقدموں میں سے ایک 'ٹرائل آف دی ہنڈریڈ نائنٹی تھری' نام سے مشہور ہے۔ مختصراً حکومتی اعداد و شمار کے مطابق ہزاروں لوگوں کو گرفتار کیا گیا اور انہیں جیلوں کی تاریک وتنگ اور سیلن بھری کوٹھریوں میں کافی دنوں تک بند رکھا گیا۔ ان میں سے تین سو لوگوں کو بہت دنوں تک قیدی بنا کر رکھا گیا۔ اس طرح دیگر لوگوں نے بھی مرنے کی کوشش کی۔ 193 پر مقدمہ چلا' انتہائی غیر منصف عدالت نے عام شواہد کی بنیاد پر ہی دس دس برس کی سزا صرف اس لئے دی کہ وہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے۔ ان میں سے 90 کو بری کر دیا گیا اور باقی کو سات تا دس سال قید کی سزا سنائی اور بعد میں تاحیات سائبریا کی جلاوطنی۔ ایک دیگر مقدمہ میں ایک خاتون کو نو دس سال کی سخت سزا محض اس الزام میں ہوئی کہ اس نے ایک مزدور کو اشتراکی نظریات پر مبنی ایک پرچہ دیا تھا۔

اس طرح ظلم ہوتے دیکھ کر کام پہلے سے بھی زیادہ خفیہ طور پر اور غور و فکر کے بعد ہونے لگا۔ ساتھ ہی انتقام کا جذبہ رکھنے والے بھی سرگرم ہوا ٹھے۔ کچھ خفیہ کمینے افسران جسے بھی چاہتے' پکڑتے اور جلاوطن کر دیتے۔ اس سے اسے تو انعام مل جاتا لیکن نوجوانوں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔

کہا تو یہ جاتا ہے کہ وہ 16 راپریل 1899 میں جس کار کوزف نے زار پر گولی چلائی تھی' وہ بھی تخریب پسندوں کا ہی کام

تھا اور ایک پولش نوجوان بیریجو وسکی بھی جس نے آئندہ سال زار پر پیرس میں گولی چلائی تھی اس پارٹی کا ممبر تھا۔ لیکن موجودہ حالات میں کروپاٹکن نے لکھا ہے کہ ہمارے ابتدائی کام میں زار جتنا محفوظ تھا اتنا کبھی نہیں رہا ہوگا۔ یہ تو ہار کر آخر میں طاقت کے استعمال پر مجبور ہوئے۔ انہوں نے پہلے ہمیشہ زار کو بچانے کی کوششیں کی۔ ایک بار جب کئی نوجوان زار کو مارنے سینٹ پیٹرس برگ پہنچے تو اس پارٹی والوں نے ہی انہیں اس کام سے روک دیا۔

لیکن بعد میں کام تو زوروں پر چل پڑا۔ 1879 میں ملزم قیدیوں میں سے ایک کو جن پر ابھی مقدمہ چلا تھا بیت لگائے گئے کیوں کہ اس نے اٹھ کر پولیس آفیسر کو سلام نہیں کیا اور باقی قیدیوں کو جنہوں نے اس کی حمایت کی تھی جنرل ٹریپوف کے حکم کے مطابق بری طرح مارا پیٹا گیا۔ اس پر ایک بہادر لڑکی ویرا جسولچ نے جنرل ٹریپوف پر گولی چلادی۔ وہ مرا تو نہیں لیکن لڑکی پر مقدمہ چلا۔ وہ بری کردی گئی۔ پولیس نے پھر اسے پکڑنا چاہا لیکن عوام اسے چھین کر لے گئی۔

جب روسی انقلابیوں نے دیکھا کہ ان کی کوئی مدد نہیں کرتا ان کی حفاظت کے لئے کوئی قانون نہیں ہے تب سے انہوں نے خود ہی اپنی حفاظت کرنی شروع کردی۔ پولیس صبح صبح لوگوں کے گھر کی گھیرابندی کرلیتی خواتین تک کے کپڑے اتار کر سپاہی ان کی تلاشی لیتے۔ لوگ بہت تنگ آگئے۔ کچھ یہ بھی کہنے لگے کہ دیگر ممالک میں تو ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہم بھی یہ نہیں ہونے دیں گے۔ سب سے پہلے اڈیسہ میں کوولسکی نے یہ کام کیا۔ اس نے پولیس کے ساتھ ٹکر لی۔ مظالم مزید بڑھے۔ لیکن پھر کیا تھا ردعمل کا آغاز ہوگیا۔ حفاظت کے لئے طاقت کا استعمال مناسب سمجھا جانے لگا۔ پہلے پانچ پھر تین خفیہ آفیسر قتل کردیئے گئے جن کے بدلے میں سترہ نوجوانوں کو پھانسی دی گئی۔ بس پھر تو انتقام اور پھانسی دینے کا یہ نیا سلسلہ چل پڑا۔

1879 میں تو تخریب پسندی کا مطلب بم اور پستول چلانا ہی ہوگیا۔ تنگ آکر زار نے بھی انہیں ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کرلیا۔

بس پھر کیا تھا سبھی اس کام میں مصروف ہوگئے۔ 14 اپریل 1879 کو شولوویوف نے زار پر گولی چلادی لیکن زار بچ گیا۔ اسی سال زار کے ونٹر پیلیس یعنی "شرد محل" کو ڈائنامیٹ سے اڑادیا گیا لیکن تب بھی زار بچ گیا۔ اگلے برس جب زار پیٹرس برگ سے ماسکو جارہا تھا اس کی گاڑی اڑادی گئی۔ گاڑی کے کئی ڈبے اڑ گئے لیکن زار تب بھی بچ گیا۔ 13 مارچ 1881 کو زار اپنے خصوصی دستہ کے ساتھ گھوڑوں کی پریڈ دیکھ کر واپس لوٹ رہا تھا کہ اس پر ایک بم پھینکا گیا۔ بم سے گاڑی ٹوٹ گئی اور زار اتر کر نوکر کے پاس اسے دیکھنے کے لئے جھک کر کہنے لگا "خدا کی مہربانی سے میں بچ گیا"۔ لیکن ایک دیگر نوجوان گری نجک نے آگے بڑھ کر دوسرا بم پھینکتے ہوئے کہا "زار اتنی جلدی خدا کا شکریہ ادا نہ کرو"۔ تبھی بم پھٹا اور زار مرگیا۔ ہزاروں لوگ گرفتار ہوئے۔ متعدد لوگوں کو تختہ دار پر چڑھادیا گیا۔ پانچ افراد کو خاص طور پر سرعام پھانسی دی گئی۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ایک خاتون تھی جس کا نام صوفیہ پروو سکیا تھا۔

اس وقت پارٹی کچھ کمزور پڑگئی پھر دیگر کئی پارٹیاں بن گئیں۔ لیکن تخریب پسند پارٹی کی تاریخ اتنی سی ہے۔ تخریب پسندوں کو لوگوں نے غلط سمجھا اور نراجیت کے حامیوں کی طرح انہیں بھی بدنام کیا۔ ایک انگریزی اخبار نے ایک کارٹون بنایا جس میں تباہ و برباد ہوئی اشیاء میں نہلسٹ بم اور ڈائنامیٹ لئے کھڑے تھے۔ ایک پوچھتا ہے "کیوں جناب کچھ باقی تو نہیں ہے"۔ دوسرا کہتا ہے "دنیا کا گلوب ہی باقی ہے۔ پہلا کہتا ہے "لگا دیتا ہوں ڈائنامیٹ تمہارے اس میں بھی"۔ یہ بڑا غلط بیان ہے۔ آسکر وائلڈ نے ایک ناٹک 'ویرا دی نہلسٹ' لکھا تھا۔ اس میں تخریب پسندوں کی اچھی شبیہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس میں بہت خامیاں ہیں۔ ایک دیگر کتاب 'کیریئر آف اے نہلسٹ' بھی شائع ہوئی تھی۔ یہ قابل مطالعہ ہے۔ اس میں

تخریب پسندوں کے بارے میں صحیح لکھا ہے۔ ہندی میں 'بولشیوک کے کام' اور 'نہلسٹ رہسیہ' شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا کاکوری کے شہید رام پرساد بسمل کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں انہوں نے نہلسٹوں کی بہت دردناک تصویر کشی کی ہے۔ مگر انہیں محض تخریب پسند ہی دکھایا گیا ہے' جو ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اچھے عوامی خدمت گار تھے۔ وہ بہت ایثار پسند اور عوام سے پیار کرنے والے تھے۔ وہ لائق احترام تھے۔

غیر منصفانہ نظم

وہ لوگ جو محل بناتے اور جھونپڑیوں میں رہتے ہیں' وہ لوگ جو خوب صورت اور خوب رو اشیاء بناتے ہیں' خود پرانی اور گندی چٹائیوں پر سوتے ہیں۔ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ یہی حالات اگر ماضی میں رہے ہیں تو مستقبل میں کیوں نہیں تبدیلی آنی چاہیے؟۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کے عوام کی حالت آج سے بہتر ہو تو یہ حالات بدلنے ہوں گے۔ ہمیں ریفارمسٹ بننا ہوگا۔

اگست 1928—

مذہب اور ہماری جدوجہد آزادی

مئی 1928 کے 'کرتی' میں یہ مضمون شائع ہوا۔ امرتسر میں اپریل میں سیاسی کانفرنس اور نوجوان سبھا کی کانفرنس ہوئی تھی' جس میں مذہب کے مسائل پر شہید بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں میں جم کر تبادلہ خیال ہوا۔ یہ مضمون اسی مسئلے پر روشنی ڈالتا ہے۔
آزاد ہندوستان کے عزم کا خاکہ تب کچھ نکھرنا شروع ہو گیا تھا۔ اس مضمون میں عوامی اتحاد قائم کرنے سے متعلق چند واضح مشورے کیئے گئے ہیں۔— مدیر

امرتسر میں 11,12,13 اپریل کو سیاسی کانفرنس ہوئی اور ساتھ ہی نوجوانوں کی کانفرنس بھی ہوئی۔ دو تین سوالوں پر اس میں بڑا تنازعہ اور بحث ہوئی۔ ان میں سے ایک سوال مذہب کا بھی تھا۔ ویسے تو مذہب کا سوال کوئی نہ اٹھاتا' مگر فرقہ پرست تنظیموں کے خلاف تجویز پیش ہوئی اور مذہب کی آڑ لے کر ان تنظیموں کی جانب داری کرنے والوں نے خود کو بچانا چاہا۔ ویسے تو یہ سوال اور کچھ دیر دبا رہتا لیکن اس طرح سامنے آجانے سے کھلے عام گفتگو ہوگئی اور مذہب کے مسئلہ کو حل کرنے کا سوال بھی اٹھا۔ ریاستی کانفرنس کی سبجیکٹ کمیٹی میں بھی مولانا ظفر علی صاحب کے پانچ سات بار خدا خدا کرنے پر صدر پنڈت جواہر لعل نے کہا کہ اس اسٹیج پر آکر خدا خدا نہ کریں۔ آپ مذہب کے مشنری ہیں تو میں لامذہبیت کا مبلغ ہوں۔ بعد میں لاہور میں بھی اسی موضوع پر نوجوان سبھا نے ایک میٹنگ کی۔ کئی تقاریر ہوئیں اور مذہب کے نام کا فائدہ اٹھانے والے اور یہ سوال اٹھ جانے پر تنازعہ اٹھ کھڑا ہونے سے ڈر جانے والے کئی لوگوں نے کئی طرح کے نیک مشورے دیئے۔
سب سے ضروری بات جو بار بار کہی گئی اور جس پر شریمان بھائی امر سنگھ جی جھبال نے خاص طور پر زور دیا' وہ یہ تھی کہ مذہب کے سوال کو چھیڑا ہی نہ جائے۔ بڑی نیک صلاح ہے۔ اگر کسی کا مذہب باہر کے لوگوں کے امن و چین میں خلل انداز نہ

ہوتا تو کسی کو بھی اس کے خلاف آواز اٹھانے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اب تک کا تجربہ کیا بتاتا ہے؟ گزشتہ تحریکات میں بھی مذہب کا یہی سوال اٹھا اور سبھی کو پوری آزادی دے دی گئی۔ یہاں تک کہ کانگریس کے اسٹیج سے بھی آیات اور منتر پڑھے جانے لگے۔ ان دونوں مذہب میں پیچھے رہنے والا کوئی بھی آدمی اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ نتیجتاً قدامت پرستی بڑھنے لگی۔

جو برے نتائج برآمد ہوئے' وہ کس سے چھپے ہوئے ہیں؟ اب محبِ وطن یا آزادی سے پیار کرنے والے لوگ مذہب کی اصلیت سمجھ گئے ہیں اور وہی اسے اپنے راستے کا روڑا سمجھتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ کیا مذہب گھر میں رکھتے ہوئے بھی لوگوں کے دلوں میں تفریق نہیں بڑھاتا؟ کیا اس کا ملک کی مکمل طور پر آزادی حاصل کرنے تک پہنچنے میں کوئی اثر نہیں پڑتا؟ اس وقت مکمل آزادی کے متوالے لوگ مذہب کو دماغی غلامی کا نام دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بچے سے یہ کہنا کہ خدا سب سے طاقت ور ہے' انسان کچھ بھی نہیں' مٹی کا پتلا ہے' بچے کو ہمیشہ کے لئے کمزور بنانا ہے۔ اس کے دل کو طاقت اور اس کے اعتماد کے جذبہ کو ہی ختم کر دینا ہے۔ لیکن اس بات پر بحث نہ بھی کریں اور سیدھے اپنے سامنے رکھے دو سوالوں پر ہی غور کریں تو بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ مذہب ہمارے راستے کا روڑا ہے۔ مثلاً ہم چاہتے ہیں کہ سبھی لوگ ایک جیسے ہوں۔ ان میں سرمایہ داروں کی اونچ نیچ چھوت اچھوت کی کوئی تفریق نہ رہے۔ لیکن سناتن دھرم اس تفریق کے حق میں ہے۔ بیسویں صدی میں بھی پنڈت' مولوی جی جیسے لوگ بھنگی کے لڑکے سے ہار پہنانے پر کپڑوں سمیت غسل کرتے ہیں اور اچھوتوں کو جنیؤ تک دینے کے منکر ہیں۔ اگر اس مذہب کے خلاف کچھ نہ کہنے کی قسم لے لیں تو چپ رہ کر گھر بیٹھ جانا چاہئے' نہیں تو مذہب کی مخالفت کرنی چاہئے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان برائیوں کی اصلاح کی جائے۔ بہت خوب' چھوت اچھوت کو سوامی دیانند نے جو مٹایا تو وہ بھی چار ورنوں سے آگے نہ جا پائے۔ تفریق تو پھر بھی رہی ہی۔ گرودوارے جا کر تو سکھ 'راج کرے گا خالصہ' گائیں اور باہر آ کر پنچایتی راج کی باتیں کریں' تو اس کا مطلب کیا ہے؟

مذہب تو یہ کہتا ہے کہ اسلام پر یقین نہ کرنے والے کافر کو تلوار کے گھاٹ اتار دینا چاہئے اور اگر ادھر ایکتا کی دہائی دی جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ ہم جانتے ہیں کہ ابھی کئی اور بڑے اونچے معیار کی آیتیں اور منتر پڑھ کر کھینچ تان کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ اس سارے جھگڑے سے نجات ہی کیوں نہ پا لی جائے؟ مذہب کا پہاڑ تو ہمیں اپنے سامنے کھڑا نظر آتا ہے۔ مان لیں کہ ہندوستان میں آزادی کی جنگ چھڑ جائے' فوجیں آمنے سامنے بندوق لئے کھڑی ہوں' گولی چلنے ہی والی ہو اور اگر اس وقت کوئی محمد غوری کی طرح' جیسے کہ کہاوت میں سنا گیا ہے' آج بھی ہمارے سامنے گائیں' سور' گرنتھ صاحب' وید قرآن وغیرہ چیزیں کھڑی کر دی جائیں تو ہم کیا کریں گے؟ اگر پکے مذہبی ہوں گے تو اپنا بوریا بستر لپیٹ کر گھر بیٹھ جائیں گے۔ مذہبی ہوتے ہوئے ہندو' سکھ گائے پر اور مسلمان سور پر گولی نہیں چلا سکتے۔ مذہب کے بڑے پکے انسان تو اس وقت سوم ناتھ کے کئی ہزار پنڈوں کی طرح ٹھاکروں کے سامنے لوٹتے رہیں گے اور دوسرے لوگ 'غیر مذہبی اور لامذہبی' کام کر گزریں گے۔ لیکن اگر مذہب کے جانب داروں کی دلیل بھی مانی جائے تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں تاریکی پھیل جائے گی' گناہ بڑھ جائے گا۔ بہت اچھا' اسی بات کو لے لیں۔

روسی دانشور ٹالسائے نے اپنی کتاب Essay and Letters میں مذہب پر بحث کرتے ہوئے اس کے تین حصے کئے ہیں:

1۔ Essentials of Religion یعنی مذہب کی ضروری باتیں یعنی سچ بولنا' چوری نہ کرنا' غریبوں کی مدد کرنا' پیار

سے رہنا وغیرہ۔

2۔Philosophy of Religion یعنی حیات وممات' پنر جنم' دنیا کی تخلیق وغیرہ کا فلسفہ۔اس میں آدمی اپنی مرضی کے مطابق سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

3۔Rituals of Religion یعنی رسم ورواج وغیرہ۔ مطلب یہ کہ پہلے حصہ میں سبھی مذہب ایک ہیں۔ تبھی کہتے ہیں کہ سچ بولو' جھوٹ نہ بولو' پیار سے رہو۔ان باتوں کو کچھ لوگوں نے Individual Religion کہا ہے۔اس میں تو تنازعہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسے نیک خیال تو ہر آدمی میں ہونے چاہئیں۔ دوسرا فلاسفی کا سوال ہے۔ دراصل کہنا پڑتا ہے کہ Philosophy is the outcome of Human weakness, یعنی فلاسفی آدمی کی کمزوری کا پھل ہے۔ جہاں بھی آدمی دیکھ سکتے ہیں' وہاں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ جہاں کچھ نظر نہ آیا' وہیں دماغ لڑانا شروع کر دیا اور خاص خاص نتائج نکال لئے۔ ویسے تو فلاسفی بڑی ضروری چیز ہے کیوں کہ اس کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ امن بھی بہت ضروری ہے۔ ہمارے اسلاف کہہ گئے ہیں کہ بعد از مرگ دوبارہ جنم بھی ہوتا ہے۔ عیسائی اور مسلمان ان باتوں کو نہیں مانتے۔ بہت اچھا' اپنا اپنا نظریہ ہے۔ آئیے پیار کے ساتھ بیٹھ کر بحث کریں۔ ایک دوسرے کو جانیں لیکن 'مسئلہ تناسک' پر بحث ہوتی ہے تو آریہ ساجوں اور مسلمانوں میں لاٹھیاں چل جاتی ہیں۔ بات یہ کہ دونوں فریق دماغ کو' ذہن کو سوچنے سمجھنے کی طاقت کو تالا لگا کر گھر رکھ آتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وید بھگوان میں ایشور نے اسی طرح لکھا ہے اور وہی سچ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں خدا نے اسی طرح لکھا ہے اور یہی سچ ہے۔ اپنے سوچنے کی طاقت کو چھٹی دی ہوئی ہوتی ہے۔ سو جو فلاسفی ہر فرد کی ذاتی رائے سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو تو ایک خاص فلاسفی کو ماننے کے سبب مختلف گروہ نہ بنیں تو اس میں کیا شکایت ہو سکتی ہے۔

اب آتی ہے تیسری بات رسم ورواج۔ سرسوتی پوجا کے دن سرسوتی کی مورتی کا جلوس نکلنا ضروری ہے اور اس میں آگے آگے بینڈ باجا بجانا بھی ضروری ہے۔ لیکن ہیریمن روڈ کے راستے میں ایک مسجد بھی آتی ہے۔ مذہب اسلام کہتا ہے کہ مسجد کے آگے باجا نہ بجے۔ اب کیا ہونا چاہئے؟ شہری آزادی کا حق کہتا ہے کہ بازار میں باجا بجاتے ہوئے بھی جایا جا سکتا ہے۔ لیکن دھرم کہتا ہے کہ نہیں۔ ان کے دھرم میں گائے کی قربانی ضروری ہے اور دوسرے میں گائے کی پرستش (پوجا) لکھی ہوئی ہے۔ اب کیا ہو؟ پیپل کی شاخ کٹتے ہی دھرم میں فرق پڑ جاتا ہے تو کیا کیا جائے؟ تو یہی فلاسفی ورسم ورواج کی چھوٹی چھوٹی تفریق بعد میں جا کر National Religion بن جاتے ہیں اور الگ الگ تنظیمیں بننے کا سبب بنتے ہیں۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

اس لئے اگر مذہب گزشتہ میں رقم کی گئی تیسری اور دوسری بات کے ساتھ اندھ وشواش کو ملانے کا نام ہے تو مذہب کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے آج ہی اڑا دینا چاہئے۔ اگر پہلی اور دوسری بات میں آزاد نظریہ ملا کر مذہب تشکیل پاتا ہے تو ایسا مذہب قابل مبارک باد ہے۔

لیکن علاحدہ علاحدہ تنظیم اور کھانے پینے کا امتیاز مٹانا ضروری ہے' چھوت اچھوت جیسے الفاظ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہوگا۔ جب تک ہم اپنی تنگ دلی چھوڑ کر ایک نہ ہوں گے' تب تک ہم میں حقیقی اتحاد نہیں پیدا ہو سکتا۔

اس لئے اوپر لکھی باتوں کے مطابق چل کر ہی ہم آزادی کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ ہماری آزادی کا مطلب صرف انگریزوں کے چنگل سے چھٹکارا پانے کا نام نہیں' بلکہ مکمل آزادی اس آزادی کا نام ہے' جب لوگ اتحاد باہمی پیدا کر کے رہیں اور ذہنی غلامی سے بھی آزاد ہو جائیں۔

فرقہ وارانہ فسادات اوران کا تدارک

1919 کے جلیان والا باغ قتل کیس کے بعد برطانوی حکومت نے فرقہ وارانہ فسادات کی خوب تشہیر کی؛ جس کی پاداش میں 1924 میں کوہاٹ میں بہت ہی غیر انسانی طریقہ پر ہندو مسلم فسادات ہوئے۔اس کے بعد قومی سیاسی بیداری کے طور پر فرقہ وارانہ فسادات پر لمبی بحث ہوئی۔انہیں ختم کرنے کی ضرورت تو سبھی نے محسوس کی لیکن کانگریسی لیڈروں نے ہندو۔مسلم لیڈروں میں صلح نامہ لکھ کر فسادات کو روکنے کی کوشش کی۔
جیسا کہ اس سے قبل کہا گیا ہے کہ اس مسئلہ کے ضروری حل کے لئے انقلابی تحریک نے اپنے نظریات پیش کیے۔درج ذیل مضمون جون 1928 کے 'کرتی' میں شائع ہوا۔مدیر

ہندوستان کی حالت اس وقت انتہائی قابل رحم ہے۔ایک مذہب کے معتقد دوسرے مذہب کے معتقدین کے جانی دشمن ہیں۔اب تو ایک مذہب کا ہونا ہی دوسرے مذہب کا سخت ترین دشمن ہونا ہے۔اگر اس بات کا ابھی یقین نہ ہوا تو لاہور کے تازہ فسادات ہی دیکھ لیں۔کس طرح مسلمانوں نے معصوم سکھوں، ہندوؤں کو مارا ہے۔اور کس طرح سکھوں نے بھی حتی المقدور کوئی کسر نہیں چھوڑی۔یہ مار کاٹ اس لئے نہیں کی گئی کہ فلاں آدمی مجرم ہے بلکہ اس لئے کہ فلاں آدمی ہندو ہے یا سکھ ہے یا مسلمان ہے۔بس کسی فرد کا سکھ یا ہندو ہونا مسلمانوں کے ذریعہ مارے جانے کے لئے کافی تھا اور اسی طرح کسی فرد کا مسلمان ہونا ہی اس کی جان لینے کے لئے بیّن دلیل تھی۔جب حالات ایسے ہوں تو ہندوستان کا خدا ہی مالک ہے۔
ایسے حالات میں ہندوستان کا مستقبل بہت ہی تاریک نظر آتا ہے۔ان 'مذاہب' نے ہندستان کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔اور ابھی پتہ نہیں مذہبی فسادات ہندوستان کا پیچھا کب چھوڑیں گے۔ان فسادات نے دنیا کی نظروں میں ہندوستان کو بدنام کر دیا ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ اس ضعیف الاعتقادی کی رو میں سبھی بہہ جاتے ہیں۔کوئی ورلا ہی ہندو، مسلمان یا سکھ ہوتا ہے جو اپنا دماغ ٹھنڈا رکھتا ہے۔باقی ڈنڈے لاٹھیاں، تلواریں، چھرے ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں اور آپس میں سر توڑ پھوڑ کر مر جاتے ہیں۔باقی بچے کچھ تو پھانسی چڑھ جاتے ہیں اور کچھ جیلوں میں پھینک دیئے جاتے ہیں۔اتنی خوں ریزی ہونے کے بعد مذہب کے ماننے والوں پر انگریز حکومت کا ڈنڈا برستا ہے اور پھر ان کے دماغ کا کیڑا ٹھکانہ پر آجاتا ہے۔
جہاں تک دیکھا گیا ہے، ان فسادات کے پیچھے فرقہ پرست لیڈروں اور اخباروں کا ہاتھ ہے۔اس وقت ہندوستان کے لیڈروں نے ایسی گندگی مچائی ہے کہ چپ ہی بھلی۔وہی لیڈر جنہوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کا بیڑہ اپنے سروں پر اٹھایا ہوا تھا اور جو 'ایک قومیت' اور 'سوراج سوراج' کے نعرے بلند کرتے نہیں تھکتے تھے، وہی یا تو اپنے سر چھپائے چپ چاپ بیٹھے ہیں یا اسی مذہبی جنون کے بہاؤ میں بہہ رہے ہیں۔سر چھپا کر بیٹھنے والوں کی تعداد بھی کیا کم ہے؟ لیکن ایسے لیڈر جو فرقہ وارانہ تحریکات میں جا ملے ہیں، ویسے تو زمین کھودنے پر سیکڑوں نکل آتے ہیں۔جو لیڈر دل سے سب کا بھلا چاہتے ہیں، ایسے بہت ہی کم ہیں اور فرقہ پرستی کا ایسا طاقتور سیلاب آیا ہے کہ وہ بھی اسے روک نہیں پا رہے ہیں۔ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستانی قیادت دیوالیہ پن کی شکار ہو گئی ہے۔

دوسرے لوگ، جو فرقہ وارانہ فسادات کو بھڑکانے میں خصوصی طور پر حصہ لے رہے ہیں، وہ اخبار والے ہیں۔

صحافت کا پیشہ، جو کسی وقت بہت بلند سمجھا جاتا تھا، آج بہت ہی گندہ ہو گیا ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف بڑی بڑی شہ سرخیوں والے بیان دے کر لوگوں کے جذبات بھڑکاتے ہیں اور باہم متصادم ہیں۔ ایک دو جگہ ہی نہیں، کتنی ہی جگہوں پر اس لئے فسادات ہوئے ہیں کہ مقامی اخباروں نے بہت بھڑکانے والی تحریریں شائع کی ہیں۔ ایسے مضمون نگار جن کا دل و دماغ ایسے دنوں میں بھی پرامن رہا ہو، بہت کم ہیں۔

اخباروں کا حقیقی فرض تعلیم دینا، لوگوں سے نفرت مٹانا، فرقہ وارانہ جذبات ہٹانا، باہم میل ملاپ بڑھانا اور ہندوستان کی مشترکہ قومیت کو فروغ دینا تھا لیکن انہوں نے اپنی اہم ذمہ داری جہالت پھیلانا، نفرت کی تشہیر، فرقہ پرست بنانا، لڑائی جھگڑے کروانا اور ہندوستان کی مشترکہ قومیت کو برباد کرنا بنالیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے بارے میں سوچ کر آنکھوں سے خون کے آنسو بہنے لگتے ہیں اور دل میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہندوستان کا کیا ہوگا؟'۔

جو لوگ عدم تعاون کے دنوں کے جوش و ولولہ کو جانتے ہیں، انہیں اس حال میں رونا آتا ہے۔ کہاں تھے وہ دن کہ آزادی کی جھلک سامنے دکھائی دیتی تھی اور کہاں آج یہ دن کہ سوراج محض ایک خواب بن گیا ہے۔ بس یہی تیسرا فائدہ ہے جو ان فسادات سے مظلومین کو ملا ہے۔ وہی نوکر شاہی، جس کے وجود کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا، کہ آج گئی۔ کل گئی، اس نے آج اپنی جڑیں اتنی مستحکم کرلی ہیں کہ اسے ہلانا کوئی معمولی کام نہیں۔

اگر ان فرقہ وارانہ فسادات کی جڑیں تلاش کی جائیں تو ہمیں اس کا سبب معاشی ہی نظر آتا ہے۔ عدم تعاون کے دنوں میں لیڈروں اور صحافیوں نے بہت قربانیاں دیں۔ ان کی معاشی حالت بگڑ گئی تھی۔ عدم تعاون تحریک سست پڑنے پر لیڈروں پر سے اعتماد اٹھ سا گیا تھا، جس سے آج کل کے بہت سے فرقہ پرست سیاست دانوں کے دھندے چوپٹ ہو گئے۔ دنیا میں جو بھی کام ہوتا ہے'، اس کی تہہ میں پیٹ کا سوال ضرور ہوتا ہے۔ کارل مارکس کے تین بڑے اصولوں میں سے یہ ایک اہم اصول ہے۔ اسی اصول کے سبب ہی تبلیغ، تنظیم اور شدھی وغیرہ تنظیمیں شروع ہوئیں اور اسی وجہ سے ہماری ایسی بری حالت ہوئی جو ناقابل بیان ہے۔

بس سبھی فسادات کا علاج اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ ہندوستان کی معاشی حالت میں اصلاح ہی ہو سکتا ہے کیوں کہ ہندوستان کے عام لوگوں کی معاشی حالت اتنی خراب ہے کہ ایک شخص دوسرے کو چونی دے کر کسی اور کو بے عزت کروا سکتا ہے۔ بھوک اور دکھ سے عاجز آکر انسان سبھی اصولوں کو طاق پر رکھ دیتا ہے۔ سچ ہے مرتا کیا نہ کرتا۔

لیکن موجودہ صورت حال میں اقتصادی اصلاح بہت مشکل ہے کیوں کہ حکومت غیر ملکی ہے اور یہ لوگوں کی حالت کو سدھرنے نہیں دیتی۔ اس لئے لوگوں کو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جانا چاہئے اور اور جب تک حکومت بدل نہ جائے، چین کی سانس نہیں لینی چاہئے۔

لوگوں کو باہم متصادم ہونے سے روکنے کے لئے ہر طبقہ میں بیداری کی ضرورت ہے۔ غریب، محنت کشوں و کسانوں کو صاف طور پر سمجھا دینا چاہئے کہ تمہارے اصلی دشمن سرمایہ دار ہیں، اس لئے تمہیں ان ہتھکنڈوں سے بچ کر رہنا چاہئے اور ان کے ہتھے چڑھ کر کچھ نہ کرنا چاہئے۔ دنیا کے سبھی غریبوں کے، خواہ وہ کسی بھی ذات، رنگ، مذہب یا ملک سے تعلق رکھتے ہوں، حقوق ایک ہی ہیں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم مذہب، رنگ، نسل، اور قومیت و ملکی امتیاز کو مٹا کر متحد ہو جاؤ اور حکومت کی طاقت اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کرو۔ اس جد وجہد میں تمہارا نقصان کچھ نہیں ہوگا بلکہ اس سے کسی نہ کسی دن تمہاری زنجیریں

کٹ جائیں گی اور تمہیں اقتصادی آزادی مل جائے گی۔

جو لوگ روس کی تاریخ جانتے ہیں' انہیں معلوم ہے کہ زار کے وقت وہاں بھی ایسے ہی حالات تھے۔ وہاں بھی بہت سارے فرقے تھے جو باہم جوتم پیزار رہتے تھے لیکن جس دن سے وہاں لیبر حکومت برسر اقتدار آئی' وہاں کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ اب وہاں کبھی فسادات نہیں ہوتے۔ اب وہاں سبھی کو انسان سمجھا جاتا ہے' مذہبی فرد نہیں۔ زار کے وقت لوگوں کی اقتصادی حالت بہت خراب تھی' اس لئے سبھی طرح کے دنگے فسادات ہوتے تھے۔ لیکن اب روسیوں کی اقتصادی حالت سدھر گئی ہے اور ان میں طبقاتی بیداری آگئی ہے' اس لئے اب وہاں سے کبھی کسی دنگے کی خبر نہیں آتی۔

ان فسادات میں ویسے تو بڑی قابل افسوس خبریں سننے کو ملتی ہیں لیکن کلکتہ کے فسادات میں ایک خبر بہت اچھی سننے کو ملی' وہ یہ کہ وہاں فسادات میں ٹریڈ یونین کے مزدوروں نے حصہ نہیں لیا اور نہ ہی وہ باہم متصادم ہوئے البتہ سبھی ہندو مسلم بہت پیار سے کارخانوں وغیرہ میں اٹھتے بیٹھتے اور فسادات روکنے کی بھی کوششیں کرتے رہے۔ یہ اس لئے کہ ان میں طبقاتی بیداری تھی اور وہ اپنے طبقہ کے حقوق سے بخوبی واقف تھے۔ طبقاتی بیداری کا یہی خوب صورت راستہ فرقہ وارانہ فسادات کو روک سکتا ہے۔

یہ خوش خبری ہمارے گوش گزار ہوئی ہے کہ ہندوستان کے نوجوان اب ویسے مذاہب سے جو باہمی تصادم اور نفرت کا سبق دیتے ہوں' سے تنگ آکر ہاتھ دھو رہے ہیں اور ان میں اتنی رواداری آگئی ہے کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کو مذہب کی نظر سے ہندو مسلمان یا سکھ کے طور پر نہیں بلکہ سبھی کو پہلے انسان سمجھتے ہیں پھر ہندوستانی۔ ہندوستان کے نوجوانوں میں ان نظریات کا فروغ ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کا مستقبل تابناک ہے اور ہندوستانیوں کو ان فسادات وغیرہ کو دیکھ کر گھبرانا نہیں چاہئے بلکہ کوشاں ہونا چاہئے کہ ایسا ماحول نہ بنے تاکہ فسادات ہوں ہی نہ۔

1914-15 کے شہیدوں نے مذہب کو سیاست سے علاحدہ رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مذہب آدمی کا ذاتی معاملہ ہے' اس میں دوسرے کا کوئی دخل نہیں۔ نہ ہی اسے سیاست میں گھسانا چاہئے کیوں کہ یہ سب کو مل کر ایک جگہ کام نہیں کرنے دیتا۔ اسی لئے غدر پارٹی جیسی تحریک مجتمع اور ایک جان رہی' جس میں سکھ بڑھ چڑھ کر پھانسیوں پر چڑھے اور ہندو مسلمان بھی پیچھے نہیں رہے۔

اس وقت کچھ ہندوستانی لیڈر بھی میدان میں اترے ہیں جو مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ تنازعہ ختم کرنے کا یہ بھی ایک بہترین علاج ہے اور ہم اس کی حمایت کرتے ہیں۔

اگر مذہب کو الگ کر دیا جائے تو ہم سبھی جمع ہو سکتے ہیں' مذاہب میں ہم چاہے الگ الگ ہوں۔

ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان کے سچے ہمدرد ہمارے بتائے گئے اقدام تدارک پر ضرور غور کریں گے اور ہندوستان کا اس وقت جو نقصان ہو رہا ہے' اس سے ہمیں بچالیں گے۔

اچھوتوں کا مسئلہ

کاکی ناڈا میں 1923 میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ محمد علی نے اپنے صدارتی خطبہ میں آج کل کی درج فہرست ذاتوں کو' جنہیں ان دنوں 'اچھوت' کہا جاتا تھا' ہندو اور مسلم مشنری تنظیموں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا۔ ہندو اور مسلم امیر لوگ اس طبقاتی امتیاز

کو پختہ کرنے کے لئے پیسہ دینے کو تیار تھے۔
اس طرح 'اچھوتوں' کے یہ دوست انہیں مذہب کے نام پر تقسیم کرنے کی کوششیں کرتے تھے۔ اسی وقت جب اس مسئلہ پر بحث کا ماحول تھا' بھگت سنگھ نے 'اچھوت کا سوال' نامی مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مزدور طبقہ کی طاقت اور حدود کا اندازہ لگا کر اس کی ترقی کے لئے اہم مشورے دیے گئے ہیں۔ بھگت سنگھ کا یہ مضمون جون 1923 کی 'کرتی' میگزین میں 'ودروہی' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مدیر

ہمارے ملک جیسے برے حالات کسی دوسرے ملک کے نہیں ہوئے۔ یہاں عجب عجب سوال اٹھتے رہتے ہیں۔ ایک اہم سوال چھوت چھات کا مسئلہ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ تیس کروڑ کی آبادی والے ملک میں جو چھ کروڑ لوگ 'اچھوت' کہلاتے ہیں' ان کے لمسِ محض سے دھرم بھرشٹ ہو جائے گا' ان کے مندروں میں داخلہ سے دیوتا ناراض ہو جائیں گے۔ کنوئیں سے ان کے پانی نکالنے سے کنواں ناپاک ہو جائے گا۔ یہ سوال بیسویں صدی میں کئے جا رہے ہیں' جنھیں سننے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔
ہمارا ملک بہت روحانی ملک ہے لیکن ہم انسان کو انسان کا درجہ دیتے ہوئے بھی جھجک محسوس کرتے ہیں' جب کہ مکمل طور پر مادہ پرست کہلانے والا یوروپ کئی صدیوں سے صدائے انقلاب بلند کر رہا ہے۔ انہوں نے امریکہ اور فرانس کے انقلابات کے دوران ہی مساوات کا اعلان کر دیا تھا۔ آج روس نے بھی ہر طرح کے امتیاز کو ختم کر کے انقلاب کے لئے کمر کس لی ہے۔ ہم ہمیشہ سے ہی آتما پرماتما کے وجود کو لے کر فکر مند ہونے اور اس زوردار بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ کیا اچھوت کو جنیئو دے دیا جائے گا؟ وہ وید شاستر پڑھنے کے حق دار ہیں یا نہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ساتھ غیر ممالک میں اچھا برتاؤ نہیں ہوتا۔ انگریز حکومت ہمیں اپنے برابر نہیں سمجھتی لیکن کیا ہمیں یہ شکایت کرنے کا حق ہے؟
سندھ کے ایک مسلمان مسٹر نور محمد' جو ممبئی کونصل کے ممبر ہیں' نے اس موضوع پر 1926 میں کیا خوب کہا:

"If the Hidu Society refuses to allow other human beings, fellow creatures so that to attend public schools, and if ......the president of local board representing so many lakhs of people in this house refuses to allow his fellows and brothers the elementary human right of having water to drink, what right have they to ask for more rigthts from the bureacracy? Before we accuse people coming from other lands, we Should see how we ourselves behave towards our own people ......How can we ask for greater plolitical rights when we ourselves deny elementary rights of human beings.

وہ کہتے ہیں کہ جب تم ایک انسان کو پینے کے پانی کے لئے پانی دینے سے بھی انکار کرتے ہو' جب تم انہیں اسکولوں میں بھی پڑھنے نہیں دیتے تو تمہیں کیا حق ہے کہ اپنے لئے زیادہ حقوق کا مطالبہ کرو؟ جب تم ایک انسان کو مساوی حقوق دینے سے بھی انکار کرتے ہو تو تم زیادہ سیاسی حقوق کے مطالبہ کے حق دار کیسے بن گئے؟
بات بالکل کھری ہے' لیکن کیوں کہ ایک مسلم نے کہی ہے' اس لئے ہندو کہیں گے کہ دیکھو وہ ان اچھوتوں کو مسلمان بنا کر اپنے مذہب میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔

جب تم انہیں اس طرح جانوروں سے بھی بدتر سمجھتے ہو تو وہ لازماً دوسرے مذاہب میں شامل ہو جائیں گے، جن میں انہیں زیادہ حق ملیں گے، جہاں ان سے انسانوں جیسا برتاؤ کیا جائے گا پھر یہ کہنا کہ دیکھو جی عیسائی اور مسلمان ہندو قوم کو نقصان پہنچا رہے ہیں، فضول ہوگا۔

کتنا واضح قول ہے لیکن یہ سن کر سبھی تلملا جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کی فکر ہندوؤں کو بھی ہوئی۔ سناتنی پنڈت بھی کچھ نہ کچھ اس مسئلہ پر سوچنے لگے ہیں۔ بیچ بیچ میں بڑے 'یوگانت کاری' کہے جانے والے بھی شامل ہوئے۔ پٹنہ میں ہندو مہاسبھا کا اجلاس لالہ لاجپت رائے' جو کہ اچھوتوں کے بہت پرانے حامی رہے ہیں' کی صدارت میں ہوا تو زوردار بحث چھڑی۔ اچھی نوک جھونک ہوئی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اچھوتوں کو 'یگوپویت دھارن' (جنیو دھارن کرنے کی ایک رسم) کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ اور کیا انہیں وید شاستروں کے مطالعہ کا حق ہے؟ بڑے بڑے سماجی مصلح تمتما اٹھے' لیکن لالہ جی نے سب کو قائل کرلیا اور یہ دو باتیں منظور کر کے ہندو دھرم کی لاج رکھ لی۔ ورنہ ذرا سوچئے کتنی شرم کی بات ہوتی۔ کتا ہماری گود میں بیٹھ سکتا ہے۔ ہماری رسوئی میں بے خوف گھومتا پھرتا ہے لیکن ایک انسان ہم سے مس ہو جائے تو بس دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ اس وقت مالویہ جی جیسے بڑے سماجی مصلح' اچھوتوں کو بہت پیار کرنے والے اور نہ جانے کیا کیا پہلے ایک مہتر کے ہاتھوں گلے میں ہار ڈلوا لیتے ہیں لیکن کپڑوں سمیت غسل کئے بغیر خود کو ناپاک اور اشدھ سمجھتے ہیں۔ کیا خوب یہ چال ہے۔ سب کو پیار کرنے والے بھگوان کی پرستش کے لئے مندر بنا ہے لیکن وہاں اچھوت داخل ہو گئے تو وہ مندر ناپاک ہو جاتے ہیں۔ بھگوان ناراض ہو جاتا ہے۔ گھر کی جب یہ حالت ہو تو باہر ہم برابری کے نام پر جھگڑتے اچھے لگتے ہیں؟ تب ہمارے اس رویے میں تحقیر کی بھی حد پائی جاتی ہے' جو نیچ کام کر کے ہمارے لئے سہولیات مہیا کراتے ہیں' انہیں ہی ہم ٹھکرا دیتے ہیں۔ جانوروں کو ہم پوجتے ہیں لیکن انسان کو پاس نہیں بٹھا سکتے۔

آج اس سوال پر بہت شور ہو رہا ہے۔ ان نظریات پر آج کل خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ ملک میں مکتی کا منا (نجات کی آرزو) جس طرح بڑھ رہی ہے' اس میں فرقہ وارانہ جذبات نے اور کوئی فائدہ پہنچایا ہو یا نہیں لیکن ایک فائدہ ضرور پہنچایا ہے۔ زیادہ حقوق کے مطالبات کے لئے اپنی اپنی قوم کی تعداد بڑھانے کی فکر سبھی کو لاحق ہوئی۔ مسلمانوں نے ذرا زیادہ زور دیا۔ انہوں نے اچھوتوں کو مسلمان بنا کر اپنے مساوی حقوق دینا شروع کیا۔ اس سے ہندوؤں کی انا کو چوٹ پہنچی' کشمکش بڑھی' فسادات بھی ہوئے۔ آہستہ آہستہ سکھوں نے بھی سوچا کہ ہم پیچھے نہ رہ جائیں۔ انہوں نے بھی ''امرت چھکانا'' شروع کر دیا۔ ہندو سکھوں کے درمیان اچھوتوں کے جنیؤ اتارنے یا بال کٹوانے کے سوالوں پر جھگڑے ہوئے۔ اب تینوں قومیں اچھوتوں کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ اس کا بہت شور شرابہ ہے۔ ادھر عیسائی چپ چاپ ان کا رتبہ بڑھا رہے ہیں۔ چلو اس ساری ہلچل سے ہی ملک کی بدقسمتی کی لعنت دور ہو رہی ہے۔

ادھر جب اچھوتوں نے دیکھا کہ ان کی وجہ سے ان میں فساد ہو رہے ہیں اور انہیں ہر کوئی اپنی اپنی خوراک سمجھ رہا ہے تو وہ الگ ہی کیوں نہ منظم ہو جائیں؟ اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے میں انگریز حکومت کا کوئی ہاتھ ہو یا نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس نظریہ کی تشہیر میں سرکاری مشنری کا بہت بڑا ہاتھ تھا یعنی ''دھرم منڈل'' جیسی تنظیمیں اس نظریہ کے فروغ کا نتیجہ ہیں۔

اب ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا حقیقی حل کیا ہے؟ اس کا جواب بہت اہم ہے۔ سب سے پہلے فیصلہ کر لینا چاہئے کہ سب انسان برابر ہیں اور نہ تو پیدائشی طور پر کوئی مختلف پیدا ہوا ہے اور نہ کام کی تقسیم سے کیوں کہ ایک آدمی غریب مہتر کے گھر پیدا ہو گیا ہے' اس لئے پوری زندگی غلاظت صاف کرے گا اور دنیا میں کسی طرح کی ترقی کا کام پانے کا اس کا کوئی حق

نہیں ہے۔ یہ باتیں فضول اور بے کار ہیں۔ اس طرح ہمارے اسلاف آریوں نے اس کے ساتھ ایسا غیر منصفانہ برتاؤ کیا تھا' انہیں نیچ (ذلیل) کہہ کر دھتکار دیا اور کمتر درجہ کے کام کروانے لگے۔ ساتھ ہی یہ بھی فکر ہوئی کہ کہیں یہ بغاوت نہ کر دیں تب فلسفہ تناسخ کا پرچار شروع کر دیا کہ یہ تمہارے پچھلے جنموں کے پاپوں کا ثمرہ ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ چپ چاپ دن گزاریں۔ اس طرح انہیں صبر کی تلقین کر کے وہ لوگ انہیں لمبے وقت کے لئے مطمئن کر گئے۔ لیکن انہوں نے گناہ عظیم کیا۔ انسان کے اندر کی انسانیت کو بھی ختم کر دیا۔ بہت ظلم اور ناانصافی کی گئی۔ آج اس سب کی تلافی کا وقت ہے۔

اس کے ساتھ ایک دوسری خرابی پیدا ہو گئی۔ لوگوں کے دلوں میں غیر ضروری کاموں کے تئیں نفرت پیدا ہو گئی۔ ہم نے جولاہے کو بھی دھتکارا۔ آج کپڑا بننے والے بھی اچھوت سمجھے جاتے ہیں۔ یو پی کی طرف کہار کو بھی اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ اس سے بڑی خرابی پیدا ہوئی۔ ایسے میں ترقی کے عمل میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں۔

ان طبقوں کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے ہمیں چاہئے کہ ہم نہ انہیں اچھوت کہیں اور نہ سمجھیں۔ بس یہیں مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ نوجوان کانگریس نے جو طریقہ اپنایا ہے' وہ بہت اچھا ہے۔ جنہیں آج تک اچھوت کہا جاتا رہا' ان کو اپنے ان گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہئے اور انہیں اپنے جیسا انسان سمجھنا چاہئے' بغیر امرت پلائے' بغیر کلمہ پڑھائے یا شدھ کئے انہیں اپنوں میں شامل کر کے ان کے ہاتھ سے پانی پینا' یہی مناسب اور موزوں طریقہ ہے۔ اور آپس میں کھینچا تانی کرنا اور معاملات میں کوئی حق نہ دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

جب گاؤں میں مزدور پرچار شروع ہوا' اس وقت کسانوں کو سرکاری آدمی یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ دیکھو یہ بھنگی چماروں کو سر پر چڑھا رہے ہیں اور تمہارا کام بند کرائیں گے۔ بس کسان اتنے میں ہی مشتعل ہو گئے۔ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی حالت تب تک نہیں سدھر سکتی جب تک کہ وہ ان غریبوں کو نیچ اور کمین کہہ کر اپنی جوتی کے نیچے دبائے رکھنا چاہتے ہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ صاف نہیں رہتے۔ اس کا جواب صاف ہے۔ وہ غریب ہیں' غریبی کا علاج کرو۔ اونچے گھرانوں کے غریب لوگ بھی کوئی کم گندے نہیں رہتے۔ گندے کام کرنے کا بہانا بھی نہیں چل سکتا کیوں کہ مائیں بچوں کی گندگی صاف کرنے سے مہتر اور اچھوت تو نہیں ہو جاتیں۔

لیکن یہ کام اس وقت تو نہیں ہو سکتا جب تک کہ اچھوت قومیں اپنے آپ کو منظم نہ کر لیں۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ان کی خود علاحدہ تنظیم سازی یا مسلمانوں کے برابر تعداد میں ہونے کے سبب ان کے برابر حقوق کا مطالبہ کرنا امید افزا علامت ہے۔ یا تو فرقہ وارانہ امتیاز کا جھنجھٹ ہی ختم کرو' نہیں تو ان کے الگ حقوق انہیں دے دو۔ کونسلوں اور اسمبلیوں کا فرض ہے کہ وہ اسکول و کالج' کنوئیں اور سڑک کے استعمال کی مکمل آزادی انہیں دلائیں۔ زبانی طور پر ہی نہیں بلکہ ساتھ لے جا کر انہیں کنوئیں پر چڑھائیں۔ ان کے بچوں کو اسکولوں میں داخلہ دلائیں۔ لیکن جس لیجسلیٹو میں بچپن کی شادی کے خلاف پیش کردہ بل اور مذہب کے بہانے ہائے توبہ مچائی جاتی ہے' وہاں وہ اچھوتوں کو اپنے ساتھ شامل کرنے کا حوصلہ کیسے کر سکتے ہیں۔

اس لئے ہم مانتے ہیں کہ ان کے اپنے عوامی نمائندے ہوں۔ وہ اپنے لئے زیادہ حقوق کا مطالبہ کریں۔ ہم تو صاف کہتے ہیں کہ اٹھو' اچھوت کہلانے والے اصلی عوامی خدمت گاروں اور بھائیو اٹھو' اپنی تاریخ دیکھو۔ گرو گوبند سنگھ کی فوج کی اصلی طاقت تمہیں تھے۔ شواجی تمہارے بھروسے ہی سب کچھ کر سکے' جس کی وجہ سے ان کا نام آج بھی زندہ ہے۔ تمہاری قربانیاں زریں حروف سے لکھی ہوئی ہیں۔ تم جو لوگوں کی خدمت کر کے' عوام کے سکھ میں اضافہ کر کے اور زندگی ممکن بنا کر جو بہت بڑا احسان کر رہے ہو' اسے ہم لوگ نہیں سمجھتے۔ لینڈ ایلئے نیشن ایکٹ (Land Alienation Act) کے مطابق تم

دولت جمع کرکے زمین بھی نہیں خرید سکتے۔تم پر اتنا ظلم ہو رہا ہے کہ مس میو انسانوں سے کہتی ہیں اٹھو اپنی طاقت پہچانو۔منظم ہو جاؤ۔حقیقت میں ذاتی کوشش کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔ (Those who would be free must themselves strike the blow.) آزادی کے لئے آزادی چاہنے والوں کو کوشش کرنی چاہئے۔انسان کی دھیرے دھیرے کچھ ایسی عادتیں ہو گئی ہیں کہ وہ اپنے لئے زیادہ حق کا طلب گار ہے لیکن جو اس کے ماتحت ہے' انہیں اپنی جوتی کے نیچے دبائے رکھنا چاہتا ہے۔کہاوت ہے کہ 'لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے'۔مطلب یہ ہے کہ منظم ہو کر اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر پورے سماج کو چیلنج کر دو۔تب دیکھنا' کوئی بھی تمہیں تمہارے حقوق دینے سے انکار کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔تم دوسروں کی خوراک مت بنو۔دوسروں کی طرف نہ دیکھو۔لیکن خیال رہے نوکر شاہی کے جھانسے میں مت پھنسنا۔یہ تمہاری کوئی مدد نہیں کرنا چاہتی بلکہ تمہیں اپنا مہرہ بنانا چاہتی ہے۔یہی سرمایہ دار نوکر شاہی تمہاری غلامی اور غریبی کا حقیقی سبب ہے'اس لئے تم اس کے ساتھ کبھی نہ ملنا۔اس کی سازشوں سے بچنا۔تب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔تم اصلاً عوام ہو'منظم ہو جاؤ' تمہارا کچھ بھی نقصان نہیں ہوگا۔بس غلامی کی زنجیریں کٹ جائیں گی۔اٹھو اور حالیہ نظام کے خلاف بغاوت کر دو۔آہستہ آہستہ ہونے والی اصلاح سے کچھ نہیں ہوگا۔سماجی تحریکات سے انقلاب پیدا کر دو اور سیاسی اور معاشی انقلاب کے لئے کمر کس لو تم ہی تو ملک کی اصل اساس ہو' حقیقی طاقت ہو۔سوئے ہوئے شیر' اٹھو اور بغاوت کر دو۔

ستیہ گرہ اور ہڑتالیں

جون 1928 کے 'کرتی' میں ان دو موضوعات پر تفصیلات شائع ہوئیں۔بھگت سنگھ 'کرتی' کی مجلس ادارت میں تھے۔اس وقت ان کے نظریات سے متعلق کچھ جھلک ان سے بھی مل سکتی ہے -مدیر

ستیہ گرہ

1928 میں ہندوستان میں پھر جان پڑتی نظر آنے لگی ہے۔ایک طرف ہڑتالوں کا زور ہے اور دوسری طرف ستیہ گرہ کی تیاریاں شروع ہو رہی ہیں۔یہ اچھی علامتیں ہیں۔سب سے بڑا ستیہ گرہ باردولی (صوبہ گجرات) کے کسان کر رہے ہیں۔تیس برسوں کے بعد نیا بندوبست کیا جا رہا ہے اور ہر بار زمین کا لگان دیا جاتا ہے۔اسی طرح اس بار بھی بندوبست ہوا اور معاملہ بڑھا دیا گیا۔بے چارے لوگ کیا کریں؟ غریب کسان تو پہلے ہی پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھا سکتے اور وہ پہلے سے 22 فی صد لگان کہاں سے دیں؟ ستیہ گرہ کی تیاریاں کی گئیں۔مہاتما گاندھی نے لاٹ پنجاب کے ساتھ خط۔کتابت کر کے لگان کم کرانے کی کوشش کی'لیکن جناب صرف خط۔کتابت سے یہ سرکار سر جھکنے والی نہیں ہے' کچھ اثر نہیں ہوا۔ستیہ گرہ کرنا ہی پڑا۔گجرات میں پہلے بھی کسان ایک دو بار بڑا ستیہ گرہ کر کے حکومت کو شکست دے چکے ہیں۔پہلے پہل 18-1917 میں زیادہ بارش نہ ہونے کے سبب فصلیں خراب ہو گئی تھیں اور فصلیں روپے میں چار آنہ بھی نہیں ہوئی۔قانون یہ تھا کہ روپے میں چھ آنے سے کم فصل ہونے سے اس سال کا لگان نہیں لیا جائے' آئندہ سال ایک ساتھ لے لیا جائے۔اس سال لوگوں نے جب کہا کہ چار آنہ بھی فصل نہیں ہوئی تو سرکار نے نہیں مانا۔پھر مہاتما گاندھی جی نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ایک اجلاس

کر کے لوگوں کو بتایا کہ اگر آپ لگان دینے سے انکار کریں گے تو آپ کی جائیداد ضبط ہو جائے گی' کیا آپ تیار ہیں؟ لوگ خاموش بیٹھے رہے تو بمبئی کے ستیہ گرہی لیڈر اس بات پر بڑے ناراض ہوئے اور چل دیئے لیکن پھر ایک بوڑھا کسان اٹھا اور اس نے کہا کہ ہم سب برداشت کریں گے اور بعد میں بھی لوگ یہی کہنے لگے۔ ستیہ گرہ شروع ہوا۔ سرکار نے بھی زمین وجائیداد ضبط کرنا شروع کر دیا لیکن دو مہینے بعد سرکار نے سر جھکا دیا اور زمین داروں کی شرط مان لی۔

دوسری مرتبہ جب مہاتما جی 24-1923 میں جیل میں تھے تب ستیہ گرہ ہوا۔ پہلی بار 600 گاؤں نے حصہ لیا۔ اس بار 94 گاؤں کا لگان بڑھایا اور ان گاؤں نے ستیہ گرہ کیا۔ ان پر تعزیری ٹیکس لگایا گیا تھا۔ وہاں قانون یہ تھا کہ طلوع آفتاب تک جائیداد قرق نہیں ہو سکتی تھی اور کسان علی الصباح ہی اپنے گھروں کو مقفل کر کے چلے جاتے اور پولیس کو کوئی گواہ تک نہ ملتا۔ عاجز آ کر حکومت نے ٹیکس واپس لے لیا۔ اس بار باردولی میں ستیہ گرہ شروع ہوا ہے۔ باردولی میں 22-1921 میں آزادی کے لئے بہت بڑا ستیہ گرہ شروع کرنے کی تیاریاں کی گئی تھیں۔ سب قسمت کا کھیل تھا۔ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ خیر' ان پچھلی باتوں کا کیا کرنا؟ اب اس علاقے کا بندوبست حکومت نے کیا۔ بے چارے کسانوں کی مصیبت' اچھا بندوبست ہوا۔ 22 فی صد لگان بڑھ گیا۔ بہت کہا گیا لیکن سرکار کب مانتی ہے؟ جناب ولبھ بھائی پٹیل کی قیادت میں کام شروع ہو گیا اور کسانوں نے لگان دینے سے منع کر دیا۔ اب ضبطی حکام اور سارے آفیسر باردولی تعلقہ کی طرف جمع ہوئے۔ جو اُن سے ہو سکتا ہے' لوگوں کو غلط راستے پر ڈالنے کے لئے کر رہے ہیں۔ جائیدادیں ضبط کی جا رہی ہیں' زمینیں ضبط کرنے کے حکم دیئے جا رہے ہیں لیکن مال واسباب اٹھانے کے لئے آدمی نہیں ملتے۔ اس وقت کام وہاں زوروں پر ہے لیکن ایک مزے کی بات یہ ہے کہ سارا کام بڑے امن وسکون سے ہو رہا ہے۔ وہ افسر' جو لوگوں کو تنگ کرتے تھے' ان کے ساتھ بڑے پیار کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ پہلے انہیں روٹی پانی نہیں ملتا تھا' اب پٹیل نے کہا کہ انہیں روٹی پانی ضرور دے دیا کرو۔ ایک دن شراب کی دکان سے چار ٹین قرق کئے گئے لیکن اٹھانے والا کوئی نہیں ملا۔ جب حکام نے کہا' بڑی پیاس لگی ہے' پانی دو' تو جھٹ پٹ ایک خدمت گار ستیہ گرہی نے سوڈے کی بوتل لا کر پلائی۔ اس طرح کام بڑے زوروں سے' پورے امن کے ساتھ چل رہا ہے۔ بڑی امید ہے کہ سرکار کو آخر کار جھکنا پڑے گا۔

دوسری جگہ کان پور ہے' جہاں ستیہ گرہ ہونے والا ہے۔ پچھلے دنوں کان پور میں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ بعد میں تعزیری پولیس بٹھائی گئی۔ کچھ دن ہوئے کہ کان پور کے کونسل ممبر مسٹر گنیش شنکر جی ودیارتھی' مدیر 'پرتاپ' کان پور کو ایک خط مجسٹریٹ کے ذریعہ ملا کہ اپنے دفتر کے سبھی ملازمین کی فہرست' تنخواہ اور عہدہ لکھ کر بھیجیں کیوں کہ تاری تعزیری ٹیکس وصول کیا جانا ہے۔ لیکن ودیارتھی جی نے لکھ بھیجا کہ میں کوئی ٹیکس دینے کو تیار نہیں ہوں اور نہ ہی اس کام میں کوئی مدد کروں گا کیوں کہ فساد پولیس نے کرایا تھا۔ ہمیں اس کی سزا نہیں ملنی چاہئے۔ لوگوں نے ودیارتھی جی سے پوچھا کہ ہم کیا کریں؟ آپ نے کہا کہ مصیبت آئے گی' نقصانات زیادہ ہوں گے' لیکن یہ ظالمانہ ٹیکس نہیں دینا چاہئے۔ جلسے ہوئے۔ 7000 لوگوں نے ٹیکس نہ دینے کے کاغذات پر دستخط کر کے سرکار کو ارسال کر دیا۔ تیاریاں ہو رہی ہیں۔

تیسری جگہ میرٹھ ہے۔ وہاں بھی بندوبست ہوا اور لگان بڑھ گیا۔ وہاں بھی ستیہ گرہ کا اعلان کر دیا گیا۔

پنجاب میں بھی کچھ ایسی ہی باتیں نظر آ رہی ہیں۔ شیخ پور اور لاہور اضلاع میں اولے گرنے سے فصلیں برباد ہو گئی تھیں۔ اناج کچھ بھی نہیں ہوا' پھر لگان کیسے دیا جائے؟ لیکن یہاں کے سیانے سیانے آدمی کچھ مختلف باتیں کرتے ہیں۔ "کانگریس کے بدنام' آدمی ان کسانوں میں تقریر نہ کریں' کہیں حکومت ناراض نہ ہو جائے۔ ایسی ایسی باتیں ہو رہی ہیں لیکن

انہیں اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ انگریز پیسے کے پیر اور امید یہ کی جائے کہ وہ لگان خود معاف کر دیں گے۔ یہ بھرم ابھی کب تک چلے گا؟

ہڑتالیں

ادھر ستیہ گرہ کی دھوم ہے اور ادھر ہڑتالوں کا بھی کچھ کم زور نہیں ہے۔ بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ ملک میں پھر بیداری آئی ہے اور پہلے پہل ہی کسانوں اور مزدورں کی جنگ چھڑی ہے۔ آئندہ انقلاب پر بھی اس بات کا کافی اثر پڑے گا۔ حقیقت میں تو یہی لوگ ہیں جنہیں آزادی کی ضرورت ہے۔ کسان اور مزدور روٹی چاہتے ہیں اور ان کی روٹی کا سوال تب تک حل نہیں ہوسکتا جب تک یہاں مکمل آزادی نہیں مل جائے۔ یہ گول میز کانفرنس یا دیگر ایسی کسی بات پر رک نہیں سکتے۔ خیر۔

آج کل لیلوا ریلوے ورکشاپ، ٹاٹا کی جمشید پور ملیں، جمشید پور شہر میں بھنگیوں اور ممبئی کی کپڑا ملوں میں ہڑتال ہوگئی ہے۔ حقیقت میں تو موٹی موٹی شکایتیں سب ایک سی ہوتی ہیں۔ تنخواہ کم، کام زیادہ اور برا رویہ۔ ایسے حالات میں غریب مزدور جیسے تیسے گزارا کرتے ہیں، لیکن صورت حال آخرش نا قابل برداشت ہوجاتی ہے۔ آج ممبئی میں ڈیڑھ دو لاکھ لوگ ہڑتال پر بیٹھے ہیں۔ صرف ایک مل چلتی ہے۔ بات یہ کہ نئے ہتھ کرگھے آئے ہیں، جن میں ایک آدمی کو دو ہتھ کرگھوں پر کام کرنا پڑتا ہے اور محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ یہیں کام کرنے والوں کی تنخواہ خاص طور پر بڑھانے، باقی عام مزدوروں کی تنخواہ بڑھانے اور آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہ لینے اور کچھ برتاؤ سے متعلق شرائط پیش کی گئی ہیں۔ اس وقت ہڑتال کا بڑا زور ہے۔ جمشید پور مل کے مزدوروں کی بھی کچھ ایسی ہی مانگیں ہیں۔ وہاں بھی ہڑتال بڑھتی جارہی ہے۔ بھنگی اپنی ہڑتال کیے ہوئے ہیں اور شہر کی ناک میں دم کیے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ خدمت کرنے والے بھائیوں کو ہم 'بھنگی بھنگی' کہہ کر پاس پھٹکنے نہ دیں اور ان کی غریبی کا فائدہ اٹھا کر تھوڑے پیسے دے کر کام کراتے رہیں اور بیگار بھی خوب گھسیٹیں۔ خوب۔ آخر انہیں بھی اٹھ کھڑا ہونا ہی تھا۔ وہ تو لوگوں کو خاص طور پر شہروں میں دو دن میں سیدھے راستے پر لا سکتے ہیں۔ ان کا اٹھ کھڑا ہونا بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیلوا ورکشاپ سے کچھ آدمی نکال دیئے گئے تھے اور تنخواہ کا بھی معاملہ تھا، اس لئے ہڑتال ہوگئی۔ بعد میں اعلان ہوگیا کہ کئی ہزار افراد کا کام بالکل ہی بند کر دیا جائے گا اور ہڑتال ختم ہونے پر بھی انہیں کام میں نہیں لیا جائے گا۔ اس سے بڑی سنسنی پھیلی۔ لیکن ہڑتال زوروں پر ہے۔ شری اسپریٹ وغیرہ خوب کام کر رہے ہیں۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ ان کی ہر طرح مدد کریں اور ان کی ہڑتالیں تڑوانے کی جو تیاری ہورہی ہے، وہ بند کرائی جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سبھی کسان اور مزدور منظم ہوں اور اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے جدوجہد کریں۔

طلباء اور سیاست

اس بات کا خوب شور وغل ہو رہا ہے کہ پڑھنے والے نوجوان (طالب علم) سیاسی یا پولیٹکل کاموں میں حصہ نہ لیں۔ حکومت پنجاب کی رائے بالکل ہی انوکھی ہے۔ طالب علموں سے کالج میں داخلہ ہونے سے قبل اس شرط پر دستخط کرائے جاتے ہیں کہ وہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیں گے۔ اب اسے بدقسمتی ہی کہا جاسکتا ہے کہ لوگوں کا منتخب منوہر لال جواب وزیر تعلیم ہے، اسکول اور کالجوں کے نام ایک سرکلر یا میمورنڈم بھیجتا ہے کہ کوئی پڑھنے یا پڑھانے والا پولیٹکس میں حصہ نہ لے۔ کچھ دن ہوئے جب لاہور میں اسٹوڈنٹس یونین یا ودیارتھی سبھا کی جانب سے 'ودیارتھی سپتاہ' (طالب علم ہفتہ) منایا جارہا تھا۔

وہاں بھی سر عبدالقادر اور پروفیسر ایشور چند نندا نے اس بات پر زور دیا کہ طالب علموں کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لینا چاہئے۔

پنجاب کو سیاسی اعتبار سے سب سے پچھڑا ہوا (Politically Backward) کہا جاتا ہے۔اس کا کیا سبب ہے؟ کیا پنجاب نے قربانیاں کم دی ہیں؟ اس کی ظاہری وجہ یہ ہے کہ ہمارے محکمۂ تعلیم کے حکام بالکل ہی بے وقوف ہیں۔ آج پنجاب کونسل کی کارروائی پڑھ کر اس بات کا اچھی طرح پتہ چلتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ہماری تعلیم نکمی اور فضول ہوتی ہے اور طالب علموں کا نوجوان طبقہ اپنے ملک کی باتوں میں کوئی حصہ نہیں لیتا۔ انہیں اس تعلق سے بھی کوئی علم نہیں ہے۔ اب وہ پڑھ کر نکلتے ہیں تب ان میں سے کچھ ہی آگے پڑھتے ہیں لیکن وہ ایسی ناپختہ باتیں کرتے ہیں کہ سن کر کف افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ جن نوجوانوں کو کل ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینی ہے' انہیں آج ہی عقل کا اندھا بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس سے جو نتیجہ نکلے گا' وہ ہمیں خود ہی سمجھ لینا چاہئے۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ طالب علم کا پہلا کام پڑھائی کرنا ہے' انہیں اپنی پوری توجہ اس پر لگانی چاہئے لیکن کیا ملک کے حالات کا علم اور اس کی اصلاح کے اقدامات کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا اس تعلیم میں شامل نہیں؟ اگر نہیں تو ہم اس تعلیم کو بھی فضول سمجھتے ہیں جو صرف کلرکی کرنے کے لئے حاصل کی جائے۔ ایسی تعلیم کی ضرورت کیا ہے؟ کچھ چالاک آدمی یہ کہتے ہیں کہ ''بیٹا تم سیاست کے مطابق پڑھو اور سوچو ضرور' لیکن عملی طور پر حصہ نہ لو۔ تم زیادہ باصلاحیت ہو کر ملک کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگے''۔

بات بڑی اچھی لگتی ہے لیکن ہم اسے بھی مسترد کرتے ہیں کیوں کہ یہ بھی صرف اوپری بات ہے۔ اس بات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک دن طالب علم ایک کتاب "Appeal to the young, -Prince Kropotkin" (نوجوانوں کے نام اپیل۔ پرنس کروپوٹکن) پڑھ رہا تھا۔ ایک پروفیسر صاحب کہنے لگے' یہ کون سی کتاب ہے؟ اور یہ تو کسی بنگالی کا نام لگتا ہے۔ لڑکا بول پڑا پرنس کروپوٹکن کا نام بہت مشہور ہے۔ وہ ماہر معاشیات تھے۔ اس نام سے واقفیت ہر پروفیسر کے لئے بہت ضروری تھی۔ پروفیسر کی 'صلاحیت' پر لڑکا ہنس بھی پڑا اور اس نے پھر کہا۔ یہ روسی شخص تھے۔ بس روسی' قہر ٹوٹ پڑا۔ پروفیسر نے کہا کہ تم بولشیوک ہو' کیوں کہ تم سیاسی کتابیں پڑھتے ہو۔

دیکھئے آپ پروفیسر کی صلاحیت۔ اب ان بے چارے طالب علموں کو ان سے کیا سیکھنا ہے؟ ایسے حالات میں وہ نوجوان کیا سیکھ سکتے ہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ عملی سیاست کیا ہوتی ہے؟ مہاتما گاندھی' جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس کا استقبال کرنا اور تقریر سننا تو ہوئی عملی سیاست۔ لیکن کمیشن یا وائسرائے کا استقبال کرنا کیا ہوا؟ کیا وہ سیاست کا دوسرا پہلو نہیں۔؟ حکومتوں اور ملکوں کے انتظام سے متعلق کوئی بھی بات سیاست ہی شمار کی جائے گی تو پھر یہ بھی سیاست ہوئی کہ نہیں؟ کہا جائے گا کہ اس سے حکومت خوش ہوتی ہے اور دوسری سے ناراض؟ پھر سوال تو سرکار کی خوشی یا ناراضگی کا ہی ہوا۔ کیا طالب علموں کو پیدا ہوتے ہی خوشامد اور چاپلوسی کا سبق پڑھانا چاہئے؟ ہم جو سمجھتے ہیں کہ جب تک ہندوستان میں غیر ملکی ڈاکو حکومت کر رہے ہیں' تب تک وفاداری کرنے والے وفادار نہیں بلکہ غدار ہیں' انسان نہیں' جانور ہیں' پیٹ کے غلام ہیں۔ تو ہم کس طرح کہیں کہ طالب علم وفاداری کا سبق پڑھیں۔

سبھی مانتے ہیں کہ ہندوستان کو اس وقت ایسے ملکی خدمت گاروں کی ضرورت ہے' جو تن من دھن ملک پر پیش کر دیں اور پاگلوں کی طرح پوری عمر ملک کی آزادی کے لئے نچھاور کر دیں لیکن کیا بوڑھوں میں ایسے آدمی مل سکیں گے؟ کیا خاندان اور

دنیاداری کے چکر میں پھنسے سیانے لوگوں میں ایسے لوگ نکل سکیں گے؟ یہ تو وہی نوجوان نکل سکتے ہیں جو ہر طرح کے جنجال سے آزاد ہوں اور جنجال میں پڑنے سے پہلے طالب علم یا نوجوان تبھی سوچ سکتے ہیں اگر انہوں نے عملی علم حاصل کیا ہو۔ صرف ریاضی اور جغرافیہ کے ہی امتحان کے پرچوں کو حفظ نہ کیا ہو۔

کیا انگلینڈ کے سبھی طالب علموں کو کالج چھوڑ کر جرمنی کے خلاف لڑنے کے لئے نکل پڑنا سیاست نہیں تھی؟ تب ہمارے ناصح کہاں تھے جوان سے کہتے جاؤ، جا کر تعلیم حاصل کرو۔ آج نیشنل کالج، احمد آباد کے جولڑ کے ستیہ گرہ میں باردولی والوں کی مدد کر رہے ہیں، وہ ایسے ہی بے وقوف رہ جائیں گے؟ سبھی ملکوں کو آزاد کروانے والے وہاں کے طالب علم اور نوجوان ہی ہوا کرتے ہیں۔ کیا ہندوستان کے نوجوان الگ الگ رہ کر اپنا اور اپنے ملک کا وجود بچا پائیں گے؟ نوجوان 1919 میں طالب علموں پر کیے گئے مظالم بھول نہیں سکتے؟ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ انہیں ایک بڑے انقلاب کی ضرورت ہے۔ وہ پڑھیں، ضرور پڑھیں۔ ساتھ ہی سیاسی علم بھی حاصل کریں اور جب ضرورت ہو تو میدان میں کود پڑیں اور اپنی زندگی اسی کام میں لگا دیں۔ اپنی جانوں کو اس میں جھونک دیں۔ بصورت دیگر بچنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔

نئے لیڈروں کے منفرد نظریات

جولائی 1928 کے 'کرتی' میں چھپے اس مضمون میں بھگت سنگھ نے سبھاش چندر بوس اور جواہر لال نہرو کے خیالات کا موازنہ کیا ہے۔ مدیر

عدم تعاون تحریک کی ناکامی کے بعد عوام میں بہت ناامیدی اور مایوسی پھیل گئی۔ ہندو مسلم فسادات نے بچی کچھی ہمت بھی ختم کر ڈالی۔ لیکن ملک میں جب ایک بار بیداری پیدا ہو جائے تو ملک زیادہ دن تک سویا نہیں رہ سکتا۔ کچھ ہی دنوں بعد عوام پورے جوش کے ساتھ اٹھتے اور حملہ بولتے ہیں۔ آج ہندوستان میں پھر جان آ گئی ہے۔ ہندوستان پھر جاگ رہا ہے۔ دیکھنے میں تو کوئی بڑی عوامی تحریک نظر نہیں آتی لیکن بنیاد ضرور مضبوط کی جا رہی ہے۔ جدید نظریات رکھنے والے متعدد قائدین سامنے آ رہے ہیں۔ اس بار نوجوان لیڈر ہی محبانِ وطن کی نظروں میں آ رہے ہیں۔ بڑے بڑے لیڈر بڑا ہونے کے باوجود ایک طرح سے پیچھے چھوڑے جا رہے ہیں۔ اس وقت جو لیڈر آگے آئے ہیں، وہ ہیں بنگال کے عزت مآب مسٹر سبھاش چندر بوس اور عزت مآب مسٹر پنڈت جواہر لعل نہرو۔ یہی دو لیڈر ہندوستان میں ابھرتے نظر آ رہے ہیں اور نوجوانوں کے آندولن میں خاص طور سے حصہ لے رہے ہیں۔ دونوں ہی ہندوستان کی آزادی کے کٹر حامی ہیں۔ دونوں سمجھ دار اور سچے دیش بھگت ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک کو ہندوستان کی قدیم ثقافت کا محافظ کہا جاتا ہے تو دوسرے کو پکا عہد ساز۔ ہم اس مضمون میں ان کے منفرد نظریات کو عوام کے سامنے رکھیں گے تاکہ عوام خود ان کے فرق کو سمجھ سکے اور خود بھی غور و فکر کر سکے۔ لیکن ان دونوں کے خیالات اور نظریات کا ذکر کرنے سے قبل ایک اور شخص کا ذکر بھی ضروری ہے جو انہیں کی طرح آزادی کا متوالا ہے اور تحریک نوجوانان میں ایک اہم شخصیت ہے۔ سادھو واسوانی خواہ کانگریس کے بڑے لیڈروں کی طرح معروف تو نہیں، ملک کے سیاسی حلقوں میں ان کا کوئی خاص مقام بھی نہیں تو بھی نوجوانوں پر، جنہیں کل ملک

کی باگ ڈور سنبھالنی ہے' ان کا اثر ہے اور ان کی ہی شروع کردہ تحریک 'بھارت یوا سنگھ' اس وقت نوجوانوں میں خصوصی اثر رکھتی ہے۔ ان کے خیالات بالکل الگ ہیں۔ ان کے خیالات ایک ہی لفظ میں بتائے جاسکتے ہیں...... 'واپس ویدوں کی جانب لوٹ چلو' (بیک ٹو ویدس)۔ یہ آواز سب سے پہلے آریہ سماج نے اٹھائی تھی۔ اس نظریہ کی بنیاد اس عقیدت میں پنہاں ہے کہ ویدوں میں پرماتمانے دنیا جہاں کا سارا علم انڈیل دیا ہے۔ اس سے آگے اور زیادہ ترقی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ہمارے ہندوستان نے جو چوطرفہ ترقی کرلی تھی' اس سے آگے نہ دنیا بڑھی ہے اور نہ بڑھ سکتی ہے۔ خیر' واسوانی وغیرہ اسی عقیدہ کے قائل ہیں۔ اس لئے ایک جگہ کہتے ہیں:

''ہماری سیاست نے اب تک کبھی تو میزنی اور والٹیر کو اپنا آدرش مان کر مثالیں قائم کی ہیں یا کبھی لینن اور ٹالسٹائے سے سبق لیا۔ حالاں کہ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے پاس اس سے کہیں بڑے آدرش ہمارے پرانے رشی ہیں''۔ وہ اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ ہمارا ملک ایک بار تو ترقی کی آخری حد پر پہنچ چکا تھا اور آج ہمیں آگے کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں بلکہ پیچھے لوٹنے کی ضرورت ہے۔

آپ ایک شاعر ہیں۔ شعریت آپ کے خیالات میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی وہ مذہب کے بہت بڑے حامی ہیں۔ وہ 'شکتی' (طاقت) دھرم چلانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''اس وقت ہمیں طاقت کی بے حد ضرورت ہے''۔ وہ 'شکتی' لفظ کا مطلب محض ہندوستان کے لئے استعمال نہیں کرتے' لیکن ان کو اس لفظ سے ایک قسم کی دیوی کا' ایک خاص خدائی حصولیابی کا یقین ہے۔ وہ ایک جذباتی شاعر کی طرح کہتے ہیں:

"For in solitude have communicated with her, our admired Bharat Mata, And my aching head has heard voices saying...... The day of freedon is not far of: ...... Sometimes indeed a strange feeling visits me and I say to myself. Holy, holy is Hindustan. For Still is she under the protection of her mighty Rishis and their beauty is around us, but we behold it not.

یعنی تنہائی میں میں نے ہندوستان کی آواز سنی ہے۔ میرے رنجیدہ دل نے کئی بار یہ آواز سنی ہے کہ 'آزادی کا دن دور نہیں'...... کبھی کبھی بہت عجیب خیالات میرے دماغ میں آتے ہیں اور میں کہہ اٹھتا ہوں ہمارا ہندوستان پاک اور مقدس ہے' کیوں کہ قدیم رشی (عابد) اس کا تحفظ کررہے ہیں اور ان کی خوب صورتی ہندوستان کے پاس ہے لیکن ہم انہیں دیکھ نہیں پارہے ہیں۔

یہ شاعر کی فریاد ہے کہ وہ پاگلوں یا دیوانوں کی طرح کہتے رہے ہیں 'ہماری ماتا بڑی مہان ہے۔ بہت شکتی شالی (طاقت ور) ہے۔ اسے شکست دینے والا کون پیدا ہوا ہے''۔ اس طرح کی باتیں وہ صرف جذباتی ہوکر کہتے ہیں: "Our national movement must become a purifying mass movement, if it is to fulfil Its destiny without falling into class war one of the dangers of Bolshevism"

یعنی ہمیں اپنی قومی تحریکات کو ملکی اصلاح کی تحریک میں تبدیل کردینا چاہئے۔ تبھی ہم طبقاتی جنگ کے بولشیوازم کے خطروں سے بچ سکیں گے۔ وہ اتنا کہہ کر ہی کہ غریبوں کے پاس جاؤ' گاؤں کی طرف جاؤ' ان کو دوا علاج مفت دو' سمجھتے ہیں کہ ہمارا پروگرام مکمل ہوگیا۔ وہ چھایہ وادی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا کوئی خاص مطلب تو نہیں نکل سکتا' محض دل کا جوش

بڑھایا جاسکتا ہے۔بس قدیم تہذیب کے علاوہ ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں۔نوجوانوں کے دماغ کو وہ کچھ نیا نہیں دیتے۔ محض دل کو جذبات سے ہی بھرنا چاہتے ہیں۔ان کا نوجوانوں میں بہت اثر ہے اور مزید پیدا ہو رہا ہے۔ان کے دقیانوسی اور محدود خیالات یہی ہیں جو کہ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں درج کیے ہیں۔ان کے نظریات کا سیاسی حلقوں میں براہ راست اثر نہ ہونے کے باوجود خاصا اثر پڑتا ہے۔خاص کر اس وجہ سے کہ نوجوانوں کو ہی کل آگے بڑھنا ہے اور ان ہی کے درمیان ان خیالات کی تشہیر کی جارہی ہے۔

اب ہم شری سبھاش چندر بوس اور مسٹر جواہر لعل نہرو کے خیالات کی جانب آرہے ہیں۔دو تین ماہ قبل وہ بہت سی کانفرنسوں کے صدر بنائے گئے اور انہوں نے اپنے اپنے خیالات لوگوں کے سامنے رکھے۔سبھاش بابو کو حکومت تختہ پلٹ گروہ کا ممبر سمجھتی ہے اور اس لئے انہیں بنگال ایکٹ کے تحت قید کر رکھا تھا۔وہ رہا ہوئے اور گرم دل کے لیڈر بنائے گئے۔وہ ہندوستان کا آدرش مکمل سوراج مانتے ہیں اور مہاراشٹر کانفرنس کی صدارتی تقریر میں انہوں نے اسی تجویز کی تشہیر کی۔

پنڈت جواہر لعل سوراج پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لعل نہرو ہی کے فرزند ہیں۔بیرسٹری پاس ہیں، دانشور ہیں، روس وغیرہ ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔آپ بھی گرم دل کے لیڈر ہیں اور مدراس کانفرنس میں آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی کوششوں کی ہی وجہ سے مکمل سوراج کی تجویز پاس ہو سکی تھی۔آپ نے امرتسر کانفرنس کی تقریر میں بھی اس بات پر زور دیا۔لیکن پھر بھی ان دونوں لوگوں کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔امرتسر اور مہاراشٹر کانفرنس کے ان دونوں صدور کی تقاریر پڑھ کر ہمیں ان کے خیالات میں واضح فرق نظر آیا۔لیکن بعد میں بمبئی کی ایک تقریر میں یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آ گئی۔پنڈت جواہر لعل نہرو اس اجلاس عام کی صدارت کر رہے تھے اور سبھاش چندر نے تقریر کی۔وہ ایک بہت جذباتی بنگالی ہیں۔انہوں نے تقریر شروع کی کہ ہندوستان کا دنیا کے نام ایک خصوصی پیغام ہے۔وہ دنیا کو روحانی تعلیم دے گا۔خیر آگے وہ دیوانوں کی طرح کہنا شروع کر دیتے ہیں۔چاندنی رات میں تاج محل دیکھو اور جس دل کی آواز کا یہ نتیجہ تھا' اس کی عظمت کا تصور کرو۔سوچو' ایک بنگالی ناول نگار نے لکھا ہے کہ ہم میں یہ ہمارے آنسو ہی جم جم کر پتھر بن گئے ہیں۔وہ بھی واپس ویدوں کی طرف ہی واپس لوٹنے پر زور دے رہے ہیں۔آپ نے اپنی پونہ والی تقریر میں' قومیت' کے تعلق سے کہا ہے کہ بین اقوامیت' قومیت کو ایک محدود دائرۂ فکر پر مبنی نظریہ ثابت کرتی ہے۔لیکن یہ بھول ہے۔ہندوستانی قومیت کا خیال ایسا نہیں ہے۔وہ نہ محدود ہے نہ خود غرضی سے پر ہے اور نہ تکلیف دہ ہے کیوں کہ اس کی جڑ یا بنیاد تو' ستیم شوم سندرم' میں ہے یعنی' سچ' فلاح و بہبود اور خوب صورتی۔

یہ بھی وہی چھایاواد ہے۔خالص جذباتیت ہے۔ساتھ ہی انہیں بھی اپنے قدیم عہد پر بہت یقین ہے۔وہ ہر بات میں اپنے قدیم عہد کی عظمت کو دیکھتے ہیں۔پنچایتی راج کا طریق کار اور ان کے خیالات میں کوئی جدت نہیں ہے۔پنچایتی راج اور عوام کا راج' وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں بہت پرانا ہے۔وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کمیونزم بھی ہندوستان کے لئے نئی چیز نہیں ہے۔خیر انہوں نے سب سے زیادہ اس دن کی تقریر میں جس بات پر زور دیا تھا' وہ یہ تھی کہ ہندوستان کا دنیا کے لئے ایک خاص پیغام ہے۔پنڈت جواہر لعل وغیرہ کے خیالات اس کے بالکل برعکس ہیں۔وہ کہتے ہیں:

''جس ملک میں جاؤ' وہی سمجھتا ہے کہ اس کا دنیا کے لئے ایک خاص پیغام ہے۔انگلینڈ دنیا کو تہذیب یافتہ بنانے کا ٹھیکہ دار بنتا ہے۔میں تو کوئی خاص بات اپنے ملک کے پاس نہیں دیکھتا۔سبھاش بابو کو ان باتوں پر بہت یقین ہے''۔

جواہر لعل کہتے ہیں:

" Every youth must rebel. Not only in political sphere, but in social economic and religious spheres also.I have not much use for any man who comes and tells me that such and such thing is said in Quran, Every thing unreasonable must be discarded even if they find authourity for it in the vedas and Quran"

یعنی ”ہر نوجوان کو بغاوت کرنی چاہئے۔سیاسی حلقوں میں ہی نہیں بلکہ سماجی، معاشی اور مذہبی حلقوں میں بھی۔ مجھے ایسے شخص کی کوئی ضرورت نہیں جو آ کر کہے کہ فلاں بات قرآن میں لکھی ہوئی ہے۔کوئی بات، جو اپنی سمجھ داری کی پرکھ میں صحیح ثابت نہ ہوُاسے خواہ وید اور قرآن میں کتنا ہی اچھا کیوں نہ بتایا گیا ہو نہیں ماننی چاہئے“۔

یہ ایک عہد ساز کا خیال ہے اور سبھاش کا بھی جو تبدیلی حکومت کے قائل ہیں۔ایک کے خیال میں ہماری پرانی چیزیں بہت اچھی ہیں اور دوسرے کے خیال میں ان کے خلاف بغاوت کردی جانی چاہئے۔ایک کو جذباتی کہا جاتا ہے اور ایک کو عہد ساز اور باغی۔پنڈت جی ایک جگہ کہتے ہیں:

"To those who still fondly cherish old ideas and are striving to bring back the conditions which prevailed in Arabia 1300 years ago or in the vedic age in India. I say, that it is inconvinciable that you can bring back the hoary past. The world of reality will not retrace its steps, the world of imagination may remain stationary".

وہ کہتے ہیں کہ جواب بھی قرآن کے زمانے کے یعنی 1300 برس قبل کے عرب کے حالات پیدا کرنا چاہتے ہیں، جو پیچھے ویدوں کے زمانے کی طرف دیکھ رہے ہیں، ان سے میرا یہ کہنا ہے کہ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ عہد واپس لوٹ آئے گا۔درحقیقت دنیا پیچھے نہیں لوٹ سکتی، تصوراتی دنیا کو چاہے کچھ دن یوں ہی خیالوں میں بسائے رکھو اور اسی لئے وہ بغاوت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

سبھاش بابو مکمل آزادی کے حامی ہیں کیوں کہ وہ کہتے ہیں کہ انگریز مغرب کے رہنے والے ہیں، ہم مشرق کے۔ پنڈت جی کہتے ہیں، ہمیں اپنا راج قائم کر کے سارا سماجی نظام تبدیل کر دینا چاہئے۔اس کے لئے مکمل آزادی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

سبھاش بابو مزدوروں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کی حالت میں اصلاح کے خواہاں ہیں۔ پنڈت جی ایک انقلاب بپا کر کے سارے نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں۔سبھاش جذباتی ہیں، دل کے لئے۔نوجوانوں کو بہت کچھ دے رہے ہیں لیکن صرف دل کے لئے۔دوسرا عہد ساز ہے جو کہ دل کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی بہت کچھ دے رہا ہے۔

"They should aim at Swaraj for the masses based on socialism. That was a revolutionary change which they could not bring about without revolutionary method...... Mere reform or gradual repairing of the existing machinery could not achieve the real proper Swaraj for the General Masses"

یعنی ہمارا آدرش سماج وادی اصولوں کے مطابق ہونا چاہئے' جو کہ عہد ساز طریقوں کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔محض اصلاح اور موجودہ حکومت کی مشینری کی آہستہ آہستہ کی گئی مرمت عوام کے لئے حقیقی آزادی نہیں لاسکتی۔

یہ ان کے خیالات ونظریات کا عین عکس ہے۔سبھاش بابو قومی سیاست کی طرف اتنے وقت تک ہی توجہ دینا ضروری سمجھتے ہیں جتنے وقت تک دنیا کی سیاست میں ہندوستان کا تحفظ اور ترقی کا سوال ہے۔مگر پنڈت جی قومیت کے محدود دائرے سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے سامنے دونوں نظریات آگئے ہیں۔ہمیں کس طرف جھکنا چاہئے؟ ایک پنجابی اخبار نے سبھاش کی تعریف کے پل باندھ کر پنڈت جی وغیرہ کے بارے میں کہا تھا کہ ایسے باغی پتھروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاتے ہیں۔ دھیان رکھنا چاہئے کہ پنجاب پہلے ہی بہت جذباتی صوبہ ہے۔لوگ جلد ہی جوش میں آجاتے ہیں اور جلد ہی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔

سبھاش آج شاید دل کو کچھ غذا دینے کے علاوہ کوئی دوسری ذہنی خوراک نہیں دے رہے ہیں۔اب ضرورت اس بات کی ہے کہ پنجاب کے نوجوانوں کو ان عہد ساز خیالات کو بہت غور وفکر کے بعد پختہ کر لینا چاہئے۔اس وقت پنجاب کو ذہنی غذا کی سخت ضرورت ہے اور یہ پنڈت جواہر لعل نہرو سے ہی مل سکتی ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے اندھے پیروکار بن جانا چاہئے۔لیکن جہاں تک خیالات ونظریات کا تعلق ہے' وہاں تک اس وقت پنجابی نوجوانوں کو ان کے ساتھ رہنا چاہئے تا کہ وہ انقلاب کے حقیقی معنی' ہندوستان کے انقلاب کی ضرورت' دنیا میں انقلاب کا مقام کیا ہے' وغیرہ کے بارے میں جان سکیں۔غور وفکر کے ساتھ نوجوان اپنے خیالات کو مضبوط کریں تا کہ نا امیدی' مایوسی اور شکست کے وقت میں بھی گمراہ نہ ہو پائیں اور اکیلے کھڑے ہو کر دنیا کے مقابلے میں ڈٹے رہ سکیں۔اسی طرح عوام انقلاب کے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں گے۔

لالہ لاجپت رائے اور نوجوان

اگست 1928 کے 'کرتی' میں شائع اس مضمون میں لالہ لاجپت رائے کے داخلی تنازعات کو بھگت سنگھ نے اجاگر کیا ہے -مدیر

لالہ لاجپت رائے وغیرہ نہ جانے کیوں پہلے سے ہی نوجوانوں کی تقاریر کی مخالفت کرتے آرہے تھے۔انہوں نے حب الوطنی کا اصول اٹلی کے عظیم میجنی سے سیکھا۔وہ نوجوانوں کا بڑا معترف تھا اور کہتا تھا کہ "بڑے کاموں کا بوجھ نوجوان ہی اٹھاتے ہیں' ان کی آواز میں جادو جیسا اثر ہوتا ہے۔وہ عوام جدوجہد آزادی کے لئے تیار کر دیتے ہیں"۔ایسے شخص کو اپنی زندگی کا اصول بتانے والا شخص اس کے بالکل برعکس رویہ اختیار کرے' یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔1907-08 کے پرانے گڑے مردے کیا اکھاڑنے؟ آجکل کی کچھ باتیں کافی ہیں۔

پچھلی کونسل کے چناؤ میں لالہ جی نے کانگریس کا ساتھ چھوڑ کر اس کی مخالفت شروع کر دی اور اسی دوران ایسی باتیں کہتے رہے جو کہ کسی بھی طرح انہیں زیبا نہیں دیتی تھیں۔یہ دیکھ کر چند حساس نوجوانوں نے آپ کے خلاف آواز اٹھائی۔اس کا بدلہ لینے کے لئے لالہ جی نے کھلے عام تقریروں میں کہا کہ یہ نوجوان بہت ہی خطرناک اور انقلاب کے حامی ہیں اور لینن

جیسا قائد چاہتے ہیں۔ مجھ میں لینن بننے کی قوت نہیں۔ ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ ان نوجوانوں کو اگر پچاس روپے کی بھی نوکری مل گئی تو جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا پچاس روپے کے لئے اپنا آدرش چھوڑنے والے نوجوان ہی لینن کے ساتھ تھے؟ کیا لینن اسی سطح کا ہے؟ نہیں تو ایسی باتیں کیوں کہی گئیں؟ صرف اس لئے کہ لالہ جی جہاں ایک طرف سرکار کو ان کے خلاف سخت کارروائی کے لئے آمادہ کر رہے ہیں وہیں عوام کی نظروں میں ان کی عزت کم کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔

بھائی چارے سے کسی شخص کسی کام یا نظریات کی از حد مذمت کرنے کا سب کو اختیار ہے لیکن دانستہ اور جان بوجھ کر کسی کے افکار و نظریات کی غلط بیانی کر کے غلط فہمیاں پیدا کر کے کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا ہر شخص کے لئے نامناسب ہے۔ اس وقت خواہ لالہ لاجپت رائے ہوں یا کوئی نامعلوم نوجوان۔ اس چناؤ کے بعد متعدد مواقع ایسے آئے لیکن ان کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

لالہ جی نے ابھی دوسرا مضمون لکھا ہے۔ در حقیقت یہ ''کنٹری لیگ'' جس کا تذکرہ ہم پچھلے شمارہ میں کر چکے ہیں کے پس منظر میں لکھا گیا تھا لیکن اس میں نوجوانوں کا ذکر آ گیا۔ لالہ جی فرماتے ہیں کہ آج کل کے متشدد نظریات کے حامل نوجوانوں کی تقریروں سے عوام کو بچنا چاہئے۔ یہ عہد ساز انقلابی ہیں۔ ملکیت کے لئے ان کا پرچار نقصان دہ ہے کیوں کہ اس سے طبقاتی کشمکش پیدا ہونے کا خوف ہے۔ آخر میں کہا کہ یہ کام چند غیر ملکی شر پسند عناصر کے اکسانے پر شروع کیا گیا ہے۔ وہ خارجی عناصر ہماری قومی تحریک میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں اس لئے وہ بہت خطرناک ہیں۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اس قسم کے پرچار سے ملکیت والے افراد سرکار سے مل جائیں گے۔ ان پرچار کرنے والے نوجوانوں کو گمراہ خارجی عناصر کے بہکاوے میں آئے ہوئے شر پسند اور حریص بتاتے ہوئے آخر میں کہا ہے کہ انہیں پنڈت جواہر لعل نہرو پر مکمل اعتماد ہے۔ وہ اگر کچھ کر رہے ہیں یا کہہ رہے ہیں تو نیک نیتی اور عقل و فہم سے۔ بہت خوب! جن پنڈت جواہر لعل نہرو وغیرہ کے افکار پر روس کا اچھا خاصا اثر ہوا جنہوں نے روس سے واپسی کے بعد ان افکار کی تشہیر شروع کی ان کی نیت پر کوئی شک نہیں۔ وہ غیر ملکی اثر یا اشتعال میں نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ نیک نیتی سے کہہ رہے ہیں لیکن جو بے چارے ملک سے باہر نہیں جا سکے وہ اکساوے میں آئے ہوئے ہیں۔ خوب! بہت خوب! اصل بات یہ ہے کہ جواہر لعل نہرو کی حیثیت بہت بڑی ہو گئی ہے۔ ان کا نام کانگریس کی صدارت کے لئے پیش ہو رہا ہے تو امید بھی ہے کہ وہ جلد ہی صدر بھی بن جائیں گے۔ ان کے خلاف لکھنے پر اینٹ کا جواب پتھر سے ملنے کا خوف ہوتا ہے لیکن گمنام نوجوانوں کے لئے جو دل میں آئے...... کون پوچھتا ہے۔ نوجوانوں کو مصیبت میں پھنسانے کی ان کوششوں کو ہم کیا کہیں؟ لالہ جی کو یہ زیب نہیں دیتا۔ خیر جوان کے دل میں آئے کریں۔ اب ہم ان کی کچھ باتوں کا جواب دینا چاہیں گے۔

سب سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس پرچار کے لئے کوئی غیر ملکی ہمیں گمراہ نہیں کر رہا ہے۔ نوجوان کسی کے بہکاوے میں یہ باتیں نہیں کر رہے ہیں بلکہ اب ملک کے اندر سے ہی محسوس کرنے لگے ہیں۔ لالہ جی خود بڑے آدمی ہیں۔ فرسٹ یا سکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ تھرڈ کلاس میں کون سفر کر رہا ہے؟ یہ کیا جانیں کہ تھرڈ کلاس کے مسافر خانہ میں کسے لاتیں کھانی پڑتی ہیں؟ وہ موٹر میں بیٹھ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے ہزاروں گاؤں سے گزر جاتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ہزاروں لوگوں پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا آج ہم 'ان ہپی انڈیا' جیسی کتاب کے مصنف کو ہندوستان کے کروڑوں بھوکوں مرنے والوں کی قابل رحم حالت بتائیں؟ کیا آج ان کروڑوں انسانوں کو دیکھ کر جو صبح سے شام تک خون

پسینہ ایک کر کے پیٹ بھی نہیں بھر سکتے۔ یہ ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی باہر سے آ کر ہمیں کہے کہ ان کے پیٹ بھرنے کی کوئی راہ نکالو۔ ہم گاؤوں میں گرمی' سردی' بارش' دھوپ' لو اور کہرے میں دن رات کسانوں کو کام کرتے دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ بے چارے روکھی سوکھی روٹی کھا کر گزارا کر رہے ہیں اور قرض کے بوجھ تلے دبے ہیں۔ اس وقت کیا ہم تڑپ نہیں اٹھتے؟ اس وقت ہمارے دلوں میں آگ نہیں بھڑک اٹھتی؟ اس وقت بھی کیا ہمیں کسی کی ضرورت رہ جاتی ہے جو آ کر یہ بتائے کہ اس نظام کو بدلنے کی کوشش کرو۔ جب کہ ہم دن بہ دن دیکھتے ہیں کہ مزدور بھوکے مرتے ہیں اور نکمے بیٹھ کر کھانے والے لطف لے رہے ہیں تو کیا ہم اس معاشی اور سماجی نظام کی خرابیوں کو محسوس نہیں کر سکتے؟ جب ہم دیکھتے ہیں کہ روز بہ روز جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے' عوام کی حالت دن بہ دن قابل رحم ہوتی جا رہی ہے تو کیا ہمیں خارجی مبلغین کی ضرورت ہے جو آ کر ہمیں یہ سمجھائیں کہ انقلاب کی ضرورت ہے...... کروڑوں انسانوں کو جنہیں ہم نے اچھوت کہہ کر ان سے فاصلہ بنا رکھا ہے' ان کی دردناک حالت دیکھ کر کیا ہمیں غصہ نہیں آتا؟ کروڑوں (لوگوں) دنیا کی بہت ترقی کر سکتے ہیں' وہ خدمت خلق کر سکتے تھے لیکن آج وہ ہم پر بار محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی اس حالت میں اصلاح کے لئے' انہیں مکمل طور پر انسان بنانے کے لئے اور کنوؤں کے چبوترے پر چڑھانے کے لئے کیا تحریک کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا انہیں ایسے نظام میں لانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ہماری طرح روزی کما سکیں؟ اس کے لئے کیا سماجی اور اقتصادی قوانین میں انقلاب کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا پنجاب اور ہندوستان کے نوجوانوں میں بذات خود کسی احساس کی طاقت باقی نہیں رہ گئی ہے؟ ان کے سینے میں کیا دل نہیں دھڑکتا؟ کیا ان کے دلوں میں انسانیت نہیں ہے؟ نہیں تو پھر کیوں کہا جاتا ہے کہ غیر ملکیوں نے آ کر انہیں اکسایا ہے۔ ہاں' ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ روسی انقلاب نے دنیا کے سامنے بالکل جدید اور اچھوتے نظریات و افکار پیش کئے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ جن باتوں کا حل شاید ابھی ہم خود نہیں سوچ سکتے' روسی دانشوروں نے تاحیات مصائب سہہ کر' لمحہ لمحہ زندگی ختم کرتے ہوئے ان کے بارے میں اپنے نظریات دنیا کے سامنے پیش کئے۔ کیا انہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ملنا چاہئے؟ کیا ان کے نظریات سے مماثلت بھی اشتعال ہے؟ پھر تو لالہ جی کو میجنی نے ملک کے نوجوانوں کو گمراہ کر کے خدمت خلق کے کام میں لگایا تھا۔

سوال یہ ہے کہ آج کل 1928 میں کیا دنیا کو فرانسیسی انقلاب سے کوئی سبق سیکھنا اور اسے اپنا آئیڈیل بنانا چاہئے یا نئے ماحول میں جدید افکار سے مکمل روسی انقلاب کو؟ کیا لالہ جی کی منشا یہ ہے کہ اب انگریز حکومت کے خلاف ہی انقلاب لایا جائے اور حکومت کی باگ ڈور امیروں کے ہاتھوں میں دی جائے؟ کروڑوں لوگ اسی طرح نہیں' اس سے بھی بری حالت میں رہیں اور مریں تو پھر سینکڑوں برسوں کے خون خرابے اور قتل و غارت گری کے بعد دوبارہ اس راستے پر آئیں اور پھر ہم اپنے سرمایہ داروں کے خلاف انقلاب لائیں؟ یہ اول درجے کی حماقت ہوگی۔

لالہ جی نے ایک دوبار اس کے لفظ سن کر گاؤوں میں تنظیم کی بات تھوڑی اٹھائی تھی۔ لالہ جی کو تو گاؤوں میں جانے کی فرصت ہی نہیں۔ وہ کیا جانیں کہ عوام کے خیالات کیا ہیں؟ لوگ واضح طور پر کہتے ہیں کہ ہمیں انقلاب کا کیا فائدہ؟ جب اسی طرح مر کر دو وقت کی روٹی جمع کرنی ہے اور اس وقت بھی نمبردار' تحصیل دار اور تھانے دار کو اسی طرح مظالم کرنے ہیں' اسی طرح کرائے وصول کئے جانے ہیں تو ہم ابھی کی روٹی کیوں گنوائیں؟ کسی کے لئے اپنے عزیزوں کو الجھن میں کیوں ڈالیں؟ ہم انہیں کیا بتائیں کہ ان کے اسلاف کیسے تھے جس سے کہ وہ قربانی کے لئے تیار ہو جائیں۔

اچھا' مانا کہ یہاں انقلاب آ جائے تو لالہ جی کے خیال میں کسے حکمرانی سونپی جائے گی؟ کیا مہاراجہ وردھان پٹیالہ کو اور سرمایہ داروں کی جماعت کو؟ کیا آج امریکہ اور فرانس کے کروڑوں مزدور بھوکوں نہیں مر رہے ہیں؟ ہم سب کچھ جان بوجھ

کر کیوں کنوئیں میں گریں؟

لالہ جی کہتے ہیں کہ ہمارے اشتراکی نظریات کی تشہیر سے سرمایہ دار سرکار کے ساتھ مل جائیں گے۔ بہت خوب! پہلے وہ کدھر ہیں؟ کتنے سرمایہ دار عہد ساز بنے ہیں؟ انقلاب سے' جنہیں اپنے سرمایہ میں تھوڑا بہت نقصان ہونے کا خطرہ ہوگا' وہ ہمیشہ ہی مخالف ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں ان کی جی حضوری کے لئے اصولوں کو ترک کر کے خواہ مخواہ اپنے کام کو نقصان پہنچانا مناسب نہیں۔ اپنے مطلب کے لئے اپنے ساتھ ضرور ملا لیں گے لیکن آہستہ آہستہ ان کا سرمایہ چھین کر اسے اپنے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں منتقل کر دیں گے۔ اس وقت یہ غریب (ہو گئے سرمایہ دار) آج جیسے کروڑوں مزدوروں میں شامل ہو کر مرتے رہیں گے۔ انہیں سماجی نظام میں ناانصافی نظر آئے گی۔ اگر وہ اشتراکی انقلاب پیدا کر لیں تو آج ان کی حرام خوری پر تو ضرور لگام لگے گی۔ لیکن دنیا کی عام خوش حالی میں جو کہ یقینی طور پر آنی ہے' شامل ہو کر وہ بہت خوش حال رہیں گے۔ ہندوستانی سرمایہ دار سوچ لیں کہ ان کو کس میں فائدہ ہے؟

لیکن مزدور آندولن ان کے لئے نہیں رک سکتا' ان کا انتظار بھی نہیں کر سکتا۔ نوجوانوں کو گھبرانا نہیں چاہئے۔ کام کو شروع کرنے میں کافی دشواریاں پیش آتی ہیں' اس کا حوصلہ مندی کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہئے۔ لالہ جی اور دوسرے سرمایہ دار پالیسی کے حامی لیڈران بھی آہستہ آہستہ خود بہ خود میدان سے باہر ہو رہے ہیں' جس طرح سریندر ناتھ بنرجی ہوئے تھے اور آج سپرو اور چنتامنی جیسے ہو رہے ہیں۔ آخر میں مزدور آندولن کی جیت ہوگی۔ کہو اشتراکیت پسندوں کی جیت! عہد سازی کا رجحان قائم رہے۔

بم کا دیدار

قومی تحریک کے دوران انقلابیوں کی مذمت میں گاندھی جی برطانوی سرکار سے ایک قدم آگے رکھتے تھے۔ 23 دسمبر 1929 کو انقلابیوں نے برطانوی استعماریت کے ستون وائسرائے کی گاڑی کو اڑانے کی کوشش کی جو کامیاب رہے۔ گاندھی جی نے اس واقعہ پر سخت مضمون بہ عنوان 'بم کی پوجا' جس میں انہوں نے وائسرائے کو ملک کا خیر خواہ اور نوجوانوں کو آزادی کی راہ میں خلل ڈالنے والا بتایا۔ اسی کے جواب میں ہسپرس کی جانب سے بھگوتی چرن وو ہرانے 'بم کا دیدار' مضمون لکھا جس کا عنوان ''انڈین ری پبلک سوشلسٹ پارٹی کا منشور'' رکھا۔ بھگت سنگھ نے جیل میں اسے آخری شکل دی۔ 26 جنوری 1930 کو اسے پورے ملک میں تقسیم کیا گیا۔ مدیر

حالیہ واقعات' خاص طور سے 23 دسمبر 1929 کو وائسرائے کی اسپیشل ٹرین اڑانے کی جو کوشش کی گئی تھی' اس کی مذمت کرتے ہوئے کانگریس کی پاس کردہ قرارداد اور ینگ انڈیا میں گاندھی جی کے تحریر کردہ مضامین سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انڈین کانگریس نے گاندھی جی سے مفاہمت کر کے ہندوستانی انقلابیوں کے خلاف زبردست تحریک چھیڑ دی ہے۔ عوام کے درمیان تقریروں اور اخباروں کے توسط سے انقلابیوں کے خلاف مسلسل تشہیر کی جاتی ہے۔ یا تو یہ دانستہ کیا گیا یا پھر عدم علم کے سبب ان کے بارے میں غلط پرچار ہوتا رہا ہے اور انہیں غلط سمجھا جاتا رہا مگر انقلابی اپنے اصولوں اور کاموں کی ایسی مذمت سے نہیں گھبراتے ہیں بلکہ وہ ایسی مذمت کا خیر مقدم کرتے ہیں کیوں کہ وہ اسے اس بات کا سنہرا موقع سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے

سے انہیں ان لوگوں کو انقلابیوں کے بنیادی اصولوں اور اعلیٰ آدرشوں کو جو ان کی تحریک اور قوت کے لامحدود وسائل ہیں' سمجھانے کا موقع ملتا ہے۔ امید کی جاتی ہے اس مضمون سے عام لوگوں کو یہ جاننے کا موقع ملے گا کہ انقلابی کیا ہیں؟ ان کے خلاف ہونے والے غلط پرچار سے پیدا ہونے والی غلط فہمی سے انہیں بچایا جا سکے۔

پہلے ہم تشدد اور عدم تشدد کے سوال پر غور کریں گے۔ ہمارے خیال سے ان لفظوں کا استعمال ہی غلط کیا گیا ہے اور ایسا کرنا ہی دونوں گروپ کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے کیوں کہ ان لفظوں سے دونوں ہی گروپ کے اصولوں کو واضح طور پر علم نہیں ہوتا۔ تشدد کا مطلب ہے ناانصافی کے لئے کیا گیا طاقت کا استعمال مگر انقلابیوں کا تو یہ مقصد نہیں ہے' دوسری طرف عدم تشدد کا معنی جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے' وہ یہ ہے کہ ضمیر کی طاقت کا اصول۔ اس کا استعمال ذاتی اور قومی حقوق کی حصولیابی کے لئے کیا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر امید کی جاتی ہے کہ اس طرح آخر میں اپنے مخالفین کے دلوں کو بدلنا ممکن ہو سکے گا۔

ایک انقلابی جب کچھ باتوں کو اپنا حق سمجھ لیتا ہے تو وہ ان کی مانگ کرتا ہے' اپنی اس مانگ کی حمایت میں دلیلیں دیتا ہے' پوری ضمیری قوت کے ساتھ اسے حاصل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے' اس کی حصولیابی کے لئے انتہائی مصائب سے دوچار ہوتا ہے' اس لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی پیش کرتا ہے اور اس کی حمایت میں وہ اپنی مکمل جسمانی طاقت کا استعمال بھی کرتا ہے۔ اس کی انہی کوششوں کو آپ چاہے جس نام سے پکاریں' مگر آپ انہیں تشدد کا نام نہیں دے سکتے کیوں کہ ایسا کرنا ڈکشنری میں دیئے گئے لفظ کے معانی کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ستیہ گرہ کا مطلب ہے ستیہ کے لئے آگرہ۔ اس کی قبولیت کے لئے محض ضمیری طاقت کے استعمال کی ہی اپیل کیوں؟ اس کے ساتھ ساتھ جسمانی طاقت کا استعمال بھی (کیوں) نہ کیا جائے؟ انقلابی آزادی کی حصولیابی کے لئے اپنی جسمانی اور اخلاقی قوت دونوں کے استعمال میں یقین رکھتے ہیں مگر اخلاقی قوت کا استعمال کرنے والے جسمانی قوت کے استعمال کو فضول مانتے ہیں۔ اس لئے اب سوال یہ نہیں ہے کہ آپ تشدد چاہتے ہیں یا عدم تشدد' بلکہ سوال تو یہ ہے کہ آپ اپنے مقصد کی حصولیابی کے لئے جسمانی قوت سمیت اخلاقی قوت کا استعمال کرنا چاہتے ہیں' یا محض ضمیر کی قوت کا؟

انقلابیوں کو یقین ہے کہ انقلاب سے ہی آزادی ملے گی۔ وہ جس انقلاب کے لئے کوشاں ہیں اور جس انقلاب کی شکل ان کے سامنے واضح ہے' اس کا مطلب محض یہ نہیں ہے کہ غیرملکی حکمرانوں اور ان کے حامیوں سے انقلابیوں کی محض مسلح جد وجہد ہو بلکہ اس مسلح جدوجہد کے ساتھ ساتھ جدید سماجی نظام کے دروازے ملک کے لئے آزاد ہو جائیں۔ انقلاب سرمایہ داری' نظریات اور کچھ لوگوں کو ہی خصوصی اختیار دلانے والے سسٹم کا خاتمہ کر دے گا۔ یہ انقلاب قوم کو اپنے پیروں پر کھڑا کرے گا۔ اس سے نئے ملک اور نئے سماج کی تشکیل ہوگی۔ انقلاب سے سب سے بڑی بات تو یہ ہوگی کہ وہ مزدور اور کسانوں کا اسٹیٹ قائم کر کے ان سبھی سماجی غیر پسندیدہ عناصر کا خاتمہ کر دے گا جو ملک کی سیاسی قوت کو ہتھیا کر بیٹھے ہیں۔

آج کی نوجوان نسل کو جو ذہنی غلامی اور مذہبی سخت گیریت کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں اور اس سے نجات پانے کے لئے نوجوان بے قرار ہیں' انقلابی اسی میں ترقی پذیریت کے بیج دیکھ رہے ہیں۔ نوجوان جیسے جیسے اس نفسیات کو اپنائے گا' ویسے ویسے قوم کی غلامی کی تصویر اس کے سامنے واضح ہوتی جائے گی اور ملک کو آزاد کرانے کی اس کی خواہش تقویت پائے گی۔ اور اس کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ نوجوان انصاف' غصہ اور حسد جلن سے بالاتر ہو کر ناانصافی کرنے والوں کا قتال نہ شروع کر دیں۔ اس طرح ملک میں دہشت گردی جنم لیتی ہے۔ دہشت گردی مکمل انقلاب نہیں اور انقلاب بھی دہشت گردی کے بغیر مکمل نہیں۔ یہ تو انقلاب کا ایک لازمی جز ہے۔ اس اصول کا ثبوت تاریخ کے کسی بھی انقلاب

کا تجزیہ کر کے جانا جاسکتا ہے۔ دہشت گردی ظالم کے دل میں خوف اور مصیبت زدہ عوام میں جذبہ انتقام پیدا کر کے اسے قوت عطا کرتا ہے۔ غیر مستحکم جذباتی لوگوں کو اس سے حوصلہ ملتا ہے اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے دنیا کے سامنے انقلاب کا مقصد حقیقی طور پر عیاں ہو جاتا ہے کیوں کہ یہ کسی ملک کی آزادی کی قومی امیدوں کی یقین دہانی کرانے والے ثبوت ہیں جیسے دوسرے ممالک میں ہوتا آیا ہے ویسے ہی ہندوستان میں دہشت گردی انقلاب کی شکل اختیار کرلے گی اور آخر میں انقلاب سے ملک کو سماجی، سیاسی اور اقتصادی آزادی نصیب ہوگی۔

تو یہ ہے انقلابی کے اصول جن میں وہ یقین رکھتا ہے اور جنہیں ملک کے لئے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس حقیقت کی حصولیابی کے لئے وہ خفیہ اور کھلے عام دونوں طریقوں سے کوشش کر رہا ہے، وہی تجربہ اس کے نشانہ پر پہنچنے کے لئے مشعل راہ ہے۔ انقلابی جن طریقوں میں یقین رکھتے ہیں، وہ کبھی ناکام نہیں ہوں گے۔

اس درمیان کانگریس کیا کر رہی تھی؟ اس نے اپنا مقصد سوراج سے بدل کر مکمل آزادی پر مرکوز کر دیا۔ اس اعلان کے بعد کوئی بھی شخص یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ کانگریس نے برطانوی حکومت کے خلاف نا جنگ معاہدہ کر کے انقلابیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں کانگریس کا پہلا وار تھی وہ تجویز جس میں 23 دسمبر 1929 کو وائس رائے کی اسپیشل ٹرین اڑانے کی کوشش کی مذمت کی گئی اور تجویز کا مسودہ گاندھی جی نے خود تیار کیا تھا اور اس کو پاس کرانے کے لئے گاندھی جی نے پورا زور لگا دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 1913 رکنی تعداد میں وہ محض 31 زیادہ ووٹوں سے پاس ہوسکا۔ کیا اس اقل ترین اکثریت میں بھی سیاسی ایمان داری تھی؟ اس سلسلے میں ہم سرلا دیوی چودھرانی کی رائے یہاں پیش کریں۔ وہ پوری زندگی کانگریس کی پرستار رہیں۔ اس تعلق سے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تھا۔ ”میں نے مہاتما گاندھی سے عقیدت رکھنے والوں کے ساتھ اس موضوع پر جو بات چیت کی، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ اس سلسلے میں اپنی آزادانہ رائے مہاتما گاندھی کے تئیں انتہائی عقیدت کے سبب ظاہر نہ کر سکے اور اس تجویز کے خلاف ووٹ دینے میں ناکام رہے، جس کے محرک مہاتما گاندھی جی تھی۔ جہاں تک گاندھی جی کی دلیل کا سوال ہے، اس پر ہم بعد میں غور کریں گے۔ انہوں نے جو دلائل پیش کئے ہیں، وہ کم وبیش اس سلسلے میں کانگریس میں دیئے گئے خطبہ کی ہی توسیعی شکل ہے۔

اس افسوس ناک تجویز کے بارے میں ایک بات مارک کی ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے، وہ یہ کہ اس میں تنازعہ ہے کہ کانگریس عدم تشدد کا اصول مانتی ہے اور پچھلے دس برسوں سے وہ اس کے حق میں تشہیر کرتی رہی ہے۔ یہ سب ہونے کے باوجود تجویز کی حمایت میں تقاریر میں گالی گلوچ کی گئی۔ انہوں نے انقلابیوں کو بزدل کہا اور ان کے کاموں کو قابل نفریں بتایا۔ ان میں سے ایک مقرر نے دھمکی آمیز انداز میں یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر وہ (ممبران) گاندھی جی کی قیادت چاہتے ہیں تو انہیں اس تجویز کو اتفاق رائے سے پاس کرنا چاہئے۔ ان سب اقدامات کے باوجود یہ تجویز بہت کم ووٹوں سے پاس ہوسکی۔ اس سے بلاشبہ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ملک کے عوام کی بڑی تعداد انقلابیوں کی حامی تھی۔ اس طرح سے گاندھی جی ہماری مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس سوال پر تنازعہ پیدا کیا اور اس دنیا کو دکھا دیا کہ کانگریس جو عدم اصول کا گڑھ تصور کیا جاتا ہے، وہ مکمل نہیں تو ایک حد تک تو کانگریس سے زیادہ انقلابیوں کے ساتھ ہے۔

اس بارے میں گاندھی جی نے جو فتح حاصل کی، وہ ایک طرح سے شکست کے مانند تھی اور اب وہ 'دی کلٹ آف دی بم'' مضمون کے ذریعہ دوسرا حملہ کر بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے میں آگے کچھ کہنے سے قبل اس مضمون پر ہم اچھی طرح غور و فکر کریں گے۔ اس مضمون میں انہوں نے تین باتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کا تیقن، ان کے افکار اور ان کی آراء۔ ہم ان کے تیقن کا تجزیہ نہیں

کریں گے کیوں کہ یقین میں حجت کا کوئی مقام نہیں۔ گاندھی جی جسے تشدد کہتے ہیں اور جس کے خلاف انہوں نے مدلل افکار ظاہر کئے ہیں ہم ان کا سلسلہ وار تجزیہ کریں۔

گاندھی جی سوچتے ہیں کہ ان کی یہ سوچ صحیح ہے کہ بیشتر ہندوستانی عوام کو تشدد کا جذبہ چھو کر بھی نہیں گزرا ہے اور عدم تشدد ان کا سیاسی اسلحہ بن گیا ہے۔ حال ہی میں انہوں نے ملک کا جو دورہ کیا ہے اس کے تجربہ کی بنیاد پر ان کی یہ سوچ بنی ہے مگر انہیں اس سفر کے تجربہ سے اس بھرم میں نہیں پڑنا چاہئے۔ یہ بات درست ہے کہ (کانگریس) لیڈر اپنا دورہ وہیں تک محدود رکھتا ہے جہاں تک ڈاک گاڑی اسے آرام سے پہنچا سکتی ہے جب کہ گاندھی جی نے اپنی یاترا کا دائرہ وہاں تک بڑھا دیا ہے جہاں تک کہ موٹر کار کے ذریعہ وہ جا سکیں۔ اس یاترا میں وہ صاحب ثروت افراد کے پاس ٹھہرے۔ اس یاترا کا زیادہ تر وقت ان کے پرستاروں کے ذریعہ منعقد میٹنگوں میں کی گئی ان کی تعریف' جلسوں میں کبھی کبھار ناخواندہ عوام کو دیئے جانے والے دیدار میں گزرا' جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ انہیں بخوبی سمجھتے ہیں مگر یہی بات اس دلیل کے برعکس ہے کہ وہ عوام کے نظریات کو جانتے ہیں۔

کوئی شخص عوامی نظریات کو محض اسٹیجوں سے دیدار اور وعظ و نصیحت کر کے نہیں سمجھ سکتا۔ وہ تو محض اتنا ہی دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے مختلف موضوعات پر اپنے نظریات عوام کے سامنے پیش کئے۔ کیا گاندھی جی نے ان برسوں میں عوام کی سماجی زندگی میں بھی کبھی جھانکنے کی کوشش کی۔؟ کیا کبھی انہوں نے کسی شام گاؤں کے کسی چوپال کے الاؤ کے پاس بیٹھ کر کسی کسان کے افکار جاننے کی کوشش کی؟ کیا کسی کارخانے کے مزدور کے ساتھ ایک بھی شام گزار کر اس کے نظریات سمجھنے کی کوشش کی؟ مگر ہم نے یہ کیا ہے اور اس لئے ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم عام لوگوں کو جانتے ہیں۔ ہم گاندھی جی کو یقین دلاتے ہیں کہ عام ہندوستانی عام انسانوں کی طرح ہی عدم تشدد اور اپنے دشمن سے پیار کرنے کے روحانی جذبہ کو بہت کم سمجھتا ہے۔ دنیا کا تو یہی قانون ہے تمہارا ایک دوست ہے' تم اس سے محبت کرتے ہو' کبھی کبھی تو بے پناہ کہ تم اس کے لئے اپنی جان بھی دے دیتے ہو۔ تمہارا دشمن ہے' تم اس سے کسی طرح کا رابطہ بھی رکھتے ہو۔ انقلابیوں کا یہ اصول انتہائی سچا' آسان اور سیدھا ہے اور یہ سچ آدم اور حوا کے وقت سے چلا آ رہا ہے اور اس کو سمجھنے میں کبھی کسی کو دقت نہیں پیش آئی۔ ہم یہ بات ذاتی تجربہ کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب لوگ انقلابی نظریات کو سرگرم روپ دینے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوں گے۔

گاندھی جی اعلان کرتے ہیں کہ عدم تشدد کی حمایت اور اپنے آپ کو تکلیف دینے کے سسٹم سے انہیں یہ امید ہے کہ وہ ایک دن غیر ملکی حکمرانوں کے قلب کو تبدیل کر کے اپنے نظریات کا انہیں قائل کر لیں گے۔ اب انہوں نے اپنی سماجی زندگی کے اس چمتکار کے پریم اصول (پریم سنہتا) کی تشہیر کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ وہ بے پناہ اعتماد کے ساتھ اس کا پرچار کر رہے ہیں جیسا کہ ان کے چند معتقدین نے بھی کیا ہے۔ مگر کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستان میں کتنے دشمنوں کا دل تبدیل کر کے وہ انہیں ہندوستان کا دوست بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں؟ وہ کتنے او ڈائروں' ڈائروں وریڈنگ اور اروِن کو ہندوستان کا رفیق بنا سکے ہیں؟ اگر کسی کو بھی نہیں تو ہندوستان ان کے اس نظریات سے کیسے اتفاق کر سکتا ہے کہ وہ انگلینڈ کو عدم تشدد کے ذریعہ سمجھا بجھا کر اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار کر لیں گے کہ وہ ہندوستان کو آزادی دے دیں۔

اگر وائسرائے کی گاڑی کے نیچے بموں کا صحیح طریقے پر دھماکہ ہوا ہوتا تو دو میں ایک بات۔ یقیناً ہوتی یا تو وائسرائے انتہائی زخمی ہو جاتے یا ان کی موت ہو گئی ہوتی۔ ایسے حالات میں وائسرائے اور سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کے مابین صلاح مشورہ نہیں ہو پاتا' یہ کوشش رک جاتی اور اس سے ملک کا ہی بھلا ہوتا۔ کلکتہ کانگریس کے چیلنج کے بعد بھی آزادی کی بھیک مانگنے

کے لئے وائسرائے بھون کے آس پاس منڈلانے والوں کی قابل نفریں کوششیں ناکام ہو جاتیں۔ اگر بم صحیح طریقہ پر پھٹتے تو ہندوستان کا ایک دشمن مناسب سزا پاتا۔ میرٹھ اور لاہور سازش اور بھساول کانڈ کا مقدمہ چلانے والے محض ہندوستان کے دشمنوں کو ہی دوست ظاہر ہو سکتے ہیں۔ سائمن کمیشن کی مجموعی مخالفت سے ملک میں جو اتحاد قائم ہو گیا تھا' گاندھی اور نہرو کی سیاسی دانشوری کے بعد ہی اروِن اسے الگ تھلگ کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ آج کانگریس بھی باہمی انتشار کا شکار ہو گئی۔ ہماری اس بدقسمتی کے لئے وائسرائے یا اس کے چاپلوسوں کے سوا کون ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ اس پر بھی ہمارے ملک میں ایسے لوگ ہیں جو اسے ہندوستان کا دوست کہہ سکتے ہیں۔

ملک میں ایسے بھی لوگ ہوں گے جنہیں کانگریس کے تئیں عقیدت نہیں' اس سے وہ کچھ امید بھی نہیں کرتے۔ اگر گاندھی جی انقلابیوں کو اس زمرہ میں شمار کرتے ہیں تو وہ ان کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ کانگریس نے عوامی بیداری کا اہم کام کیا ہے۔ اس نے عام لوگوں میں آزادی کا جذبہ جگایا ہے کیوں کہ ان کا یقین محکم ہے کہ جب تک کانگریس میں سین گپتا جیسے 'بے مثال' بارسوخ افراد کا' جو وائسرائے کی ٹرین اڑانے میں خفیہ محکمہ کا ہاتھ ہونے کی بات کرتے ہیں؟ اور انصاری جیسے لوگ جو سیاست کم جانتے ہیں اور مناسب دلیل کے بجائے غیر مدلل طور پر کہتے ہیں کہ کسی ملک نے بم سے آزادی حاصل نہیں کی۔ جب تک کانگریس کے نظریات میں ان جیسے نظریات وافکار کا دخل رہے گا' تب تک ملک اس سے بہت کم امید کر سکتا ہے۔ انقلابی تو اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب کانگریسی آندولن سے عدم تشدد کی یہ سنک ختم ہو جائے گی اور وہ انقلابیوں کے شانوں سے شانہ ملا کر مکمل آزادی کے مجموعی نشانوں کی طرف بڑھے گی۔ اس سال کانگریس نے اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے۔ ہم امید کریں کہ اگلے برس وہ آزادی کی حصولیابی کے طریقوں کی بھی حمایت کریں گے۔

گاندھی جی یہ ثابت کرتے ہیں کہ جب بھی تشدد کا استعمال ہوا ہے' فوجی خرچ میں اضافہ ہوا ہے۔ اگر ان کا مقصد انقلابیوں کی گزشتہ 25 برسوں کی سرگرمیوں سے ہے تو ہم ان کے بیان کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ اپنے اس قول کو حقائق اور تخمینوں سے ثابت کریں۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ ان کے عدم تشدد اور ستیہ گرہ کا اثر' جن کا موازنہ جدوجہد آزادی سے نہیں کیا جاسکتا' نوکرشاہی معاشیات پر پڑا ہے۔ تحریکات خواہ وہ متشدد ہوں یا غیر متشدد' کامیاب ہوں یا ناکام' اثر تو ہندستان کی معاشیات پر ہی پڑے گا۔

ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک میں سرکار نے جو مختلف آئینی اصلاحات کئے' گاندھی جی ان میں ہمیں کیوں الجھاتے ہیں؟ انہوں نے مارلیمنٹو ریفارم' مانٹے گیو ریفارم یا اس قسم کی دیگر اصلاحات کی نہ تو کبھی پروا کی اور نہ ہی ان کے لئے تحریکات چلائیں۔ حکومت برطانیہ نے تو یہ ٹکڑے آئینی طور پر تحریک چلانے والوں کے سامنے پھینکے تھے جس سے انہیں مناسب راستے پر چلنے سے گمراہ کیا جاسکے۔ حکومت برطانیہ نے انہیں تو یہ رشوت دی تھی جس سے وہ انقلابیوں کو مکمل طور پر ختم کرنے کی ان کی پالیسی میں معاونت کریں۔ گاندھی جی جیسا کہ انہیں خطاب کرتے ہیں' کہ ہندوستان کے لئے یہ کھلونے جیسے ہیں' ان لوگوں کو بہلانے پھسلانے کے لئے جو وقت وقت پر ہوم رول' خود حکمرانی' ذمہ دار سرکار' مکمل طور پر ذمہ دار سرکار' اوپ نویشک سوراجیہ جیسے متعدد آئینی نام جو غلامی ہیں' مانگ کرتے ہیں۔ انقلابیوں کا نشانہ حکومتی اصلاحات نہیں ہے' وہ تو آزادی کی سطح کہیں اونچی کر چکے ہیں اور وہ اسی نصب العین کی حصولیابی کے لئے بغیر کسی ہچکچاہٹ قربانی دے رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کے ایثار نے عوام کے نظریات میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کی ہے۔ اس کی کوششوں سے وہ ملک کو آزادی کے راستے پر بہت آگے لے گئے ہیں اور یہ بات سیاسی حلقوں میں ان سے اختلاف رکھنے والے لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں۔

گاندھی جی کا قول ہے کہ تشدد سے ترقی کا راستہ رک کر حصول آزادی کا دن ختم ہو جاتا ہے تو ہم اس موضوع پر متعدد ایسی مثالیں دے سکتے ہیں جن میں جن ممالک نے تشدد کا راستہ اختیار کیا' ان کی سماجی ترقی کے ساتھ انہیں سیاسی آزادی حاصل ہوئی۔ ہم روس اور ترکی کی ہی مثال لیں۔ دونوں نے تشدد کے اقدامات سے ہی مسلح انقلاب کے ذریعہ حکومت حاصل کی۔ اس کے بعد بھی سماجی اصلاحات کے سبب وہاں کی عوام نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ محض افغانستان کی مثال سے سیاسی اصول ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو محض بدنامی ہے۔

گاندھی جی کے خیال میں 'تحریک عدم تعاون' کے وقت جو بیداری پیدا ہوئی' وہ عدم تشدد کی تعلیم کا ہی نتیجہ تھی' مگر یہ تصور غلط ہے اور اس کا سہرا عدم تشدد کو دینا بھول ہے کیوں کہ جہاں بھی زیادہ عوامی بیداری پیدا ہوئی' وہ براہ راست مورچوں کی کارروائی سے ہوئی۔ مثال کے طور پر روس میں طاقت ور عوامی تحریک سے ہی وہاں کسان اور مزدوروں میں بیداری پیدا ہوئی۔ انہیں تو کسی نے عدم تشدد کا سبق نہیں پڑھایا بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ عدم تشدد اور گاندھی جی کی مفاہمتی پالیسی سے ہی ان طاقتوں میں پھوٹ پڑ گئی جو مجموعی مورچوں کے کنارے سے ایک ہو گئی تھیں۔ یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ سیاسی ناانصافی کا مقابلہ عدم تشدد کے ہتھیار سے کیا جاسکتا ہے مگر اس بارے میں مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ انوکھا نظریہ ہے جس کا ابھی استعمال نہیں ہوا ہے۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے لئے منصفانہ حقوق کا جو مطالبہ کیا جاتا تھا' ان کی حصولیابی میں عدم تشدد کا ہتھیار ناکام رہا۔ وہ ہندوستان کو سوراج دلانے میں بھی ناکام رہا' جب کہ قومی کانگریس کارکنوں کی ایک بڑی فوج اس کے لئے کوشش کرتی رہی ہے اور اس پر تقریباً سوا کروڑ روپے بھی خرچ کئے گئے۔ حال ہی میں باردولی ستیہ گرہ میں اس کی ناکامی ثابت ہو چکی ہے۔ اس موقع پر ستیہ گرہ کے لیڈر گاندھی اور پٹیل نے باردولی کے کسانوں کو جو کم سے کم حقوق دلانے کا یقین دلایا تھا' اسے بھی وہ نہ دلا سکے۔ اس کے علاوہ دیگر کسی ملکی سطح پر تحریکات کی بات ہمیں معلوم نہیں۔ اب تک اس عدم تشدد کو ایک ہی آشیرواد ملا اور وہ تھا ناکامی کا۔ ایسے حالات میں یہ تعجب نہیں کہ ملک نے پھر ان کے استعمال سے انکار کر دیا۔ درحقیقت گاندھی جی جس شکل میں ستیہ گرہ کی تشہیر کرتے ہیں' وہ ایک قسم کا آندولن ہے' ایک مخالفت ہے' جس کا فطری نتیجہ سمجھوتے کی شکل میں ہوتا ہے جیسا کہ ظاہری طور پر دیکھا گیا ہے' اس لئے جتنی جلد ہم سمجھ لیں کہ آزادی اور غلامی میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا' اتنا ہی اچھا ہے۔

گاندھی جی سوچتے ہیں کہ ہم نئے عہد میں داخل ہو رہے ہیں۔ مگر کانگریس کے قانون میں محض لفظوں کی ہیرا پھیری کر کے یعنی سوراج کو مکمل آزادی کہہ دینے سے نیا عہد شروع نہیں ہو جاتا۔ وہ دن حقیقت میں عظیم دن ہوگا جب کانگریس ملکی سطح پر تحریک شروع کرنے کا فیصلہ لے گی جس کی بنیاد مقبول عام انقلابی اصول ہوں گے۔ ایسے وقت میں آزادی کا جھنڈا لہرانا مضحکہ خیز ہوگا۔ اس سلسلے میں ہم سرلا دیوی چودھرانی کے ان نظریات سے متفق ہیں جو انہوں نے ایک اخبار کے نمائندہ سے بات کرتے وقت ظاہر کئے۔ انہوں نے کہا کہ 31 دسمبر 1929 کی نصف شب سے ٹھیک ایک منٹ بعد آزادی کا جھنڈا لہرانا ایک منفرد اور انوکھا واقعہ ہے۔ اس وقت جی او سی' اسسٹنٹ جی او سی اور دیگر لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ آزادی کا جھنڈا لہرانے کا فیصلہ نصف شب تک موخر ہے کیوں کہ اگر وائس رائے یا سکریٹری آف اسٹیٹ کا کانگریس کو یہ پیغام جاتا ہے کہ ہندوستان کو اوپ نیوشک سوراجیہ دے دیا گیا تو رات کو گیارہ بجکر 59 منٹ پر بھی حالات میں تبدیلی ہو سکتی تھی۔ اس سے واضح ہے کہ مکمل سوراج کی حصولیابی کا عزم لیڈروں کی دلی خواہش نہیں تھی بلکہ ایک طفلانہ ضد کی مانند تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے لئے مناسب تو یہ ہوتا کہ وہ پہلے آزادی حاصل کر کے اس کا اعلان کرتی۔ یہ سچ ہے کہ اب اوپ نیوشک سوراجیہ کے

بجائے کانگریس کے ترجمان عوام کے سامنے مکمل آزادی کا ڈھول پیٹیں گے۔ وہ اب عوام سے کہیں گے کہ عوام کو اس جدوجہد کے لئے تیار ہو جانا چاہئے جس میں ایک فریق تو مکے بازی کرے گا اور دوسرا انہیں محض اسے برداشت کرتا رہے گا جب تک کہ وہ اچھی طرح پٹنے کے بعد بے دم نہ ہو جائے کہ دوبارہ نہ اٹھ سکے؟ کیا اسے شنگھرش کہا جا سکتا ہے اور کیا اس سے ملک کو آزادی مل سکتی ہے۔ کسی بھی قوم کے لئے اعلیٰ نصب العین کی حصولیابی کا عزم سامنے رکھنا بہتر ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے اس نشانہ تک پہنچنے کے لئے ان وسائل کا استعمال کیا جائے جو اہل ہوں اور جو پہلے استعمال میں آچکے ہوں ورنہ دنیا کے سامنے ہمارا مضحکہ بننے کا خوف برقرار رہے گا۔

گاندھی جی نے سبھی غور و فکر کرنے والے لوگوں سے کہا کہ وہ لوگ انقلابیوں کی معاونت بند کر دیں اور ان کے کاموں کی مذمت کریں جس سے ہمارے اس طرح متوقع پرستاروں کے متشددانہ کاموں سے جو نقصان ہوا اسے سمجھ سکیں۔ لوگوں کو متوقع اور پرانی دلیلوں کا حامی کہہ دینا جتنا آسان ہے اسی طرح ان کی مذمت کر کے عوام سے ان کے ساتھ تعاون نہ کرنے کو کہنا جس سے وہ الگ الگ ہو کر اپنا پروگرام معطل کرنے پر مجبور ہو جائیں یہ سب کرنا خصوصاً اس شخص کے لئے آسان ہوگا جو کہ عوام کو چند بارسوخ افراد کا معتمد ہو۔ گاندھی جی نے زندگی بھر عوامی زندگی کا تجربہ کیا ہے مگر یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ بھی انقلابیوں کی نفسیات کو نہیں سمجھ سکتے ہیں اور نہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ اصول بیش قیمت ہے جو ہر انقلابی کو محبوب ہے۔ جو شخص انقلابی بنتا ہے جب وہ اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر کسی لمحہ بھی قربانی کے لئے تیار رہتا ہے تو وہ محض کھیل کے لئے نہیں۔ وہ یہ ایثار اور قربانی اس لئے بھی نہیں کرتا کہ جب عوام اس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کی حالت میں ہوں تو اس کی خوب واہ واہی کریں۔ وہ اس راستہ کا انتخاب اس لئے کرتا ہے کہ اس کا ضمیر اس کی تحریک دیتا ہے اس کا ضمیر اس کے لئے اسے راغب کرتا ہے۔

ایک انقلابی سب سے زیادہ دلیلوں پر یقین کرتا ہے۔ وہ صرف اور صرف دلیلوں پر ہی بھروسہ کرتا ہے۔ کسی طرح کی گالی گلوج یا مذمت خواہ وہ اونچی سے اونچی سطح پر کی گئی ہو اسے اپنے لازمی مقصد کی حصولیابی سے محروم نہیں کر سکتی۔ یہ سوچنا کہ اگر عوام کا تعاون نہ ملا یا اس کے کاموں کی تعریف نہ کی گئی تو وہ اپنے مقصد کو ترک کر دے گا انتہائی بے وقوفی اور حماقت کی بات ہے۔ متعدد انقلابی جن کے کاموں کی آئینی طور پر تحریک چلانے والوں نے بھرپور مذمت کی پھر بھی وہ اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پھانسی کے تختہ پر جھول گئے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ انقلابی اپنی سرگرمیوں سے باز آجائیں تو اس کے لئے ہونا تو یہ چاہئے کہ ان کو اپنی رائے کی تصدیق دلیل سے کی جائے۔ یہی ایک اور واحد راستہ ہے اور باقی باتوں کے بارے میں کسی کو شک وشبہ نہیں ہونا چاہئے۔ انقلابی اس طرح ڈرانے دھمکانے کو کبھی ماننے والے نہیں۔

ہم سبھی حب الوطنوں سے اپیل کرتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ سنجیدگی سے اس لڑائی میں شامل ہو جائیں۔ کوئی بھی شخص عدم تشدد اور ایسے ہی عجیب و غریب طریقوں کی نفسیات کا استعمال کر کے ملک کی آزادی کے ساتھ کھلواڑ نہ کرے۔ آزادی ملک کی جان ہے۔ ہماری غلامی ہمارے لئے شرمندگی کا باعث ہے نہ جانے کب ہمیں یہ عقل اور احساس ہوگا کہ ہم اس سے آزادی حاصل کر کے آزاد ہو سکیں؟ ہماری قدیم ثقافت اور قابل افتخار وراثت کا کیا فائدہ اگر ہم میں یہ سوابھیمان نہ رہے کہ ہم غیر ملکی غلامی غیر ملکی پرچم اور بادشاہ کے سامنے سرخم کرنے سے اپنے آپ کو نہ روک سکیں۔

کیا یہ جرم نہیں ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان میں غیر اخلاقی حکمرانی کی؟ ہمیں بھکاری بنایا اور ہمارا پورا خون چوس لیا؟

ایک نسل اور انسانیت کے ناطے ہماری بری طرح تحقیر اور استحصال کیا گیا ہے۔ کیا عوام اب بھی چاہتے ہیں کہ اس بے عزتی کو فراموش کر کے ہم برطانوی حکمرانوں کو معاف کر دیں۔ ہم انتقام لیں گے جو عوام کے ذریعہ حکمرانوں سے لیا گیا منصفانہ انتقام ہوگا۔ بزدلوں کو پشت دکھا کر سمجھوتہ اور امن کی امید لگائے رہنے دیجئے۔ ہم کسی سے بھی ہمدردی کی بھیک نہیں مانگتے ہیں اور ہم بھی کسی کو معاف نہیں کریں گے۔ ہماری جنگ فتح یا موت کے فیصلہ تک جاری رہے گی۔ انقلابیوں کی عمر طویل ہو۔

کرتار سنگھ

صدر

میں دہریہ کیوں ہوں؟

بھگت سنگھ جب لاہور جیل میں تھے، تب غدر پارٹی سے رابطہ رکھنے کے جرم میں بھائی صاحب بھائی رندھیر سنگھ بھی قید کی سزا کاٹ رہے تھے۔ بھائی رندھیر سنگھ کی رہائی سے چند دن قبل بھگت سنگھ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ غدر کے رہنماؤں بابا ہرنام سنگھ کلا سنگھیا اور تیجا سنگھ چوہڑکانا نے یہ ملاقات کرانے میں اہم رول نبھایا۔ بھائی رندھیر سنگھ نے ایک بار یہ کہہ کر کہ بھگت سنگھ نے کیش کٹوا دیئے ہیں، ان سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں خط لکھ کر بھگت سنگھ نے کہا تھا:

'میں سکھ مذہب کے انگ انگ کٹوانے کے رواج کا قائل ہوں۔ ابھی تو میں نے ایک ہی انگ (کیش) کٹوایا ہے۔ یہ بھی پیٹ کے لئے نہیں، ملک کے لئے۔ جلد ہی گردن بھی کٹواؤں گا لیکن ایک سکھ کی تنگ نظری اور تنگ دلی کا گلہ ضرور رہے گا'۔

اس کے بعد بھائی صاحب ملاقات کے لئے آئے۔

ایک مرتبہ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے بھگت سنگھ نے بابا سوہن سنگھ بھکنا سے کہا تھا: 'ہماری قدیم وراثت کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک تہذیبی اور دوسرا عقائد پرمبنی۔ میں تہذیبی خوبیوں جیسے مخلصانہ ملک کی خدمت، ایثار، اعتماد پر قائم رہنا' کو پوری ایمانداری سے اپنا کر آگے بڑھنے کی کوشش میں ہوں لیکن عقائد پر مبنی نظریات، جو کہ قدیم زمانہ کی سوچ سے مطابقت رکھتے ہیں، بعینہ ماننے کو بالکل تیار نہیں ہوں کیوں کہ سائنس نے علم کے میدان میں خوب ترقی کی ہے اور سائنسی نظریات اپنا کر بھی مستقبل کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اب بھلے ہی فرقہ پرست عناصر یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ بھگت سنگھ کے نظریات میں گندلا پن لایا جائے، لیکن ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ بھگت سنگھ کی تخلیقات میں سب سے اہم اس دستاویز (میں دہریہ کیوں ہوں؟) نے بھائی صاحب کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مذہب یا فرقہ سے متعلق عدم وضاحت کے لئے کوئی بنیاد نہیں چھوڑی۔ اس دستاویز کی تخلیق 6-5 اکتوبر 1930 کو ہوئی تھی۔ -مدیر

ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ کیا میں کسی زعم کے سبب قدیر وخبیر خدا کے وجود پر یقین نہیں کرتا ہوں؟ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ مجھے اس مسئلہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن اپنے دوستوں سے بات چیت کے دوران مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے کچھ دوست، اگر دوستی کا میرا دعویٰ غلط نہ ہو، میرے ساتھ اپنے مختصر سے رابطہ میں اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے بے قرار ہیں کہ میں خدا کے وجود کو مسترد کر کے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی آگے جا رہا ہوں اور میرے زعم نے کچھ حد تک مجھے اس عدم اعتماد کے لئے مشتعل کیا ہے۔ جی ہاں، یہ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ میں ایسی کوئی شیخی نہیں بگھارتا کہ میں انسانی کمزوریوں سے

بالاتر ہوں۔ میں ایک انسان ہوں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کوئی بھی اس سے زیادہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ایک کمزوری میرے اندر بھی ہے۔ غرور میرے برتاؤ کا حصہ ہے۔ اپنے کامریڈوں کے درمیان مجھے ایک بے لگا شخص کہا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے دوست مسٹر بی کے دت بھی مجھے کبھی کبھار ایسا ہی کہتے تھے۔ کئی مواقع پر من موجی کہہ کر میری مذمت بھی کی گئی۔ کچھ دوستوں کو یہ شکایت ہے اور بجا طور پر ہے کہ میں نادانستہ ہی اپنے نظریات ان پر تھوپتا ہوں اور اپنی تجاویز کو منوا لیتا ہوں۔ یہ بات کسی حد تک سچ بھی ہے' اس سے میں انکار نہیں کرتا۔ اسے انانیت کہا جا سکتا ہے۔ جہاں تک دیگر مشہور آرا کے مقابلے ہماری اپنی رائے کا سوال ہے مجھے لازمی طور پر اپنی رائے پر فخر ہے۔ لیکن یہ ذاتی نہیں ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ محض اپنے اعتقاد کے تئیں انصاف پر مبنی ہو اس کو گھمنڈ نہیں کہا جا سکتا۔ گھمنڈ یا صحیح لفظوں میں نفرت تو خود کے تئیں نامناسب فخر کی انتہا ہے۔ تو پھر کیا یہ نامناسب فخر ہے جو مجھے دہریت کی طرف لے گیا۔ اس موضوع کا بڑی احتیاط سے مطالعہ کرنے اور کافی غور و خوض کے بعد میں نے خدا پر عدم اعتماد کیا؟ یہ سوال ہے جس کے بارے میں میں یہاں بتانا چاہتا ہوں لیکن پہلے میں یہ واضح کر دوں کہ تکبر اور انانیت دو علاحدہ علاحدہ چیزیں ہیں۔

پہلی بات تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ نامناسب فخر یا زعم ناقص کس طرح کسی شخص کے خدا میں یقین کرنے کے راستے میں حائل ہو سکتا ہے۔ میں حقیقت میں کسی عظیم شخصیت کی عظمت کو تسلیم نہ کروں' یہ تبھی ہو سکتا ہے جب مجھے بھی تھوڑا ایسا افتخار حاصل ہو گیا ہو' جس کا یا تو میں اہل نہیں ہوں یا میرے اندر وہ خوبیاں نہیں جو کہ اس کے لئے لازمی یا ناگزیر ہیں۔ یہاں تک تو سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جو خدا میں یقین رکھتا ہو' اپنے زعم کے سبب اس میں یقین کرنا بند کر دے؟ دو ہی راستے ممکن ہیں۔ یا تو انسان اپنے کو خدا کا مخالف سمجھنے لگے یا وہ خود کو ہی خدا ماننا شروع کر دے۔ ان دونوں ہی صورتوں میں وہ سچا دہریہ نہیں بن سکتا۔ پہلی صورت میں تو وہ حریف کے وجود کو مسترد ہی نہیں کرتا۔ دوسری صورت میں بھی وہ ایک ایسے غیر مرئی وجود کو مانتا ہے جو پردے کے پیچھے سے کائنات کو چلاتا ہے۔ ہمارے لئے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ وہ خود کو خدا سمجھتا ہے یا یہ سمجھتا ہے کہ وہ پرم چیتنا یا اس سے پرے کچھ اور ہے۔ بنیادی بات تو موجود ہے۔ اس کا یقین موجود ہے۔ وہ کسی بھی طرح دہریہ نہیں ہے۔ تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں پہلے درجہ میں آتا ہوں اور نہ دوسرے میں۔ میں تو اس قادر مطلق خدا کے وجود سے ہی انکار کرتا ہوں۔ میں اس سے کیوں انکار کرتا ہوں' اس کو بعد میں دیکھیں گے۔ یہاں تو میں ایک بات یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ زعم نہیں ہے جس نے دہریت کے اصولوں کو تحریک دی۔ نہ تو میں ایک حریف' نہ ہی پیغمبر اور نہ ہی خود خدا۔ ایک بات ضرور ہے' یہ زعم نہیں ہے جو مجھے اس طرح سوچنے کی طرف لے گیا۔ اس الزام کو تسلیم کرنے کے لئے آیئے! حقائق پر غور کریں۔ میرے ان دوستوں کے مطابق' دلی بم کیس اور لاہور سازش کیس کے دوران مجھے جو غیر ضروری شہرت ملی' شاید اسی وجہ سے میں مغرور ہو گیا ہوں۔ تو پھر آیئے دیکھیں کہ کیا یہ پہلو صحیح ہے۔ میری دہریت کوئی ابھی حال کی پیداوار نہیں ہے۔ میں نے تو خدا پر یقین کرنا اس وقت چھوڑ دیا تھا جب میں ایک غیر معروف نوجوان تھا' جس کے وجود کے بارے میں میرے مذکورہ بالا دوستوں کو کوئی خبر نہ تھی۔ کم سے کم ایک کالج کا طالب علم تو ایسے کسی غیر مناسب زعم کو نہیں اپنا سکتا جو اسے دہریت کی جانب لے جائے۔ اگرچہ میں کچھ استادوں کا چہیتا تھا اور بعض دیگر کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن میں کبھی بہت محنتی یا پڑھنے والا طالب علم نہیں رہا۔ زعم ناقص کے حصار میں آنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ میں تو ایک بہت شرمیلا لڑکا تھا' جس کی مستقبل کے بارے میں کچھ مایوس کن سوچ تھی اور ان دنوں میں مکمل دہریہ نہیں تھا۔ میرے بابا' جن کے زیر اثر میں پروان چڑھا' ایک قدامت پرست آریہ سماجی ہیں۔ ایک آریہ سماجی اور کچھ بھی ہو' دہریہ نہیں ہو سکتا۔ اپنی

ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے ڈی اے وی اسکول' لاہور میں داخلہ لیا اور پورے ایک سال اس کے ہاسٹل میں رہا۔ ان دنوں میں پورا بھگت تھا۔ بعد ازاں میں نے اپنے والد کے ساتھ رہنا شروع کیا۔ جہاں تک مذہبی قدامت پرستی کا سوال ہے' وہ ایک روادار شخص ہیں۔ انہیں کی تعلیم سے مجھے آزادی کے حوصلہ کے لئے اپنی زندگی کو وقف کرنے کی تحریک ملی۔ مگر وہ دہریہ نہیں ہیں۔ ان کا خدا میں پختہ یقین ہے۔ وہ مجھے روزانہ پوجا کی ترغیب دیتے تھے۔ اس طرح میری پرورش ہوئی۔ عدم تعاون تحریک کے دنوں میں میں نے نیشنل کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں آکر ہی میں سارے مذہبی مسائل' یہاں تک کہ خدا کے بارے میں کھلے طور پر سوچنا' غور و خوض کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس کی مذمت کرنا شروع کیا۔ لیکن ابھی بھی میں پکا مذہبی تھا۔ اس وقت تک میں نے اپنے بغیر کاٹے اور سنورے ہوئے لمبے بال رکھنا شروع کر دیا تھا اگرچہ مجھے کبھی بھی سکھ یا دیگر مذاہب کی پیروی اور اصولوں میں یقین نہ ہو سکا تھا۔ مگر مجھے ایشور کے وجود کا پختہ یقین تھا۔

بعد میں انقلابی پارٹی سے وابستہ ہو گیا۔ وہاں پر جس پہلے لیڈر سے میرا رابطہ ہوا' وہ تو پختہ یقین نہ ہونے کے باوجود بھی خدا کے وجود سے انکار کا حوصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ خدا کے بارے میں میرے زبردستی پوچھنے پر وہ کہتے ''جب خواہش ہو تو پوجا کر لیا کرو۔ یہ ایسی دہریت ہے جس میں اس یقین کو اپنانے کے حوصلہ کی کمی تھی۔ دوسرے لیڈر' جن کے رابطہ میں میں آیا' عقیدت مند تھے۔ ان کا نام بتا دوں...... محترم کامریڈ شچندر ناتھ سانیال' جو کہ آج کل کاکوری سازش کیس کے سلسلے میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ ان کی واحد مشہور کتاب 'بندی جیون' میں پہلے صفحہ سے ہی خدا کی عظمت و برتری کا زور شور سے ذکر ہے۔ اس خوب صورت کتاب کے دوسرے حصہ کے آخری صفحہ پر انہوں نے خدا کی تعریف میں پھول برسائے ہیں' وہ ان کے خیالات کا عجیب و غریب حصہ ہیں۔ 28 جنوری 1925 کو پورے ہندوستان میں جو 'دی ریوالیوشنری' (انقلابی) پرچہ تقسیم کیا گیا تھا' وہ فرد جرم عائد کرنے والوں کی کہانی کے مطابق انہیں کی ذہنی ریاضت کا نتیجہ ہیں۔ اب اس طرح کے خفیہ کاموں میں کوئی اہم لیڈر لازماً اپنے خیالات کو ہی رکھتا ہے' جو اسے خود بہت عزیز ہوتے ہیں اور کارکنوں کو ان سے متفق ہونا ہوتا ہے۔ ان اختلافات کے باوجود جو ان کے ہو سکتے ہیں۔ اس پرچہ میں پورا ایک پیراگراف اس قادر المطلق اور خدا کی حمد سے بھرا پڑا تھا۔ یہ سب راز ہائے سربستہ ہیں۔ میں جو کہنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ خدا کے تئیں بے یقینی کا جذبہ انقلابی گروپ میں بھی نہیں پیدا ہوا تھا۔ کاکوری کیس سے شہرت پائے ہوئے سبھی چار شہیدوں نے اپنے آخری ایام عبادت اور پرستش میں گزارے تھے۔ رام پرساد بسمل ایک قدامت پرست آریہ سماجی تھے۔ سوشلزم اور اشتراکیت میں اپنے وسیع مطالعہ کے باوجود راجندر لاہری اپنشد اور گیتا کے شلوکوں کا ورد کرنے کی اپنی خواہش کو دبا نہ سکے۔ میں نے ان سب میں صرف ایک ہی شخص کو دیکھا جو کبھی دعا نہیں کرتا تھا اور کہتا تھا' علم فلسفہ انسان کی کمزوری یا علم کے محدود ہونے کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ وہ بھی کالا پانی کی سزا کاٹ رہا ہے۔ لیکن اس نے بھی خدا کے وجود کو مسترد کرنے کی کبھی ہمت نہیں کی۔

اس وقت تک میں صرف ایک رومانٹک آدرش وادی انقلابی تھا۔ اب تک ہم دوسروں کی تقلید کرتے تھے' اب اپنے کندھوں پر ذمہ داری اٹھانے کا وقت آیا ہے۔ کچھ عرصہ تک تو لازمی عمل کے نتیجہ میں پارٹی کا وجود ہی ناممکن سا نظر آنے لگا۔ پرجوش کامریڈوں' نہیں' لیڈروں نے بھی ہمارا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ تک مجھے یہ خوف رہا کہ ایک دن میں بھی کہیں اپنے پروگرام کے بے کار ہونے کے بارے میں مطمئن نہ ہو جاؤں گا۔ وہ میری انقلابی زندگی کا ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ مطالعہ کی پکار میرے دل کی گلیوں کے گلیاروں میں گونج رہی تھی۔ مخالفین کے پیش کردہ دلائل کا سامنا کرنے کے قابل بننے کے لئے مطالعہ کرو۔ اپنی رائے کی حمایت میں دلیل دینے کے کے قابل بننے کے واسطے پڑھو۔ میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس

سے میرے قدیم خیالات اور یقین میں انوکھے طور پر شستگی آئی۔ تشدد آمیز طریقوں کو اپنانے کا مزہ جو کہ ہمارے پرانے ساتھیوں میں کافی زیادہ تھا' کی جگہ سنجیدہ نظریات نے لے لی ہے۔ اب تجسس اور ضعیف الاعتقادی کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ حقیقت پسندی ہماری بنیاد بنی۔ تشدد تبھی جائز ہے جب کسی اہم ضرورت کی خاطر اس کا سہارا لیا جائے۔ اہنسا سبھی تحریکات کا لازمی اصول ہونا چاہئے۔ یہ تو رہی طریقوں کی بات۔ سب سے ضروری بات اس آدرش کا واضح فلسفہ ہے' جس کے لئے ہمیں لڑنا ہے۔ چوں کہ اس وقت کوئی خاص انقلابی کام نہیں ہو رہا تھا' لہٰذا مجھے عالمی انقلاب کے متعدد فلسفوں کے بارے میں پڑھنے کا خوب موقع ملا۔ میں نے نراجیت کے حامی لیڈر بکونن کو پڑھا' کچھ اشتراکیت کے بانی مارکس کو' مگر زیادہ تر لینن' ٹراٹسکی اور دیگر لوگوں کو پڑھا جو اپنے ملک میں کامیاب انقلاب لائے تھے۔ وہ سبھی دہریہ تھے۔ بکونن کی کتاب 'خدا اور مملکت' اس موضوع پر اگرچہ اچھا مطالعہ ہے۔ بعد میں مجھے نرلمب سوامی کی تحریر کردہ کتاب 'سہج گیان' ملی۔ اس میں صرف ایک رازدارانہ دہریت تھی۔ اس موضوع کے تئیں میرا گہرا جھکاؤ ہو گیا ہے۔ 1926 کے آخر تک مجھے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ قادرالمطلق خدا نے کائنات کی تخلیق کی ہے۔ اسے روشن و منور کیا اور وہی اسے چلا رہا ہے وغیرہ فضول باتیں ہیں۔ میں نے اپنے اس عدم اعتماد کو ظاہر کیا۔ میں نے اس موضوع پر اپنے دوستوں سے بحث کی۔ میں ایک کھلا ہوا دہریہ ہو چکا تھا۔ مگر اس کا مطلب کیا تھا۔ یہ میں آگے بتاؤں گا۔

مئی 1927 میں میں لاہور میں گرفتار ہوا۔ یہ گرفتاری اچانک ہوئی تھی۔ مجھے اس کا ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ پولیس کو میری تلاش ہے۔ اچانک باغیچہ سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ میں پولیس والوں سے گھرا ہوا ہوں۔ مجھے خود بہت تعجب ہوا کہ میں اس وقت بہت خاموش رہا۔ نہ تو کوئی سنسنی محسوس ہوئی' نہ ہی ذرا بھی مشتعل ہوا۔ مجھے پولیس نے حراست میں لے لیا۔ اگلے دن مجھے ریلوے پولیس میں لے جایا گیا' جہاں مجھے پورا ایک مہینہ بسر کرنا پڑا۔ پولیس افسروں سے کئی دنوں کی بات چیت کے بعد مجھے ایسا لگا کہ انہیں میرے کاکوری گروپ کے ساتھ تعلق کے بارے میں اور انقلابی تحریک سے متعلق میری سرگرمیوں کے بارے میں کچھ معلومات ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میں لکھنؤ میں تھا جب وہاں مقدمہ چل رہا تھا' کہ میں نے انہیں چھڑانے کے کسی منصوبہ پر بات کی تھی کہ ان کی منظوری حاصل کرنے کے بعد ہم نے کچھ بم حاصل کئے تھے کہ 1926 میں دسہرہ کے موقع پر ان بموں میں سے ایک آزمائش کے طور پر بھی بھیڑ پر پھینکا گیا۔ اس کے بعد میری بھلائی کے لئے انہوں نے مجھے بتایا کہ اگر میں انقلابی گروپ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالنے والا ایک بیان دے دوں تو مجھے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ میں اس تجویز پر ہنسا۔ یہ سب بے کار بات تھی۔ ہم لوگوں جیسی فکر رکھنے والے اپنے معصوم عوام پر بم نہیں پھینکا کرتے۔ ایک دن صبح سی آئی ڈی کے سینئر ڈائریکٹر مسٹر نیومن میرے پاس آئے۔ کافی ہمدردی بھری باتوں کے بعد انہوں نے مجھے' اپنی سمجھ کے مطابق' یہ بے حد تکلیف دہ خبر دی کہ اگر میں نے ان کا طلب کردہ بیان نہیں دیا تو وہ مجھ پر کاکوری کیس سے متعلق بغاوت چھیڑنے کی سازش اور دسہرا بم حملہ میں بہیمانہ قتل کا مقدمہ چلانے پر مجبور ہوں گے۔ اور آگے انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ان کے پاس مجھے سزا دلانے اور (پھانسی پر) لٹکانے کے لئے وافر شواہد موجود ہیں۔ ان دنوں مجھے یہ یقین تھا' اگرچہ میں بالکل بے گناہ تھا کہ پولیس اگر چاہے تو ایسا کر سکتی ہے۔ اسی دن سے کچھ پولیس افسروں نے مجھے باقاعدہ دونوں وقت خدا کی عبادت کرنے کے لئے بہلانا شروع کر دیا۔ لیکن اب میں ایک دہریہ تھا۔ میں خود کے لئے یہ بات طے کرنا چاہتا تھا کہ کیا امن اور تفریح کے دنوں میں ہی میں دہریہ ہونے کا دم بھرتا ہوں یا ایسے مشکل وقت میں بھی میں ان اصولوں پر اٹل رہ سکتا ہوں؟ کافی غور و خوض کے بعد میں نے یہ ارادہ کیا کہ کسی بھی طرح خدا پر یقین اور اس کی عبادت میں نہیں کر سکتا۔ نہ ہی میں نے ایک

لمحہ کے لئے خدا سے فریاد کی۔ یہی حقیقی آزمائش تھی اور میں اس میں کامیاب رہا۔ ایک لمحہ کے لئے بھی دیگر باتوں کی قیمت پر اپنی گردن بچانے کی میری خواہش نہیں ہوئی۔ اب میں ایک پکا دہریہ تھا اور تب سے لگاتار ہوں۔ اس آزمائش پر کھرا اترنا آسان کام نہیں تھا۔ 'یقین' مصائب کو کم کردیتا ہے' یہاں تک کہ انہیں خوشی سے قبول کرنے کا عادی بنادیتا ہے۔ انسان کو خدا سے ایک زیادہ تسلی بخش بنیاد مل سکتی ہے۔ اس کے بغیر انسان کو خود پر منحصر ہونا پڑتا ہے۔ طوفان اور لہروں کے درمیان اپنے قدموں پر قائم رہنا کوئی بچوں کا کام نہیں ہے۔ آزمائش کے ان اوقات میں' اگر کوئی زعم ہے' تو بھاپ بن کر اڑجاتا ہے اور انسان عام یقین کو مسترد کرنے کا حوصلہ نہیں کرپاتا۔ لیکن اگر کرتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کے پاس صرف گھمنڈ نہیں بلکہ کوئی دیگر طاقت ہے۔ آج بالکل ویسی ہی حالت ہے۔ پہلے ہی اچھی طرح معلوم ہے کہ (مقدمے میں) کیا فیصلہ ہوگا۔ ایک ہفتہ میں ہی فیصلہ سنادیا جائے گا۔ میں اپنی زندگی ایک مشن کے لئے قربان کرنے جارہا ہوں' اس خیال کے علاوہ اور کیا تسلی ہوسکتی ہے؟ خدا میں یقین رکھنے والا ہندو پنرجنم پر ایک راجا بننے کی امید کرسکتا ہے۔ ایک مسلمان یا عیسائی جنت سے لطف اندوز ہونے کی خواہش دل میں لئے اپنے مصائب اور قربانیوں کے انعام کا تصور کرسکتا ہے۔ مگر میں کس بات کی امید کروں؟ میں جانتا ہوں کہ جس لمحہ رسی کا پھندہ میری گردن پر لگے گا اور میرے پیروں کے نیچے سے تختہ ہٹے گا' وہی مکمل آرام ہوگا۔ وہی آخری لمحہ ہوگا۔ میں یا مختصراً کہا جائے تو روحانیت کی تعریف کے مطابق میری روح وہیں ختم ہوجائے گی۔ آگے کچھ بھی نہیں رہے گا۔ جہد مسلسل سے بھری ہوئی ایک چھوٹی سی زندگی' جس کی کوئی عظمت نہیں ہے' اپنے آپ میں خود ایک انعام ہوگی۔ اگر مجھ میں اسے اس نظریہ سے دیکھنے کا حوصلہ ہو۔ یہی سب کچھ ہے۔ بغیر کسی لالچ کے اس دنیا میں یا یہاں کے بعد انعام کی خواہش کے بغیر' میں نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنی زندگی کو آزادی کے مشن کی خاطر وقف کردیا ہے کیوں کہ میں اور کچھ کرہی نہیں سکتا۔ جس دن ہمیں اس ذہنیت کے بہت سے مردو خواتین مل جائیں گے' جو اپنی زندگی کو خدمت خلق اور مصیبت زدہ انسانیت کی فلاح کے علاوہ اور کہیں وقف کرہی نہیں سکتے' اسی دن عہد آزادی کا آغاز ہوگا۔ وہ استحصال کرنے والوں' مصیبت ڈھانے والوں اور ظالموں کو چیلنج دینے کے لئے آمادہ ہوں گے' اس لئے نہیں کہ انہیں راجا بننا ہے یا کوئی دیگر انعام حاصل کرنا ہے۔ یہاں یا اگلے جنم میں یا بعد از مرگ جنت میں۔ انہیں تو انسانیت کی گردن سے غلامی کا چولا اتار پھینکنے اور مکتی اور شانتی قائم کرنے کے لئے اس راستہ کو اپنانا ہوگا۔ کیا وہ اس راستے پر چلیں گے' جو ان کے اپنے لئے خطرناک مگر ان کی عظیم روح کے لئے واحد شاندار راستہ ہے؟ کیا اپنے عظیم مشن کے تئیں ان کے فخر کو زعم کہہ کر اس کا غلط مطلب نکالا جائے گا؟ کون اس طرح کے قابل نفرت الفاظ ان سے وابستہ کرنے کا حوصلہ کرتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ایسا شخص یا تو بیوقوف ہے یا بے عقل۔ ہمیں چاہئے کہ اسے معاف کردیں' کیوں کہ وہ اس دل میں جگہ پاچکے اعلیٰ نظریات' جذبات' امنگوں اور ان کی گہرائی کو محسوس نہیں کرسکتا۔ اس کا دل گوشت کے ایک ٹکڑے کی طرح مردہ ہے۔ اس کی آنکھیں دیگر مفاد کا سایہ پڑنے سے کمزور ہوگئی ہیں۔ خود پر یقین کرنے کو ہمیشہ زعم کا نام دیا جاسکتا ہے اور یہ تکلیف دہ اور اذیت رساں ہے لیکن چارہ ہی کیا ہے۔

تم جاؤ اور کسی مشہور مذہب کی مخالفت کرو اور کسی ہیرو کی' عظیم شخصیت کی' جس کے بارے میں عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ تنقید سے بالاتر ہے کیوں کہ وہ غلطی کرہی نہیں سکتا' تنقید کروگے تو تمہاری دلیل کی طاقت ہزاروں لوگوں کو تم پر مغرور ہونے کا الزام لگانے پر مجبور کردے گی۔ ایسی فکری ٹھہراؤ کے سبب ہوتی ہے۔ تنقید اور آزاد خیالی دونوں ہی ایک انقلابی کی لازمی خوبیاں ہیں جو کہ مہاتماجی مہان ہیں' لہٰذا کسی کو ان کی مذمت نہیں کرنی چاہئے۔ چوں کہ وہ اوپر اٹھ گئے ہیں' لہٰذا ہر بات جو وہ کہتے ہیں' خواہ وہ سیاسی میدان کی ہو یا مذہب' معاشیات یا علم الاخلاق وغیرہ کی سب صحیح ہے۔ آپ چاہے

پر اعتماد ہوں یا نہیں' آپ کو کہنا چاہئے' ہاں یہی سچ ہے۔ ایسی ذہنیت ترقی کی جانب نہیں لے جا سکتی۔ یہ تو مبینہ ردعمل ہے۔

کیوں کہ ہمارے اسلاف نے کسی قادر المطلق خدا کے تئیں یقین قائم کر لیا تھا' لہٰذا کسی بھی ایسے شخص کو جو اس کو چیلنج کرے' مرتد اور لامذہب کہا جائے گا۔ اگر اس کے دلائل کو کوئی رد نہیں کر سکتا اور اس کا عقیدہ اتنا مضبوط ہے کہ اسے خدا کے قہر سے ہونے والے مصائب کا خوف دکھا کر دبایا نہیں جا سکتا تو اس کی یہ کہہ کر مذمت نہیں کی جائے گی کہ وہ زعم ناقص میں مبتلا ہے تو اس بے کار کے جھگڑے پر وقت برباد کرنے کا کیا فائدہ؟ پھر ان ساری باتوں پر بحث کرنے کی کوشش کیوں؟ یہ طویل بحث اس لئے' کیوں کہ عوام کے سامنے یہ سوال آج ہی پہلی بار آیا ہے اور آج اس پر صحیح معنوں میں بحث ہو رہی ہے۔

جہاں تک پہلے سوال کی بات ہے' میں سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ میرا زعم نہیں تھا' جو مجھے دہریت کی طرف لے گیا۔ میری حجت کا طریقہ اطمینان بخش ثابت ہوتا ہے یا نہیں اس کا فیصلہ قارئین کو کرنا ہے' مجھے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ موجودہ حالات میں خدا پر یقین نے میری زندگی آسان اور میرا بوجھ ہلکا کر دیا ہوتا تو میرے اس عدم اعتماد نے اس پوری فضا کو پوری طرح مکدر کر دیا ہے۔ حالات ایک مشکل شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ تھوڑی سی رازداری اسے شعریت فراہم کر سکتی ہے۔ میں حقیقت پسند ہوں۔ میں اپنی ذہنی سوچ پر عقل کی مدد سے فتح چاہتا ہوں۔ اس مقصد میں میں' ہمیں ہمیشہ کامیاب نہیں رہا ہوں۔ کوشش اور جد و جہد کرنا انسان کا فرض ہے' کامیابی تو حالات پر منحصر ہوتی ہے۔

اور دوسرا سوال یہ کہ اگر یہ زعم نہیں ہے تو خدا کے وجود کے بارے میں قدیم اور آج بھی مروجہ عقیدت پر عدم اعتماد کا کوئی سبب ہونا چاہئے۔ جی ہاں' میں اب اس پر آتا ہوں۔ وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے خیالات کوئی بھی انسان جس میں ذرہ برابر بھی عقل ہے' وہ اپنے ماحول کو مدلل انداز میں سمجھنا چاہے گا۔ جہاں براہ راست تصدیق نہیں ہوتی' وہاں علم فلسفہ اہم مقام لے لیتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا' میرے انقلابی ساتھی کہا کرتے تھے کہ علم فلسفہ انسان کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ جب ہمارے اسلاف نے فرصت میں دنیا کے راز کو' اس کے ماضی' حال اور مستقبل' اس کے کیوں اور کہاں سے کو' کو سمجھنے کی کوشش کی تو براہ راست تصدیق کی زبردست کمی میں ہر شخص نے اس سوالوں کو اپنے اپنے طریقے سے حل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مذہبی آراء کے بنیادی حقائق میں' ہمیں فرق ملتا ہے کہ جو کبھی کبھی تصادم اور تنازعہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ نہ صرف مشرق اور مغرب کے فلسفہ میں اختلاف ہے بلکہ کرۂ ارض کے مختلف مذاہب میں بھی اختلاف ہے۔ ایشیائی مذاہب میں اسلام اور ہندو مذہب میں ذرہ برابر یکسانیت نہیں ہے۔ ہندوستان میں بودھ اور جین مذہب اس کائنات سے بہت الگ ہیں' جس میں خود آریہ سماج و سناتن دھرم جیسی مخالف آراء پائی جاتی ہیں۔ پرانے زمانے کا ایک اور آزاد خیال مفکر چارواک ہے۔ اس نے خدا کو قدیم عہد میں ہی چیلنج دے دیا تھا۔ یہ سبھی رائیں ایک دوسرے سے بنیادی سوالوں پر اختلاف رکھتی ہیں اور ہر شخص اپنے کو صحیح ٹھہراتا ہے۔ یہی تو بدقسمتی کی بات ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم قدیم دانشوروں اور مبلغین کے تجربات اور نظریات کو مستقبل میں جہالت کے خلاف جنگ کی بنیاد بنائیں اور اس رازدارانہ سوال کو حل کرنے کی کوشش کریں' ہم سست لوگوں کی طرح جو کہ ہم ثابت ہو چکے ہیں' یقین کی حد تک' ان کے قول میں خامی نکالتے ہیں اور اعتماد کی' چیخ و پکار مچاتے رہتے ہیں اور اس طرح ہم انسانیت کی ترقی کو روکنے کے مجرم ہیں۔

ہر انسان کو جو ترقی کرنا چاہتا ہے' اسے پرانے عقائد کے ہر پہلو کی مذمت اور ان پر عدم اعتماد کرنا ہوگا اور ان کو چیلنج دینا ہوگا۔ ہر رائج تجویز کی ہر بات کو ہر کونے سے دلیل کی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا۔ اگر وافر دلیل کے بعد بھی وہ کسی اصول یا رہنمائی کے تئیں متحرک ہوتا ہے تو اس کے یقین کا خیر مقدم ہے۔ اس کی دلیل جھوٹ' فریب یا چھلاوا یا کبھی کبھی دھوکہ ہو سکتی ہے لیکن اس

کی اصلاح کی جاسکتی ہے کیوں عقل زندگی کی راہ نما ہے لیکن کورایقین اور اندھ وشواس خطرناک ہے۔ یہ دماغ کو کند اور انسان کو ردعمل ظاہر کرنے والا بنا دیتا ہے۔ جو انسان اپنے حقیقت پسند ہونے کا دعوی کرتا ہے' اسے پورے قدیم یقین کو چیلنج کرنا ہوگا۔ اگر وہ بھرپور دلیل کا وار نہ برداشت کرسکے تو ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر پڑیں گے۔ تب اس شخص کا پہلا کام ہوگا تمام پرانے اعتقادوں کو رد کرکے نئے فلسفہ کے لئے راہ متعین کرنا۔ یہ تو منفی پہلو ہوا۔ اس کے بعد صحیح کام شروع ہوگا' جس میں ازسرنو تعمیر کے لئے قدیم عقائد کی کچھ باتوں کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' میں ابتدا سے ہی مانتا ہوں کہ اس سمت میں میں کبھی کوئی خاص مطالعہ نہیں کرپایا۔ ایشیائی فلسفہ کو پڑھنے کی میری بڑی تمنا تھی لیکن ایسا کرنے کا مجھے کوئی اتفاق یا موقع نصیب نہیں ہوا۔ مگر جہاں تک اس تنازعہ کے منفی پہلو کی بات ہے' میں قدیم اعتقاد کے استحکام پر سوال اٹھانے سے متعلق پراعتماد ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ خدا کا' جو کہ فطرت کی بقا کا ضامن ہے' اس طرح کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہم خدا میں یقین رکھتے ہیں اور سبھی ترقی کا مقصد انسان کا' مفاد کے لئے فطرت پر فتح پانا ہے۔ اس کو سمت فراہم کرنے کے لئے کوئی غیبی طاقت نہیں ہے۔ یہی ہمارا فلسفہ ہے۔

جہاں تک منفی پہلو کی بات ہے' ہم مذہبی لوگوں سے کچھ سوال کرنا چاہتے ہیں۔

1۔ اگر جیسا کہ آپ کا یقین ہے۔ خدا جو کہ قدیر' علیم اور بصیر ہے' جس نے روئے زمین یا کائنات کی تخلیق کی ہے تو مہربانی کرکے یہ بتائیں کہ اس نے یہ تخلیق کیوں کی؟ مصائب اور آفتوں سے بھری یہ دنیا کیوں بنائی جہاں ایک بھی شخص پوری طرح خوش نہیں ہے۔

برائے مہربانی یہ نہ کہیں کہ یہی قانون فطرت ہے۔ اگر وہ کسی قانون پر کاربند ہے تو وہ قادر المطلق نہیں ہے۔ پھر تو وہ بھی ہماری طرح غلام ہے۔ مہربانی کرکے یہ بھی نہ کہیں کہ یہ اس کا شغل ہے۔ نیرو نے صرف ایک روم جلا کر خاک کیا تھا' اس نے چند لوگوں کا قتل کیا تھا۔ اس نے تو بہت تھوڑے دکھ دیئے اپنے شوق اور ارمانوں کے لئے اور اس کا تاریخ میں کیا مقام ہے؟ اسے مورخ کس نام سے پکارتے ہیں؟ سبھی منفی الفاظ اس سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ نیرو کی مذمت ظالم' بےرحم' شیطان جیسے الفاظ سے صفحات رنگے پڑے ہیں۔ ایک چنگیز خان نے اپنی تفریح کے لئے چند ہزار جانیں لے لیں اور آج ہم اس کے نام سے نفرت کرتے ہیں۔ تب پھر تم اس انتہائی طاقتور نیرو کو' جو ہر دن' ہر گھنٹے اور ہر منٹ لاتعداد دکھ پہنچاتا رہا اور ابھی بھی دے رہا ہے' کسی طرح جائز ٹھہراتے ہو پھر تم اس کے برے کاموں کی حمایت کیسے کروگے۔ جو ہر پل چنگیز کے کارناموں کو بھی مات دے رہے ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس نے دنیا بنائی ہی کیوں؟ ایسی دنیا جو سچ مچ جہنم ہے۔ آلام و مصائب کا گھر ہے؟ قادر المطلق نے انسان کی تخلیق کیوں کی؟ جب کہ اس کے پاس انسان کی تخلیق نہ کرنے کی طاقت تھی؟ ان سب باتوں کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ تم یہ کہو گے کہ یہ سب اگلے جنم میں' ان بےگناہ مصیبت جھیلنے والوں کو انعام اور غلطی کرنے والوں کو سزا دینے کے لئے ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ تم کب تک اس شخص کو جائز ٹھہراتے رہوگے جو ہمارے جسم کو زخمی کرنے کی جرات اس لئے کرتا ہے کہ اس پر بہت ہمدردی سے مرہم لگائے گا؟ گلیڈیئٹر ادارہ کے بانیوں اور معاونوں کا یہ کام کہاں تک جائز تھا کہ ایک بھوکے خوں خوار شیر کے سامنے انسان کو پھینک دو کہ اگر وہ اس جنگلی جانور سے بچ کر اپنی جان بچالیتا ہے تو اس کی خوب دیکھ ریکھ کی جائے گی؟ اس لئے میں پوچھتا ہوں ''اس خدا نے اس دنیا اور اس میں انسانوں کی تخلیق کیوں کی؟ مزہ کے لئے؟ تب اس میں اور نیرو میں کیا فرق ہے''؟

مسلمانوں اور عیسائیو! ہندو فلسفہ مذہب کے پاس ابھی اور دلائل ہوسکتے ہیں۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تمہارے پاس اوپر

پوچھے گئے سوالوں کا کیا جواب ہے؟ تم تو پنر جنم میں یقین نہیں رکھتے۔ تم تو ہندوؤں کی طرح یہ دلیل پیش نہیں کر سکتے کہ ہر بے گناہ شخص کے مصائب گزشتہ زندگی میں کیئے گئے اس کے برے اعمال کا نتیجہ ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ اس قادر المطلق نے کائنات کی تخلیق کے لئے چھ دن کی محنت کیوں کی اور یہ کیوں کہا تھا کہ سب ٹھیک ہے۔ اسے آج ہی بلاؤ' اسے پچھلی تاریخ دکھاؤ۔ اسے موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے دو پھر ہم دیکھیں گے کہ کیا وہ آج بھی یہ کہنے کی جرات کرتا ہے سب ٹھیک ہے۔

قید خانوں کی کوٹھریوں سے لے کر' جھونپڑیوں اور بستیوں میں بھوک سے تڑپتے لاکھوں انسانوں کے فرقوں سے لے کر' استحصال کا شکار ہونے والے ان مزدوروں سے لے کر جو سرمایہ داروں کے ذریعہ خون چوسنے کے عمل کو صبر و تحمل کہنا چاہئے' بے دلی سے دیکھ رہے ہیں اور اس انسانی طاقت کی بربادی کا مظاہرہ کر رہے ہیں' جسے دیکھ کر کوئی بھی شخص' جسے تھوڑا بہت بھی علم ہے' خوف سے لرز اٹھے گا اور زیادہ پیداوار کو ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کرنے کی بجائے سمندر میں پھینک دینے کو بہتر سمجھنے سے لے کر بادشاہوں نے ان محلوں تک' جن کی بنیاد انسانی ہڈیوں پر کھڑی ہے' اس کو یہ سب دیکھنے دو اور پھر کہے سب کچھ ٹھیک ہے''۔ کیوں اور کس لئے؟ یہی میرا سوال ہے؟ تم چپ ہو؟ ٹھیک ہے تو میں اپنی بات آگے بڑھاتا ہوں۔

اور تم ہندوؤ! تم کہتے ہو کہ آج جو لوگ مصیبت جھیل رہے ہیں' یہ پچھلے جنم کے گنہ گار ہیں۔ ٹھیک ہے۔ تم کہتے ہو' آج کے ظالم پچھلے جنموں میں سادھو تھے' لہٰذا وہ اقتدار کا مزہ لوٹ رہے ہیں۔ مجھے یہ ماننا پڑتا ہے کہ آپ کے اسلاف بہت چالاک تھے۔ انہوں نے ایسے اصول وضع کیئے جن میں دلیل اور عدم اعتماد کی بھی کوششوں کو ناکام کرنے کی کافی طاقت ہے۔ لیکن ہمیں یہ تجزیہ کرنا ہے کہ یہ باتیں کہاں تک درست ثابت ہوئی ہیں؟

قانون کے سب سے مشہور دانشوروں کے مطابق سزا کو مجرم پر پڑنے والے اثر کی بنیاد پر' صرف تین یا چار اسباب سے جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ ہیں انتقام' خوف اور اصلاح۔ آج سبھی ترقی پسند مبلغین کے ذریعہ انتقام کے اصولوں کی مذمت کی جاتی ہے۔ خوف زدہ کرنے کے اصولوں کا بھی خاتمہ ویسا ہی ہے' صرف اصلاح کرنے کا اصول ہی ضروری ہے اور ارتقائے انسانی کا جزو لاینفک ہے۔ اس کا مقصد مجرم کو ایک انتہائی قابل اور امن پسند شہری کے طور پر سماج کو لوٹانا ہے۔ مگر یہ بات مان بھی لیں کہ انسانوں نے پہلے جنم میں گناہ کیئے ہیں تو خدا کے ذریعہ انہیں دی گئی سزا کا جواز کیا ہے؟ تم کہتے ہو کہ وہ انہیں گائے' بلی' درخت' جڑی بوٹی یا جانور پیدا کرتا ہے۔ تم ایسی 84 لاکھ سزائیں شمار کراتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ انسان پر مصلح کے طور پر ان کا کیا اثر ہے؟ تم ایسے کتنے افراد سے ملے ہو جو یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی گناہ کے سبب پچھلے جنم میں گدھوں کی شکل میں پیدا ہوئے تھے؟ ایک بھی نہیں؟ اپنے پرانوں (ہندوؤں کی مذہبی کتاب) کی مثال مت دو۔ میرے پاس تمہاری مذہبی کہانیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور پھر کیا تمہیں پتہ ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا گناہ غریب ہونا ہے؟ غریبی ایک لعنت ہے' یہ ایک سزا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کریمنالوجی یا قانون کے ایک ایسے دانشور کی آپ کہاں تک تعریف کریں گے جو کسی ایسی سزا کا نظم کرے جو کہ لازمی طور پر انسان کو مزید جرم کرنے پر مجبور کرے؟ کیا تمہارے خدا نے یہ نہیں سوچا تھا؟ یا اس کو بھی یہ ساری باتیں انسانیت کے ذریعہ کیئے گئے مصائب کی قیمت پر تجربات سے سیکھنی تھیں۔ تم کیا سوچتے ہو' کسی غریب اور جاہل کنبہ جیسے ایک چمار یا مہتر کے یہاں پیدا ہونے پر انسان کی قسمت کیا ہوگی؟ چوں کہ وہ غریب ہے' اس لئے تعلیم نہیں حاصل کر سکتا۔ وہ اپنے ان ساتھیوں سے الگ تھلگ رہتا ہے جو بڑی ذات میں پیدا ہونے کے سبب اپنے کو اس سے برتر سمجھتے ہیں۔ اس کی جہالت' اس کی غریبی اور اس کے ساتھ کیا جانے والا برتاؤ اس کے دل کو سماج کے تئیں بیگانہ بنا دیتا ہے۔ مان لو اگر وہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا پھل کون کھائے گا؟ خدا' وہ خود یا سماج کے تعلیم یافتہ افراد اور ان لوگوں کی سزا کے بارے میں تم کیا کہو گے'

جنہیں مغرور برہموں نے جان بوجھ کرنا خواندہ بنائے رکھا اور جنہیں تمہارے علم کی مقدس کتابوں، ویدوں کے چند جملے سن لینے کے سبب کان میں سیسہ پلائے جانے کی سزا بھگتنی پڑتی تھی؟ اگر وہ کوئی جرم کرتے ہیں تو اس کے لئے کون ذمہ دار ہوگا اور ان کے حملہ کو کون برداشت کرے گا؟ میرے عزیز دوستو! یہ سارے اصول خصوصی اختیارات رکھنے والے لوگوں کے ایجاد کردہ ہیں۔ یہ اپنی غصب کردہ طاقت، سرمایہ اور عظمت کو ان اصولوں کی بنیاد پر یح قرار دیتے ہیں۔ جی ہاں، شاید وہ افٹن سنکلیئر ہی تھا، جس نے کسی جگہ لکھا تھا کہ انسان کو بس (روح کی) عمارت میں یقین دلا دو اور اس کے بعد اس کا سارا مال و دولت لوٹ لو۔ وہ بلا تکلف اس کام میں تمہاری مدد کرے گا۔ مذہب کے ٹھیکہ داروں اور اقتدار کے مالکوں کے اشتراک سے ہی جیل، پھانسی گھر، کوڑے اور یہ سارے اصول پیدا ہوتے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ تمہارا خدائے قدیر ہر شخص کو اس وقت کیوں نہیں روک دیتا ہے جب وہ کوئی گناہ یا جرم کررہا ہوتا ہے۔؟ یہ تو وہ بہت آسانی سے کرسکتا ہے۔ اس نے کیوں نہیں لڑاکوں راجاؤں کو یا ان کے اندر لڑنے کی فطرت کو ختم کیا اور اس طرح عالمی جنگ کے ذریعہ انسانیت پر پڑنے والے مصائب سے اسے کیوں نہیں بچایا؟ اس نے انگریزوں کے ذہن میں ہندوستان کو آزاد کردینے کے لئے جذبہ کیوں نہیں پیدا کیا؟ وہ کیوں نہیں سرمایہ داروں کے دل میں یہ جوش بھر دیتا کہ وہ پیداوار کے وسائل پر ذاتی ملکیت کا اپنا حق چھوڑ دیں اور اس طرح نہ صرف پورے مزدور طبقہ بلکہ پوری نسل انسانی کو سرمایہ داری کی بیڑیوں سے آزاد کریں۔ عام سوشلزم کی معنویت پر بحث چاہتے ہیں، میں اسے آپ کے خدائے قدیر پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ اسے لاگو کرے۔ جہاں تک عام لوگوں کی بھلائی کا سوال ہے، لوگ سوشلزم کی خوبیوں کو مانتے ہیں، لیکن وہ اس کے عملی نہ ہونے کا بہانہ کرکے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ چلو آپ کا خدا آئے اور وہ ہر چیز کو صحیح طریقہ سے انجام دے دے۔ اب گھما پھرا کر دلیل دینے کی کوشش نہ کریں، وہ بے کار بات ہے۔ میں آپ کو یہ بتادوں کہ انگریزوں کی حکومت یہاں اس لئے نہیں ہے کہ خدا چاہتا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ان کے پاس طاقت ہے اور ہم میں اس کی مخالفت کی جرأت نہیں۔ وہ ہمیں اپنے اقتدار میں خدا کی مدد سے نہیں رکھے ہوئے ہیں بلکہ وہ ایسا بندوقوں، رائفلوں، بم اور گولیوں، پولیس اور فوج کی مدد سے کئے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ سماج کے خلاف سب سے قابل مذمت جرم ایک ملک کا دوسرے ملک کے ذریعہ استحصال کامیابی کے ساتھ کررہے ہیں۔ کہاں ہے خدا؟ وہ کیا کررہا ہے؟ کیا وہ نسل انسانی کے ان مصائب کا مزہ لے رہا ہے؟ وہ نیرو ہے، چنگیز ہے تو وہ برباد ہو۔

کیا تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں اس دنیا کے وجود اور انسان کے وجود کی تعریف کیسے کرسکتا ہوں؟ ٹھیک ہے، میں تمہیں بتاتا ہوں، چارلس ڈارون نے اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کو پڑھو۔ سوہن سوامی کی 'سہج گیان' پڑھو۔ تمہیں اس سوال کا کچھ حد تک جواب مل جائے گا۔ تخلیق کائنات ایک قدرتی واقعہ ہے۔ یعنی مختلف مادوں کے مرکب سے زمین بنی۔ کب؟ تاریخ دیکھو۔ اسی طرح کے واقعات سے ذی روح پیدا ہوئے اور ایک طویل عرصہ کے بعد انسان۔ ڈارون کی "Origin of Species" پڑھوں اور اس کے بعد سمجھ میں آجائے گا کہ ساری ترقی انسان کی فطرت سے جدوجہد اور اس پر فتح پانے کی لگن سے ہوئی۔ یہ اس واقعہ کی مختصر تعریف ہے۔

تمہاری دوسری دلیل یہ ہوسکتی ہے کہ کیوں ایک بچہ اندھا یا لنگڑا پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کے پچھلے جنم کے ایک کام کا پھل نہیں ہے تو؟ سائنس دانوں نے اس مسئلہ کا سائنسی حل نکالا ہے۔ ان کے مطابق اس کی ساری ذمہ داری والدین کے کاندھوں پر ہے، جو اپنے ان کاموں کے تئیں لاپرواہ یا بے فکر رہتے ہیں جو بچے کی پیدائش سے قبل ہی اسے معذور بنادیتے ہیں۔

ممکنہ طور پر تم ایک اور سوال پوچھ سکتے ہو' اگرچہ یہ سوال طفلانہ ہے۔ وہ سوال یہ کہ اگر خدا کہیں نہیں ہے تو لوگ اس میں یقین کیوں کرنے لگے؟ میرا جواب مختصر اور واضح ہوگا' جس طرح لوگ بھوت پریتوں اور بری آتماؤں میں یقین کرنے لگے اسی طرح خدا کو ماننے لگے۔ فرق صرف یہ ہے کہ خدا میں یقین عالمی پیمانے پر ہے اور اس کا فلسفہ انتہائی ترقی یافتہ۔ کچھ تبدیلی چاہنے والوں (ریڈیکلس) کے برعکس میں اس کی پیدائش کا سہرا ان استحصال کرنے والوں کی اہلیت کو نہیں دیتا جو پرماتما کے وجود کا وعظ کر کے لوگوں کو اپنے دائرہ اختیار میں رکھنا چاہتے تھے اور ان سے اپنی خصوصی حیثیت کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اگرچہ بنیادی نکتہ پر میرا ان سے اختلاف نہیں ہے کہ سبھی مذاہب' فرقے' پنتھ اور ایسی دیگر تنظیمیں آخر میں بے رحم اور استحصالی تنظیموں' لوگوں اور طبقوں کی حامی ہو جاتی ہیں۔ راجا کے خلاف بغاوت ہر مذہب میں ہمیشہ ہی گناہ رہا ہے۔

خدا کی موجودگی کے بارے میں میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ انسان اپنی حدود' کمزوریوں اور خامیوں کو سمجھنے کے بعد' امتحان کی گھڑی کا بہادری اور حوصلہ کے ساتھ سامنا کرنے' خود کو پرجوش بنانے' سبھی خطروں کو مردانگی کے ساتھ جھیلنے اور عیش و آرام میں واقع ہونے والے خلل کو روکنے کے لئے خدا کے خیالی تصور کا وجود میں لایا۔ اپنے ذاتی مقاصد کی خاطر خدا کا بڑھا چڑھا کر تصور کیا گیا اور پیش کیا گیا۔ جب اس کا ذکر ہوتا ہے تو اس کا استعمال ایک قہار کے طور پر کیا جاتا ہے تا کہ انسان سماج کے لئے ایک خطرہ نہ بن جائے۔ جب اس کے اوصاف کا بیان ہوتا ہے تو اس کا استعمال ایک والد' والدہ' بھائی' بہن' دوست اور معاون کی طرح کیا جاتا ہے۔ اس طرح جب انسان اپنے سبھی دوستوں کی اعتماد شکنی اور ان کے ذریعہ چھوڑ دینے سے انتہائی دکھی ہو تو اسے اس خیال سے سکون مل سکتا ہے کہ ایک سچا دوست ہمیشہ اس کی مدد کرنے کو تیار ہے' اسے سہارا دے گا' جو کہ خدائے قدیر ہے اور وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ درحقیقت غیر تہذیب یافتہ دور میں یہ سماج کے لئے مفید تھی۔ آفات میں پڑے انسان کے لئے خدا کا تصور معاون ثابت ہوتا ہے۔

سماج کو اس خدا کے یقین کے خلاف اسی طرح لڑنا ہوگا جیسا کہ مورتی پوجا اور مذہب سے متعلق تنگ نظریات کے خلاف لڑنا پڑا۔ اسی طرح انسان جب اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگے اور حقیقت پسند بن جائے تو اسی خدا پر عقیدہ کو پرے ہٹا دینا چاہئے اور ان سبھی تکالیف' پریشانیوں کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کرنا چاہئے' جن میں حالات اسے لا کھڑا کر سکتے ہیں۔ میری حالت آج یہی ہے۔ یہ میرا زعم نہیں ہے۔ میرے دوست! یہ میرا طرز فکر ہے' جس نے مجھے دہریہ بنا دیا۔ میں نہیں جانتا کہ خدا کا یقین اور روزانہ دعا' جسے میں انسان کا سب سے زیادہ خود غرضانہ اور پست عمل تصور کرتا ہوں' میرے لئے معاون ثابت ہوگا یا میری حالت کو مزید ابتر کر دے گا۔ میں نے ان دہریوں کے بارے میں پڑھا ہے' جنھوں نے سبھی مصائب کا بہادری سے مقابلہ کیا' لہٰذا میں بھی ایک مرد کی طرح پھانسی کے پھندے پر آخری دم تک سر اونچا کئے کھڑا رہنا چاہتا ہوں۔

دیکھنا یہ ہے کہ میں اس پر کتنا کھرا اترتا ہوں۔ میرے ایک دوست نے مجھے عبادت کرنے کے لئے کہا۔ جب میں نے اسے اپنے دہریہ ہونے کی بات بتائی تو اس نے کہا ''دیکھ لینا' اپنے آخری دنوں میں تم خدا کو ماننے لگو گے''۔ میں نے کہا نہیں محترم' ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا کرنا میرے لئے تحقیر آمیز اور شکست کی بات ہوگی۔ مفاد کی خاطر میں دعا نہیں کروں گا''۔ قارئین! میرے دوستو! کیا یہ زعم ناقص ہے؟ اگر ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔

جنگ آزادی کی تحریک میں پنجاب کی اہمیت

1931

بھگت سنگھ نے جیل میں بہت کچھ لکھا تھا۔ میں دہریہ کیوں ہوں؟ سماج واد کا آدرش' دی ڈور ٹو ڈیتھ وغیرہ۔ ان میں سے ایک پنجاب کی سیاسی بیداری کی تاریخ بھی تھی' جس کا مندرجہ ذیل حصہ 1931 میں لاہور کے ہفتہ وار 'بندے ماترم' میں بالترتیب شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اردو میں لکھا گیا۔ - مدیر

پنجاب کے سابق گورنر سر مائیکل اوڈائر نے اپنی کتاب میں ایک غیر مقبول مگر بہت اہم سچائی کو ظاہر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ پنجاب سیاسی ہلچل میں سب سے پیچھے ہے۔ پنجاب کی سیاسی تحریکات کا جنہیں تھوڑا بہت علم ہے' وہ اس سچائی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

آج تک کی تاریخ دیکھئے۔ ہندوستان کو آزاد کرانے میں سب سے زیادہ قربانیاں اسی صوبہ نے دی ہیں۔ اس کے لئے اس ریاست کے عوام کو کافی مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں۔ سیاسی' مذہبی تحریکات وغیرہ میں پنجاب ہندوستان کے دیگر صوبوں سے آگے رہا ہے اور ملک کے لئے جان و مال کی قربانی سب سے زیادہ اسی صوبہ کے لوگوں نے دی ہے مگر اس پر بھی ہمیں سر خم کر کے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سیاسی میدان میں پنجاب سب سے پیچھے ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سیاسی تحریکات یہاں کے عوام کی ذاتی زندگی کا لازمی جز نہیں بن سکیں۔ ادبی میدان میں بھی اس صوبہ نے قابل ذکر مقام حاصل نہیں کیا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے اس وقت تک' اوڈائر کی اس کتاب کے لکھنے تک ملک کی جد وجہد آزادی کا سوال سب سے زیادہ ضروری اور اہم نہیں بنا تھا' اس لئے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صوبہ سب سے پیچھے ہے۔ ہندوستان میں اور بھی ایسے صوبے ہیں' جو پنجاب سے بہت پیچھے ہیں مگر افسوس ہے کہ یہ بد قسمت صوبہ اس قسم کے الزامات برداشت کر کے بھی پیچھے ہی ہے۔

پنجاب کی خصوصی طور پر اپنی کوئی زبان نہیں ہے۔ زبان کے فقدان کے سبب ادبی شعبہ میں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ لہٰذا تعلیم یافتہ برادری کو مشرقی ادب پر ہی انحصار کرنا پڑا۔ اس کا افسوس ناک نتیجہ یہ سامنے آیا کہ پنجاب کا ناخواندہ طبقہ اپنے صوبہ کی سیاسی ہلچلوں سے الگ تھلگ پڑا رہا۔ اسی وجہ سے پنجابی ادب اور آرٹ میں سیاست کو مقام نہیں مل سکا۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب میں ایسے کارکن چنندہ ہی ہیں' جنہوں نے اپنی پوری زندگی سیاست میں گزاری۔ اسی بنیاد پر اس صوبہ پر ایسے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ اپنے صوبہ کی اس کمی کی طرف صوبائی رہنماؤں اور مردانہ سماج کی توجہ مبذول کرانا ان مضامین کا مقصد ہے۔

گرو رام سنگھ جی کی قیادت میں ہوئی ''کوکا بغاوت'' سے لے کر آج تک پنجاب میں جو بھی تحریکات سامنے آئیں اور جس طرح عوام میں بیداری آئی' اس سے وہ آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے تیار ہو گئے ان میں جن شخصیات نے اپنی جانوں کی قربانیاں دیں' ان کے احوال زندگی اور تاریخ ہر مرد و عورت کی بہادری کو جوش اور ولولہ دینے والا ہے' جس سے وہ اپنے مطالعہ اور تجربات کی روشنی میں آئندہ تحریکات کو بھی بخوبی چلا سکیں گے۔ اس تاریخ کو قلم بند کرنے کا میرا مقصد قطعی یہ نہیں ہے کہ مستقبل میں بھی بالکل اسی طرح کی تحریکات کامیابی سے ہم کنار ہو سکیں گی۔ میرا مقصد تو صرف یہ

ہے کہ عوام ان شہیدوں کی قربانیوں اور ان کے تاحیات ملک کی خدمت کرنے سے تحریک پائے اور ان کی تقلید کرے۔ وقت آنے پر کس طرح کام کرنا ہوگا' اس کا فیصلہ ملک کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے کارکن خود کر سکتے ہیں۔

پنجاب میں سیاسی ہلچل کیسے شروع ہوئی؟

1907 سے قبل پنجاب میں مکمل خاموشی تھی۔ بغاوت (کوکا بغاوت) کے بعد کوئی ایسی سیاسی تحریک نہیں چلی' جو حکمرانوں کو نیند سے جگا سکے۔ 1908 میں پنجاب میں پہلی بار کانگریس کا اجلاس ہوا' مگر اس وقت کانگریس کے کام کی بنیاد حکمرانوں کے تئیں وفاداری ظاہر کرنا تھا' اس لئے سیاسی حلقوں میں اس کا کوئی قابل ذکر اثر نہیں پڑا۔ 06-1905 میں تقسیم بنگال کے خلاف جو طاقت ور تحریک شروع ہوئی' سودیشی کے فروغ اور غیر ملکی اشیاء کے بائیکاٹ کی جو سرگوشی شروع ہوئی تھی' اس کا پنجاب کی صنعتی زندگی اور عام لوگوں پر کافی اثر پڑا۔ ان دنوں یہاں بھی (پنجاب) سودیشی اشیاء' خاص طور پر کھانڈ تیار کرنے کا سوال پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دو ملیں بھی کھل گئیں۔ اگرچہ ریاست کی سیاسی زندگی پر اس کا کوئی قابل ذکر اثر نہیں پڑا مگر حکومت نے اس صنعت کو برباد کرنے کے لئے گنے کی کاشت کاری کا لگان تین گنا بڑھا دیا۔ پہلے ایک بیگھہ پر لگان 2.50 روپے تھا جب کہ اب ساڑھے سات روپے دینے پڑتے تھے۔ اس سے کسانوں پر بھاری بوجھ آن پڑا اور وہ مجبور محض رہ گئے۔

نیا کالونی ایکٹ

دوسری طرف سرکار نے لائل پور وغیرہ میں کئی نہریں کھدوا کر اور جالندھر' امرت سر' ہوشیار پور کے باشندوں کو بہت سی سہولیات کا لالچ دے کر اس علاقہ میں بلا لیا تھا۔ یہ لوگ اپنی پرانی زمین جائیداد چھوڑ کر آئے اور کئی برس تک اپنا خون پسینہ ایک کر کے انہوں نے اس جنگل کو گلزار کر دیا۔ لیکن ابھی یہ چین کی سانس بھی نہ لے پائے تھے کہ نیا کالونی ایکٹ ان کے سر آ گیا۔ یہ ایکٹ کیا تھا' کسانوں کے وجود کو مٹا دینے کا ایک طریقہ تھا۔ اس ایکٹ کے مطابق ہر شخص کی جائیداد کا وارث محض اس کا بڑا لڑکا ہو سکتا ہے۔ چھوٹے بیٹوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں رکھا گیا تھا۔ بڑے بیٹے کی موت کے بعد یہ زمین اور دیگر جائیداد چھوٹے بیٹے کو نہیں مل سکتی تھی' جس سے اس پر حکومت کا اختیار ہو جاتا تھا۔

کوئی آدمی اپنی زمین پر لگے درختوں کو نہیں کاٹ سکتا تھا۔ ان سے وہ ایک مسواک تک نہیں توڑ سکتا تھا۔ کسی طرح کا مکان یا جھونپڑا' یہاں تک کہ مویشیوں کو چارہ ڈالنے کے لئے کھرلی تک نہیں بنائی جا سکتی تھی۔ قانون کی تھوڑی حکم عدولی کرنے پر چوبیس گھنٹہ کا نوٹس دے کر مبینہ طور پر ملزم کی زمین ضبط کر لی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا قانون بنا کر سرکار چاہتی تھی کہ تھوڑے سے غیر ملکیوں کو تمام زمین کا مالک بنا دیا جائے اور زمین کے ہندوستانی کاشت کار ان پر منحصر رہیں۔ علاوہ ازیں حکومت یہ بھی چاہتی تھی کہ دیگر ریاستوں کی طرح پنجاب میں تھوڑے سے (چند) بڑے بڑے زمین دار ہوں اور باقی انتہائی غریب کاشت کار ہوں۔ اس طرح عوام کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مال دار کبھی بھی اور کسی بھی حالت میں حکومت مخالفین کا ساتھ دینے کی جرأت نہیں کر سکیں گے اور غریب کاشت کاروں کو جو دن رات محنت کر کے بھی پیٹ نہیں بھر سکیں گے' اس کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ اس طرح حکومت کھلے ہاتھوں جو چاہے گی کرے گی۔

بدامنی کے بیج

ان دونوں اتر پردیش اور بہار وغیرہ ریاستوں میں کسانوں کی حالت ایسی ہی ہے (تھی) لیکن پنجاب کے لوگ جلد ہی

سنبھل گئے۔حکومت کی اس پالیسی کے خلاف انہوں نے زبردست احتجاج شروع کیا۔راولپنڈی کی طرف بھی ان دنوں ہی نیا بندوبست ختم ہوا تھا اور لگان بڑھایا گیا تھا۔اسی طرح 1907 کے آغاز میں ہی بدامنی کے بھی اسباب موجود تھے۔اس سال کے آغاز میں ہی پنجاب کے گورنر سر ایبٹسن نے کہا بھی تھا کہ اس وقت ظاہری طور پر تو امن ہے لیکن عوام کے دلوں میں بے چینی اور بے اطمینانی بڑھتی جا رہی ہے۔

ان دنوں پورے ملک میں ایک خاموشی سی چھائی ہوئی تھی۔عوام ٹھہرو اور دیکھو کی ذہنی حالت میں تھے۔یہ خاموشی طوفان سے قبل کی خاموشی تھی۔بے چینی پیدا ہونے کے سبھی اسباب موجود تھے' خاص طور پر پنجاب میں تو ایسے حالات تھے کہ بدامنی پھیلنا مناسب اور لازمی تھا۔

1906 کی کانگریس

1906 میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوا۔دادا بھائی نوروجی اس کے صدر تھے۔اس اجلاس میں انہوں نے سب سے پہلے اپنے خطاب میں 'سوراجیہ' لفظ کا استعمال کیا۔برطانوی پارلیمنٹ کے اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر آں جہانی دادا بھائی نے کہا تھا کہ اگر ہم کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے اندر طاقت پیدا کرنی ہوگی۔اپنے پیروں کی طاقت پر ہی ہمیں کھڑا ہونا ہوگا' پتھر کے بت کی طرح جمی ہوئی نگاہ سے دیکھتے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔

لالہ لاجپت رائے

ٹھیک یہی بات ایک سال قبل بنارس میں کانگریس کے اجلاس میں پنجاب کیسری لالہ لاجپت رائے جی نے کہی تھی۔محترم لالہ جی کانگریس کے صدر آں جہانی گوکھلے کے ساتھ ایک ڈیپوٹیشن میں انگلینڈ بھیجے گئے تھے۔وہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے ایک بہت ہی گرم تقریر کی۔

لوک مانیہ تلک

1906 کے کانگریس اجلاس میں لوک مانیہ تلک کا بول بالا تھا' نوجوان طبقہ ان کی کھری اور واضح باتوں کے سبب ان کا دیوانہ بن گیا تھا۔ان کی بے باکی' کچھ کر گزرنے کا جذبہ اور بڑی سے بڑی مصیبت جھیلنے کے لئے ہر لمحہ تیار رہنے کے سبب نوجوان ان کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔کانگریس اجلاس کے علاوہ کانگریس کے پنڈال سے باہر بھی لوک مانیہ کی متعدد تقاریر اس موقع پر ہوئیں۔

سردار کشن سنگھ اور سردار اجیت سنگھ

جو نوجوان لوک مانیہ تلک کے جانب خصوصی طور پر مائل ہوئے' ان میں کچھ پنجابی نوجوان بھی تھے۔ایسے ہی دو پنجابی جوان کشن سنگھ اور میرے قابل احترام چچا سردار اجیت سنگھ جی تھے۔

'بھارت ماتا' اخبار اور مہتہ نند کشور

سردار کشن سنگھ اور سردار اجیت سنگھ نے لاہور لوٹ کر 'بھارت ماتا' نامی ایک ماہانہ اخبار شروع کیا اور محترم مہتہ نند کشور کو ساتھ لے کر اپنے خیالات کی تشہیر شروع کر دی۔ان کے پاس نہ دولت تھی نہ صاحب ثروت طبقہ سے تعلق تھا۔کسی برادری کے لیڈر یا مہنت بھی نہیں تھے' لہٰذا تشہیری کام کے لئے بذات خود سبھی وسائل مہیا کرنے پڑے۔ایک دن گھنٹی بجا کر بازار میں کچھ

لوگوں کو جمع کرلیا اور اس موضوع پر تقریر کرنے لگے کہ غیر ملکیوں نے ہندوستانی صنعتوں اور پیشہ کو کس طرح برباد کیا ہے۔ وہیں یہ بھی اعلان کر دیا کہ آئندہ اتوار کو ایک اہم سبھا 'بھارت ماتا' کے دفتر کے پاس' جو لاہور اور شالیمار دروازے کے وسط میں واقع ہے' ہوگی۔ پہلی میٹنگ پاپڑ منڈی میں' دوسری لاہوری منڈی میں ہوئی۔ تیسری میٹنگ میں تقاریر سے قبل ایک پنجابی نوجوان نے بڑی حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ایک نظم پڑھی' جس کی سامعین نے بہت تعریف کی۔ اب یہ نوجوان بھی اس پارٹی میں شامل ہوگیا۔ یہ نوجوان پنجاب کے مشہور قومی شاعر لالہ لال چند 'فلک' تھے' جو آج تک اپنی حوصلہ مند نظموں سے ملک کو جگاتے رہے ہیں۔ اسی ہفتہ لالہ پنڈی داس جی اور ڈاکٹر ایشوری پرساد جی وغیرہ اور چند مزید افراد بھی اس پارٹی میں شامل ہوگئے۔ ان کے پارٹی میں آنے سے 'انجمن محبان وطن' کے نام سے ایک تنظیم بنائی گئی' جو بعد میں 'بھارت ماتا سوسائٹی' کے نام سے مشہور و معروف ہوئی۔

آئندہ اتوار کو پھر ایک عام میٹنگ ہونے والی تھی۔ اسی دن لاہور میں مسز اینی بیسنٹ کی تقریر بھی ہونی تھی۔ کچھ ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ اس موقع پر 'بھارت ماتا سوسائٹی' تحلیل کر دی جائے مگر یہ تجویز قبول نہیں کی گئی اور نہ ہی اجلاس کو رد کرنا مناسب سمجھا۔ آخر کار اجلاس ہوا تو موجودگی کافی تعداد میں تھی۔ اسی اجلاس میں یہ اعلان کیا گیا کہ ہر اتوار کو اجلاس ہوا کرے گا اور اس ادارہ کے معتمد سردار اجیت سنگھ اور سکریٹری مہتہ نند کشور منتخب کئے گئے ہیں۔

جاٹوں کی میٹنگ

ایک دو ماہ تک اسی طرح تشہیری مہم جاری رہی۔ ایک دن لاہور اور امرت سر کے علاقوں میں جاٹ کاشت کاروں نے لگان بڑھائے جانے کے خلاف ایک میٹنگ کرنے کا ارادہ کیا۔ اجمیری دروازہ کے باہر رتن چند کی سرائے میں یہ میٹنگ منعقد کی گئی مگر جب جاٹ لوگ جمع ہوگئے تو ڈی سی نے رتن چند کے لڑکے کو بلا کر جائیداد ضبط کر لینے کی دھمکی دی۔ اس پر رتن چند کے لڑکے نے وہاں جمع ہوئے کسانوں کو اپنی سرائے سے باہر نکال دیا۔ ایسے حالات میں کسانوں نے شہر کے لیڈر سمجھے جانے والے لوگوں سے رابطہ قائم کیا مگر وہاں سے بھی انہیں کوئی واضح جواب نہیں ملا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر وہ بے چارے میونسپل گارڈن میں جا بیٹھے۔ اسی درمیان 'بھارت ماتا سوسائٹی' کے ممبروں کو اس کی اطلاع مل گئی اور وہ ان لوگوں کو اپنی جگہ پر لے آئے۔ سوسائٹی کے پاس ایک کمرے کے علاوہ ایک وسیع میدان بھی تھا۔ اس میدان میں دریاں بچھا کر شامیانہ لگوا دیا گیا اور ایک طرف ان کسانوں کے کھانے کے لئے لنگر کا انتظام کر دیا گیا۔ اس سے کسانوں کا جوش کافی بڑھ گیا اور پھر پورے ایک ہفتہ روزانہ وہیں میٹنگیں ہوئیں' جن میں بے باک تقاریر کی گئیں۔ اس میٹنگ میں جاٹوں کا جوش دیکھ کر 'بھارت ماتا سوسائٹی' کے ممبروں کا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔

بعد ازاں دیہاتوں کے دورے کا پروگرام بنایا گیا' جس سے کسانوں کو لگان بندی کے لئے تیار کیا جا سکے۔ یہ حکومت کے خلاف اعلان جنگ تھا اور عوام میں جوش اتنا تھا کہ جدوجہد میں وہ سب کچھ داؤ پر لگا دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔

صوفی امبا پرساد

ٹھیک انہیں دنوں 'بھارت ماتا سوسائٹی' میں ایک اعلیٰ درجہ کے محب وطن' سیاست داں اور رائٹر داخل ہوئے۔ آپ کا نام صوفی امبا پرساد تھا۔ صوفی کی ولادت 1858 میں مرادآباد میں ہوئی۔ وہ اردو کے معتبر رائٹر' ہندو مسلم اتحاد کے کٹر حامی اور آزادی کے متوالے تھے۔ آپ نے ایک ہفتہ وار نکالا تھا اور اس کے ایک سال بعد ہی حکومت سے بغاوت کے الزام میں

سوا دو سال کی قید کی سزا پائی۔ یہ سزا کاٹ کر آئے تو ایک سال کے اندر اندر آپ کے خلاف دوسرا مقدمہ درج کر لیا گیا اور اس مرتبہ آپ کو چھ سال قید کی سزا ملی۔ ان دونوں سرکار سے بغاوت کی سزا پائے ہوئے قیدیوں کو بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا اور ان کے ساتھ جیل میں برا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ 1906 میں آپ جیل سے رہا ہوئے اور پنجاب میں یہ نئی سیاسی بیداری دیکھ کر پنجاب چلے گئے۔ یہاں پر آپ کو 'ہندوستان' نامی ہفتہ وار کا معاون مدیر بنایا گیا۔ آپ کے شعلہ فشاں مضامین اور اداریوں میں آپ کا نام دیئے جانے سے اخبار کے مالکان کو بڑی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اس پر آپ کو مذکورہ اخبار سے استعفا دینا پڑا۔ سب سے پہلے آپ جاٹوں کی میٹنگ میں آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بعد میں تو سردار اجیت سنگھ سے آپ کی ایسی قربت ہو گئی تھی کہ ایک دوسرے سے علاحدہ ہونا ناممکن ہو گیا۔

انہیں دنوں لائل پور میں ایک بہت بڑا میلہ لگنے والا تھا۔ یہ میلہ 'منڈی مویشیاں' کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں میلہ لوگ ہزاروں مویشیوں کی خرید و فروخت کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ اس سال روزنامہ 'زمین دار' کے مالک میاں سراج الدین اور ایک دو دیگر لوگوں نے اس موقع پر ایک اجلاس کرنے کا ارادہ کیا۔ اس میں نئے کالونی ایکٹ کے خلاف تجویز پاس کرنی تھی۔ اس اجلاس کو خطاب کرنے کے لئے لالہ لاجپت رائے کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ بھارت ماتا سوسائٹی کے ممبران نے بھی اس موقع پر اجلاس کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بھارت ماتا سوسائٹی کے ممبران گرم دل ہوا تھے' لہٰذا قانونی طور پر تحریکات چلانے کا خیال رکھنے والے افراد اس سے ذرا گھبرا گئے۔ بھارت ماتا سوسائٹی کی طرف سے دو کارکنوں کو وہاں اس مقصد کے لئے بھیجا گیا کہ وہاں پہنچ کر حالات کو اپنے حق میں کر لیں' جس سے ایک دو دن بعد سردار اجیت سنگھ جی اپنے دیگر رفقاء کے ساتھ پہنچ کر کامیابی کے ساتھ تشہیر کا کام انجام دے سکیں۔

زمین دار سبھا کی طرف سے جو پنڈال لگا تھا' اس میں ہی دو ایک دن تقریر کر کے بھارت ماتا سوسائٹی کے کارکنوں نے عوام کی ہمدردی حاصل کر لی۔ ادھر جس دن آں جہانی لالہ جی لاہور سے روانہ ہوئے' اسی دن سردار اجیت سنگھ جی بھی وہاں کے لئے روانہ ہو گئے۔ لالہ جی نے سردار اجیت سنگھ سے تفتیش کرائی کہ آپ کا آئندہ پروگرام کیا ہے؟ اپنے پروگرام کی اطلاع بھی لالہ جی نے دی کہ حکومت نے کالونی ایکٹ میں جو تھوڑی سی تبدیلی کی ہے' اس کے لئے حکومت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس قانون کو بیک جنبش قلم مسترد کرنے کا مطالبہ کریں گے۔

سردار جی نے جواب میں کہا۔ ''ہمارا پروگرام تو یہ ہے کہ عوام کو لگان بندی کے لئے تیار کیا جائے۔ ساتھ ہی ہمارے پروگرام میں حکومت کے تئیں تشکر کے لئے تو کوئی جگہ مل ہی نہیں سکتی۔

لالہ جی اور سردار جی دونوں ہی لائل پور پہنچے۔ آں جہانی لالہ جی کا عظیم الشان جلوس نکالا گیا' جس کے سبب تقریباً دو گھنٹہ میں لالہ جی پنڈال میں پہنچ سکے۔ لیکن ہمارے ایسے بھی لوگ تھے' جو جلوس میں شمولیت اختیار نہ کر کے براہ راست پنڈال میں پہنچ گئے تھے اور وہاں تقاریر شروع ہو گئی تھیں۔ ایک دو مختصر تقریر کے بعد سردار اجیت سنگھ نے تقریر کی۔ آپ بہت موثر مقرر تھے۔ آپ کی بے باک اور منفرد طرز تقریر نے عوام کو آپ کا دیوانہ بنا دیا اور سامعین بھی جوش میں آ چکے تھے۔ جس وقت اس اجلاس کے کنوینر جلوس کو لے کر پنڈال میں پہنچے' عوام 'بھارت ماتا سوسائٹی' کے ساتھ ہو چکے تھے۔ ایک دو نرم دل لیڈروں نے سردار اجیت سنگھ کو بولنے سے روکنے کی کوشش کی لیکن سامعین نے ان کو ایسی پھٹکار لگائی کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اس سے عوام کے جوش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ایک کسان نے اٹھ کر اعلان کر دیا کہ میرے پاس دس مربع زمین ہے' جسے میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور اپنی بیوی کے ساتھ ملک کی خدمت کو تیار ہوں۔

سردار اجیت سنگھ کے بعد لالہ لاجپت رائے تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ لالہ جی پنجاب کے بے نظیر مقرر تھے مگر اس دن کے ماحول میں وہ جس شان، جس بے باکی اور جس عزم مصمم کے ساتھ بولے اس کی بات ہی کچھ نرالی تھی۔ لالہ جی کی تقریر کی ایک ایک لائن پر تالیاں بجتی تھیں اور جے کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ اجلاس کے بعد بہت سے لوگوں نے اپنے آپ کو ملک کی خدمت کرنے کے لئے وقف کرنے کا اعلان کیا۔

لائل پور کے ڈی سی بھی وہاں موجود تھے۔ اجلاس کی کارروائی دیکھ کر انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اجلاس کا انعقاد ایک سازش تھی۔ لالہ لاجپت رائے ان سب کے گرو ہیں اور نوجوان سردار اجیت سنگھ ان کا شاگرد ہے۔ حکومت کا یہ خیال بہت دنوں تک قائم رہا۔ ممکنہ طور پر لالہ جی اور اجیت سنگھ کو نظر بند کرنے کا بھی یہی سبب تھا۔

لالہ جی کی تقریر کے بعد مسٹر بانکے دیال جی نے ایک بہت موثر نظم پڑھی، جو بعد میں انتہائی مقبول ہوئی۔ یہ نظم 'پگڑی سنبھال اوجٹا' تھی۔

لالہ بانکے دیال پولیس میں سب انسپکٹر تھے اور سرکاری نوکری چھوڑ کر اس آندولن میں شامل ہو گئے تھے۔ اس دن نظم پڑھ کر جب وہ اسٹیج سے اترے تو بھارت ماتا سوسائٹی کے کارکنوں نے ان کو گلے سے لگا لیا۔

لاہور میں ہوئے فسادات کے بعد میونسپل بورڈ نے ایک تجویز پاس کی کہ شہر میں سبھی کالجوں کے پرنسپل سے کہا جائے کہ وہ طالب علموں کو سیاسی تحریکات میں حصہ لینے سے روکیں اور انہیں ہوسٹل سے باہر نہ جانے دیں۔ جو طالب علم ان کے حکم کی خلاف ورزی کریں، انہیں سخت سے سخت سزا دی جائے۔

اس تجویز کے تعلق سے لوک مانیہ تلک نے اپنے مراٹھی اخبار 'کیسری' میں ایک زبردست مضمون لکھا۔ لوک مانیہ تلک نے لکھا تھا کہ اس فساد پر کسے افسوس اور رنج نہ ہوگا؟ کون کہتا ہے کہ نوجوان تھوڑے صبر سے کام نہ لیں؟ لیکن میونسپل بورڈ کی اس تجویز کا کیا مطلب ہے؟ پچاس سال بعد آج ملک میں تھوڑی سی بیداری نظر آئی ہے۔ اسے ایک معمولی بلوہ کے سبب ختم کرنے کی تجویز کیوں پاس کی جائے؟ آج جب نوجوانوں میں حب الوطنی کا جذبہ اُمڈ پڑا ہے اور وہ آزادی کے لئے بے قرار ہیں تو ان کو پیار کے ساتھ سمجھانا چاہئے کہ وہ اپنی طاقت کو اس طرح فضول برباد نہ کریں۔

عوام جوش میں آ کر جب کچھ کر گزرتے تھے تو گرم گروپ کی یہی پالیسی ہوتی تھی۔ گرم گروپ کے لیڈر جانتے تھے کہ جب عوام میں بیداری آتی ہے تو اس کے ساتھ جوش اور بے چینی ہونا بھی لازمی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ پھونک پھونک قدم رکھنے والے افراد بھی جدوجہد آزادی میں زیادہ وقت تک نہیں ٹک سکتے۔ تعمیر قوم تو نوجوانوں کے ہی دم سے ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ:

"اصلاح بوڑھے آدمی نہیں کر سکتے کیوں کہ وہ بہت ہی ذہین اور سمجھ دار ہوتے ہیں۔ اصلاح تو ہوتی ہے نوجوانوں کی محنت، حوصلہ، قربانی اور عقیدت سے، جن میں خوف کے لئے ذرہ برابر جگہ نہیں ہوتی اور جو غور و خوض کم اور تجربہ زیادہ کرتے ہیں"۔

ایسا لگتا ہے کہ اس وقت اس ریاست (پنجاب) کے نوجوان ان جذبوں سے متاثر ہو کر ہی جدوجہد آزادی میں کود پڑے تھے۔ تین سال قبل جہاں مکمل سکوت طاری تھا، وہاں اب سودیشی اور سوراجیہ کا آندولن اتنا طاقتور ہو گیا کہ نوکر شاہی پریشان ہو گئی۔ ادھر لائل پور وغیرہ اضلاع میں نئے کالونی ایکٹ کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ وہاں کسانوں کی ہمدردی میں ریلوے کے مزدوروں نے بھی ہڑتال کی اور ان کی مدد کے لئے پیسہ بھی جمع کیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپریل کے آخر میں حکومت پنجاب گھبرا گئی۔ پنجاب کے موجودہ گورنر نے حکومت ہند کو اپنے ایک خط میں اس کی مفصل جانکاری دیتے ہوئے

لکھا تھا: ''ریاست کے شمالی اضلاع میں صرف تعلیم یافتہ طبقۂ اور ان میں بھی خاص کر وکیل اور طالب علم طبقہ تک ہی نئے خیالات محدود ہیں مگر ریاست کے مرکز کی طرف بڑھتے ہی یہ صاف نظر آتا ہے کہ بے چینی بدامنی تیزی سے بڑھتی جارہی ہے''۔اسی خط میں آگے انہوں نے لکھا تھا: ''ان لوگوں کو (تحریک کے لیڈران کو) امرتسر اور فیروزپور میں خاص طور پر کامیابی ملی ہے۔راولپنڈی اور لائل پور کی طرف بھی وہ بے چینی پھیلانے میں کامیاب ہورہے ہیں۔لاہور کا تو کہنا ہی کیا ہے''۔خط کے آخر میں کہا گیا ہے: ''کچھ لیڈر تو انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کرنے کا منصوبہ بنارہے ہیں۔وہ یا تو طاقت کے ذریعہ ایسا کرنا چاہتے ہیں یا عوام اور اقتدار کے درمیان عدم تعاون کے ذریعہ ایسا ماحول پیدا کرنے کے لئے وہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ طریقہ سے انگریزوں کے تئیں نفرت اور غصہ پیدا کردینا چاہتے ہیں۔موجودہ صورت حال بہت نازک ہے اور جلد ہی ہمیں اس کا کچھ نہ کچھ انتظام کرنا چاہئے۔

'ڈریم لینڈ' کا دیباچہ

لالہ رام سرن داس آزادی کی لڑائی کے ان مشہور مجاہدین میں شمار کئے جاتے ہیں' جنہوں نے قدم آگے بڑھانے کے بعد رکنے کا نام نہیں لیا۔1907 میں شہید بھگت سنگھ کے چچا آں جہانی اجیت سنگھ کے ساتھ انہوں نے جنگ آزادی میں قدم رکھا۔عمر قید کاٹ کر جیل سے آئے تو انقلابیوں کی مدد کرنے لگے۔لاہور سازش کیس میں پھر انہیں پھنسایا گیا اور پھر پانچ سال کی قید ہوئی۔جیل میں ہی وہ انگریزی میں نظم لکھتے رہتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ 'ڈریم لینڈ' جب تیار ہوا تو انہوں نے بھگت سے اس کا دیباچہ لکھنے کی درخواست کی۔بھگت سنگھ نے اسے بڑے تامل کے بعد قبول کیا اور لاہور سنٹرل جیل میں ہی 15 جنوری 1931 کو بطور دیباچہ تنقیدی مضمون تحریر کیا جو کہ بنیادی طور پر انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ڈریم لینڈ' کے دیباچہ سے بھگت سنگھ کی ادبی فہم وفراست کا بھی پتہ چلتا ہے نیز مضمون ان کے نقطۂ نظر کے حوالے سے بھی انتہائی اہم ہے۔ مدیر

میرے قابل دوست لالہ رام سرن داس نے مجھ سے اپنی کتاب 'ڈریم لینڈ' (خوابوں کا جہاں) نامی کتاب کا دیباچہ لکھنے کے لئے کہا ہے۔میں نہ تو شاعر ہوں' نہ ادیب' نہ ہی مصنف یا نقاد۔اس لئے میں ان کے مطالبہ کی کوئی معنویت نہیں محسوس کر پا رہا ہوں۔لیکن میں جن حالات میں ہوں' وہ مجھے مصنف سے اس معاملے پر بحث یا حجت کرنے کی سہولت فراہم نہیں کرتے اور اس طرح اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ میں اپنے دوست کی خواہش کی تکمیل کروں۔

چوں کہ میں شاعر نہیں ہوں' اس لئے میں اس پر اس نظریہ سے بحث نہیں کرنے جا رہا ہوں۔مجھے ردیف اور قافیہ کا بالکل علم نہیں ہے اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ قافیہ کے پیمانوں سے جانچنے پر یہ صحیح ثابت ہوگا یا نہیں۔ادیب نہ ہونے کے ناطے قوم کے ادب میں اسے جائز مقام دلانے کے نقطۂ نظر سے بھی میں اس پر بحث نہیں کرنے جا رہا ہوں۔

ایک سیاسی کارکن ہونے کے ناطے میں زیادہ سے زیادہ اس پر اسی نقطۂ نظر سے بات کر سکتا ہوں۔لیکن یہاں بھی ایک بات میرے کام کو تقریباً ناممکن بنا دیتی ہے کیوں کہ میں کتاب کے موضوع کے بارے میں مصنف سے متفق نہیں ہوں' میں اپنے دوست سے سبھی معاملات پر یکساں رائے رکھنے والا نہیں ہوں۔وہ اس بات کو جانتے تھے کہ میں بنیادی سوالوں پر ان

سے اختلاف رکھتا ہوں' اس لئے میں جو لکھنے جا رہا ہوں' وہ کسی بھی حالت میں کتاب کا دیباچہ نہیں ہوگا بلکہ حد درجہ امکان ہے کہ اس میں ان کی بہت کچھ تنقید ہو سکتی ہے اور اس لئے اسے کتاب کے آخر میں شامل کیا جائے' ابتدا میں نہیں۔

سیاسی حلقوں میں 'ڈریم لینڈ' کا بہت اہم مقام ہے۔ موجودہ صورت میں وہ تحریک کی ایک اہم کمی کو پورا کر رہی ہے۔ دراصل جدید تاریخ میں کسی طرح کی اہم رول رکھنے والی ہر سیاسی تحریک بغیر کسی آدرش کے رہی ہے۔ انقلابی تحریک بھی اس سے اچھوتی نہیں ہے۔ ایک غدر پارٹی کو چھوڑ کر جس نے امریکی طرز کی سرکار سے متاثر ہو کر واضح طور پر کہا تھا کہ وہ ہندوستان کی موجودہ حکومت کو ہٹا کر اس کی جگہ جمہوری طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں' اپنی پوری کوششوں کے باوجود مجھے ایسی ایک بھی انقلابی پارٹی نہیں ملی' جسے اس بات کا واضح علم ہو کہ وہ کس کے لئے لڑ رہی ہے۔ دیگر سبھی پارٹیوں میں جو لوگ تھے' وہ محض اتنا جانتے تھے کہ انہیں غیر ملکی حکمرانوں سے نبرد آزما ہونا ہے۔ یہ خیالات اپنے آپ میں قابل تعریف ہیں لیکن اسے انقلابی نظریہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہمیں واضح کر دینا چاہئے کہ انقلاب کا مطلب صرف اتھل پتھل یا ایک قتل و غارت گری نہیں ہے۔ جب ہم انقلاب کی بات کرتے ہیں تو اس میں موجودہ نظام (یعنی حکومت) کو پوری طرح نیست و نابود کرنے کے بعد سماج کی منظم تشکیل کا پروگرام پوشیدہ ہے۔

سیاسی حلقوں میں لیبرلس موجودہ سرکار کے ماتحت رہ کر ہی کچھ اصلاح چاہتے تھے' جب کہ انتہا پسندوں کے مطالبات کچھ زیادہ تھے اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے انتہا پسندی کے حق میں تھے۔ انقلابی ہمیشہ اشتعال انگیز اقدامات کے حق میں رہے ہیں اور ان کا نظریہ رہا ہے غیر ملکی تسلط کو ختم کرنا۔ بلاشبہ اس میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے' جو ان اشتعال انگیز اقدامات سے کچھ زیادہ حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ ان سبھی تحریکات کو صحیح معنوں میں انقلابی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن لالہ رام سرن داس پہلے انقلابی ہیں' جنہیں پنجاب میں ایک بنگالی کے توسط سے 1908 میں باضابطہ طور پر (انقلابی پارٹی میں) شامل کیا تھا۔ تب سے وہ مسلسل انقلابی تحریکات کے رابطہ میں رہے اور آخر کار وہ غدر پارٹی میں شامل ہو گئے۔ لیکن تحریک کے آدرش کے بارے میں ان لوگوں کے (1908 کے انقلابیوں کے) جو قدیم خیالات تھے' ان کو انہوں نے ترک نہیں کیا۔ کتاب کی قدر و قیمت کو بڑھانے والی ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ لالہ رام سرن داس کو 1915 میں سزائے موت ملی تھی۔ بعد ازاں وہ سزا کم کر کے عمر قید میں بدل دی گئی تھی۔ آج خود پھانسی کی کوٹھری میں بیٹھ کر اپنے قارئین سے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ عمر قید کی سزا سزائے موت سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ لالہ رام سرن داس کو پورے چودہ سال جیل میں گزارنے پڑے اور انہوں نے یہ شاعری جنوبی ہند کی کسی جیل میں کی تھی۔ مصنف کی اس وقت کی ذہنی کیفیت اور جدوجہد کی شاعری پر واضح چھاپ ہے اور وہ اسے مزید خوب صورت اور دلچسپ بنا دیتی ہے۔ ان اشعار کو رقم کرنے سے قبل مصنف مختلف جذبوں کے خلاف جدوجہد کرتا رہا ہے۔ ایسے وقت میں جب بہت سے ساتھی یقین دہانی (انڈرٹیکنگ) کرا کر رہا ہو گئے تھے اور سب کے سامنے' اس کے سامنے بھی بڑی بڑی ترغیبات تھیں اور جب بیوی اور بچوں کی خوش گوار یادیں نجات کی امیدوں کو مزید مستحکم کر رہی تھیں' تب اسے ان سب باتوں سے پست کرنے والے اثر کے خلاف جدوجہد کرنی پڑی تھی تب اس نے اپنی توجہ ان (شعری تخلیقات) پر مرکوز کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ شعر کے ابتدائی بند میں ہمیں اس طرح کا جذبہ نظر آتا ہے:

"Wife, Children, Friends that me surround
Were poisonous snakes all around."

''پتنی' پتر' متر گن میرے

جو مجھ کو رہتے ہیں گھیرے
وِش دھرناگ سدر شیہ تھے یہ سب
دیتے رہے چھند شی پھیرے"

وہ ابتدا میں فلسفہ کی بات کرتا ہے۔ یہ فلسفہ بنگال اور پنجاب کی سبھی انقلابی تحریکوں کی جان ہے۔ میرا مصنف سے اس نکتہ پر شدید اختلاف ہے۔ اس کی دنیا کی تعریف میٹافیزیکل ہے جب کہ میں ایک مادہ پرست ہوں اور موجودہ صورت حال نظر آنے والی دنیا کی میری تعریف اسباب سے متعلق ہوگی۔ پھر بھی یہ تخلیق کسی حالت میں غیر ضروری نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں جو عام نظریہ رائج ہے، وہ مصنف کے ذریعہ ظاہر کئے گئے نظریات سے زیادہ میل کھاتا ہے۔ اس وقت کی اضمحلالی کیفیت سے لڑنے کے مقصد سے اس نے دعا کا راستہ اپنایا ہے۔ یہ اس بات سے ظاہر ہے کہ کتاب کا مکمل ابتدائی حصہ خدا، اس کی تخلیق اور اس کی تعریف وغیرہ کو وقف ہے۔ خدا پر یقین کا نتیجہ ہے اور یہ راز دارانہ ذہنیت افسردگی کی فطری پیداوار ہے۔ یہ دنیا مایا ہے یا فریب ہے، ایک خواب یا تخیل ہے، ایسے نظریات کو راز کہتے ہیں۔ اس نظریہ کو قدیم عہد کے شنکر آچاریہ اور ان جیسے دیگر فلسفیوں نے جنم دیا اور اسے فروغ دیا۔ لیکن فلسفۂ مادیت کے تحت اس طرح کے نظریہ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پھر بھی مصنف کا یہ تجسس کسی بھی شکل میں حقیر، او چھا یا غمزدہ کرنے والا نہیں ہے۔ اس کا اپنا حسن اور جاذبیت ہے۔ اس کے خیالات حوصلہ افزا ہیں۔ دیکھئے:

"Be a foundatoin stone obscure,
And on thy breast Cheerfully bear
The architecture vast and huge,
In suffering find true refuge
Envy not the plastered top- stone
On which all worthy praise thrown" etc. etc.

یعنی:

نگاہ سے اوجھل چھپے ہوئے بنیاد کے پتھر بنو
اور اپنے سینے پر خوشی برداشت کرو
عظیم اور بھاری عمارت کا بوجھ
تکلیف برادشت کرنے کا سچا جذبہ پیدا کرو
نہ کہ دروازے پر نصب شدہ اس پتھر سے حسد کرو
پوری دنیا رشک سے نگاہ ڈالتی ہے۔

اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر میں آسانی سے کہہ سکتا ہوں کہ خفیہ کاموں میں جب انسانوں کو مسلسل خطروں بھری زندگی گزارنی پڑتی ہے نا امیدی اور بے خوفی ہمیشہ انجانی، بے نیاز، بے کیف موت کے لئے آمادہ، تب ایسے مواقع پر ذاتی لالچ اور خواہشات سے وہ اس طرح کے تجسس کے سہارے لڑ سکتا ہے۔ اور ایسا تجسس کسی طرح سے بھی پستی یا کم مائیگی پیدا کرنے والا نہیں ہوتا۔

مصنف نے ایک انقلابی کی ذہنیت کا ذکر کیا ہے۔ لالہ رام سرن داس ایک ایسی انقلابی پارٹی کے ممبر تھے، جسے بہت سے تشدد آمیز کاموں کے لئے جواب دہ ٹھہرایا گیا تھا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انقلابی لوگ بربادی اور تباہی میں سکھ کا احساس کرنے والے اور خون کے پیاسے افراد ہوتے ہیں۔ دیکھئے:

"اگر ضرورت ہو تو اوپر سے انتہا پسند اور خوف ناک بنو
لیکن دل سے ہمیشہ منکسر المزاج رہو
پھپھکارو اگر ضرورت ہو، مگر کاٹو مت،
دل سے پیار کرو اور اوپر سے لڑو

تعمیر کے لئے تخریب ضروری ہی نہیں لازمی ہے۔ انقلابیوں کو اسے اپنے عمل کے لئے لازمی طور پر اپنانا پڑتا ہے۔ اور تشدد اور اہنسا کے فلسفہ کا مذکورہ بالا اشعار میں بہت خوب صورتی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ لینن نے ایک بار گورکی سے کہا تھا کہ ایسی موسیقی سننے کو نہیں ملی جو جسم میں روح پھونک دے اور یہ کہ ایسی موسیقی سن کر ان کی خواہش فن کاروں کے سر تھپتھپانے کی ہوتی ہے۔ انہوں نے آگے کہا "لیکن یہ وقت سر تھپتھپانے کا نہیں ہے۔ اس وقت تو ہاتھوں کا کام سروں کو توڑنے کا ہے۔ اگر چہ ہمارا حتمی مقصد ہر طرح کے تشدد کا خاتمہ کرنا ہے"۔ جب انقلابیوں کو ایک لازمی ضرورت کے طور پر متشددانہ اقدامات سے کام لینا پڑتا ہے تو وہ بھی بالکل ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔

اس کے بعد مصنف نے آپس میں ٹکرانے والے مختلف مذاہب کے مسائل کو لیا ہے۔ وہ سبھی مذاہب میں تال میل قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ سبھی نیشنلسٹ کرتے ہیں۔ سوال کو سلجھانے کا یہ طریقہ طویل اور گول مول ہے اور جہاں تک میرا سوال ہے، میں اسے کارل مارکس کے ایک جملہ سے یہ کہہ کر رد کر دوں گا کہ "مذہب عوام کے لئے افیم ہے"۔

آخر میں اس کی نظم کا سب سے اہم حصہ وہ آتا ہے، جہاں اس نے مستقبل کے سماج کے بارے میں لکھا ہے، جس سماج کی تشکیل کے لئے ہم بے قرار ہیں۔ لیکن میں ابتدا میں ہی ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ڈریم لینڈ سچ مچ کا ایک خوابستان ہے۔ مصنف نے بڑی فراخ دلی سے کتاب کے عنوان کے ذریعہ اسے تسلیم کر لیا ہے۔ وہ اس موضوع پر کوئی سائنسی تھیسس لکھنے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ ڈریم لینڈ (خوابستان) عنوان اس بات کو بالکل واضح کر دیتا ہے۔ لیکن خوابستان کا لازمی طور پر سماجی ترقی میں اہم رول ہے۔ سینٹ سائمن، فوریے اور رابرٹ اوین اور ان کے اصولوں کی عدم موجودگی میں شاید مارکسی سائنٹفک سوشلزم بھی نہ ہوتا۔ جب ہمارے کارکن اپنے تحریک کے فلسفہ کو منظم شکل دینے اور تحریک کے بارے میں ایک سائنسی نظریہ وضع کرنے کی اہمیت کو سمجھیں گے، اس وقت یہ کتاب ان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوگی۔

میں نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ مصنف کا طرز اظہار واضح نہیں ہے۔ اپنے خوابستان کا ذکر کرتے وقت مصنف موجودہ سماج کے خیالات سے اچھوتا نہیں رہ پایا ہے۔

ضرورت مندوں کو عطیہ دینا

مستقبل کے سماج میں یعنی کمیونسٹ سماج میں جس کی ہم تعمیر کرنا چاہتے ہیں، ہم خیراتی ادارے قائم کرنے نہیں جا رہے ہیں بلکہ اس سماج میں نہ غریب ہوں گے نہ ضرورت مند، نہ عطیہ دہندگان، نہ عطیہ یافتگان۔ اس مساوات کے باوجود مصنف نے سوال کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کتاب میں مصنف نے سماج کے جس عام خاکہ پر بحث کی ہے، وہ بہت کچھ ویسا ہی ہے جیسا سائنسی سماج واد۔ لیکن اس میں ایسی باتیں بھی ہیں، جن کی مخالفت یا ردعمل ضروری ہے، یا یوں کہا جائے کہ ان میں اصلاح ضروری ہے۔ مثال کے طور پر 427ویں بند کے نیچے دی ہوئی تفصیل میں وہ لکھتا ہے کہ ملک کے ملازمین کو اپنی روزی کمانے کے لئے روزانہ چار گھنٹے گھنٹوں پر یا کارخانوں میں کام کرنا چاہئے۔ لیکن یہ غیر عملی اور غیر مفید بات ہے۔ یہ بات شاید موجودہ نظام میں سرکاری ملازمین کو جو بڑی تنخواہ دی جاتی ہے، اس کے خلاف ردعمل کے طور پر کہی گئی ہے۔ دراصل بولشیوکوں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا تھا کہ دماغی کام اتنا ہی محنت کا ہے، جتنی کہ جسمانی محنت اور مستقبل کے سماج میں جب مختلف عناصر کے آپسی تعلقات کا ادغام مساوات کی بنیاد پر ہوگا تب دونوں مساوی طور پر اہم سمجھے جائیں گے۔ آپ ایک جہاز راں سے یہ امید نہیں کرسکتے کہ وہ ہر چوبیس گھنٹے بعد اپنے جہاز کو روک کر روزی کمانے کے لئے چار گھنٹے کھیت پر کام کرنے چلا جائے گا یا ایک سائنس داں اپنی لیبارٹری اور اپنے تجربہ (کام) کو چھوڑ کر کھیت پر اپنے کام کا کوٹہ پورا کرنے چلا جائے گا۔ یہ دونوں بہت اہم کام کررہے ہیں۔ سوشلسٹ سماج میں اتنے ہی فرق کی امید کی جاسکتی ہے کہ ذہنی کام کرنے والا جسمانی کام کرنے والے سے برتر نہیں مانا جائے گا۔

مفت تعلیم کے بارے میں لالہ رام سرن داس کا خیال واقعی قابل توجہ ہے اور روس سے وہاں کی سماج وادی سرکار نے بہت کچھ اسی قسم کا طریقہ اپنایا ہے۔

جرم کے بارے میں ان کی یہ بحث واقعی بہت دور رس اور اعلیٰ فکر کی حامل ہے۔ جرم ایک بہت سنگین سماجی مسئلہ ہے، جو بہت محتاط علاج کا متقاضی ہے۔ مصنف نے اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ جیل میں گزارا ہے۔ اسے عملی تجربہ ہے۔ ایک مقام پر اس نے خالص جیل کی زبان استعمال کی ہے جیسے ہلکی مشقت، درمیانی مشقت اور سخت مشقت وغیرہ۔ سبھی دیگر سماجوادیوں کی طرح اس کی تجویز ہے کہ سزا کی بنیاد انتقام کی بجائے اصلاح ہونا چاہئے۔ قانون کے ذریعہ انصاف کے نفاذ کا اصول سزا دینا نہ ہوکر مجرم کو راہ راست پر لانا ہونا چاہئے اور جیلوں کا نظم جہنم نما ہونے کی بجائے اصلاح خانوں کے طور پر ہو تو بہتر ہے قارئین کو چاہئے کہ اس سلسلے میں میں روسی قید خانوں کے نظام کا مطالعہ کریں۔

افواج سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اس نے جنگوں کے بارے میں بھی اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ میری رائے ہے کہ اس وقت (مستقبل میں) کے انسائیکلوپیڈیا میں جنگ کے بارے میں بہت کم صفحات رکھے جائیں گے اور جنگی آلات حرب وضرب عجائب گھروں کی زینت بڑھائیں گے کیوں کہ اس سماج میں جنگ کی صورت حال پیدا کرنے والے باہم مخالف نہیں رہ جائیں گے۔

زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنگ ابتدائی مرحلے تک ہوں گی۔ یعنی ہم روس کی مثال لیں تو اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ وہاں اس وقت پسماندہ طبقات کے ہاتھوں میں نظام حکومت ہے۔ وہ لوگ سوشلسٹ سماج کا قیام چاہتے ہیں۔ تب تک کے لئے سرمایہ دارانہ سماج سے اپنے تحفظ کی خاطر انہیں ایک فوج رکھنی پڑی لیکن اس کے جنگی مقاصد بالکل مختلف ہوں گے۔ انقلابی افواج دوسرے ممالک میں جائیں گی۔ وہاں کے عوام پر اقتدار کرنے یا اسے لوٹنے کے لئے نہیں

بلکہ استحصالی حکمرانوں کا تختہ پلٹنے کے لئے' ان کا خون چوسنے والے استحصالی نظام کا خاتمہ کرنے کے لئے اور وہاں کے محنت کش عوام کو نجات دلانے کے لئے لیکن وہاں ہمارے جوانوں کو لڑنے کے لئے آمادہ کرنے کی خاطر قدیم قومی یا نسلی منافرت نہیں ہوگی۔

آج کے سبھی آزاد خیال لوگوں کا سب سے زیادہ مقبول اور فوری مقصد ہے عالمی تنظیم اور مصنف نے اس موضوع سے انصاف کیا ہے اور مبینہ طور پر "لیگ آف نیشن" کی بہت خوب صورت انداز میں مذمت کی گئی ہے۔

571 ویں (572) بند کے نیچے درج ایک فٹ نوٹ میں مصنف نے مختصراً اقدامات کا سوال اٹھایا ہے۔ وہ کہتا ہے "اس طرح کی حکومت پر تشدد سے نہیں قائم کی جاسکتی۔ اسے سماج پر باہر سے تھوپا نہیں جاسکتا۔ اسے تو اندر سے ہی ترقی یافتہ ہونا پڑے گا۔ اس کا حصول آہستہ آہستہ اور سلسلہ وار ترقی کے عمل اور عوام کو مذکورہ بالا طرز پر تربیت دے کر ہوسکتا ہے' وغیرہ۔ اس بیان میں بذات خود کوئی خامی نہیں ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن پوری طرح سے اس کی وضاحت نہ کئے جانے کے سبب وہ کچھ غلط فہمیاں یا الجھن پیدا کرسکتا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ لالہ رام سرن داس کو طاقت کے استعمال کی لایعنیت کا علم ہوگیا ہے؟ کیا وہ اہنسا کے سخت حامی بن گئے ہیں؟ نہیں' اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا۔ مذکورہ بیان کا کیا مطلب ہے' آیئے' اس پر ذرا سی روشنی ڈالتے چلیں۔ دیگر کسی شخص کے مقابلے انقلابی اس بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ سوشلسٹ سماج کا قیام متشدد اقدامات سے نہیں ہوسکتا بلکہ اسے اندر سے ہی پروان چڑھنا ہے۔ مصنف کا مشورہ ہے کہ اس قسم کے اقدامات کی شکل میں محض تربیت سے ہی کام لینا چاہئے۔ لیکن ہر شخص اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ یہاں موجودہ سرکار بلکہ سبھی سرمایہ دار حکومتیں اس طرح کی کوششوں کی نہ صرف معاون نہیں ہوں گی بلکہ اس کے برعکس بے رحمی کے ساتھ اس کا خاتمہ کردیں گی۔ تب اس کی مسلسل ترقی سے کیا ملے گا۔ ہم انقلابی لوگ اقتدار ہتھیانے اور ایک انقلابی سرکار کی تشکیل کی کوشش کررہے ہیں۔ اس سرکار کو عوام کو خواندہ بنانے کے لئے اپنے سبھی وسائل کو بروئے کار لانا ہوگا۔ جیسا کہ اس وقت روس میں ہورہا ہے۔

سرمایہ داروں کے ہاتھوں سے اقتدار چھیننے کے بعد تعمیری کاموں کے لئے پرامن اقدامات بروئے کار لائے جائیں گے اور رخنوں کو ختم کرنے کے لئے طاقت کا استعمال کیا جائے گا۔ اگر مصنف کا یہی مقصد ہے تو ہم اس کے حامی ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کا یہی مطلب ہے۔

کتاب پر میں نے کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ دراصل میں نے اس پر تنقید کی ہے۔ لیکن میں کتاب میں کسی طرح کی تبدیلی لانے کے لئے کہنے نہیں جارہا ہوں کیوں کہ اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ 15-1914 کے انقلابیوں کے یہی نظریات تھے۔

میں اپنے نوجوانوں کے لئے خاص طور پر اس کتاب کی خاطر سفارش کرتا ہوں لیکن اس بات کے لئے متنبہ کرتے ہوئے کہ برائے مہربانی آنکھیں موند کر اس پر عمل نہ کرنے یا اس میں جو کچھ لکھا ہے' اسے بعینہ ماننے کے لئے نہ پڑھیں۔ اسے پڑھیں' اس کی تنقید کریں' اس پر سوچیں اور اس کی مدد سے اپنی فہم میں اضافہ کریں۔

۔ بھگت سنگھ

سیاسی پروگرام کا خاکہ

شہید بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی ہر کوشش اور ان کا تمام وقت عوام کو بیدار کرنے میں صرف ہوا۔ ہندوستانی عوام کے مستقبل کو ذہن میں رکھ کر انہوں نے ہندوستان میں انقلاب لانے کا پورا منصوبہ بنا کر اپنے ساتھیوں کے لئے جیل سے باہر بھیجا تھا۔ انقلابی پروگرام کا منصوبہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک چھاپ کر بانٹنے کے لئے جو ایک خط کی طرح لکھا گیا ہے اور دوسرا ایک مضمون کی شکل میں انقلابی ساتھیوں سے تبادلہ خیال کی خاطر اور کام میں ان کی رہنمائی کے لئے ہے۔ اس کا پہلا حصہ 'نوجوان سیاسی کارکنوں کے نام' کے عنوان سے اس وقت کے اخباروں میں کتر بیونت کے بعد شائع ہوا تھا۔ لاہور کے 'پیوپلس' میں 29 مارچ 1931 اور الہ آباد کے 'ابھیودے' میں 8 مئی 1931 کے شمارہ میں اس کے کچھ حصے شائع ہوئے تھے۔
یہ دستاویز اپنی اصل شکل میں ایک کتاب میں دستیاب ہوئی ہے۔ یہ کتاب سی آئی ڈی آفیسر سی ای ایس فیئر ویدر نے 1936 میں 'بنگال میں سنیکت مورچہ آندولن کی پرگتی پر نوٹ' عنوان سے لکھی تھی۔ اس کے مطابق یہ خاکہ بھگت سنگھ نے لکھا تھا اور 3 اکتوبر 1931 کو مسز وملا پربھا دیوی کے گھر سے تلاشی کے دوران برآمد ہوا تھا۔ اس پولیس آفیسر نے حتمی طور پر یہ اعادہ کیا تھا کہ اب بھی انقلابی طاقتیں اس پروگرام میں ذکر کردہ تجاویز کے مطابق کام کر رہی ہیں۔۔ مدیر

نوجوان سیاسی کارکنوں کے نام خط

عزیز ساتھیوں

اس وقت ہماری تحریک انتہائی اہم مرحلہ سے گزر رہی ہے۔ ایک سال کی سخت جدوجہد کے بعد گول میز کانفرنس نے ہمارے سامنے آئینی اصلاحات سے متعلق چند لازمی باتیں کہی ہیں اور کانگریسی لیڈروں سے کہا گیا ہے کہ موجودہ حالت میں اپنی تحریک واپس لے کر اس میں تعاون کریں۔ اس بات کی ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں ہے کہ وہ تحریک ختم کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں یا نہیں۔ یہ تو لازمی ہے کہ موجودہ تحریک کا خاتمہ کسی نہ کسی طرح کی مفاہمت کی شکل میں ہوگا۔ یہ بات الگ ہے کہ معاہدہ جلد ہوتا ہے یا بدیر۔ حقیقت میں معاہدہ کوئی حقیر یا قابل نفرت چیز نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی جدوجہد کا یہ ایک لازمی عنصر ہے۔ کوئی بھی ملک جو ظالم حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے ابتدا میں لازماً ناکام رہتا ہے۔ جدوجہد کے درمیان معاہدے کے ذریعہ چند آدھی ادھوری اصلاحات حاصل کرتا ہے اور صرف آخری دور میں ہی۔ جب تمام طاقتیں اور وسائل پوری طرح یکجا اور منظم ہو جائیں تو حکمراں طبقہ کو برباد کرنے کے لئے آخری زوردار حملہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ تب بھی ناکامی ہاتھ لگے اور کسی طرح معاہدہ ناگزیر ہو جائے۔ یہ بات روس کی مثال سے بخوبی واضح کی جا سکتی ہے۔

1905 میں جب روس میں انقلابی تحریکیں شروع ہوئیں تو سیاسی لیڈروں کو بڑی امیدیں تھی۔ لینن تب غیر ملک سے 'جہاں وہ پناہ گزیں تھے' لوٹ آئے تھے اور جدوجہد کی قیادت کر رہے تھے۔ لوگ انہیں یہ بتانے پہنچے کہ درجنوں جاگیردار جیل میں قتل کر دیئے گئے ہیں اور بیسوں محلات خاکستر کر دیئے گئے ہیں۔ لینن نے جواب میں کہا کہ لوٹ کر بارہ سو جاگیرداروں کا قتل کردو اور اتنے ہی محلوں کو جلا ڈالو کیوں کہ اگر ناکام رہے تو بھی اس کی کچھ اہمیت رہے گی۔ ڈیوما (روسی پارلیمنٹ) کی تشکیل ہوئی۔ اب لینن نے ڈیوما میں حصہ لینے کی وکالت کی۔ یہ 1907 کی بات ہے جب کہ 1906 میں وہ ڈیوما میں حصہ

لینے کے خلاف تھے۔ باوجود اس کے کہ اس ڈیوما میں کام کرنے کا موقع زیادہ تھا اور اس ڈیوما کے اختیار انتہائی محدود کر دیئے گئے تھے۔ یہ فیصلہ بدلتے ہوئے حالات کے سبب تھا۔ اب ری ایکشنری طاقتیں بہت بڑھ رہی تھیں اور لینن ڈیوما کے اسٹیج کو سوشلسٹ نظریات پر بحث کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

دوبارہ 1917 کے انقلاب کے بعد جب بالشیوک بریسٹ لٹوسک معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے مجبور ہوئے تو لینن کے سوائے باقی سبھی اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ لیکن لینن نے کہا ''امن' امن اور از سر نو امن'' کسی بھی قیمت پر امن ہونا چاہئے''۔ جب چند بالشیوک مخالفین نے اس سمجھوتہ کے لئے لینن کی مذمت کی تو انہوں نے واضح طور پر کہا کہ ''بالشیوک جرمن حملے کا سامنا کرنے سے اتفاق نہیں رکھتے' اس لئے مکمل تباہی کی جگہ مفاہمت کو ترجیح دی گئی ہے''۔

جو بات میں واضح کرنا چاہتا ہوں' وہ یہ ہے کہ معاہدہ ایک ایسا ضروری ہتھیار ہے' جسے جدوجہد کے فروغ کے ساتھ ساتھ استعمال کرنا ضروری ہو جاتا ہے' لیکن جس چیز کا ہمیشہ خیال رہنا چاہئے وہ ہے ''تحریک کا مقصد''۔ جن مقاصد کے حصول کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ ہم پر پوری طرح واضح ہونا چاہئے۔ اس بات سے اپنی تحریک کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا اندازہ کرنے میں ہمیں مدد ملتی ہے اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے میں بھی۔ تلک کی پالیسی' ان کے مقاصد کے باوجود یعنی ان کے داؤ پیچ بہت اچھے تھے۔ آپ اپنے دشمن سے سولہ آنا پانے کے لئے لڑ رہے ہیں۔ آپ کو ایک آنہ ملتا ہے' اسے جیب میں ڈالئے اور باقی کے لئے جدوجہد جاری رکھئے۔ نرم دل کے لوگوں میں جس چیز کی کمی دکھائی دیتی ہے' وہ ان کے آدرش کی ہے۔ وہ اکنی کے لئے لڑتے ہیں اور اس لئے انہیں مل ہی کچھ نہیں سکتا۔ انقلابیوں کو ہمیشہ یہ بات اپنے ذہن میں رکھنی چاہئے کہ وہ مکمل انقلاب کے لئے لڑ رہے ہیں۔ طاقت کی باگ ڈور پوری طرح اپنے ہاتھوں میں لینی ہے۔ مفاہمت سے اس لئے خوف محسوس ہوتا ہے کیوں کہ مخالف طاقتیں سمجھوتے کے بعد انقلابی طاقتوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن سمجھ دار اور بہادر انقلابی لیڈر تحریک کو ختم ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ ہمیں ایسے وقت میں اور ایسے موڑ پر حقیقی مدعوں اور خاص طور پر مقاصد کے تعلق سے انتشار نہیں پیدا ہونے دینا چاہئے۔ انگلینڈ کی لیبر پارٹی نے حقیقی جدوجہد سے فریب کیا ہے اور وہ (اس کے لیڈر) صرف کٹر سوشلسٹ بن کر رہ گئے ہیں۔

میرے خیال میں ان چولا بدلے ہوئے سوشلسٹ لیبر لیڈروں سے کٹر مخالفین ہمارے لئے بہتر ہیں۔ داؤ پیچ اور حکمت عملی سے متعلق لینن کی حیات اور تحریر پر ہمیں غور کرنا چاہئے۔ مفاہمت کے معاملے پر لیفٹ کمیونزم' میں ان کے واضح خیالات ملتے ہیں۔

کانگریس کا مقصد کیا ہے؟

میں نے کہا ہے کہ حالیہ تحریک کسی نہ کسی معاہدہ یا مکمل ناکامی پر ختم ہوگی۔

میں نے یہ اس لئے کہا ہے کیوں کہ میری رائے میں اس وقت حقیقی انقلابی طاقتیں میدان میں نہیں ہیں۔ یہ جدوجہد درمیانی طبقہ کے دکانداروں اور چند سرمایہ داروں کے بل بوتے پر کیا جا رہا ہے۔ یہ دونوں طبقے خاص طور پر سرمایہ دار' اپنی جائیداد یا ملکیت خطرہ میں ڈالنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ حقیقی انقلابی افواج تو گاؤں اور کارخانوں میں ہیں...... کسان اور مزدور۔ لیکن ہمارے 'بورژوا' لیڈروں میں انہیں ساتھ لینے کی ہمت نہیں ہے' نہ ہی وہ ایسی ہمت کر سکتے ہیں۔ یہ سوئے ہوئے شیر اگر ایک بار گہری نیند سے بیدار ہو گئے تو وہ ہمارے لیڈروں کے نصب العین کی حصولیابی کے بعد بھی رکنے والے نہیں

ہیں۔1920 میں احمد آباد کے مزدوروں کے ساتھ اپنے اولین تجربہ کے بعد مہاتما گاندھی نے کہا تھا''ہمیں مزدوروں کے ساتھ سانٹھ گانٹھ نہیں کرنی چاہئے۔کارخانوں کے سروہارا(پسماندہ) طبقہ کا سیاسی مفادات کے لئے استعمال کرنا خطرناک ہے''۔ (مئی 1931 کے دی ٹائمس سے ماخوذ) تب سے انہوں نے اس طبقہ کو ساتھ لینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔یہی حال کسانوں کا ہے۔1922 کی باردولی تحریک پوری طرح یہ واضح کرتی ہے کہ لیڈروں نے جب کسان طبقہ کی اس بغاوت کا مشاہدہ کیا' جسے نہ صرف غیر ملکی شکنجہ سے نجات حاصل کرنا تھا' بلکہ زمین داروں کی زنجیریں بھی توڑ دینی تھیں تو کتنا خطرہ محسوس کیا گیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیڈر کسانوں کے آگے جھکنے کے بجائے انگریزوں کے آگے گھٹنے ٹیکنا پسند کرتے ہیں۔پنڈت جواہر لعل نہرو کو چھوڑ دیں تو کیا آپ کسی بھی لیڈر کا نام لے سکتے ہیں' جس نے مزدوروں یا کسانوں کو منظم کرنے کی کوشش کی ہو۔نہیں' وہ خطرہ نہیں مول لیں گے۔یہی تو ان میں کمی تھی' اس لئے میں کہتا ہوں کہ وہ مکمل آزادی کے خواہاں نہیں۔معاشی اور انتظامی دباؤ ڈال کر وہ چند اور اصلاحات یعنی ہندوستانی سرمایہ داروں کے لئے مزید مراعات حاصل کرنا چاہیں گے۔اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اس آندولن کا بیڑہ تو غرق ہوگا ہی......شاید کسی نہ کسی مفاہمت یا ایسی کسی چیز کے بغیر ہی۔نوجوان کارکن جو پوری تن دہی کے ساتھ 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے لگاتے ہیں' خود پوری طرح منظم نہیں ہیں اور اپنی تحریک پروان چڑھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔حقیقت میں پنڈت موتی لعل نہرو کے سوائے ہمارے بڑے لیڈر کوئی ذمہ داری نہیں لینا چاہتے۔یہی سبب ہے کہ وہ ہر مرتبہ گاندھی کے آگے بلا شرط گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔اختلاف ہونے پر بھی وہ پوری شدت کے ساتھ مخالفت نہیں کرتے اور گاندھی کے سبب تجاویز پاس کر دی جاتی ہیں۔ایسے حالات میں انقلاب کے تئیں پوری سنجیدگی رکھنے والے نوجوان کارکنوں کو میں متنبہ کرتا ہوں کہ مشکل وقت آرہا ہے' وہ محتاط اور چوکس رہیں' ہمت نہ ہاریں اور الجھنوں میں گرفتار نہ ہوں۔'مہان گاندھی' کے ذریعہ آزادی کی جدوجہد کے دوران کی گئی کوششوں کے تجربوں کی روشنی میں ہم آج کے حالات اور مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں واضح رائے قائم کرسکتے ہیں۔

اب میں بالکل سادے طریقے سے یہ کیس بتاتا ہوں۔آپ 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ لگاتے ہو۔میں یہ مان کر چلتا ہوں کہ آپ اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔اسمبلی بم کیس میں دی گئی ہماری تعریف کے مطابق انقلاب کا مطلب موجودہ سماجی ڈھانچہ میں مکمل تبدیلی اور سوشلزم کا قیام ہے۔اس ہدف کی خاطر ہمارا اولین قدم طاقت حاصل کرنا ہے۔حقیقت میں 'اسٹیٹ' یعنی سرکاری مشینری' حکمراں طبقہ کے ہاتھوں میں اپنے مفاد کا تحفظ اور انہیں آگے بڑھانے کا ہی آلہ ہے۔ہم اس آلہ کو چھین کر اپنے آدرشوں کی تکمیل کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ہمارا آدرش ہے......نئے طریقہ کی سماج سازی' یعنی مارکسوادی نظریہ سے۔اسی ہدف کی حصولیابی کی لئے ہم سرکاری مشینری کا استعمال کرنا چاہتے ہیں۔عوام کو مسلسل تعلیم دیتے رہنا ہے تاکہ اپنے سماجی پروگرام کی تکمیل کے لئے مناسب اور موزوں ماحول بنایا جاسکے۔ہم انہیں جدوجہد کے دوران ہی اچھی تربیت اور تعلیم دے سکتے ہیں۔

ان باتوں کے بارے میں وضاحت یعنی ہمارے فوری اور حتمی نشانہ کی وضاحت سمجھنے کے بعد ہم موجودہ حالات کا تجزیہ کرسکتے ہیں۔کسی بھی حالت میں تجزیہ کرتے وقت ہمیں بالکل بے جھجک' انصاف پرست اور حقیقت پسند ہونا چاہئے۔

ہم جانتے ہیں کہ جب حکومت ہند میں ہندوستانی حصہ داری کو لے کر شور وغل ہوا تھا تو منٹو مارلے اصلاحات نافذ کی گئی تھیں' جن کے ذریعہ محض صلاح دینے کا اختیار رکھنے والی وائسرائے کونسل بنائی گئی تھی۔

عالمی جنگ کے دوران جب ہندوستانیوں مدد کی بے حد ضرورت تھی' خودمختار اقتدار والی سرکار نے وعدہ کیا اور موجودہ

اصلاحات نافذ کیں۔ اسمبلی کو کچھ محدود قانون بنانے کے اختیارات دیئے گئے لیکن سب کچھ وائسرائے کی مرضی پر منحصر ہے۔ اب تیسرا مرحلہ ہے۔ اب اصلاحات سے متعلق غور ہو رہا ہے اور مستقبل قریب میں یہ نافذ ہوں گے۔ اب نوجوان اس کو کیسے پرکھ سکتے ہیں' یہ ایک سوال ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کانگریسی لیڈر انہیں کیسے انہیں پرکھیں گے؟ لیکن ہم انقلابی انہیں مندرجہ ذیل کسوٹی پر جانچیں گے:

1۔ کس حد تک حکومت کی ذمہ داری ہندوستانیوں کو سونپی جاتی ہے؟

2۔ حکومت چلانے کے لئے کس طرح کی سرکار بنائی جاتی ہے اور عوام کو اس میں حصہ لینے کا کہاں تک موقع ملتا ہے؟

3۔ مستقبل میں کیا امکانات ہو سکتے ہیں اور ان حصولیابیوں کو کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے؟

اس کے لئے شاید کچھ مزید وضاحت کی ضرورت ہو۔ پہلی بات یہ کہ ہمارے عوام کے نمائندوں کو مجلس عاملہ میں کتنا اختیار اور ذمہ داری حاصل ہوتی ہے۔ اب تک مجلس عاملہ کو لیجسلیو اسمبلی کے تئیں جواب دہ نہیں بنایا گیا ہے۔ وائسرائے کے پاس ویٹو کی طاقت ہے' جس سے منتخب نمائندوں کی ساری کوششیں بے اثر کر دی جاتی ہیں یا روک دی جاتی ہیں۔

ہم سوراج پارٹی کے شکر گزار ہیں' جن کی کوششوں سے وائسرائے نے اپنی اس طاقت کا بڑی بے شرمی سے بار بار استعمال کیا اور قومی نمائندوں کے فیصلوں کو پامال کر دیا۔ یہ بات پوری طرح واضح ہے اور اس پر مزید بحث کی گنجائش نہیں۔

آیئے' سب سے پہلے مجلس عاملہ کے قیام کے طریقہ پر غور کریں؟ مجلس عاملہ کو اسمبلی کے منتخب ممبر چنتے ہیں یا پہلے کی طرح اوپر تھوپے جائیں گے؟ کیا یہ اسمبلی کے تئیں جواب دہ ہوگی یا پہلے ہی کی طرح اسمبلی کو حقیقی سمجھے گی؟

جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے' اسے ہم حق رائے دہندگی کے امکان کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ملکیت رکھنے کے حق کی دفعہ کو پوری طرح ختم کر کے وسیع حق رائے دہندگی کا اختیار دیا جانا چاہئے۔ ہر بالغ مرد و عورت کو ووٹ دینے کا حق ملنا چاہئے۔ اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ حق رائے دہی کس حد تک دیئے جاتے ہیں۔

یہاں میں صوبائی خودمختاری کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میں نے سنا ہے' اس کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اوپر سے تھوپا گیا گورنر' جس کے پاس اسمبلی سے زیادہ خصوصی اختیار رہوں گے' تاناشاہ سے کم ثابت نہیں ہوگا۔ ہم اسے صوبائی خودمختاری نہ کہہ کر صوبائی ظلم کہیں۔ اسٹیٹ کی تنظیموں کی یہ عجیب و غریب جمہوریت سازی ہے۔

تیسری بات تو بالکل واضح ہے۔ گزشتہ دو سال سے انگریز سیاست داں اس وعدے سے منحرف ہونے لگے ہیں' جسے مونٹ گیو نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ جب تک انگریزی خزانے میں دم ہے' ہر دس سال پر مزید اصلاحات کی جاتی رہیں گی۔

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ انہوں مستقبل کے لئے کیا فیصلہ کیا ہے۔ میں یہ بات واضح کر دوں کہ ہم ان باتوں کا تجزیہ اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ حصولیابیوں پر جشن منایا جائے بلکہ اس لئے کہ عوام میں بیداری پیدا کی جائے اور انہیں آئندہ جدوجہد کے لئے تیار کیا جا سکے۔ ہمارے لئے سمجھوتہ گھٹنے ٹیکنا نہیں ہے بلکہ ایک قدم بڑھنا اور پھر کچھ آرام کرنا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ سمجھوتہ اس سے زیادہ کچھ اور ہے بھی نہیں۔ یہ نہ آخری ہدف ہے اور نہ حقیقی معنوں میں جائے پناہ۔

موجودہ حالات پر کچھ حد تک غور کرنے کے بعد مستقبل کے پروگرام اور حکمت عملی پر غور و فکر کر لیا جائے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ کسی انقلابی پارٹی کے لئے حتمی پروگرام کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ انقلاب کا مطلب سرگرمیاں نہیں ہے۔ اس کا مطلب منظم اور مسلسل عمل کے ذریعہ سوچی سمجھی تبدیلی لانا ہے اور یہ توڑ

پھوڑ بدنظمی یا یکبارگی تبدیلی کے خلاف ہے۔ پروگرام طے کرنے کے لئے لازمی طور پر ان باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

1۔ منزل یا مقصد

2۔ بنیاد جہاں سے آغاز کرنا ہے یعنی موجودہ حالت۔

3۔ عملی شکل یعنی وسائل اور طریقہ کار۔

جب تک ان چیزوں سے متعلق کچھ واضح مقاصد نہ ہوں، تب تک پروگرام سے متعلق کوئی غور و فکر ممکن نہیں ہے۔

موجودہ صورت حال پر ہم کچھ حد تک غور کر چکے ہیں، ہدف کے حوالے سے بھی کچھ ذکر ہوا ہے۔ ہم سوشلزم پر مبنی انقلاب چاہتے ہیں جس کے لئے بنیادی ضرورت سیاسی انقلاب کی ہے۔ یہی مقصد ہے، جو ہم چاہتے ہیں۔ سیاسی انقلاب کا مطلب اقتدار (یعنی مجملہ طور پر طاقت) کا انگریزی ہاتھوں سے ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل ہونا ہے اور وہ بھی ان ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں، جن کا ہدف ہمارے ہدف سے مماثلت رکھتا ہے اور واضح طور پر کہیں تو اقتدار کو عوام کی کوششوں سے انقلابی پارٹی کے ہاتھوں میں منتقل ہونا ہے۔ اس کے بعد پوری سنجیدگی سے پورے سماج کو سماجی وادی سمت میں لے جانے کے لئے متحد ہو جانا ہوگا۔ اگر انقلاب سے آپ کا یہ مطلب نہیں ہے تو محترم مہربانی کریں اور 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے لگانا بند کر دیں۔ کم از کم ہمارے لئے لفظ انقلاب میں بہت بلند فکر مخفی ہے اور اس کا استعمال سنجیدگی کے بغیر نہیں کرنا چاہئے۔ نہیں تو اس کا غلط استعمال ہوگا۔ لیکن اگر آپ کہتے ہیں کہ آپ قومی انقلاب چاہتے ہیں؛ جس کا نصب العین ہندوستانی جمہوریت کا قیام ہے تو میرا سوال یہ ہے کہ اس کے لئے' آپ انقلاب میں معاونت کے لئے' کن طاقتوں پر انحصار کر رہے ہیں؟ انقلاب قومی ہو یا سماج وادی، جن طاقتوں پر ہم منحصر ہو سکتے ہیں، وہ ہیں کسان اور مزدور۔ کانگریسی لیڈروں میں انہیں منظم کرنے کی طاقت نہیں ہے، اس تحریک میں یہ آپ نے واضح طور پر دیکھ لیا ہے۔ کسی اور سے زیادہ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ ان طاقتوں کے بغیر وہ لاچار ہیں۔ جب انہوں نے مکمل آزادی کی تجویز پاس کی تو اس کا مطلب انقلاب ہی تھا، لیکن ان کا (کانگریس) مطلب یہ نہیں تھا۔ اسے نوجوان کارکنوں کی عدم موجودگی میں پاس کیا گیا تھا اور اس کا استعمال وہ دھمکی کے طور پر کرنا چاہتے تھے تاکہ اپنا من پسند ڈومینین اسٹیٹس حاصل کر سکیں۔ آپ کانگریس کے گزشتہ تینوں اجلاس کی تجاویز پڑھ کر اس کے سلسلہ میں صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں۔ میرا اشارہ مدراس، کلکتہ اور لاہور اجلاس کی طرف ہے۔ کلکتہ میں ڈومینین اسٹیٹ کے مطالبہ کی تجویز پاس کی گئی۔ 12 مہینے کے اندر اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے لئے کہا گیا اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو کانگریس مجبوراً مکمل آزادی کو اپنا مقصد بنا لے گی۔ پوری سنجیدگی سے وہ 31 دسمبر 1929 کی نصف شب تک اس تحفہ کی حصول یابی کا انتظار کرتے رہے اور تب انہوں نے مکمل آزادی کی تجویز تسلیم کرنے کے لئے خود کو پابند عہد پایا، جو کہ وہ چاہتے نہیں تھے اور اس وقت بھی مہاتما جی نے یہ بات چھپا کر نہیں رکھی کہ بات چیت کے دروازے کھلے ہیں۔ یہ تھا اس کا حقیقی مقصد۔ بالکل ابتدا سے ہی وہ جانتے تھے کہ ان کی تحریک کا خاتمہ کسی نہ کسی طور پر ہوگا۔ اس بے دلی سے ہم نفرت کرتے ہیں نہ کہ جدوجہد کے کسی مسئلے پر سمجھوتے سے۔

خیر! ہم اس بات کا ذکر کر رہے تھے کہ انقلاب کن کن طاقتوں پر منحصر ہے؟ لیکن اگر آپ سوچتے ہیں کہ کسانوں اور

مزدوروں کی سرگرم حصہ داری کے لئے تیار کرلیں گے تو میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کسی طرح کی جذباتی باتوں سے بے وقوف نہیں بنائے جاسکتے۔وہ صاف صاف پوچھیں گے کہ انہیں آپ کے انقلاب سے کیا فائدہ ہوگا؟ وہ انقلاب جس کے لئے آپ ان سے قربانی کا مطالبہ کررہے ہیں۔ حکومت ہند کے چیف لارڈ ریڈنگ کسی جگہ اگر سر پرشوتم داس ٹھاکر داس ہوتو انہیں (عوام کو) اس سے کیا فرق پڑے گا' اگر لارڈ ارون کی جگہ سرتیج بہادر سپرو آجائیں۔قومی جذبات کی اپیل بالکل بیکار ہے۔ اسے آپ اپنے کام کے لئے استعمال نہیں کرسکتے۔آپ کو سنجیدگی سے کام لینا ہوگا اور انہیں سمجھانا ہوگا کہ انقلاب ان کے حق میں ہے اوران کا اپنا ہے۔پسماندہ مزدور طبقہ کا انقلاب' پسماندہ لوگوں کے لئے۔

جب آپ اپنے نصب العین کے تعلق سے واضح رائے قائم کرلیں گے تو ایسے مقاصد کی تکمیل کے لئے آپ اپنی طاقت کو جمع کرنے میں لگ جائیں گے۔اب دو الگ الگ مرحلوں سے گزرنا ہوگا' پہلا تیاری کا مرحلہ' دوسرا اسے عملی شکل دینے کا۔

جب موجودہ تحریک ختم ہوگی تو آپ متعدد ایمان دار اور سنجیدہ انقلابی کارکنوں کو مایوس اور نا امید دیکھیں گے۔لیکن آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔جذبات کو ایک جانب رکھو۔حقیقت کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہو۔انقلاب لانا بہت مشکل کام ہے۔یہ کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی مقررہ تاریخ کو آسکتا ہے۔یہ تو خاص سماجی' معاشی حالات سے ظہور پذیر ہوتا ہے اور ایک منظم پارٹی کو ایسے مواقع کو سنبھالنا ہوتا ہے اور عوام کو اس کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے۔اس سب کے لئے انقلابی کارکنوں کو متعدد قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔یہاں میں واضح طور پر کہہ دوں کہ اگر آپ تاجر ہیں یا دنیا دار یا خاندانی فرد ہیں تو محترم اس آگ سے نہ کھیلیں۔ایک لیڈر کے طور پر میں اور آپ پارٹی کے کسی کام کے نہیں۔ پہلے ہی ہمارے پاس ایسے بہت سے لیڈر ہیں جو شام کے وقت تقریر کرنے کے لئے کچھ وقت ضرور نکال لیتے ہیں۔یہ لیڈر ہمارے کسی کام کے نہیں ہیں۔ہم تو لینن کے انتہائی مقبول لفظ' پیشہ ور انقلابی' کا استعمال کریں گے۔پورا وقت دینے والے کارکن' انقلاب کے سوائے زندگی میں جن کی اور کوئی خواہش ہی نہ ہو۔جتنے زیادہ ایسے کارکن پارٹی میں منظم ہوں گے' کامیابی کے مواقع اسی قدر بڑھیں گے۔

پارٹی کو صحیح طریقہ پر آگے بڑھانے کے لئے جس بات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے' وہ یہ ہے کہ ایسے کارکن واضح فکر' فہم' پیش قدمی کی اہلیت اور فوری فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتے ہوں۔پارٹی میں مضبوط ڈسپلن ہوگا اور یہ ضروری نہیں کہ پارٹی انڈر گراؤنڈ رہ کر ہی کام کرے' بلکہ اس کے برعکس کھلے طور پر کام کرسکتی ہے' حالاں کہ جیل جانے کی پالیسی پوری طرح چھوڑ دینی چاہئے۔اس طرح بہت سے کارکنوں کو خفیہ طور پر کام کرتے ہوئے زندگی بسر کرنے کی بھی ضرورت پڑسکتی ہے لیکن انہیں اسی طرح پورے جوش سے کام کرتے رہنا چاہئے اور یہی ہے وہ گروپ جس سے حالات پر قابو پالینے والے لیڈر تیار ہوں گے۔

پارٹی کو کارکنوں کی ضرورت ہوگی' جنہیں نوجوانوں میں تحرک پیدا کرکے بھرتی کیا جاسکتا ہے۔اس لئے نوجوانوں کی تحریک سب سے پہلی منزل ہے' جہاں سے ہماری تحریک کی ابتدا ہوگی۔نوجوانوں کی تحریک کے لئے (اسٹڈی سرکل) کھولنے چاہئیں۔لیف لیٹ' پمفلیٹ' کتابیں اور میگزین شائع کرنا چاہئیں۔کلاسوں میں لیکچر ہونے چاہئیں۔سیاسی کارکنوں کے

لئے موج مستی کرنے اور ٹریننگ دینے کی یہ سب سے بہترین جگہ ہوگی۔

ان نوجوانوں کو پارٹی میں لینا چاہئے' جن کے خیالات پختہ ہو چکے ہوں اور وہ اپنی زندگی اس کام میں لگانے کے لئے تیار ہوں۔ پارٹی کارکن نوجوان تحریکات کے کاموں کو سمت فراہم کرسکیں گے۔ پارٹی اپنا کام پروپیگنڈہ سے شروع کرے گی۔ یہ انتہائی ضروری ہے۔ غدر پارٹی (15-1914) کے ناکام ہونے کی اہم وجہ تھی عدم واقفیت' عدم دلچسپی اور کئی بار مخالفت۔ علاوہ ازیں کسانوں اور مزدوروں کی سرگرم حمایت حاصل کرنے کے لئے بھی پروپیگنڈہ ضروری ہے۔ پارٹی کا نام کیمونسٹ پارٹی ہو۔ سخت ڈسپلن پر مبنی سیاسی کارکنوں کی یہ پارٹی بقیہ تمام تحریکات چلائے گی۔ اسے مزدوروں و کسانوں کی اور دیگر پارٹیوں کو بھی چلانا ہوگا اور لیبر یونین کانگریس اور اس قسم کے دیگر سیاسی اداروں پر اثر انداز ہونے کی کوشش بھی پارٹی کرے گی۔ پارٹی ایک بڑی اشاعتی مہم چلائے گی' جس سے قومی بیداری ہی نہیں' طبقاتی بیداری بھی پیدا ہوگی۔ سماجوادی اصولوں سے متعلق عوام کو بیداری لانے کے لئے سبھی مسائل ہر فرد کو سمجھ میں آنا چاہئے اور ایسے کتابچے بڑے پیمانے پر تقسیم ہونے چاہئیں۔ انداز بیان سادہ اور واضح ہو۔

مزدور آندولن میں ایسے افراد ہیں جو مزدوروں اور کسانوں کی اقتصادی اور سیاسی آزادی کے بارے میں بڑے عجیب خیالات رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اشتعال پھیلانے والے ہیں یا بوکھلائے ہوئے ہیں۔ ایسے خیالات یا تو بکواس ہیں یا تصورات سے پرے۔ ہمارا مطلب عوام کی معاشی آزادی سے ہے اور اسی کے لئے ہم سیاسی طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ شروع میں چھوٹے موٹے اقتصادی مطالبات اور ان طبقوں کے خصوصی حقوق کے لئے ہمیں لڑنا ہوگا۔ یہی جدوجہد انہیں سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے آخری جدوجہد کے لئے بیدار اور تیار کرے گی۔

علاوہ ازیں فوجی ونگ کو بھی منظم کرنا ہوگا۔ یہ بہت اہم ہے۔ کئی بار اس کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ موجودہ وقت میں ایسی ابتدا کرکے آپ ایسا گروپ تیار نہیں کرسکتے جس کے پاس کام کرنے کی پوری صلاحیت ہو۔ شاید اس موضوع کی باریکی کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس موضوع پر میرے خیالات کو غلط رنگ دینے کا بہت زیادہ امکان ہے۔ ظاہری طور پر میں نے ایک دہشت گرد کی طرح کام کیا ہے۔ لیکن میں دہشت گرد نہیں ہوں۔ میں ایک انقلابی ہوں' جس کے پاس طویل مدتی پروگرام سے متعلق ٹھوس اور خصوصی نظریات ہیں' جن پر یہاں غور کیا جارہا ہے۔ 'ہتھیاروں کے ساتھی' میرے کچھ دوست مجھے رام پرساد بسمل کی طرح اس بات کے لئے گنہگار قرار دیں گے کہ پھانسی کی کوٹھری میں رہ کر میرے اندر کچھ ردعمل پیدا ہورہے ہیں۔ اس میں کچھ سچائی نہیں ہے۔ میرا نظریہ وہی ہے' مجھ میں وہی عزم اور جوش ہے۔ مجھ میں یہاں وہی اسپرٹ ہے' جو باہر تھی۔ نہیں' اس سے کچھ زیادہ ہے۔ اس لئے اپنے قارئین کو میں متنبہ کرتا ہوں کہ میرے الفاظ کو وہ پوری توجہ کے ساتھ پڑھیں۔

انہیں بین السطور میں کچھ بھی نہیں دیکھنا چاہئے۔ میں زور دے کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انقلابی زندگی کے آغاز کے چند ایام کے سوائے نہ تو میں دہشت گرد ہوں اور نہ ہی تھا اور مجھے مکمل اعتماد ہے کہ ایسے طریقوں سے ہم کچھ بھی حاصل نہیں کرسکتے۔ ہندوستان سماج وادی ری پبلکن پارٹی کی تاریخ سے یہ بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ ہمارے سبھی کام اسی سمت میں تھے' یعنی بڑی قومی تحریک کے آرمی ونگ کی جگہ اپنی شناخت قائم کرنا۔ اگر کسی نے مجھے غلط سمجھ لیا ہے تو وہ اصلاح کرلیں۔ میرا

مطلب یہ ضرور ہے کہ محض بم پھینکنا نہ صرف بے کار بلکہ نقصان دہ ہے۔ پارٹی کی آرمی ونگ کو ہمیشہ تیار رہنا چاہئے تا کہ مشکل گھڑی میں کام آسکیں۔ اسے پارٹی کے سیاسی کاموں میں معاون ہونا چاہئے۔ یہ اپنے آپ آزادانہ طور پر کام نہ کرے۔

جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں بتایا گیا کہ پارٹی اپنے کام کو آگے بڑھائے۔ وقت بوقت میٹنگ اور سیمینار منعقد کر کے کارکنوں کو بھی موضوعات کے بارے میں اطلاعات دی جاتی چاہئے اور انہیں اور بیدار کرتے رہنا چاہئے۔ اگر آپ اس طرح سے کام کی ابتدا کرتے ہیں تو آپ کو بڑی سنجیدگی سے کام لینا ہوگا۔ اس کام کو مکمل ہونے میں کم از کم بیس سال لگیں گے۔ انقلاب کا عہد شباب دس سال میں مکمل ہونے کے خوابوں کو ایک جانب رکھ دیں بالکل ویسے ہی جیسے گاندھی کے (ایک سال میں سوراجیہ) خواب کو پرے رکھ دیا گیا تھا۔ نہ تو اس کے لئے جذباتی ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی یہ آسان ہے۔ ضرورت ہے مسلسل جدوجہد کی، مصیبت جھیلنے اور قربانی بھری زندگی گزارنے کی۔ اپنی خودغرضی پہلے ختم کرو۔ قدم پھونک پھونک کر آپ آگے بڑھیں۔ اس کے لئے ہمت، عزم اور مستحکم ارادے کی ضرورت ہے۔ کتنی ہی بڑی مصیبت اور مشکل کیوں نہ ہو، آپ کی ہمت کم نہ ہو۔ کوئی بھی شکست یا فریب آپ کا دل نہ توڑ سکے۔ کتنی ہی مصیبتیں کیوں نہ آئیں، آپ کا انقلابی جوش سرد نہ پڑے۔ مصیبت جھیلنے اور قربانی دینے کے اصولوں سے آپ کامیابی حاصل کریں گے اور یہ ذاتی کامیابیاں انقلاب کی انمول ملکیت ہوں گی۔

انقلاب زندہ باد!

2 فروری 1931

باب 4

انقلابیوں کا تعارف: چاند کے پھانسی نمبر سے ماخوذ

چاند کے پھانسی نمبر (نومبر 1928) میں "وپلو یگیہ کی آہوتیاں" عنوان سے انقلابی محبان وطن کے 47 خاکے شائع ہوئے تھے۔ بھگت سنگھ کی بھتیجی ویریندر سندھو نے 1977 میں انہیں "میرے انقلابی ساتھی۔ مصنف: بھگت سنگھ" عنوان سے شائع کیا تھا کہ ان میں سے بیشتر مضامین بھگت سنگھ نے پہلے 'کیرتی' (پنجاب) میں لکھے تھے، خصوصاً پنجاب کے انقلابیوں سے متعلق مضامین۔ پھانسی نمبر کے مدیر اور معروف ہندی رائٹر آچاریہ چترسین شاستری نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ ان مضامین میں سے اکثر مضامین بھگت سنگھ نے الگ الگ فرضی ناموں سے تحریر کیے تھے۔ ان 47 خاکوں میں 37 تو لازمی طور پر بھگت سنگھ کے تخلیق کردہ ہیں، بقیہ شوورما کے بھی فرضی ناموں سے لکھے گئے تھے۔ انہیں اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

کوکا بغاوت اور مدن لال ڈھینگرو سے متعلق خاکے 'کیرتی' میں زیادہ تفصیلی انداز میں شائع ہوئے ہیں اور 'چاند' میں ان کا محض اختصار شائع ہوا ہے۔ بہر حال ان مضامین کو 'کیرتی' سے لے کر کتاب کے تیسرے باب میں شامل کیا گیا ہے۔

—مدیر

وی پلو۔ یگ کی قربانیاں، شورش یگ کی قربانیاں

صوفی امباپرساد

آج ہندوستان میں کتنے لوگ ان کے نام سے واقف ہیں؟ کتنے ان کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں؟ ہندوستان نے کتنے ہی ایسے رتن کھو دیئے اور لمحہ بھر کے لئے بھی احساس رنج نہیں کیا۔

وہ سچے وطن پرست تھے۔ ان کے دل میں ملک کا درد تھا۔ وہ ہندوستان کے وقار کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ہندوستان کو ترقی کی چوٹی پر پہنچانا چاہتے تھے، تو بھی آج ہندوستان کے بہت کم لوگ ان کا نام جانتے ہیں۔ ان کی قدر کی بھی تو ایران نے، آج یہاں آقا صوفی کا نام مقبول عام ہو رہا ہے۔

صوفی جی کی ولادت 1858 میں مرادآباد میں ہوئی۔ ان کا دایاں ہاتھ پیدائشی طور پر کٹا ہوا تھا۔ وہ بطور مذاق کہتے تھے۔ "ارے بھائی، ہم نے 57 میں انگریزوں کے خلاف جنگ کی تھی۔ ہاتھ کٹ گیا۔ موت ہو گئی۔ دوبارہ جنم ہوا، ہاتھ کٹے کا کٹا ہی رہ گیا۔"

آپ نے مرادآباد، بریلی اور جالندھر وغیرہ کئی شہروں میں تعلیم پائی۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد آپ نے وکالت

پڑھی مگر کی نہیں۔ آپ اردو کے معتبر رائٹر تھے۔ آپ نے یہی کام سنبھالا۔

1890 میں آپ نے مرادآباد سے جامع العلوم نامی اردو ہفتہ وار اخبار نکالا۔ اس کا حرف حرف ان کی دلی آرزو کا ترجمان تھا۔ وہ معروف مزاحیہ رائٹر تھے مگر ان میں سنجیدگی بھی کم نہ تھی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے کٹر حمایتی تھے اور حکمرانوں کی بہت مذمت کرتے تھے۔

1897 میں آپ کو حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں ڈیڑھ برس کی قید ہوئی۔ انہیں 1899 میں رہائی ملی تو یوپی کے چند چھوٹے چھوٹے صوبوں پر انگریز مداخلت کر رہے تھے۔ صوفی جی نے وہاں کے انگریزوں اور ریزیڈنٹوں کے خوب راز فاش کئے۔ آپ پر جھوٹا الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا اور مکمل جائیداد ضبط کر کے چھ سال کی قید دی گئی۔ جیل میں انہوں نے ناقابل بیان مصائب برداشت کئے مگر وہ کبھی گھبرائے نہیں۔

صوفی جی جیل میں بیمار ہو گئے۔ ایک غلیظ اور تعفن زدہ کوٹھری میں قید تھے۔ انہیں دوا نہیں دی جاتی تھی یہاں تک کہ پانی وغیرہ کا بھی مناسب بندوبست نہیں تھا۔ جیلر آتا اور ہنستے ہوئے پوچھتا۔ صوفی! ابھی تک تم زندہ ہو؟ خیر! جیسے تیسے جیل کٹی اور 1906 کے آخر میں آپ باہر آئے۔

صوفی جی کی نظام حیدرآباد سے گہری وابستگی تھی۔ جیل سے رہائی ملتے ہی وہاں گئے۔ نظام نے ان کے لئے بہترین مکان تعمیر کرایا۔ مکان کی تعمیر کے بعد انہوں نے صوفی جی سے کہا۔ ''آپ کے لئے مکان تیار ہو گیا۔ آپ نے جواب دیا۔ ''ہم بھی تیار ہو گئے ہیں۔ آپ نے کپڑے اٹھائے اور پنجاب کی سمت چل پڑے۔ وہاں جا کر آپ 'ہندوستان' اخبار میں کام کرنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ خفیہ محکمہ کی جانب سے آپ کی دانشوری، فصیح اللسانی اور سمجھداری دیکھ کر سرکار کی طرف سے 1000 روپے ماہانہ پیش کش کی گئی تھی۔ مگر انہوں نے اس کے مقابلے جیل اور مفلسی کو ترجیح دی۔ بعد میں 'ہندوستان' کے مدیر سے بھی ان کی نہ بنی۔ آپ وہاں سے بھی مستعفی ہو گئے۔

انہی دنوں سردار اجیت سنگھ نے بھارت ماتا سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور پنجاب کے نیو کالونی ایکٹ کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ صوفی جی کی ان کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی ہونے لگی۔ ادھر وہ بھی ان کی جانب راغب ہونے لگے۔ 1906 میں پنجاب میں دوبارہ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو سردار اجیت سنگھ کے بھائی سردار کشن سنگھ اور بھارت ماتا سوسائٹی کے منتری مہتہ آنند کشور کے ساتھ وہ نیپال چلے گئے۔ وہاں ریاست نیپال کے گورنر شری جنگ بہادر جی صوفی جی کو پناہ دینے کے سبب عہدہ سے مبرا کر دیئے گئے۔ ان کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ خیر صوفی جی وہاں گرفتار ہوئے اور لاہور لائے گئے۔ لالہ پنڈی داس جی کے اخبار 'انڈیا' میں شائع آپ کے مضامین کے سلسلے میں ہی آپ پر مقدمہ چلایا گیا مگر بے گناہ ثابت ہونے پر بعد میں آپ کو رہا کر دیا گیا۔

بعد از اں سردار اجیت سنگھ بھی رہا ہو گئے اور 1909 میں ہندوستان ماتا بک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس کا زیادہ تر کام صوفی جی ہی کرتے تھے۔ آپ نے 'باغی مسیحا' یا 'ودروہی مسیحا' نامی ایک کتاب شائع کرائی جو بعد میں ضبط کر لی گئی۔

اسی سال لوک مانیہ تلک پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں بھی چھ برس کی قید ملی۔ اس وقت دیش بھگت منڈل کے سبھی اراکین سادھو کے بھیس میں پروتوں کی یاترا کرنے نکل پڑے۔ پروتوں کے اوپر جا رہے تھے۔ ایک بھگت بھی ساتھ آیا۔ بیٹھے تو اس بھگت نے صوفی جی کے قدموں میں سر رکھ نمسکار کیا۔ بڑا جنٹلمین تھا۔ خوب سوٹ بوٹ پہنے تھا۔ صوفی جی کے قدموں میں سر رکھا اور دریافت کرنے لگا۔ بابا جی آپ کہاں رہتے تھے؟

صوفی نے سخت لہجہ میں جواب دیا۔ ''رہتے ہیں تمہارے سر میں'' ۔
''سادھو جی آپ ناراض کیوں ہو گئے؟'' ۔
ارے بیوقوف! تم نے مجھے کیوں نمسکار کیا۔ اتنے اور سادھو بھی تھے ان کو پرنام کیوں نہیں کیا؟
میں آپ کو سادھو سمجھا تھا۔
اچھا خیر جاؤ' کھانے پینے کی چیزیں لاؤ۔ وہ کچھ دیر بعد انواع واقسام کے کھانے لے کر آیا۔ کھا پی کر صوفی جی نے اسے دوبارہ بلایا اور کہنے لگے۔ ''کیوں بے ہمارا تعاقب چھوڑے گا یا نہیں؟
بھلا میں آپ سے کیا کہتا ہوں جی؟
چالاکی کو چھوڑ۔ آیا ہے جاسوسی کرنے۔ جا' اپنے باپ سے کہہ دینا کہ صوفی پہاڑ میں غدر کرنے جا رہا ہے۔
وہ قدموں میں گر گیا۔ ''حضور پیٹ کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے 1909 میں ''پیشوا'' اخبار نکالا۔ انہیں دنوں بنگال میں انقلابی تحریک نے شدت اختیار کر لی۔ سرکار کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں یہ پنجاب کو بھی جلا نہ ڈالے۔ خیر' دمن۔ چکر یعنی طاقت کے زور پر دبانے کی مہم شروع ہو گئی۔ اس وقت صوفی جی سردار اجیت سنگھ اور ضیاء الحق ایران چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر ضیاء الحق کی نیت بدل گئی۔ اس نے چاہا کہ انہیں گرفتار کرا دوں تو انعام بھی ملے گا اور سزا بھی نہیں ملے گی۔ مگر صوفی جی کو احساس ہو گیا۔ انہوں نے اسے آگے بھیج دیا۔ ''نتیجتاً'' وہ خود ہی پکڑا گیا اور یہ دونوں بچ نکلے۔
ایران میں وہ کیسے رہے' کیا ہوا' یہ باتیں تو کسی موقع پر افشا ہوں گی لیکن جو کچھ سننے میں آیا' اسی کا ذکر یہاں جگہ کیا جا رہا ہے۔ ایران میں انگریزوں نے ان کو بہت تلاش کیا اور انہیں کئی طرح کے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک جگہ ان کا محاصرہ کر لیا گیا۔ وہاں سے نکلنا ناممکن سا ہو گیا۔ وہاں تاجروں کا ایک قافلہ مقیم تھا۔ اونٹوں پر بہت سارے صندوق لدے ہوئے تھے۔ آگے کپڑے وغیرہ بھرے تھے۔ ایک اونٹ کے دونوں صندوقوں میں صوفی جی اور اجیت سنگھ کو بند کر دیا گیا اور وہاں سے بچا کر نکالا گیا۔
بعد ازاں کسی امیر کے گھر ٹھہرے۔ پتہ چل گیا اور ان کو گھیر لیا گیا۔ اسی وقت ان دونوں کو برقعہ پہنا کر زنانہ میں بیٹھا دیا گیا۔ سب کی تلاشی لی گئی اور آخر میں خواتین کی بھی تلاشی لی جانے لگی۔ ایک دو خاتون کے برقعے اٹھائے بھی گئے' مگر مسلمان لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے اور دیگر کسی عورت کا برقعہ نہیں اٹھانے دیا گیا۔ اس طرح وہ دونوں یہاں بھی بچ گئے۔
پیچھے انہوں نے وہاں سے 'آب حیات' نامی اخبار نکالا اور قومی تحریک میں حصہ لینے لگے۔ سردار صاحب کے ترکی چلے جانے کے بعد وہاں کا سارا کام انہیں کے سر پر آن پڑا اور پھر یہ وہاں آ کر صوفی کے نام سے مشہور ہوئے۔ 1915 میں جس وقت ایران میں انگریز مکمل طور پر قبضہ جمانا چاہتے تھے تو پھر تھوڑی اتھل پتھل مچی۔ شیراز پر گھیرا ڈالا گیا۔ اس وقت صوفی جی نے بائیں ہاتھ سے ریوالور چلا کر مقابلہ کیا تھا مگر آخرکار آپ انگریزوں کے ہاتھ آ گئے۔ ان کا کورٹ مارشل کیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ کل گولی سے اڑا دیئے جائیں گے۔ صوفی کوٹھری میں بند تھے۔ علی الصباح دیکھا تو وہ یاد خدا میں منہمک ہونے کی حالت میں تھے۔ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ ان کے جنازے کے ساتھ لاتعداد ایرانی گئے اور انہوں نے بہت سوگ منایا۔ کئی دنوں تک شہر میں غم و یاس کا ماحول رہا۔ صوفی جی کی قبر بنائی گئی۔ ابھی تک ہر سال ان کی قبر پر میلہ لگتا ہے۔ لوگ ان کا نام سنتے ہی عقیدت سے سر جھکا لیتے ہیں۔ پیر سے بھی قلم پکڑ کر اچھی طرح لکھ سکتے تھے۔ ایک دن ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ مجھے انہوں نے پیر سے لکھ کر ایک نسخہ دیا تھا۔

ایک اور کہانی دوستوں نے سنائی۔ پتہ نہیں کہاں تک اس میں سچائی ہے۔ مگر ممکن ہے کہ وہ سچ ہو۔ کہتے ہیں جب بھوپال یا کسی اور اسٹیٹ میں ریزیڈنٹ کچھ گڑبڑ کر رہے تھے اور اس کو ہڑپنے کی فکر میں تھے تو وہاں کا راز شائع کرنے کے لئے امرت بازار میگزین کی جانب سے صوفی جی وہاں بھیجے گئے۔ یہ بات لگ بھگ 1890 کی ہے۔

ایک پاگل سا انسان ریزیڈنٹ کے پاس ملازمت کی تلاش میں آیا اور آخر میں محض کھانے پر رکھ لیا گیا۔ وہ پاگل برتن صاف کرتا تو مٹی میں لت پت ہو جاتا۔ منہ پر مٹی لگا لیتا۔ وہ سودا خریدنے میں بہت ہوشیار تھے۔ جو بھی ہو چیزیں خریدنے کے لئے انہیں ہی بھیجا جاتا تھا۔

ادھر امرت بازار میگزین میں ریزیڈنٹ کے خلاف یکے بعد دیگر مضامین شائع ہونے لگے۔ آخر میں اس قدر بدنامی ہوئی کہ عہدہ سے ہٹا دیئے گئے۔ جس وقت وہ اسٹیٹ سے باہر پہنچ گیا تو ایک جنکشن پر ایک کالا سا آدمی ہیٹ اور پتلون بوٹ پہنے اس کی جانب آیا۔ اسے دیکھ کر ریزیڈنٹ حیران رہ گیا۔ یہ تو وہی ہے جو میرے برتن صاف کیا کرتا تھا۔ آج پاگل نہیں ہے۔ اس نے آتے ہی انگریزی میں گفتگو شروع کی۔ اسے دیکھ کر ریزیڈنٹ کانپنے لگا۔ آخر اس نے کہا' تمہیں انعام تو دیا جا چکا ہے اب تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟

آپ نے کہا کہ جو آدمی اس جاسوس کو جس نے کہ آپ کا راز کھولا ہے' گرفتار کرائیں تو آپ کچھ انعام دیں گے۔

ہاں' کہا تو تھا۔ کیا تم نے اسے پکڑا؟

ہاں' ہاں...... انعام دیجئے۔ وہ میں خود ہی ہوں۔

وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ بولا اگر اسٹیٹ کے اندر ہی مجھے تیرا پتہ چل جاتا تو بوٹی بوٹی اڑوا دیتا۔ خیر' اس نے انہیں ایک سونے کی گھڑی دی اور کہا۔ اگر تم قبول کرو تو خفیہ محکمہ میں 1000 روپے ماہانہ تنخواہ پر تمہاری تقرری کرا سکتا ہوں۔ مگر صوفی جی نے کہا اگر تنخواہ ہی لینی ہوتی تو آپ کے برتن کیوں صاف کرتا؟

آج صوفی اس ملک میں نہیں ہیں۔ مگر ایسے محبِ وطن کا ذکر ہی فرحت انگیز ہوتا ہے۔ بھگوان ان کی آتما کو چرشانتی دے۔

- 'چاند' (پھانسی نمبر) نومبر 1928

شری بلونت سنگھ

وہ بہت ایشور بھگت تھے۔ مذہبی وابستگی کے سبب انہیں سکھوں میں پروہت بنا دیا گیا۔ امن کے ہمنوا بلونت سنگھ بڑے خوش مزاج اور رحم دل تھے۔ ابتدا میں وہ خدا کی عبادت میں مصروف رہے۔ پھر لوگوں کو اس جانب لانے کی تبلیغ شروع کی۔ بعد میں لوگوں کے مصائب دور کرنے کی کوشش میں آہستہ آہستہ گورے آقاؤں سے مقابلہ اور آخر میں پھانسی پر ہنستے ہوئے اپنی جان نچھاور کی۔

شری بلونت سنگھ کی ولادت خرد پور جالندھر میں یکم اشون 1039 وکرم جمعہ کو ہوئی۔ آپ کے والد کا نام سردار بدھ سنگھ تھا۔

خاندان بہت مالدار تھا۔ والد کو دولت کے علاوہ اخلاق اور دیگر خوبیوں کے سبب سبھی لوگ عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی آدم پور کے مڈل اسکول میں تعلیم کے لئے داخل کرادیا گیا۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہی ان کی شادی ہوگئی۔ لیکن شادی کے بعد جلد ہی بیوی کی موت ہوگئی۔ مڈل پاس کئے بغیر ہی اسکول چھوڑ کر وہ فوج میں بھرتی ہوگئے۔ پلٹن میں آپ کی سنت کرم سنگھ جی سے جان پہچان ہوئی۔ ان کی رفاقت سے آپ کا جھکاؤ ایشور بھجن کی جانب ہوگیا۔ دس سال جیسے تیسے نوکری کی۔ پھر ایکا یک نوکری چھوڑ کر اپنے گاؤں میں رہ کر ایشور اپاسنا شروع کر دی۔ پلٹن کی ملازمت کے دوران ہی آپ کی دوسری شادی بھی ہوگئی۔ گاؤں کے پاس ایک سرنگ تھی۔ اسی میں بند ہو کر بھگود بھجن میں غرق رہنے لگے۔ گیارہ مہینے وہاں پر قیام کے بعد باہر آتے ہی 1905 میں کناڈا جانے کا عزم کیا اور وہاں روانہ ہوگئے۔

کناڈا میں جاکر آپ نے دوسرے دوست شری بھاگ سنگھ جی سے جنہیں ایک باغی نے بعد میں گولی ماردی تھی' مل کر گرودوارہ بنانے کا کام شروع کیا۔ وینکوور میں انہی کی کوششوں سے امریکا کا سب سے پہلا گرودوارہ قائم ہوا۔ اس وقت وہاں گئے ہوئے ہندوستانیوں کی کوئی تنظیم نہیں تھی۔ انہیں گورے لوگ تنگ کرتے تھے مگر ہمارے ہیرو وہاں گئے تو انہوں نے ان سب خامیوں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

اس وقت وہاں کے باشندے ہندوؤں اور سکھوں کو موت کی آخری رسومات ادا کرنے میں کافی دقت ہوتی تھی۔ مردے جلانے کی انہیں اجازت نہ تھی۔ ایسے حالات میں بے چارے ان لوگوں کو متعدد مصائب برداشت کرنے پڑے۔ کئی بار انہیں بارش میں' برف میں' لاش کو جنگل میں لے جاکر کچھ لکڑیاں جمع کر کے تیل ڈال کر آگ لگا کر بھاگنا پڑتا۔ ایسی حالت میں بھی کنیڈین لوگوں کی گولی کا نشانہ بننے کا خوف رہتا۔ شری بلونت سنگھ جی نے یہ پریشانی دور کرنے کا نظم کیا۔ کچھ زمین خرید لی۔ آخری رسومات کی اجازت بھی حاصل کر لی۔ گرودوارہ میں ہندوستانی مزدوروں کو منظم بھی کرنے لگے۔ ان لوگوں کو سچائی اور خدا کی عبادت کی تلقین کرتے تھے۔ گرودوارہ بڑی کوششوں کے بعد تعمیر ہو پایا تھا۔ ان سب میں آپ کی محنت سب سے زیادہ تھی۔ آخر کار سب نے مل کر آپ کو ہی گرنتھی بنانے کا ارادہ کیا۔ پہلے تو آپ نے انکار کیا مگر بعد میں قبول کرلیا۔

سکھ لوگ بڑے ہٹے کٹے اور محنتی ہوتے ہیں۔ ان کے کناڈا میں جانے سے گورے مزدوروں کی قدر کم ہوگئی۔ ادھر انگریز مزدوروں کے مقابلے ان کی تنخواہ بھی کم ہوتی تھی۔ ان کے پہلے گروپ کے پہنچتے ہی گورے مزدوروں نے دنگا فساد شروع کر دیا۔ مگر مجاہد بہادر سکھ ان باتوں سے ڈرنے والے نہیں تھے۔ اس سے گورے مزید جل اٹھے۔ اور ادھر گرودوارہ بنانے سے ان کی تنظیم بڑھنے لگی۔ نئے آنے والوں کو ہر قسم کی سہولت ملنے لگی۔ یہ سب دیکھ کر وہاں کی گوری سرکار نے ان کو نکالنے کے لئے چند اقدامات تلاش کرنے شروع کئے۔ امیگریشن محکمہ نے ہندوستانی مزدوروں کو بہلا پھسلا کر ہنڈوراس نامی جزیرہ میں چلے جانے پر راضی کرنے کی کوشش کی۔ اس جزیرہ کی بہت تعریف کی گئی۔ مگر بھائی بلونت سنگھ جی اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ سب فریب دہی ہے۔ آپ نے اپنے کسی بھروسہ مند شخص کو وہ مقام دیکھنے کے لئے بھیجا۔ اس شخص کا نام تھا ناگر سنگھ۔ انہیں وہاں امیگریشن محکمہ والوں نے ہندوستان کے پانچ مربع زمین اور پانچ ہزار ڈالر دینے کا لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ ہندوستانیوں کو ہنڈوراس میں آنے پر راضی کرلیں۔ انہوں نے آتے ہی سب راز افشا کر دیا۔ امیگریشن محکمہ والے بھی کھل کر کھیلے۔ اب کھلم کھلا جنگ چھڑ گئی۔ امیگریشن محکمہ نے زیبا نا زیبا کا خیال ترک کر دیا۔ جوں جوں معاملہ بڑھا' ویسے ویسے شری بلونت سنگھ بھی آگے بڑھتے گئے۔

مقیم ہندوستانیوں کی خواہش تھی کہ وہ لوگ ہندوستان واپس آکر اپنے کنبوں کو ساتھ لے جاسکیں۔ کافی دنوں تک

کشیدگی رہی۔ بالآخر ایک مشورہ کیا گیا۔ شری بلونت سنگھ شری بھگت سنگھ اور بھائی سندر سنگھ جی کو ہندوستان واپس آ کر اپنے کنبہ کو لانے کے لئے بھیجنے کی تجویز پیش ہوئی۔ وہ تینوں لوگ ہندوستان لوٹ آئے۔

1911 میں وہ پھر کنبہ کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ ہانگ کانگ پہنچ کر ٹکٹ نہ ملنے کے سبب رکنا پڑا۔ وہیں رہ کر وہ وینکوور گرودوارہ والوں سے خط و کتابت کے ذریعہ صلاح مشورہ کرتے رہے۔ آخر تینوں لوگ چل دیئے۔ شری سندر سنگھ جی تو گئے وینکوور اور بقیہ دونوں لوگ تینوں کنبوں سمیت سان فرانسسکو روانہ ہوئے۔ بھائی سندر سنگھ تو وینکوور پہنچ گئے مگر ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھی تو آخر گوروں کا ہی ملک تھا اور یہاں تو وہ غلام ہندوستانی تھے' کنبہ سمیت ان دونوں کو لوگوں وہاں اترنے کی اجازت نہیں ملی۔ وہ دوبارہ ہانگ کانگ واپس آ گئے۔ پھر بہت دن کے بعد کافی تگ و دو اور کوششوں سے کنبوں کے لئے وینکوور کے ٹکٹ ملے۔ وینکوور میں ان دونوں لوگوں کو اترنے کی اجازت مل گئی' کنبے کو اترنے کی اجازت نہیں ملی۔ بڑی دقت پیش آئی۔ آخر کنبے کو اتنے دنوں تک اترنے کی اجازت ملی جتنے دنوں تک امید کی جا سکتی تھی کہ امیگریشن محکمہ کے مرکزی اوٹوا (Otava) سے حتمی حکم آ جائے گا۔ کنبے اترے تو سہی' مگر ضمانت پر۔ ضمانت کی مدت پوری ہو جانے کے دو دن بعد امیگریشن محکمہ والے کنبوں کو لینے آئے مگر سکھ لوگ لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ افسر حضرات ذرا گرم ہوئے مگر بہادر مجاہدوں کی سرخ آنکھیں دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر لوٹ گئے۔ سرخ آنکھوں کے پیچھے کون سی طاقت کارفرما تھی اور کون سا عزم تھا جس سے طاقت ور کناڈا حکومت کی اور ان کا امیگریشن محکمہ تھر تھر کانپ اٹھا اور ان کنبوں کو وہیں رہنے دیا گیا۔ یہ باتیں اس وقت محکوم ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ان کی جہالت' ان کا محدود نظریہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ملک کو بنانے میں کیسا وقت' کیسے حالات ابھرتے ہیں۔ آزاد ہندوستان اپنی جدوجہد آزادی کے ان بے مثال واقعات کو یاد کرے گا۔ اس کے مورخین کو ہی ان سب باتوں کو اچھی طرح حقیقی شکل میں لکھنے کا سنہرا موقع مل پائے گا۔ دفعہ 124 اے وغیرہ و کرال دانو گلا دبائے' آنکھیں نکالے ان کی سانس بند نہیں کئے رہا کریں گے۔ وہ کنبے تو وہیں رہ گئے مگر بقیہ ہندوستانیوں کے خاندان کو لانے کا مسئلہ جوں کا توں برقرار رہا۔ دو سال تک مسلسل جھگڑا کیا لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ آخر میں طے پایا کہ انگلینڈ کی سرکار اور عوام اور حکومت ہند اور عوام کے سامنے اپنے مطالبات رکھے جائیں اور ان کی معاونت سے اس الجھن کو سلجھایا جائے۔

ایک ڈیپوٹیشن بنایا گیا جو انگلینڈ بھی گیا اور ہندوستان بھی۔ اس کے تین ممبروں میں سے ایک ہمارے ہیرو بلونت سنگھ بھی تھے۔ انگلینڈ گئے۔ سبھی اعلیٰ حکام سے ملے۔ کہا گیا۔ "معاملہ حکومت ہند کے ذریعہ یہاں پہنچنا چاہئے"۔ ناامید ہو کر وہ ہندوستان آئے۔ تحریک شروع کی۔ اس وقت اہم لیڈر لالہ لاجپت رائے جی نے بھی بے ٹکا سا جواب دے کر ان سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ پھر کیا تھا؟ کچھ لوگوں کی مدد ملی۔ عام اجلاس منعقد کئے گئے۔ غصہ تھا۔ زخمی قومی اعتماد تھا اور گہری ناامیدی۔ جلے ہوئے دلوں سے جو کچھ نکلا' کہا اور پھر؟ سر مائیکل اوڈائر اپنے 'India As I Knew it,' نامی گرنتھ میں لکھتے ہیں: "At this Stage sent a warning to the delegates that if this continued, Iwould be complelled to take series action... The delegates on this asked for an interview with me. I had a long talk with them and repeated my warning. Two of them were.. and spacious; the manner of third seemed to be that of a dangerous revolutionary. They wished to see The Victory, and in sending them on to him. I particularly warned hiw about this man."

یہ تیسرے صاحب جن پر ہمارے لاٹ نے اتنا کچھ کہہ ڈالا ہے یہ وہی ہیرو بلونت سنگھ ہیں۔ اس جذباتی دل نے گہرے زخم کھائے تھے۔ جذبہ وقار کو بار بار ٹھکرایا جا چکا تھا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ عزم کرلیا تھا کہ ہندوستان کو ہر ممکن اقدامات سے آزاد کرانا ہی ہر ہندوستانی کی اولین ترجیح ہے۔

ڈیپوٹیشن پریشان اور ناامید ہوکر 1914 کے آغاز میں واپس لوٹ گیا۔ انہی دنوں ہندوستانی باغی شری بھگوان سنگھ اور شری برکت اللہ بھی امریکا پہنچ گئے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ان دنوں ہندوستان ایسوسی ایشن (Hindustan Association) کا کام زوروں پر ہونے لگا۔ غدر دل' غدر پریس' غدر اخبار جاری ہوگئے۔ مذکورہ بالا ڈیپوٹیشن والے حضرات کا اس وقت تک ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ مگر ان کو سر مائیکل اوڈائر نے غدر دل کا ہی نمائندہ لکھا ہے۔ خیر۔

اس وقت تک ہندوستانی مقدمات دیگر ذاتوں کے سامنے نہیں رکھے گئے تھے۔ مگر یہ ڈیپوٹیشن جاپان اور چین کے سیاست دانوں سے ملتا ہوا ہی گیا تھا اور انہوں نے ہندوستان کی جانب ان لوگوں کی ہمدردی متوجہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ وینکوور لوٹ کر اپنی بے ثمر کوشش کی تاریخ سناتے ہوئے شری بلونت سنگھ جی نے ایک بڑی موثر تقریر کی۔ ایسی تقاریر ملکی تاریخ میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ کافی غور و خوض کے بعد آپ کو چہار جانب سے یہی سنائی دینے لگا تھا' ان کے دل کی گہرائیوں سے ایک ہی آواز اٹھنے لگی تھی کہ 'سبھی بیماریوں کا واحد علاج ہندوستان کی آزادی ہے۔' آپ نے تقریر میں اپنا تجربہ اور عمیق غور و فکر کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا تھا' سب کہہ سنایا۔

وہ ان کی صفائی' امن' شجاعت' سنجیدگی اور بے خوفی کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ ''بلونت سنگھ سکھوں کے پادری ہیں یا سیناپتی (جنرل)' یہ عزم کرنا بہت مشکل ہے''۔ خیر

مستقبل قریب میں کیا کیا جائے' اس پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ مزید مسئلہ پیدا ہوگیا۔ کاماگاٹا مارو جہاز آپہنچا۔ ساحل پر اترنے کی اجازت نہیں ملی' اس کے برعکس ان پر متعدد مظالم ڈھائے جانے لگے۔ جتنے دنوں جہاز وہاں رکا رہا' اتنے دن سبھی ہندوستانی پوری توجہ کے ساتھ اسی کی مدد میں مصروف رہے۔ قیادت دوبارہ ہمارے ہیرو کے ہاتھ میں تھی۔ آپ نے دن رات ایک کردیا۔ اتنی محنت کوئی اور کرپاتا یا نہیں' یہ تو نہیں کہہ سکتے۔ کرایے کی کشتی کی ادائیگی میں تاخیر کرکے جو رخنہ گوری حکومت ڈالنا چاہتی تھی' اس کا بار بھی آپ پر آن پڑا۔ گیارہ ہزار ڈالر کی ضرورت تھی۔ میٹنگ میں گیارہ ہزار ڈالر کی جو اپیل آپ نے کی تھی' اس میں اتنا درد اور اس قدر تاثیر تھی کہ ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ گیارہ ہزار ڈالر اکٹھے ہوگئے۔ ان کی معاشی ضروریات کی تکمیل کے بعد آپ صلاح مشورہ کرنے کے لئے جنوب کی جانب کافی دور نکل گئے۔ اچانک وہ امریکہ کی سرحد پر پہنچ گئے۔ گوری سرکار نے گرفتار کرلیا۔ کہا' 'امریکہ سے آئے ہو اور چوری چھپے کناڈا میں داخل ہوئے ہو'۔ یہ بے بنیاد الزام بھی ایک طویل تنازعہ کا سبب بنا۔ آخر تھوڑے تنازعہ کے بعد معاملہ سلجھ گیا اور وینکوور پہنچے۔ کچھ دنوں بعد ناامید ہوکر کاماگاٹا مارو جہاز بھی واپسی پر مجبور ہوگیا۔

کاماگاٹا مارو سے ہندوستان کی جتنی امیدیں وابستہ تھیں' سب یکایک خاک میں مل گئیں۔ ہندوستان کا تجارت کی طرف یہی تو پہلا قدم تھا۔ اسی میں ہندوستان کو دوست حکمرانوں نے مکمل طور پر اس طرح پیسنے کی کوشش کی کہ دوبارہ کوئی ایسا کرنے کی ہمت نہ کرسکے۔ کناڈا میں جتنے دن جہاز ٹھہرا تھا' اس کی دلچسپ تفصیلات لکھنے کا یہ وقت نہیں۔ مگر ان کی یاد دلوں میں شعلے بھڑکاتی ہے' دیوانہ کردیتی ہے' زار زار رونے پر مجبور کرتی ہے۔ ان سب کی ذمہ داری امیگریشن محکمہ کے وینکوور کے چیف صدر مسٹر ہاپکنس پر ہی تھی۔ یہ لوگ ان سے بہت ناراض تھے مگر ذرا اور سنئے۔ شری بلونت سنگھ' شری بھاگ سنگھ یہ دو

حضرات ہی تو تھے جو پہلے دن سے امیگریشن محکمہ سے بہادری سے لڑتے رہے۔ کاماگاٹامارو جہاز میں بھی سبھی کام انہیں دو لوگوں نے کیئے۔ وہ امیگریشن محکمہ کی آنکھوں کا کانٹا بنے رہے۔ ایک باغی بھاڑے کا ٹٹو مل گیا۔ گرودوارے میں دیوان ہو رہا تھا۔ اس باغی نے ایشور بھجن میں غرق شری بھاگ سنگھ اور بلونت سنگھ پر پستول سے فائرنگ کر دی۔ شری بھاگ سنگھ جی تو وہیں جنت مقام ہو گئے مگر شری بلونت سنگھ بچ گئے۔ گولی ان کو نہ لگ کر ایک دوسرے محب وطن شری وطن سنگھ کو جا لگی۔ وہ بھی وہیں شہید ہو گئے۔ یہ قاتل موجود لوگوں کے پنجے سے بچ گیا۔ کناڈا سرکار کا قانون بھی اسے کوئی سزا نہ دلا سکا۔ وہ آج بھی زندہ ہے۔ وہ پنجاب سرکار کا لاڈلا بنا رہا ہے۔ اس نے یہ سب کانڈ کیوں کیا اور اس میں اسے کیا بھلائی نظر آئی' یہ سب وہی جانے۔

اسی طرح کی سرگرمی سے کتنے ہی مہینے گزر گئے۔ 1914 کا آخری لمحہ آ گیا۔ جنگ عظیم چھڑ گئی۔ امریکا میں موجود سبھی ہندوستانی ملک واپس لوٹنے کی تیاری کرنے لگے۔ بعد ازاں ہمارے ہیرو وہاں کیسے رک سکتے تھے۔ کنبہ کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ آپ شنگھائی پہنچے' وہیں آپ کے گھر ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ وہاں کام کے سلسلے میں آپ کو گھر لوٹنے کا ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔ کنبہ تو شری کرتار سنگھ کے ساتھ ہندوستان بھیج دیا گیا اور آپ وہیں مقیم رہے۔ وہاں جو سب کام کرنے کو تھے' کرتے ہوئے آپ 1915 میں بنکاک (Bangkok) پہنچے۔

ان دنوں مشرق بعید میں جو بغاوت کی کوشش ہو رہی تھی' اسے منظم اور کنٹرول کے لئے آپ کو ٹھہرنا پڑا۔ ان سب ناکام پروگرام کی دلچسپ تاریخ لکھنے کی یہ جگہ نہیں۔ ہفتہ بھر سنگاپور میں قتل و غارت گری کا جو رقص کیا گیا' اس میں سامراج وادی جاپان اور فرانس کی اسلحوں سے لیس افواج کی مدد سے انگریز فتح یاب ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی کی کوشش ناکام ہو گئی۔ ایسٹرن پلاٹ ختم ہو گیا۔ ایسے حالات میں شری بلونت سنگھ جی بنکاک پہنچے۔ بدقسمتی سے آپ بیمار ہو گئے۔ طبیعت نازک ہو گئی' اسپتال میں جانا پڑا۔ ناسمجھ ڈاکٹر نے آپریشن کر ڈالا اور وہ بھی بغیر کلوروفارم سنگھائے۔ آپ کی تکلیف اور لاغری میں اضافہ ہو گیا۔ ابھی چلنے پھرنے کے قابل بھی نہ ہوئے تھے کہ اسپتال والوں نے انہیں چلے جانے کو کہا۔ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہونے پر بھی توجہ نہیں دی گئی۔ اسپتال سے باہر نکال دیا گیا۔ اتنی عجلت کیوں کی گئی' وہ بھی سن لیجیے۔ باہر پولیس گرفتار کرنے کے لئے کھڑی تھی۔ دروازے سے نکلتے ہی آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ وہاں رہنے والے ہندوستانیوں کی ضمانت کی سبھی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ سیام کی آزاد سرکار نے شری بلونت سنگھ جی اور ان کے دیگر ساتھیوں کو خاموشی کے ساتھ ہندوستان کی انگریز سرکار کے حوالے کر دیا۔ لیکن کیوں؟ اس کی بھی واحد وجہ یہی ہے کہ ہندوستان غلام تھا۔ غلام ذات کے لئے کون خواہ مخواہ کی مصیبت سر لیتا ہے۔ خیر!

شری بلونت سنگھ کو جی سنگاپور لایا گیا۔ دنیا بھر کی دھمکیاں اور لالچ دے کر سبھی راز کھولنے پر راضی کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر ان کے پاس منہ بند کرنے کے سوا کیا رکھا تھا۔ آخر 1916 میں آپ کو لاہور سازش کیس کے دوسرے مقدمات میں ملوث کیا گیا۔ جرم وہی تھا جس میں ناکام ہونے پر سزائے موت ملا کرتی ہے۔ آپ پر بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ 24 دن ڈرامہ ہوا۔ بیلا سنگھ جینڈ وغیرہ کئی ایک گواہ آپ کے خلاف پیش ہوئے۔ ڈرامہ افسوس ناک تھا۔ ملزم کو سامراجیہ کی قربان گاہ پر قربان کرنے کا فیصلہ ہوا۔ سزائے موت سنتے ہی دیوتا سہم گئے۔ اس دیوتا کو سزائے موت! راکششوں۔ دانووں میں جنگ چھڑ گئی ہوگی۔

کال کوٹھری میں بند ہیں' سکھ ہونے پر بھی ٹوپی نہیں پہن سکتے۔ کمبل ہی سر پر لپیٹ لیا ہے۔ بدنام کرنے کے لئے کسی نے شرارت کی۔ کمبل کے کسی ایک کونے میں افیم باندھ دی اور کہا گیا کہ آپ خودکشی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے انتہائی خاموشی

سے جواب دیا۔موت سامنے کھڑی ہے۔اسے گلے لگانے کے لئے تیار ہو چکا ہوں۔خودکشی کر کے میں حسین موت کو بدشکل نہیں بناؤں گا۔ بغاوت کے الزام میں سزائے موت پا کر فخر محسوس کر رہا ہوں۔ پھانسی کے تختہ پر ہی بہادری سے جان دوں گا''۔ پوچھ تاچھ کرنے پر بھید کھل گیا۔ کچھ نمبر دار قیدیوں اور وارڈن کو تھوڑی بہت سزا ہوئی۔ سبھی نے آپ کی حب الوطنی اور بے خوفی کی داد دی۔

1916 کا زمانہ تھا۔ہندوستان میں کالے پانی اور پھانسی کا زور تھا۔پورے شمالی ہندوستان میں اچانک کھلبلی مچ گئی۔ اندر ہی اندر ایک شورش پنپنے لگی تھی' یہ ہندوستانی عوام نہیں جانتی تھی۔لیڈران ان کی جانب دیکھنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ سرکار نے یوں ہی ملک کو خوف زدہ کرنے کے لئے ایسے سنگین مقدمات چلائے ہیں۔جو بھی ہو'اس عظیم شورش کے ناکام ہو جانے کے بعد بھی اس کی خوب صورت یادیں باقی ہیں۔وہ خوب صورت ہے' اس لئے کہ یہ اصول پسند نوجوانوں کے مقدس لہو سے لکھی گئی ہے۔یادیں باقی ہیں' اس لئے قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔اسی سال چیتر (مارچ) کی 18 تاریخ کو شری بلونت سنگھ جی کی بیوی ملاقات کے لئے گئی۔۔ کتاب اور کپڑے دے کر انہیں بتایا گیا'' کل 17 چیتر کو انہیں پھانسی دے دی گئیں''۔ان کی بیوی کلیجہ تھام کر رہ گئیں۔

شری بلونت سنگھ کی پھانسی کے دن کی خبریں بعد میں موصول ہوئیں۔آپ نے علی الصباح غسل کیا اور اپنے چھ ساتھیوں کے ساتھ (جنہیں اسی دن پھانسی ملی تھی) بھارت ماتا کو آخری سلام کیا۔آزاد بھارت کا گیت گایا گیا۔ ہنستے ہنستے تختہ دار کھڑے ہو گئے۔پھر کیا ہوا؟ کیا پوچھتے ہو؟ وہی جلاد وہی رسی! اوہ! وہی پھانسی اور وہی جانوں کی قربانی!

آج بلونت اس دنیا میں نہیں' ان کا نام ہے' ان کا ملک ہے' ان کی شورش (وپلو) ہے۔

-- 'چاند' (پھانسی نمبر) نومبر 1928

ڈاکٹر متھرا سنگھ

سب سے زیادہ مصائب جھیلنے کے باوجود' گنتی میں سب سے زیادہ اپنے لوگوں کو آزادی کی قربان گاہ پر قربان کرنے کے باوجود آج پنجاب سیاسی شعبہ میں پھسڈی (Politically backward) صوبہ کہلاتا ہے۔بنگال میں شری خودی رام بوس پھانسی پر لٹکے۔اس کی اس قدر تشہیر کی گئی کہ آج ان کا نام اس صوبہ کے کونے کونے میں سنائی دیتا ہے۔ہندوستان کے بھی صوبوں میں ان کا نام مشہور ہے۔مگر پنجاب میں کتنے رتن ملک کے لئے اپنی جان نچھاور کر گئے' کتنے ہی لوگ ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ گئے' کتنے ہی لڑتے لڑتے سینہ میں گولی کھا کر شہید ہو گئے۔مگر انہیں کون جانتا ہے؟ اور کہیں کی تو بات ہی کیا کریں؟ صوبہ پنجاب میں ہی انہیں کتنے لوگ جانتے ہیں؟ کوئی عام شورش پسند یوں ہی پھانسی پر لٹک گیا ہو اور اسے لوگ یوں ہی بھول گئے ہوں' سو بھی تو نہیں۔جن لوگوں نے انتہائی مشقت سے' انتہائی جوش وخروش سے اور بے مثال حوصلہ مندی سے ہندوستان کی ترقی کے لئے ایسے ایسے اقدامات کر دیئے تھے کہ آج انہیں سن سن کر حیرت زدہ رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔اگر ایسے رتن کسی اور ملک میں پیدا ہوئے ہوتے تو آج ان کی واشنگٹن' گیری بالڈی اور ولیم والسی کی طرح پوجا ہوتی۔مگر انہوں نے ایک ناقابل معافی جرم یہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔اسی کی سزا یہ ہے کہ آج انہیں فراموش کر دیا گیا۔نہ ان کے

کارناموں کا ذکر ہوتا ہے نہ ان کے ایثار کا۔ نہ ان کی قربانی کی تعریف' نہ ان کی شجاعت کی داد۔ مگر ایسی احسان فراموشی دکھانے والے ملک کی ترقی کیسے ہوگی؟

سخت اصول پسند ڈاکٹر متھرا سنگھ جی کا مقام درحقیقت بہت بلند ہے۔ آپ کی ولادت 1883 میں ڈھڈیال نامی گاؤں' ضلع جہلم (پنجاب) میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام سردار ہری سنگھ تھا۔ آپ نے پہلے اپنے گاؤں میں ہی تعلیم پائی' بعدازاں آپ چکوال کے ہائی اسکول میں زیرتعلیم رہے۔ آپ کا دماغ بہت تیز تھا۔ آپ ہمیشہ اپنے درسی ساتھیوں میں سب سے اچھے رہتے تھے۔ وہاں پر میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ پرائیویٹ طور پر ڈاکٹری کا کام سیکھنے لگے۔ میسرس جگت سنگھ اینڈ برادرس کی دکان راولپنڈی میں تھی۔ وہیں پر آپ نے یہ کام سیکھنا شروع کیا۔ بڑی لگن سے آپ سبھی کام کرتے۔ تین چار برس میں آپ اس کام میں ماہر ہوگئے۔ پھر آپ نے اپنی علاحدہ دکان کھول لی۔ وہ دکان نوشیرا چھاؤنی میں تھی' آپ سبھی ممالک سے معالجہ سے متعلق کتب ورسائل منگوایا کرتے تھے۔ خصوصی طور پر تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپ نے امریکا جانے کا ارادہ کیا۔ دکان کا معاملہ ابھی طے بھی نہ ہو پایا تھا کہ آپ کی بیوی اور بیٹی کا انتقال ہوگیا۔ مگر اس سے کیا ہوتا تھا؟ آپ وہاں سے روانہ ہوگئے۔ 1913 میں آپ کوچلے تھے۔ زیادہ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو شنگھائی میں ہی رکنا پڑا۔ وہیں پر آپ نے معالجاتی کام شروع کردیا' جس میں آپ بہت کامیابی ملی۔ مگر آپ کا ارادہ کناڈا جانے کا تھا۔ آپ کچھ اور ہندوستانیوں کے ساتھ ادھر گئے۔ مگر وہاں کافی مشکلات پیش آئیں۔ پہلے محض آپ کو اور ایک اور شخص کو وہاں اترنے کی اجازت ملی' دوسرے لوگوں کو نہیں۔ اس پر آپ نے وہاں اترنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر ساتھیوں کی اپیل کے بعد وہ اترے تو سہی لیکن وہاں امیگریشن محکمہ نے دیگر ساتھیوں کے لئے لڑائی شروع کردی۔ مقدمہ تک چلا۔ مگر قانون اور کورٹ طاقت ور لوگوں کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ غلام ملک والوں کے لئے۔ وہاں سے آپ کو اور دیگر ہندوستانی مسافروں کو واپس لوٹا دیا گیا۔ بہانا وہی کہ کناڈا میں کسی جہاز سے براہ راست نہیں آئے۔ آپ شنگھائی لوٹ آئے۔ ہندوستانی لوگوں کو اپنی آپ بیتی سنائی اور شری بابا گرودت سنگھ جی کو ایک اپنا جہاز بنانے کا مشورہ دیا جو براہ راست کناڈا جائے۔ اسی صلاح پر بابا جی نے کاماگاٹامارو جہاز کرائے پر لے لیا اور اس کا نام گرونانک جہاز رکھا۔ آپ کو ادھر پنجاب آنا پڑا۔ جہاز جلد ہی تیار ہوگیا' آخر آپ مقررہ دن وہاں نہ پہنچ سکے۔ سنگاپور سے 35 کے قریب دیگر ساتھیوں سمیت دوسرے جہاز سے چلے تاکہ شنگھائی تک کاماگاٹامارو سے مل کر اس پر سوار ہوں۔ ہانگ کانگ پہنچنے پر پتہ چلا کہ جہاز وہاں سے بھی چل چکا ہے۔ اس لئے آپ وہیں رک گئے۔ اس وقت تک آپ آزادی کے لئے اپنی زندگی قربان کرنے کا ارادہ کرچکے تھے۔

ہانگ کانگ میں آپ نے تشہیر کا کام شروع کیا۔ امریکا سے غدر پارٹی کا 'غدر' اخبار آتا تھا۔ آپ بھی وہیں پر ویسا ہی خفیہ اخبار چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کرنے لگے۔ ادھر کاماگاٹامارو جہاز پر جس قدر مظالم ہونے لگے' ان سب کی خبریں آپ کو مل رہی تھیں۔ جب معلوم ہوا کہ کاماگاٹامارو جہاز کو واپس آنا ہی پڑے گا تو آپ نے بڑی تیزی کے ساتھ پرچار شروع کیا۔ اس وقت کینٹن میں ایک سکھ پولیس انسپکٹر صاحب ان سبھی تحریکوں کو دبانے کی بہت کوشش کررہے تھے۔ آپ نے ان سے ملاقات کرکے ان سے بات چیت کی تو وہ صاحب بھی ان کی مدد کرنے لگے۔ آپ کسی کام سے شنگھائی گئے۔ جاتے وقت سب سے کہہ گئے کہ اب کاماگاٹامارو جہاز میں سوار ہوکر ہندوستان کو لوٹ جانا چاہئے۔ مگر ان کا یہ ارادہ جان کر سرکار نے جہاز کو شنگھائی میں نہ ٹھہرنے دیا۔ اس سے دو ایک روز بعد وہ سبھی لوگ دوسرے جہازوں سے ہندوستان لوٹ آئے۔ کاماگاٹامارو جہاز ابھی ہگلی میں ہی کھڑا تھا کہ آپ لوگ کلکتہ پہنچ گئے۔ وہاں پر سرکار نے آپ کو پنجاب کے ٹکٹ دے کر گاڑی پر چڑھادیا۔ امرتسر

پہنچتے نہ پہنچتے بجبج کا واقعہ رونما ہو گیا۔ سبھی خبریں ملیں۔ غصہ سے بلبلا اٹھے۔ تشدد کی آگ بھڑک اٹھی۔ مگر ڈاکٹر جی نے اپنے دیگر ساتھیوں کو سمجھا بجھا کر خاموش کیا اور انہیں پرچار کے لئے جوش دلایا اور خود تنظیم کا کام شروع کر دیا۔ ادھر اس عظیم کام میں آپ کو بم بنانے کا کام سونپا گیا۔ آپ اس میں تھے بھی بہت ماہر۔ امریکا سے سینکڑوں متوالے مجاہد شورش کی آگ بھڑکانے کے لئے آنے لگے۔ فوری طور پر سارا انتظام ہو گیا۔ شورش پسند گروپ کی اس قدر مضبوط تنظیم قائم ہو گئی کہ پورے ہندوستان میں ایک ساتھ بغاوت کرنے کا خیال آیا اور تاریخ تک مقرر ہو گئی۔ دیکھتے دیکھتے سبھی کوششیں، سبھی پروگرام ناکام ہو گئے۔ ذلیل کرپال کی وجہ سے سبھی کئے دھرے پر پانی پھر گیا۔ ادھر ادھر دھر پکڑ شروع ہو گئی۔ مگر آپ گرفتار نہ ہوئے۔ ایک بار ایک سرکاری جاسوس نے آپ کے بارے میں کہا تھا کہ اگر وہ سرکاری گواہ بن جائیں تو انہیں معافی کے ساتھ کافی انعام واکرام سے بھی نوازا جائے گا' تو آپ نے اس تجویز کو یکسر مسترد کر دیا۔ بعد ازاں ایک بار پھر خفیہ آفیسر آپ کے پاس آ پہنچا۔ مگر وہ بخوبی جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب بڑے بے خوف اور بے بیباک انقلابی ہیں۔ آخر کار اسے اکیلے گرفتار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس ان سے کہنے لگا کہ سرکار نے آپ کو معافی دی ہے اور انعام دینے کا وعدہ کیا ہے' یہی کہنے کے لئے میں آیا ہوں۔ آپ بھی خوب سمجھتے تھے کہ وہ اس وقت انہیں گرفتار کرنے کی ہمت نہ کرنے کی وجہ سے ایسی باتیں کرتا تھا۔ اس طرح آپ نے تھوڑی رضامندی دکھائی اور اس سے پیچھا چھڑا کر بچ نکلے۔ اس طرح آپ نے سمجھا کہ اب ملک میں بچکر رہنا بالکل ناممکن ہے' اس لئے آپ کابل روانہ ہو گئے۔ وزیر آباد اسٹیشن پر پولیس نے گرفتار کر لیا۔ مگر وہاں آپ نے کچھ رشوت دے دی اور بچ نکلے۔ آپ کوہاٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔ پولیس کو خبر مل گئی۔ کوہاٹ اسٹیشن پر پولیس کا بہت بڑا دستہ پہرہ پر لگا دیا گیا۔ اسی ٹرین میں بہت سی پولیس بھی چڑھا دی گئی۔ راستہ میں اچانک سبھی ڈبوں کی تلاشی لی گئی مگر آپ گرفت میں نہ آسکے۔ کچھ دن وہاں رکنے کے بعد آپ کابل پہنچ گئے مگر آپ بہت مشہور ہو گئے۔ آپ کی اہلیت دیکھ کر آپ کو کابل کا چیف میڈیکل مقرر کر دیا گیا۔

ہندوستان کے اندر صوبائی انقلاب کی سبھی کوششیں ناکام ہو گئیں تو کیا' باہر پوری شدت کے ساتھ کوششیں ہو رہی تھیں۔ کابل میں اس وقت کی عبوری سرکار (Provisional Government of India) قائم تھی جو جرمنی کمیٹی سے تعاون کرتی ہوئی ہندوستان کی آزادی میں مصروف تھی۔ اس وقت عرب' مصر' میسوپوٹامیا اور ایران وغیرہ سبھی ممالک میں ہندوستان شورش پسند جن میں ہندو مسلم اور سکھ بھی شامل تھے' ہندوستان میں انقلاب برپا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ان سب کوششوں میں ڈاکٹر صاحب دوبارہ مصروف ہو گئے۔ اس سلسلے میں آپ کو جرمنی جانا پڑا۔ کچھ دنوں بعد آپ پھر لوٹ آئے۔ ایران تک تو آپ کو کئی بار جانا پڑا۔ پھر ارادہ کیا گیا کہ عبوری حکومت کی جانب سے ایک سنہرا خط زار روس کے پاس اس توقع کے ساتھ ارسال کیا جائے کہ وہ ہندوستانی انقلاب کی معاونت کرے۔ اب بڑی شان و شوکت کے ساتھ روانگی ہوئی۔ کئی خدمت گار سمیت سامان کے ساتھ لدے ہوئے اونٹ آپ کے ساتھ تھے۔ مگر اس وقت کوئی ذلیل شخص آپ کے سفر کی خبر انگریز سرکار کو دے رہا تھا۔ اس کے بارے میں انہیں خبر نہیں تھی۔ شہر تاشقند میں آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایران میں لاکر شناخت کی گئی۔ مقدمہ چلا۔ بہت لوگوں نے کوششیں کیں کہ آپ کو حکومت ہند کے سپرد نہ کیا جائے مگر اب تک دیگر سبھی اقدامات کو ناکامی ہاتھ آئی' اب کیوں کامیابی ملتی؟۔

لاہور لائے گئے۔ ادھر ان دنوں اوڈائر شاہی کا زور تھا۔ کچھ دن عدالتی ڈرامہ ہوا۔ سزائے موت سنائی گئی۔ آپ نے انتہائی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے سنا۔ آپ کے چھوٹے بھائی ملاقات کے لئے آئے۔ آپ نے پوچھا۔ ''کیوں بھائی میرے مرنے کی تمہیں فکر تو نہیں''۔ بچہ رو پڑا۔ آپ نے غصہ آمیز جوشیلی آواز میں کہا ''واہ جی! یہ وقت لطف اندوزی کا

ہے۔ کیا سکھ لوگ بھی ملک کے لئے مرتے وقت رویا کرتے ہیں؟ مجھے تو انتہائی مسرت ہو رہی ہے کہ میں ہندوستانی شورش کو کامیاب بنانے کے لئے جو مجھ سے ہو سکا' کر چکا ہوں۔ میں بڑی خاموشی کے ساتھ پھانسی کے تختہ پر جان نچھاور کروں گا''۔ اس طرح آپ نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

پھر؟ پھر 27 مارچ 1917 کا دن آ پہنچا۔ اس دن پھر وہی ڈرامہ شروع ہوا۔ اس دن کے ڈرامہ میں ایک ہی منظر ہوا کرتا ہے: اور وہ بھی چند ایک منٹوں کا۔ یہ پگلے لوگ نہ جانے کہاں سے آ گئے جنہیں نہ موت کا خوف تھا نہ جینے کی آرزو' میدان عمل میں ہنسے' میدان جنگ میں ہنسے اور پھانسی کے تختہ پر بھی مسکرا دیئے۔ ان کی عظمت بے پناہ ہے۔

''ہوں فرشتے بھی فدا جن پر یہ وہ انسان ہیں''

۔(چاند (پھانسی نمبر) نومبر 1928

شہید کرتار سنگھ سرابھا

شہید کرتار سنگھ سرابھا کی تصویر بھگت سنگھ اپنے پاس رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے ''یہ میرا استاذ رفیق اور برادر ہے''۔ ان محرکات کی تفہیم کے لئے یہ مضمون انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

رن چنڈی کے یہ خاص بھگت باغی کرتار سنگھ ابھی 20 برس کے بھی نہیں تھے کہ انہوں نے آزادی کی قربان گاہ پر اپنی جان نچھاور کر دی۔ آندھی طوفان کی طرح وہ اچانک کہیں سے آئے' شعلہ بھڑکایا اور خواب غفلت میں پڑی رن چنڈی کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ بغاوت کا یگیہ رچا اور بالآخر وہ خود اس میں بھسم ہو گئے۔ وہ کیا تھے' کس دنیا سے آچانک آئے اور آن واحد میں کہاں غائب ہو گئے' ہم کچھ بھی نہ جان سکے۔ 19 برس کی عمر میں ہی انہوں نے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ سوچ کر حیرانی ہوتی ہے۔ اتنی جرات' اعتماد' ایثار اور ایسی لگن خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہندوستان میں ایسے انسان بہت کم پیدا ہوئے ہیں جن کو صحیح معنوں میں باغی کہا جا سکتا ہے مگر ان چنندہ لیڈروں میں کرتار سنگھ کا نام فہرست میں سب سے اوپر ہے۔ ان کی رگ رگ میں انقلاب کا جذبہ سمایا ہوا تھا۔ ان کی زندگی کا ایک ہی نصب العین' ایک ہی خواہش اور ایک ہی امید' جو بھی تھی' انقلاب تھا' اس کے لئے ہی انہوں نے زندگی میں قدم رکھا اور بالآخر اسی کے لئے اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

آپ کی ولادت 1886 میں گاؤں سرابھا' ضلع لدھیانہ میں ہوئی۔ آپ والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ ابھی ان کی عمر بہت کم تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مگر آپ کے دادا نے بڑے نازوں سے آپ کو پالا پوسا۔ نویں کلاس کے بعد آپ چچا کے پاس چلے گئے۔ وہاں انہوں نے دسویں کلاس پاس کی اور کالج میں پڑھنے لگے۔ یہ 11-1910 کے دن تھے۔ ادھر آپ کو اسکول اور کالج کے نصاب میں تنگ دائرے سے باہر بہت سی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ آندولن کا عہد تھا۔ اس ماحول میں رہ کر آپ کے اندر حب الوطنی کا جذبہ بیدار ہوا۔

بعد ازاں آپ نے امریکا جانے کی خواہش کی۔ گھر والوں نے اس کی کوئی مخالفت نہیں کی۔ آپ کو امریکا بھیج دیا گیا۔ 1912 میں آپ سان فرانسسکو کی بندرگاہ پہنچے۔ آزاد ملک میں پہنچ پہنچ کر قدم قدم پر آپ کے نرم و نازک دل پر چوٹ لگنے لگی۔ ان گوروں کی زبان سے Damn Hindu (حقیر ہندو) اور Black man (کالا آدمی) وغیرہ سنتے ہی وہ پاگل

ہوا ٹھتے تھے۔ ان کو قدم قدم پر ملک کی عزت اور وقار خطرے میں نظر آنے لگا۔ گھر کی یاد آنے پر زنجیروں میں جکڑا ہوا بے بس مجبور ہندوستان نظروں کے سامنے آ جاتا۔ ان کا نرم دل آہستہ آہستہ سخت ہونے لگا اور ملک کی آزادی کے لئے زندگی قربان کرنے کا عزم مستحکم تر ہوتا گیا۔ ان کے دل پر اس وقت کیا گزرتی تھی' یہ ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

یہ ناممکن تھا کہ وہ چین سے رہ پاتے۔ ہر وقت ان کے سامنے یہ سوال اٹھنے لگا کہ اگر امن سے کام نہ چلا تو ملک آزاد کس طرح ہوگا۔ پھر بغیر زیادہ سوچے سمجھے انہوں نے ہندوستانی مزدوروں کو منظم کرنا شروع کیا۔ ان میں آزادی کا جذبہ ابھرنے لگا۔ ہر مزدور کے پاس گھنٹوں بیٹھ کر وہ سمجھانے لگے کہ بے عزتی سے بھری غلامی کی زندگی سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ کام شروع ہونے پر دیگر لوگ بھی ان کے ساتھ آ گئے۔ مئی 1912 میں ان لوگوں کی ایک خصوصی میٹنگ ہوئی۔ اس میں چند منتخب ہندوستانی شامل ہوئے۔ سبھی لوگوں نے ملک کی آزادی کے لئے تن من دھن نچھاور کرنے کا عہد کیا۔ انہی دنوں پنجاب کے جلاوطن پرستار وطن بھگت سنگھ وہاں پہنچے۔ جلدی جلدی جلسے ہونے لگے۔ کام سے کام چلتا گیا۔ میدان تیار ہو گیا۔ پھر اخبار کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ غدر' نامی اخبار نکالا گیا۔ اس کا پہلا شمارہ 1913 میں نکالا گیا۔ اس کے ادارتی شعبہ میں کرتار سنگھ بھی تھے۔ آپ کے قلم میں بے پناہ جوش اور ولولہ تھا۔ ادارتی شعبہ کے لوگ اخبار کو ہینڈ پریس پر چھاپتے تھے۔ کرتار سنگھ انقلاب پسند متوالے نوجوان تھے۔ پریس چلاتے ہوئے تھک جانے پر وہ گیت گایا کرتے تھے:

سیوا دیش دی زندڑی بڑی اوکھی
گلاں کرنی آں ڈھیر سکھلیاں نے
جناں دیش سیوا وچ پیر پایا
اُنھاں لکھ مصیبتاں جھلیاں نے

(ملک کی خدمت کرنا بہت مشکل کام ہے' جب کہ باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ جنہوں نے ملک کی خدمت کا راستہ اختیار کیا' وہ لاکھوں مصائب جھیلتے ہیں)۔

کرتار سنگھ جس لگن سے محنت کرتے تھے' اس سے سبھی کی ہمت بڑھ جاتی تھی۔ ہندوستان کو کس طرح آزاد کرایا جائے' وہ کسی اور کو پتہ چلے یا نہیں اور کسی نے اس سوال پر غور و خوض کیا ہو یا نہیں لیکن کرتار سنگھ نے اس سوال پر بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ اسی دوران آپ نیویارک ہوائی کمپنی میں بھرتی ہو گئے اور وہیں پوری دل جمعی کے ساتھ کام سیکھنے لگے۔

ستمبر 1914 میں کاما گاٹا مارو جہاز کو ظالم گورے سامراجیہ وادیوں کے ہاتھوں ناقابل ذکر مظالم جھیلنے کے بعد بھی یوں ہی لوٹنا پڑا۔ اس وقت ہمارے کرتار سنگھ انقلاب پسند گپتا اور ایک امریکی نراجیت پسند جیک کو ساتھ لے کر جاپان آئے اور کوبے میں بابا گرودت سنگھ جی سے مل کر تفصیلی گفتگو کی۔ عہد ساز آشرم' سان فرانسسکو کے غدر پریس میں' غدر اور غدر کی گونج' اور دیگر بہت سی کتاب شائع کر کے تقسیم کی جاتی رہیں۔ روز بہ روز پرچار بڑھتا گیا۔ جوش بڑھتا گیا۔ فروری 1914 میں اسٹاکرن کے پبلک جلسے میں آزادی کا پرچم لہرایا گیا اور آزادی اور مساوات کے نام پر قسمیں کھائی گئیں۔ اس جلسے میں اہم مقررین میں کرتار سنگھ بھی تھے۔ سبھی نے اعلان کیا کہ وہ اپنے خون پسینے کی کمائی ایک کر کے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں لگا دیں گے۔ اسی طرح دن گزرتے رہے۔ اچانک یورپ میں پہلی جنگ عظیم چھڑنے کی خبر آئی۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ ایک دم سبھی گانے لگے۔

چلو چلیں دیش کے لئے یدھ کرنے
یہی آخری وچن و فرمان ہو گئے

کرتار سنگھ نے ملک واپسی کا شدت کے ساتھ پرچار شروع کیا۔ پھر خود جہاز پر سوار ہو کر کولمبو (سری لنکا) پہنچ گئے۔ ان دنوں امریکا سے پنجاب آنے والے اکثر ڈیفنس آف انڈیا قانون (ڈی آئی آر) کی گرفت میں آجاتے تھے۔ بہت کم صحیح سلامت پہنچتے تھے۔ کرتار سنگھ صحیح سلامت آ گئے۔ بڑی شدت کے ساتھ کام شروع ہوا۔ تنظیم کی کمی تھی لیکن کسی طرح وہ پوری کی گئی۔ دسمبر 1914 میں مراٹھا نوجوان وشنو گنیش پنگلے بھی آ گئے۔ ان کی کوشش سے شری شچیندر ناتھ سانیال اور راس بہاری پنجاب آئے۔ کرتار سنگھ ہر وقت ہر جگہ پہنچتے۔ آج موگا میں خفیہ میٹنگ ہے۔ آپ وہاں بھی ہیں۔ کل لاہور کے طالب علموں میں پرچار ہو رہا ہے۔ آپ پھر پہلی صف میں ہیں۔ اگلے روز فیروز پور چھاؤنی کے سپاہیوں سے گٹھ جوڑ ہو رہا ہے۔ پھر ہتھیاروں کے لئے کلکتہ جا رہے ہیں۔ روپے کی کمی کا سوال اٹھنے پر آپ نے ڈاکہ ڈالنے کی صلاح دی۔ ڈکیتی کا نام سنتے ہی بہت سے لوگ حیران رہ گئے لیکن آپ نے کہہ دیا کہ کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے۔ بھائی پرمانند بھی ڈکیتی سے متفق ہیں۔ ان سے تصدیق کرانے کی ذمہ داری آپ پر ڈالی گئی۔ اگلے دن بغیر ان سے ملے ہی کہہ دیا۔ ''پوچھ آیا ہوں' وہ متفق ہیں''۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ محض روپے کی کمی کے سبب بغاوت کی تیاری میں تاخیر ہو۔

ایک دن وہ ڈکیتی ڈالنے گاؤں گئے۔ کرتار سنگھ لیڈر تھے۔ ڈکیتی چل رہی تھی۔ گھر میں ایک بے حد خوب صورت لڑکی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک پاپی آتما کا من ڈول گیا۔ اس نے زبردستی لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لڑکی نے گھبرا کر شور مچا دیا۔ کرتار سنگھ فوراً ریوالور تان کر اس کے قریب پہنچ گئے اور اس آدمی کی پیشانی پر پستول رکھ کر اسے غیر مسلح کر دیا۔ پھر سخت لہجے میں گویا ہوئے۔ ''پاپی! تیرا گناہ بہت سنگین ہے۔ تمہیں سزائے موت ملنی چاہئے لیکن حالات کی مجبوری کے سبب تمہیں معاف کیا جاتا ہے۔ فوراً اس لڑکی کے قدموں میں گر کر معافی مانگ کہ اے بہن! مجھے معاف کر دو۔ پھر اس کی ماں کے قدموں کو چھو کر کہہ کہ ماتا جی! میں اس گری ہوئی حرکت کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ اگر وہ تمہیں معاف کر دیں تو تمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے گا ورنہ گولی سے اڑا دیا جائے گا''۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ بات ابھی زیادہ نہیں بڑھی تھی۔ یہ دیکھ ماں بیٹی کی آنکھیں بھر آئیں۔ ماں نے کرتار سے پیار بھرے انداز میں کہا۔ ''بیٹا! ایسے دھرماتما اور اچھے نوجوان ہو کر تم اس کام میں کیسے شامل ہو گئے؟'' کرتار سنگھ کا بھی دل بھر آیا اور کہا۔ ''ماں جی! روپے کے لالچ میں ہم نے یہ کام شروع نہیں کیا۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر ڈکیتی ڈالنے آئے ہیں۔ ہتھیار خریدنے کے لئے پیسے کی ضرورت ہے۔ وہ کہاں سے لائیں؟ ماں جی! اسی عظیم کام کے لئے آج اس کام پر مجبور ہوئے ہیں''۔ اس وقت یہ نظارہ بہت دردناک تھا۔ ماں نے پھر کہا۔ ''اس لڑکی کی شادی کرنی ہے''۔ اس کے لئے کچھ چھوڑ جاؤ تو اچھا ہے''۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی ساری دولت ماں کے قدموں میں رکھ دی اور کہا۔ ''جتنی چاہیں لے لیں''۔ کچھ پیسہ رکھ کر ماں نے سارا روپیہ کرتار سنگھ کی جھولی میں ڈال دیا اور دعا دی۔ ''جاؤ بیٹا' تمہیں کامیابی نصیب ہو''۔ ڈکیتی جیسے بھیانک کام میں شامل ہو کر بھی کرتار سنگھ کا دل کس قدر جذباتی' مقدس اور وسیع تھا' یہ اس واقعہ سے ظاہر ہے۔

فروری 1915 میں بغاوت کی تیاری تھی۔ پہلے ہفتہ آپ پنگلے اور دوسرے دو تین ساتھیوں کے ساتھ آگرہ' کانپور' الہ آباد' لکھنؤ' میرٹھ اور دیگر مقامات پر رائے اور بغاوت کے لئے ان سے میل ملاپ کر آئے۔ آخر وہ دن قریب آنے لگا' جس کا بڑی دیر سے انتظار ہو رہا تھا۔ 21 فروری 1915 ہندوستان میں بغاوت کا دن طے ہوا۔ اسی کے مطابق تیاری ہو رہی تھی۔ لیکن اسی وقت ان کی امیدوں کے درخت کی جڑ میں بیٹھا ایک چوہا اسے کتر رہا تھا۔ چار پانچ دن قبل شک ہوا کہ کرپال سنگھ کی غداری سے سب کچھ تہ و بالا ہو جائے گا۔ اسی خوف سے کرتار سنگھ نے راس بہاری بوس سے بغاوت کی تاریخ 21 فروری کے بجائے 19 فروری کرنے کے لئے کہا۔ اس کی بھی خبر کرپال سنگھ کو مل گئی۔ اس انقلابی گروپ میں ایک غدار کی موجودگی کتنے

خطرناک نتائج کا سبب بنی۔ راس بہاری اور کرتار سنگھ بھی کوئی مناسب انتظام نہیں ہونے سے اپنا راز چھپا نہ پائے۔ اس کا سبب ہندوستان کی بدقسمتی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

کرتار سنگھ گزشتہ فیصلے کے مطابق پچاس ساٹھ ساتھیوں کے ساتھ فیروز پور جا پہنچے۔ اپنے ساتھی سپاہی حولدار سے ملے اور بغاوت کی بات کی۔ لیکن کرپال سنگھ نے تو پہلے ہی سارا معاملہ خراب کر دیا تھا۔ ہندوستانی سپاہی غیر مسلح کر دیئے گئے۔ جم کر گرفتاریاں ہونے لگیں۔ حولدار نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ کرتار سنگھ کی کوشش ناکام رہی۔ ناامید ہو کر لاہور آ گئے۔ پورے پنجاب میں گرفتاریوں کا سلسلہ تیز ہو گیا۔ اب ساتھی بھی بکھرنے لگے۔

ایسے حالات میں راس بہاری بوس مایوس ہو کر لاہور کے ایک مکان میں لیٹے ہوئے تھے۔ کرتار سنگھ بھی وہیں آ کر ایک چارپائی پر دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئے۔ ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ لیکن چپ چاپ ہی ایک دوسرے کے دل کے حالات سمجھ گئے۔ ان کی حالت کا اندازہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟:

در تدبیر پر سر پھوڑنا شیوہ رہا اپنا
وسیلے ہاتھ ہی نہ آئے قسمت آزمائی کے
(ہمارا کام قسمت کے در پر سر پھوڑنا ہی رہا لیکن قسمت آزمانے کے وسائل ہی ہاتھ نہ آئے)

ان کی تو یہی خواہش تھی کہ کہیں لڑائی ہو اور وہ اپنے ملک کے لئے لڑتے لڑتے جان دے دیں۔ پھر سرگودھا کے قریب چک نمبر پانچ میں آ گئے۔ اس کے بعد بغاوت کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہیں گرفتار ہوئے۔ زنجیروں میں جکڑے گئے۔ بے خوف باغی کرتار سنگھ کو لاہور اسٹیشن لایا گیا۔ پولیس کپتان سے کہا۔ ''مسٹر ٹامکن، کچھ کھانا تو لایئے''۔ وہ کتنا مست مولا تھا! اس پرکشش شخصیت کو دیکھ کر دوست و دشمن سبھی مسرور ہو جاتے تھے۔ گرفتاری کے وقت وہ بہت خوش تھے۔ ہر وقت کہا کرتے تھے، ''شجاعت اور ہمت سے مرنے کے بعد مجھے باغی کا لقب دینا۔ کوئی یاد کرے تو باغی کرتار سنگھ کہہ کر یاد کرے''۔ مقدمہ چلا۔ اس وقت کرتار سنگھ ساڑھے اٹھارہ برس کے تھے۔ سب سے کم عمر مجرم آپ ہی تھے۔ لیکن جج نے ان کے بارے میں یہ لکھا۔ ''وہ ان مجرموں میں سب سے خطرناک مجرم ہے۔ سفر امریکا کے دوران اور پھر ہندوستان میں اس سازش کا ایسا کوئی حصہ نہیں جس میں اس نے اہم رول نہ ادا کیا ہو۔

ایک دن آپ کے بیان دینے کا نمبر آیا۔ آپ نے سب کچھ تسلیم کر لیا۔ آپ انقلابی بیان دیتے رہے۔ جج قلم دانتوں کے نیچے دبائے دیکھتا رہا۔ ایک لفظ نہ لکھا۔ بعد میں اتنا کہا۔ ''کرتار سنگھ ابھی آپ کا بیان لکھا نہیں گیا۔ آپ سوچ سمجھ کر بیان دیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے بیان کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے''۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جج کے ان الفاظ کے جواب میں کرتار سنگھ نے بڑی مستانہ ادا سے محض اتنا کہا۔ ''پھانسی ہی تو چڑھا دیں گے اور کیا؟ ہم اس سے نہیں ڈرتے''۔ اس دن عدالت کی کارروائی ختم ہو گئی۔ اگلے دن پھر کرتار سنگھ کا عدالت میں بیان شروع ہوا۔ پہلے دن ججوں کا کچھ ایسا خیال تھا کہ کرتار سنگھ بھائی پرمانند کے اشارے پر ایسا بیان دے رہے ہیں لیکن وہ باغی کرتار سنگھ کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اتر سکتے تھے۔ کرتار سنگھ کا بیان زیادہ زوردار، پرجوش اور پہلے دن کی طرح ہی اقبالیہ بیان تھا۔ آخر میں آپ نے کہا۔ ''جرم کے لئے مجھے عمر قید کی سزا ملے گی یا پھانسی۔ لیکن میں پھانسی کو ترجیح دوں گا تاکہ پھر جنم لے کر، جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوتا، بار بار جنم لے کر پھانسی پر لٹکتا رہوں۔ یہی میری آخری خواہش ہے''۔

آپ کی بہادری سے جج بہت متاثر ہوئے لیکن انہوں نے کشادہ دل والے دشمن کی طرح آپ کی شجاعت کو شجاعت نہ

کہہ کر ''بے شرمی'' کے لفظوں میں یاد کیا۔ کرتار سنگھ کو صرف گالیاں ہی نہیں، سزائے موت بھی ملی۔ آپ نے مسکراتے ہوئے ججوں کا شکریہ ادا کیا۔ کرتار سنگھ پھانسی کی کوٹھری میں قید تھے۔ آپ کے دادا نے آ کر کہا۔ ''کرتار سنگھ جن کے لئے مر رہے ہو وہ تمہیں گالیاں دیتے ہیں۔ تمہاری موت سے ملک کو کچھ فائدہ ہوگا یہ نظر نہیں آتا''۔ کرتار سنگھ نے نہایت آہستہ سے پوچھا۔

''دادا جی! فلاں رشتہ دار کہاں ہے؟''۔

''پلیگ سے مر گیا''۔

''فلاں کہاں ہے؟''

ہیضہ سے مر گیا''۔

''تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ کرتار سنگھ مہینوں بستر پر پڑا رہے اور مصیبت میں مبتلا ہو کر کسی مرض میں مرے! کیا اس موت سے یہ موت ہزار گنا اچھی نہیں؟''۔ دادا چپ ہو گئے۔

آج دوبارہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان کی موت سے کیا فائدہ ہوا؟ وہ کس لئے مرے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ ملک کے لئے مرے۔ ان کا آدرش ہی ملک کی خدمت کے لئے لڑتے ہوئے شہید ہونا تھا۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے تھے۔ مرنا بھی گمنام ہو کر چاہتے تھے۔

چمن زار محبت میں اسی نے باغبانی کی
جس نے محنت کو ہی محنت کا ثمر جانا
نہیں ہوتا ہے محتاج نمائش فیض شبنم کا
اندھیری رات میں موتی لٹا جاتی ہے گلشن میں

ڈیڑھ برس تک مقدمہ چلا۔ 16 نومبر 1915 کا دن تھا جب انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ وہ اس دن بھی ہمیشہ کی طرف خوش تھے۔ ان کا وزن دس پونڈ بڑھ گیا تھا۔ ''بھارت ماتا کی جے'' کہتے ہوئے وہ پھانسی پر جھول گئے۔

شری امیر چند

دہلی کے مشن ہائی اسکول میں ماسٹر تھے۔ اس وقت سوامی رام تیرتھ کے بھگت تھے، بعد میں جب لالہ ہردیال نے اپنے افکار کی تبلیغ شروع کی تو آپ بھی ان سے متفق ہو گئے اور اسی کام کی تبلیغ کرنے لگے۔ آپ اردو اور انگریزی کے بہترین رائٹر تھے۔ 1908 میں جب ہردیال ہندوستان سے جانے لگے تو جماعت کا بار آپ کو سونپ گئے۔

آپ ایک زندہ دل اور آزادی پرست شخص تھے۔ ازراہ مذاق کہا کرتے تھے کہ دہلی آ کر کسی سے بھی بندر ماسٹر کا مکان پوچھنے پر میرے گھر کا پتہ مل سکے گا۔

دہلی اور لاہور میں بم پھینکنے والوں کا علم نہیں ہو سکا۔ چاروں جانب تلاشیاں لی جا رہی تھیں کہ کلکتہ کے راجا بازار میں ایک مکان کی تلاشی لینے پر اودھ بہاری کا پتہ چل گیا۔ وہ ان دنوں امیر چند کے مکان میں ہی رہتے تھے۔ شبہ تو پہلے سے ہی تھا۔ خیر تلاشی لی گئی اور مکان میں ایک بم کا خول مل گیا۔ اسی تلاشی میں لاہور سے لکھا ہوا ایک خط بھی ملا جس میں .M.S کے

دستخط تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دینا ناتھ کا تحریر کردہ ہے۔ بہت سے دینا ناتھ گرفتار کر لئے گئے۔ مگر بعد میں اصلی دینا ناتھ کا بھی پتہ چل گیا۔ اس کی بھی تلاشی لی اور گرفتار ہونے پر اسی نے سارا راز کھول دیا۔

آپ پر Liberty leaflet لکھنے کا الزام لگایا گیا اور خاص کر درج باتیں خصوصی طور پر قابل اعتراض مانی گئیں:

We are so many that we can seize and snatch form them their cannons اور **"Reforms will not do. Revolution and general massacre of all the foreigners-especially the English will and alone can serve our purpose".**

عدالت سے پھانسی کی سزا سنائے جانے پر آپ مسکرا دیئے۔ اس وقت آپ کی عمر پچاس سال تھی۔ دہلی کے بڑے بڑے لوگوں نے صفائی کی گواہی میں آپ کے اعلیٰ کردار کی بہت تعریف کی۔ اسی پر اپیل کے فیصلے میں جج نے لکھا:

"It must be born in mind that 'patriots' of Amir Chand's type are often, except in regard to the monomanla possessing them estimable men. and of blamless private life".

عدالت میں آپ کے ہی گود لئے ہوئے ایک لڑکے سلطان چند نے گواہ بن کر آپ کے خلاف گواہی دی۔ کسی نے بالکل صحیح کہا ہے:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

اس دن مسٹر امیر چند بھی سنبھل نہ سکے اور کورٹ میں ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر پھوٹ پڑا۔ انسان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر اپنے اعزا کا، جن کو اپنے دل میں اعلیٰ ترین درجہ دیا ہو، ان کی دھوکہ دہی اور دغابازی برداشت کرنا ناممکن ہے۔ آج ماسٹر جی جیسا سنجیدہ اور مضبوط شخص بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا۔ ان کا متبنّٰی (گود لیا ہوا لڑکا) آج بھی زندہ ہے اور عیش بھری زندگی بسر کر رہا ہے۔

ماسٹر امیر چند نے بیٹے کی فریب دہی پر بھلے ہی آنسو بہائے ہوں، مگر سزائے موت سن کر وہ ایک دم خوش ہو گئے۔ آپ دنیا کے دیگر لوگوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس کا ثبوت انہوں نے خوشی سے پھانسی کی رسی گلے میں ڈال کر دیا۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کا نام ہے، نیکی ہے، ان کی شورش ہے۔ جب کبھی ملک آزاد ہوگا تو اس عظیم شخصیت کی لوگ قدر و عزت کریں گے۔

شری اودھ بہاری

بی اے پاس کرنے کے بعد آپ نے لاہور سنٹرل جیل ٹریننگ کالج سے بی ٹی پاس کیا تھا۔ آپ ایک عقل مند اور چالاک نوجوان تھے۔ جج نے بھی فیصلے میں کہا تھا:

Avadh Behari only 25 years of are but he is a highly educated and

intelligent man"

راجاباز ارکلکتہ میں سراغ مل جانے کے بعد آپ امیر چند کے مکان میں گرفتار کئے گئے۔اس وقت یو پی اور پنجاب کی قیادت آپ کے سپرد تھی۔آپ کی سچندر بابو نے 'بندی جیون' میں کھل کر تعریف کی ہے۔آپ ہر وقت درج ذیل مصرعہ گنگنایا کرتے تھے:

احسان ناخدا کا اٹھائے میری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر اتار کر

عدالت نے آپ پر مجموعی طور پر تیرہ الزامات لگائے۔کہا گیا کہ لاہور لارینس گارڈن کے بم کی ٹوپی انہوں نے بسنت کمار کے ساتھ مل کر لگائی تھی اور اس میں ان کا پورا پورا ہاتھ تھا۔

آپ کو پھانسی کی سزا دی گئی۔جس دن پھانسی ہونے والی تھی' اس دن ایک انگریز نے آپ سے دریافت کیا" آپ کی آخری خواہش کیا ہے؟"۔آپ نے جواب دیا" یہی کہ انگریز سامراج نیست و نابود ہو جائے"۔اس نے کہا۔"مطمئن ہو جائیے۔آج تو خاموشی کے ساتھ جان دیجئے' اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟"۔اس پر آپ نے جواب دیا۔"آج سکون کیسا؟" میں تو چاہتا ہوں کہ شعلہ بھڑکے' چاروں طرف آگ لگے۔تم بھی جلو ہم بھی جلیں اور ہماری غلامی بھی جلے اور آخر میں ہندوستان کندن بن کر رہ جائے"۔

پھانسی کے وقت آپ نے خود رسی گلے میں ڈال لی اور 'وندے ماترم' کے ساتھ ہنستے ہنستے رخصت ہو گئے۔

بھائی بال مکند

بہت دنوں کی بات ہے۔اس وقت دہلی میں اورنگ زیب کی حکومت تھی۔ان دنوں کی دھینگا مشتی کا کیا کہنا۔ایک بار ہندو لیڈر شری گرو تیغ بہادر کو بلایا گیا۔اسلام قبول کرنے سے انکار پر انہیں سزائے موت دی گئی۔انہیں کے ساتھ ان کے پرم بھگت شری بھائی متی داس جی بھی تھے۔ان کو خصوصی تکالیف کے ذریعہ یعنی آرے سے چیر کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ان کا اس وقت کا حوصلہ اور سنجیدگی دیکھ کر دشمن تک ان کے عاشق ہو گئے۔تبھی تو ان کے خاندان کو بھائی کے لقب سے نوازا گیا۔

اسی شورش پسند خاندان نے آج بیسویں صدی میں ملک کے قدموں میں دو مزید قربانیاں دیں۔بھائی پرمانند جی' ایم اے کے نام سے کون واقف نہیں؟ آپ کے ہی چچیرے بھائی شری بال مکند جی بھی تھے۔

آپ کی پیدائش چکوال کے نزدیک کے ایک گاؤں (ضلع جہلم) پنجاب میں ہوئی۔پہلے تو وہیں تعلیم حاصل کی۔بعد میں لاہور ڈی اے وی کالج میں داخل ہوئے۔بی اے پاس کرنے کے بعد آپ نے ملک کی خدمت کا عزم مصمم کر لیا اور لالہ لاجپت رائے جی کے اچھوت ادار آندولن میں کام کرنے لگے اور دور افتادہ پہاڑوں میں جہاں تاریکی کا بسیرا ہے' جا کر متعدد مشکلات کے درمیان بھی اپنا کام پورے حوصلہ اور جوش و خروش سے کرتے رہے۔ان کے معاونین ان کی لگن اور مستعدی آج بھی کھلے دل سے کرتے ہیں۔ادھر پنجاب میں شورش پسند گروپ کا تنظیمی کام 1908 میں سردار اجیت سنگھ اور صوفی امبا پرساد کے 1907 کی تحریک کے بعد سے شروع ہو گیا تھا۔1909 میں بنگال کے ایک مہاجر شورش پسند ان کے پاس پہنچے۔اس

وقت ایک منظم گروپ کی تشکیل کا ارادہ پیدا ہونے لگا۔ ادھر 1908 میں شری لالہ ہردیال جی ایم اے اپنی تعلیم درمیان ہی چھوڑ کر انگلینڈ سے واپس آ گئے۔ انہوں نے یکا یک شورش کا پرچار شروع کر دیا۔ کچھ ہی دنوں میں متعدد اصول پسند نوجوان ان کے معتقد ہو گئے۔ اسی درمیان انہیں ہندوستان چھوڑ کر یورپ جانا پڑا۔

کچھ ہی دنوں بعد صوفی امبا پرساد اور سردار اجیت سنگھ بھی ایران جانے پر مجبور ہو گئے۔ اس وقت یہ نوجوان دہلی کے شہید شری ماسٹر امیر چند جی سے سیاسی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ادھر 1910 میں شری راس بہاری بسو دہرہ دون میں محکمہ جنگلات میں نوکری کرنے لگے اور بنگال کی طرف سے بنگال کے باہر سبھی شمالی ہند کے شورش پسند گروپ کو منظم کرنے کی ذمہ داری بھی آپ پر ہی آن پڑی۔ آپ نے لاہور میں سبھی شورش پسند نوجوانوں کو از سر نو منظم کیا اور ایک مجلس عاملہ بنائی گئی۔ اس میں لاہور گروپ کی ذمہ داری شری بال مکند کو سونپی گئی۔ اس گروپ کی طرف سے کئی بار ''لبرٹی'' (Libertz) نامی انقلابی پرچے تقسیم کیے گئے۔

1912 میں سر مائیکل اوڈائر نے پنجاب کی گورنری کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ اسی وقت ان کے علم میں لایا گیا کہ پنجاب میں ایک شعلہ آتش فشاں تیار ہو رہا ہے جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ وہ اسی کے لئے تیار ہو کر انتظامیہ کی ذمہ داری سنبھال ہی رہے تھے کہ دہلی میں لارڈ ہارڈنگ موجود وائسرائے کے جلوس پر چاندنی چوک میں بم پھینکا گیا۔

چاروں طرف کہرام مچ گیا مگر لاکھ ہاتھ پیر مارنے کے باوجود پولیس بم پھینکنے والوں کا پتہ نہیں لگا سکی۔ پولیس بہت پریشان ہوئی۔ یہ واقعہ 23 دسمبر 1912 کا ہے۔ مئی 1913 میں لاہور لارنس گارڈن میں پنجاب کے سبھی سویلین حکام انگریز جمع ہوئے۔ ان سبھی کو اڑانے کے لئے ایک بم وہاں پر رکھا گیا۔ مگر اس بم کے پھٹنے سے ایک ہندوستانی چپراسی کے علاوہ کوئی نہ مر سکا۔ مگر اس وقت اس کا بھی کچھ پتہ نہیں چل پایا۔ ادھر کچھ دنوں سے بھائی بال مکند جودھ پور میں راج کماروں کو پڑھانے کا کام کرتے تھے۔

ادھر راجا بازار کلکتہ کی تلاشی کے دوران شری اودھ بہاری کا نام معلوم ہو گیا۔ اس کی تلاشی پر دینا ناتھ کا پتہ ملا۔ متعدد دینا ناتھ گرفتار کیے گئے اور ثبوت نہ ملنے پر رہا کر دیئے گئے۔ مگر آخر ایک دن اصلی دینا ناتھ گرفت میں آ ہی گئے۔ وہ بہت اچھے کردار، گھنٹوں خدا کی عبادت میں غرق رہنے والا دینا ناتھ پکڑے جانے پر زار زار رونے لگا۔ اس دن اس کا اتنے دنوں کا حوصلہ نہ جانے کہاں چلا گیا۔ کہتے ہیں، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سردار سکھا سنگھ کی سرخ انگارے جیسی دہکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر دینا ناتھ نے کانپتے ہوئے کہا۔ لیجئے میں راز کھولتا ہوں مگر برائے مہربانی یہ آنکھیں نہ دکھائیں۔ سینکڑوں صفحات پر مشتمل بیان دیا۔ چھوٹا چھوٹا راز بھی کھول دیا۔ جودھ پور سے بھائی بال مکند اور ایم اے کے طالب علم شری بلراج وغیرہ متعدد لوگ پکڑے گئے۔ دینا ناتھ کے بیانات کے مطابق بھائی بال مکند جی کے پاس اس وقت بھی دو بم موجود تھے۔ ان کی تلاش میں ان کے گاؤں کے گھر کی تلاشی میں دو دو گز گہری زمین تک کھود ڈالی گئی۔ ساری چھت ادھیڑ دی گئی۔ مگر کچھ ہاتھ نہ لگا۔

مقدمہ چلا۔ وہ دن بڑے انوکھے تھے۔ ان دنوں کسی انقلابی سے ہمدردی کا اظہار آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ بڑے بڑے لیڈروں نے ملزموں کے رشتہ داروں کو گھر پر مشورہ لینے آتے ہوئے دیکھ کر دھکا دے کر باہر نکال دیا۔ ایسے حالات میں کون کس کی مدد کرتا۔ بھائی پرمانند جی نے ہی بھائی بال مکند جی کے مقدمہ میں سب انتظام کیا۔ مگر اس متوالے سپاہی کو یہ سب ایک محض ایک ڈرامہ محسوس ہوتا تھا۔ انہوں نے آخر میں سزائے موت سننے پر بخوشی صرف اتنا ہی کہا۔ ''آج مجھے انتہائی لطف محسوس ہو رہا ہے کیوں کہ اسی شہر میں جہاں ہمارے سابق شخص شری بھائی متی رام جی نے آزادی کے لئے

جان دی تھی، وہیں پر آج میں بھی ماں کے قدموں میں خود سپردگی کر رہا ہوں''۔ آخر انہیں 1915 کے شروع میں پھانسی دے دی گئی۔ گھر کی حالت عجیب تھی۔ بڑی مشکل سے کچھ روپیہ پیسہ جمع کر کے بھائی پرمانند جی نے پروی کونسل کے لئے ایک وکیل کو تار دیا۔ ایک شخص نے پوچھا۔ ''بھائی جی! بال مکند جی کے بارے میں کیا ہو رہا ہے؟'' آپ نے جواب دیا۔ پروی کونسل میں اپیل کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں''۔ پھر پوچھا گیا۔ ''اور خود آپ کا کیا ہو رہا ہے؟'' جواب دیا۔ ''خود بھی تیار بیٹھے ہیں''۔ انگلینڈ سے اپیل خارج ہونے کا تار پہنچتا نہ پہنچتا' بھائی پرمانند جی بھی پکڑ لئے گئے۔ اس وقت تک 1915 کی عظیم شورش کی سبھی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ اسی کے نتیجہ میں ان کی گرفتاری ہوئی۔

ادھر بھائی بال مکند جی کو پھانسی ہو گئی۔ اس دن کہتے ہیں ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ سپاہیوں سے پنجہ چھڑا کر پھانسی کے تختہ پر جا کھڑے ہوئے۔ اوہ! ایسا حوصلہ ان شورش پسندوں کے علاوہ اور کہاں ملے گا؟ موت سے اس قدر محبت کا مظاہرہ عام دنیا دار نہیں کر سکتے۔

آپ کی حسین قربانی میں آپ کی بیوی شریمتی رام رکھی نے ستی ہو کر مزید چار چاند لگا دیئے۔ بات یہ تھی کہ وہ ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ شادی ہوئے ابھی بہت زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان سے جیل میں ملنے گئی۔ پوچھا۔ ''کھانا کیسا ملتا ہے؟''۔ جواب میں جیل کی ریت ملی روٹی دکھائی گئی۔ گھر آ کر ویسا ہی کھانا تیار کر کے کھانے لگیں۔ پھر ملیں۔ کہا۔ ''سوتے کہاں پر ہیں''؟ جواب ملا۔ 'اس سخت ترین سردی میں بھی تاریک کوٹھری میں دو کمبل اوڑھ کر'۔ گھر آ کر ویسے ہی رہنا شروع کر دیا۔ ایک دن باہر سے رونے دھونے کی آواز سن کر وہ سب کچھ سمجھ گئیں۔ اٹھیں۔ غسل کیا' کپڑے زیورات پہن کر سنگار کیا اور اپنے محبوب سے ملنے کے لئے تیار ہو کر گھر کے اندر ایک چبوترے پر بیٹھ گئیں۔ پھر وہ نہیں اٹھیں۔ دور جہاں تک نگاہ جاتی تھی' جہاں تک ظالم حکمرانوں کا قانون پہنچ سکتا ہے' اسے بہت دور' اس پار' جہاں پر جیل نہیں' پھانسی نہیں' شورش نہیں' غلامی بھی نہیں' صرف محبت ہی محبت ہے' اُسی دنیا میں وہ اپنے عزیز ترین محبوب شری بال مکند جی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ملنے کا مزہ لینے چلی گئیں۔

شری بسنتو کمار وسواس

آپ بنگال کے ندیا ضلع کے باشندہ تھے اور جس وقت شری راس بہاری جی دہرہ دون میں تھے' آپ ان کے پاس ہری داس کے نام سے نوکر بن کر رہتے تھے۔ بعد میں 1912 میں آپ لاہور کی ایک ڈسپنسری میں کمپاؤنڈر ہو گئے۔

اس وقت بھائی بال مکند کے ساتھ مل کر آپ صوبہ پنجاب میں شورش پسند گروپ کو منظم کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب 1912 میں دہلی میں بم دھماکہ ہوا تھا تو آپ لاہور سے کی ایک ہی ڈسپنسری میں کمپاؤنڈر ہو گئے۔

اودھ بہاری کی معاونت سے لاہور لارنس گارڈن کا بم بھی آپ کا ہی رکھا ہوا بتایا جاتا ہے۔ بعد میں آپ دو مزید بم بھی لائے تھے جو دینا ناتھ کے قول کے مطابق بھائی بال مکند کے پاس رکھے گئے تھے۔

دسمبر 1913 میں آپ بنگال چلے گئے اور 1914 میں وہیں سے گرفتار کر کے لاہور لائے گئے۔ عدالت سے پہلے آپ کو تاحیات کالے پانی کی سزا ملی مگر سر اوڈائر کو دہلی میں بم پھینکنے والے کا پتہ نہ لگنے کے سبب بہت غصہ آ رہا تھا اور اس نے آپ کو بھی پھانسی کی سزا دیئے جانے کی اپیل کی۔ اسے اس نے خود تسلیم کیا ہے۔ بھلا پولیس کی اپیل اور اس پر سفارش سر مائیکل

اوڈائر کی اور پھر نہ مانی جاتی ؟ خیر آپ کو بھی بعد میں پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔
آپ کے بارے میں جج نے کہا تھا:

"He looked to me a man of some force of character, with none of the familier marks of weakness in his face"

پھانسی کے وقت آپ کی عمر محض 23 برس تھی۔

شری بھائی بھاگ سنگھ

اچھے گھرانے میں پیدا ہونے والے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ملک وقوم کی خدمت میں پوری زندگی بسر کرنے والے تو دنیا میں بہت ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے مگر گاؤں کے ایک عام گھرانے میں پیدا ہونے والے اور معمولی تعلیم حاصل کر کے بھی جنہوں نے اپنے کارناموں سے انسانی سماج کو حیرت زدہ کر دیا' ایسی مثالیں تاریخ میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔

ہمارے ہیرو شرل بھائی بھاگ سنگھ جی بھی ایسے ہی انگلی پر شمار کئے جانے والے رتنوں میں سے ایک ہیں۔ آپ کی ولادت لاہور ضلع میں بھکی ونڈ نامی گاؤں میں سردار نارائن سنگھ جی کے گھر 1878 میں ہوئی۔ آپ کی والدہ کا نام مان کنوری تھا۔ 20 سال کی عمر تک آپ گھر پر رہ کر کھیتی باڑی کا کام دیکھتے رہے اسی درمیان گرمکھی کا بھی تھوڑا بہت علم حاصل کر لیا۔ بس تعلیم کے ناطے اتنے کو بہت سب کچھ سمجھنا چاہئے۔ آپ بچپن سے ہی فوجی مزاج کے تھے۔ خیر بیس سال کے ہونے پر فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ آزاد طبیعت کے تو مشہور تھے ہی پھر بھلا کسی کی ڈانٹ ڈپٹ کیوں برداشت کرنے لگے؟ فوج میں آج کسی سے جھگڑا ہو رہا ہے تو کل کسی کو ڈانٹ پلائی جا رہی ہے۔ سبھی لوگ اور خاص طور سے افسر لوگ آپ سے بہت تنگ رہتے تھے۔ انہیں سب باتوں سے پانچ سال تک نوکری کرنے پر بھی آپ ایک معمولی سپاہی سے آگے نہ بڑھ سکے۔

بعد میں فوج کی نوکری چھوڑ کر گھر آئے بغیر ہی آپ چین چلے گئے اور ہانگ کانگ پولیس میں بھرتی ہو گئے۔ ڈھائی سال کام کرنے کے بعد وہاں بھی جمعدار سے ان بن ہو گئی اور آپ شنگھائی آ گئے۔ یہاں پر ڈھائی سال تک میونسپل پولیس میں کام کرنے کے بعد روزانہ بہت سے ہندوستانیوں کو امریکہ جاتے دیکھ کر آپ بھی کناڈا چلے گئے۔ بس یہیں سے آپ کی عام زندگی شروع ہوتی ہے۔

خیالات و مزاج کی ہم آہنگی کے بعد دل ملنے میں دیر نہیں لگتی۔ خیر کناڈا پہنچے۔ بھائی بلونت سنگھ' بھائی سندر سنگھ بھائی ہرنام سنگھ اور ارجن سنگھ سے آپ کی بہت گہری دوستی ہو گئی۔ اس وقت کناڈا میں رہنے والے ہندوستانیوں پر وہاں کے رہنے والے بہت ظلم کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ بڑی جدوجہد کے بعد بھی انہیں کہیں کوئی جگہ نہیں ملتی تھی۔ ان میں آپس میں بھی اختلاف تھا۔ سبھی اپنے ہی بارے میں سوچتے تھے۔ ایسے مشکل وقت میں مذکورہ بالا دوستوں نے آگے قدم بڑھایا۔ ابتدا کی دیر تھی' کام شروع ہو گیا اور جہاں ایک بھی گرودوارہ نہیں تھا' وہاں سبھی مقامات پر گرودوارے قائم ہو گئے۔ سبھی منتشر قوتیں یکجا ہو کر منظم طور پر کام کرنے لگیں۔ کناڈا میں ہندوستانیوں کو ایک ہندوستانی کی طرح زندگی بسر کرنے کی آزادی نہیں تھی۔ وہ اپنے عزیزوں کے مردہ جسم کو جلا نہیں سکتے' انہیں اس کی قبر بنانی پڑتی تھی۔ خیر' ان لوگوں نے کچھ زمین خریدی اور اس میں

شمشان بنایا۔ اس شمشان میں پہلا سنسکار بھائی ارجن سنگھ کا ہوا۔

بھلا امیگریشن والے ہندوستانیوں کی اس ترقی کو کب دیکھ سکتے تھے؟ خیر ایک طرف تو کناڈا کے ہندوستانیوں کو ہنڈوراس بھیجنے کی کوشش ہونے لگی اور دوسری جانب ایک نیا قانون وضع کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے کوئی بھی نیا ہندوستانی کناڈا میں نہیں اتر سکتا تھا۔ اپنے اپنے دیگر رفقاء کی مدد سے اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ دو آدمی ہنڈوراس کی حالت دیکھنے کے لئے بھیجے گئے۔ ان لوگوں نے آ کر رپورٹ دی کہ ہنڈوراس جہنم سے بھی زیادہ بیکار جگہ ہے۔ اپنی کوششوں میں ناکامی دیکھ کر امیگریشن والوں کو ان پر بہت غصہ آیا۔ ادھر نئے قانون کی مخالفت کرنے کا ارادہ ہوا کہ جو لوگ کناڈا میں پہلے سے رہ رہے تھے' وہ ہندوستان جا کر اپنے خاندان وغیرہ کو لے کر دوبارہ لوٹ سکتے ہیں مگر ارادہ کو عملی شکل بھی تو دینی تھی۔ بالآخر ہمارے ہیرو اپنے دیگر دو ساتھیوں کے ہمراہ ہندوستان کی جانب چل پڑے۔

ہندوستان تو آ گئے مگر اب خاندان کو کہاں سے لے جائیں۔ بیوی واصل حق ہو چکی تھیں اور بال بچے بھی تھے نہیں' آخر کار آپ نے پشاور کی ایک خاتون سے دوبارہ شادی کی اور اسے لے کر واپس لوٹ گئے۔ ہانگ کانگ آ کر معلوم ہوا کہ کناڈا جانے کے لئے ٹکٹ نہیں مل سکے گا۔ بہت ساری کوششوں کے بعد بھی آپ کو کافی دنوں تک وہیں رہنا پڑا اور وہیں پر آپ کے فرزند شری جوگیندر سنگھ جی پیدا ہوئے۔ آخر بہت کوششوں کے بعد وینکوور پہنچنے پر کافی دقتوں کے بعد آپ کو جہاز سے اترنے دیا گیا۔

ابھی تک آپ زیادہ تر مذہبی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے مگر اس سفر کے تجربہ نے آپ کے خیالات میں ایک نئی تبدیلی پیدا کر دی۔ آپ کو یہ یقین ہو گیا کہ غلاموں کے لئے دنیا کے کسی بھی کونے میں کوئی جگہ نہیں ہے اور جب تک ہندوستان کی غلامی ختم نہیں ہوتی' ہمیں اسی طرح قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اتفاق سے اسی دوران امریکہ سے غدر اخبار نکلنا شروع ہوا۔ اس وقت بھاگ سنگھ جی نے دل کھول کر روپے پیسے سے اس اخبار کی مدد کی۔ اتنا ہی نہیں' جوائنٹ اسٹیٹ سے نکلنے پر بھی غدر اخبار اور اس کی پالیسی کی تشہیر زیادہ تر کناڈا میں ہی ہوئی تھی۔

ابھی امیگریشن والوں میں لڑائی ہو رہی تھی کہ کاما گاٹا مارو جہاز کناڈا آ پہنچا۔ اس جہاز والوں پر کیا کیا مظالم ڈھائے گئے؟ کن کن مصائب کا سامنا ان کو کرنا پڑا؟ اور ان بہادروں کو ستانے کے لئے کتنے قابل نفریں اقدامات کئے گئے' اس کا ذکر تو یہاں ممکن نہیں مگر جہاں تک ہمارے ہیرو سے اس کا تعلق ہے' اس کا ذکر یہاں کئے دیتا ہوں۔ امیگریشن محکمہ والوں نے جب اس جہاز کو کہیں پر بھی ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی تو شری بھاگ سنگھ جی کے انتظام سے ایک نیا ساحل خریدا گیا اور وہیں مذکورہ جہاز کو ٹھہرایا گیا۔ اسی دوران ایک دوسری چال چلی گئی۔ جہاز کے مالک کو اپنی طرف کر کے اس بات پر راضی کر لیا گیا کہ وہ جہاز کا کرایہ قسط وار نہ لے کر یکمشت لے لیں۔ جہاز والے بڑی مصیبت میں پھنس گئے۔ ان کے پاس اتنا روپیہ تو تھا نہیں۔ ابھی کچھ سامان بھی فروخت نہیں ہو پایا تھا۔ آخر کریں تو کیا کریں؟ مگر بھاگا سنگھ جی اور ان کے رفقاء نے مل کر قسط کا روپیہ ادا کیا اور جہاز کا چارٹر اپنے نام لکھوا لیا۔

اس سب کا انتظام کر لینے کے بعد ساؤتھ برٹش کولمبیا میں اپنے کسی ساتھی سے اسی بات پر صلاح مشورہ کرنے گئے تھے کہ وہیں پر ہرنام سنگھ اور بلونت سنگھ جی کے ساتھ آپ گرفتار کر لئے گئے مگر بعد میں آپ کو اور بلونت سنگھ جی کو چھوڑ دیا گیا۔ اس وقت جہاز واپس جانے کے لئے تیار تھا بہت سے لوگوں کے پاس کھانے تک کو روپیہ نہیں رہ گیا تھا' اس لئے آپ نے آتے ہی ان لوگوں کی مدد وغیرہ کا پورا انتظام کر دیا۔

جہاز کی مدد کرنے اور آزادی کا پرچار کرنے کے سبب آپ امیگریشن کی آنکھوں میں بری طرح کھٹکنے لگے۔ جوش میں آکر کئی بار ان لوگوں نے کہہ بھی ڈالا کہ اسے گولی سے مروا کر ہی چھوڑیں گے۔ اس وقت آپ نے اس بات کو ہنس کر ٹال دیا اور لوگوں نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ انہوں نے سوچا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، ایسا کرنے کے لئے کوئی خاص حوصلہ مند شخص چاہئے۔

ایک دن کی بات ہے کہ آپ کسی سکھ کی آخری رسومات کرا کے آئے، گرودوارہ میں دیوان شروع ہوا اور آپ گروگرنتھ صاحب کا درس دینے لگے۔ سبھی کام خاموشی کے ساتھ ختم ہوگیا اور جب آپ 'ارداس' کے بعد ماتھا ٹیکنے کے لئے جھکے تو پیچھے بیٹھے ہوئے بیلا سنگھ نے پستول چلایا۔ گولی پیٹھ کو پار کرتی ہوئی پھیپھڑوں میں جا کر رکی۔ حملہ آور کو پکڑنے کی ناکام کوشش میں بھائی وتن سنگھ بھی مارے گئے۔ ان کی زندگی کہیں اور دی جا رہی ہے۔

بھاگ سنگھ جی کو اسپتال لے جایا گیا۔ آپریشن ہونے پر بھی آپ مکمل طور پر ہوش میں رہے اور مسلسل لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ جس وقت آپ کا لڑکا آپ کے سامنے آیا تو آپ نے کہا۔ ''یہ لڑکا میرا نہیں ہے بلکہ قوم کا ہے، اسے دربار میں لے جاؤ۔ میرے پاس کیوں لائے ہو؟''۔ اس وقت بہت سارے لوگ آپ کی عیادت کے لئے اسپتال میں موجود تھے۔ آخر میں یہ کہتے ہوئے کہ ''میری تو خواہش تھی کہ آزادی کی لڑائی میں آمنے سامنے دو چار ہاتھ کر کے جان دیتا مگر قسمت میں بستر پر پڑے پڑے ہی مرنا لکھا تھا۔ خیر، خدا کی یہی مرضی تھی''۔ وہ اس جہانی فانی سے کوچ کر گئے۔ موت کے وقت آپ کی عمر 44 برس کی تھی۔

آخر میں حملہ آور کو عدالت نے یہ کہنے کے بعد بری کر دیا کہ ''میں نے تو سب کچھ امیگریشن محکمہ کے صدر کے کہنے پر کیا۔ میں سرکار کا ایک وفادار ملازم ہوں اور اگر مجھے اس وقت گرفتار نہ کیا جاتا تو میں لڑائی پر جا کر اپنی وفاداری دکھاتا'' وغیرہ۔ ہائے رے غلامی۔

—سُتور

شری بھائی وطن سنگھ

وہ حقیقت میں کیا تھے، اب بات کو لوگوں نے ان کی موت سے قبل کبھی بھی نہیں سمجھا۔ ان کی عام سی زندگی تھی اور انہیں کبھی بھی لیڈر کہلانے کی خوش قسمتی نصیب نہیں ہوئی۔ مگر پھر بھی ان کا دل حب الوطنی سے خالی نہیں تھا۔ وہ محض مرنا جانتے تھے اور وہ بھی ایک سچے بہادر کی طرح۔

عہد طفلی کے بارے میں محض اتنا ہی معلوم ہے کہ آپ پٹیالہ اسٹیٹ کے 'کمبڑ وال' نامی گاؤں میں پیدا ہوئے اور والد کا نام بھائی بھکیل سنگھ جی تھا۔ آپ میں ایک خاص بات یہ تھی کہ انہیں بھینس پالنے کا بڑا شوق تھا اور اسی وجہ سے کناڈا میں بھی لوگ انہیں وطن سنگھ مائیاں والا یعنی بھینس والا کہا کرتے تھے۔

بائیس تیئس سال کی عمر تک گھر پر ہی رہنے کے بعد آپ فوج میں بھرتی ہوگئے۔ اس وقت تک آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ برما میں ہی گزرا تھا۔ پھر پانچ برس بعد ملازمت ترک کر کے گھر واپس چلے گئے اور دس برس تک گھر پر ہی رہ کر کھیتی وغیرہ کا کام کرتے رہے۔ لیکن انہیں تو ہندوستانیوں کے سامنے ایک مثال پیش کرنی تھی، لہٰذا اس طرح گھر پر کب تک بیٹھے رہ سکتے

تھے۔ گھر کے کاموں سے جی اکتانے لگا اور آخر میں آپ ہانگ کانگ کی طرف چل دیئے۔ یہاں پر پانچ برس تک جیل پولس میں گارڈ کا کام کرنے کے بعد کناڈا پہنچے۔

وینکوور تو پہنچ گئے مگر اب جائیں تو کس کے پاس۔ ایک تو اجنبی ملک اور کسی سے بھی جان پہچان نہیں۔ تلاش بسیار کے بعد گرودوارے کا پتہ چلا اور آپ وہیں جا کر ٹھہر گئے۔ اس وقت کسی کو تو کیا' وطن سنگھ جی خود بھی اس بات کو نہیں جانتے تھے کہ ایک دن اسی گرودوارے میں انسانی سماج کو شجاعت کا درس دے کر مجھے اپنی یہ زندگی ختم کرنی پڑے گی۔ خیر کچھ دنوں کے قیام کے بعد آپ مڑھی پورٹ کے لکڑی کے کارخانہ میں ملازم ہو گئے۔ ان دنوں بھاگ سنگھ جی اسی کارخانے میں کام کرتے تھے۔

آزادی کی لہر ابھی زوروں پر نہیں چل رہی تھی' اس لئے سکھ لوگوں کی توجہ آپس میں علم کے فروغ کی طرف زیادہ تھی۔ ہمارے ہیرو بھی جب کبھی چھٹی پاتے' یہی باتیں موضوع بحث ہوتیں۔

1911 میں وطن سنگھ جی دوبارہ وینکوور آ گئے۔ رائٹ پورٹ پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ ست سنگ کا بہتر موقع ہاتھ آتے دیکھ کر روزانہ گرودوارہ جانا شروع کر دیا۔ ایک برس تک آپ گرودوارہ کمیٹی کے ممبر رہے۔ آپ کے کام کرنے کی استعداد سے لوگ آپ کو بہت ماننے لگے تھے۔

بعد ازاں وہی پرانی کہانی ہے۔ وہی امیگریشن والوں سے لڑائی وہی مظالم' وہی تحریکات اور وہی بھائی بھاگ سنگھ اور بلونت سنگھ کے قتل کی سازش۔ اس وقت لوگ سینکڑوں کی تعداد میں ہندوستان واپس آ رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سازش اس لئے رچی گئی تھی کہ سکھوں کا کوئی بھی لیڈر ہندوستان واپس آ کر یہاں بھی اسی طرح کے خیالات کو فروغ نہ دے سکے۔ خیر' جو ہو' اس دن جب دیوان میں بیلا سنگھ نے بھائی بھاگ سنگھ جی پر گولی چلائی تو وطن سنگھ جی بھی ان کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ بھاگ سنگھ کو زخمی ہوتے دیکھ کر آپ نے گرج دار آواز میں حملہ آور کو للکارا۔ بس اب کیا تھا' دوسری گولی وطن سنگھ کی طرف نہ جا کر ہمارے ہیرو کے سینے میں سما گئی۔ بہادر کا ولولہ اور جوش چوٹ کھا کر ہی بیدار ہوتا ہے۔ آپ شیر کی طرح گرجتے ہوئے اس کی طرف دوڑے۔ لو دوسری گولی بھی سینے کے بیچ میں ہی رہ گئی۔ مگر اس سے کیا؟ وطن سنگھ بڑھتے ہی چلے گئے اور آخر میں سات گولیاں لگنے کے بعد آپ نے حملہ آور کی گردن پکڑ ہی لی' مگر زیادہ طاقت نہ ہونے کی وجہ سے بیلا سنگھ چھڑا کر بھاگ گیا اور آپ ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سو گئے۔ جس گرودوارہ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے خاموشی کی حکومت تھا' وہی اب میدان جنگ بن گیا۔ چہار جانب آہ و بکا مچ گئی۔ ابھی ایک بھائی کی جدائی کا غم مندمل بھی نہیں ہوا تھا کہ دو انمول رتن مزید چھین لئے گئے۔

بھائی وطن سنگھ جی اب نہیں ہیں۔ مگر پچاس برس کی عمر میں انہوں نے ایک سچے بہادر کی طرح جان دے کر جو مثال تاریخ کے صفحات میں رقم کی' وہ کبھی نہیں مٹے گی۔

- چکریش

شری میوہ سنگھ

مصائب کے آنگن میں کھیل کر بھی جن لوگوں نے ہمیشہ پیچھے رہ کر کام کرنے کی کوشش کی ہے' اس لئے نہیں کہ وہ ڈرتے تھے مگر اس لئے کہ آگے بڑھ کر شاباشی لینے کی خواہش ان میں کبھی نہیں پیدا ہوئی۔ ایسے لوگوں کے عہد طفولیت میں ہی جیوتشی یہ بتا دے کہ یہ کسی دن پگلے شورشی بن کر اپنا سب کچھ لٹا دیں گے' کسی دن یہ اونمت ہو کر دھری مرتیو پو جا ناچتے ناچتے

پھانسی کے تختہ پر جا کھڑے ہوں گے تو شاید ان کی زندگی کے کوائف مکمل طور پر لکھے جا سکیں۔ مگر وہ تو دنیا کے نہ جانے کس کونے سے اچانک آ کر انسانی سماج کے قدموں میں یکا یک اپنا سب کچھ نچھاور کر کے چلے گئے۔ اس دن تعجب سے لوگوں نے ان کی جانب دیکھا۔ بھکتی اور عقیدت کے پھول بھی چڑھائے۔ لیکن پھر ان کی باغیانہ زندگی کے دو چار واقعات کو مجتمع کر کے شائع کرنے کی پرواکسی نے بھی نہیں کی۔ آج اگر ایسے اصول پسند کی سوانح عمری لکھنے بیٹھیں تو لکھ ہی کیا سکتے ہیں۔

نا معلوم شورش پسند ہمارے شری میوہ سنگھ کی ولادت امرت سر ضلع کے ایک عام گاؤں 'لوپوکے' میں ہوئی۔ بس' خاندان اور بچپن کا اتنا ہی علم دستیاب ہے۔ وہ عام کسان تھے اور کھیتی باڑی کرتے تھے۔ کناڈا وغیرہ کی طرف لوگوں کو آئے دن جاتے دیکھ کر آپ بھی وہیں چلے گئے۔ آپ ایشور بھکتی کی طرف خصوصی طور سے مائل تھے۔

کناڈا میں ہندوستانیوں پر کیے گئے مظالم' ناانصافی اور ناروا سلوک سے آپ کے دل پر خاص چوٹ لگی۔ کاما گاٹا مارو کے بارے میں جب شری بھاگ سنگھ جی اور بلونت سنگھ جی کسی دیگر معاونین سے کچھ صلاح مشورہ کرنے کے لئے دور جنوب کی جانب نکل گئے اور امیگریشن محکمہ والوں نے انہیں پکڑ کر ''سماش'' جیل میں بند کر دیا تو آپ بھی ان کے ساتھ تھے۔ مگر آپ کے محض اتنا کہنے پر ہی کہ ادھر یوں ہی چلے آئے تھے' چھوڑ دیا گیا۔ بعد میں آپ گرونانک مائننگ کمپنی کے حصہ دار بھی بن گئے۔

دیوان ہو رہا تھا۔ شری بھاگ سنگھ جی گرو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کر رہے تھے اور شری وطن سنگھ جی انہیں کے پاس بیٹھے تھے۔ یکا یک سبھا کا سکوت توڑتے ہوئے ایک پستول کی آواز آئی اور دیکھتے دیکھتے شری بھاگا سنگھ جی اور شری وطن سنگھ جی ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ باغی بیلاس سنگھ کے اس نفرت آمیز کام کو دیکھ کر دل درد سے کراہ ہوا اٹھا۔ انہیں گرو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتے وقت گولی مار دیا جانا ناقابل برداشت تھا۔ مقدمہ چلنے پر قاتل نے بیان دیا کہ اس امیگریشن محکمہ کے صدر نے ہی مجھے ایسا کرنے کے لئے کہا تھا۔ غلام ہندوستانی کی بدحالی کی خون سے رنگی ہوئی تصویر دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کیوں کہ وہ غلام تھے' اس لئے ان سے ہر جگہ نفرت کی جاتی تھی اور کیوں کہ وہ اجنبی غلام تھے' اس لئے ان کے لیڈروں کو بلا وجہ قتل کر دیا جاتا تھا۔ ان سب باتوں سے ان کے دل پر ایک گہری چوٹ لگی۔ انہوں نے اپنے اندورنی درد کو چھپانے کے لئے ایشور بھجن کی طرف خصوصی توجہ دینی شروع کی۔ مگر اس پر بھی آپ نے دو ایک بار بہت ہی دردناک لہجے میں کہا تھا کہ ''یہ تحقیر اور غلامی کی قدم قدم پر ٹھکرائی جانے والی زندگی اب ناقابل برداشت ہے۔'' اس وقت ان کے ان جملوں پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔

وہ شورش زدگی کے عروج کے دن تھے۔ لوگوں نے رائفل اور ریوالور چلانے کی تربیت لینی شروع کر دی تھی۔ کہتے ہیں کہ ہمارے ہیرو نے بھی ایک سو روپے کی گولیاں پھونک ڈالی تھیں۔ ان کی اس بات پر بھی کسی نے کچھ خاص توجہ نہیں دی۔ ایک دن جا کر اپنی تصویر بنوالی۔ یہی ان کا اپنے گھر والوں کے لئے آخری انمول تحفہ تھا۔

اس دن مقدمہ کی پیشی تھی۔ امیگریشن محکمہ کے چیف آفیسر ہاپکنسن (Hopkinson) پیش ہونے آئے تھے۔ سبھی کام اطمینان بخش طریقہ سے ہو رہا تھا کہ اچانک گولی چلی اور قبل اس سے کہ فائرنگ کرنے والے کی طرف کوئی توجہ دیتا' ہاپکنسن ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ نشانہ اچوک تھا۔ وہ 100 فی صد کامیاب ہو گیا۔ جج حضرات کرسیوں کے نیچے جا چھپے اور وکلا صاحبان گرتے پڑتے باہر کی جانب بھاگ گئے۔ ہاپکنسن کو گرتے ہوئے دیکھ کر آپ نے اپنا ریوالور جج کی میز پر رکھ کر بلند آواز میں کہا۔ ''میں بھاگنا نہیں چاہتا۔ آپ لوگ خاموش ہو جائیے۔ میں پاگل نہیں ہوں اور کسی پر گولی نہیں چلاؤں گا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا''۔ اس کے بعد پولیس والوں کو بلا کر خاموشی سے خود سپردگی کر دی۔ ہنگامہ کے

دوران وہ چاہتے تو فرار ہو سکتے تھے مگر اس بہادر شورش پسند کی تمنا مزید جینے کی نہیں تھی۔ تذلیل غلامی اور تحقیر ہندوستان میں ابھی تک جانوں کا کوئی جز و خاص ہے یہی وہ اپنی قربانی سے ثابت کرنا چاہتے تھے۔ آج بھی وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکتے ہیں آج بھی وہ قومی تحقیر کا انتقام لے سکتے ہیں یہی ثابت کرنے کے لئے انہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا۔

گرفتاری کے بعد بیان لیتے وقت جب آپ سے ہاپکنسن کو مارنے کی وجوہات پوچھی گئیں تو آپ نے سوال کیا۔ ''کیا ہاپکنسن سچ مچ مر گیا؟''۔ جواب میں ''ہاں'' سن کر آپ نے بہت زور سے قہقہہ لگایا اور کہا ''آج میں حقیقی طور پر لطف اندوز ہو رہا ہوں''۔ پوچھنے پر آپ نے کہا۔ ''ہاپکنسن کو جان بوجھ کر اور دانستہ طور پر قتل کیا ہے۔ یہ انتقام ہے ملک اور مذہبی حقارت کا یہ بدلہ ہے ہمارے دو انمول رتنوں کی ہلاکت کا۔ مسٹر ریڈ (ہاپکنسن کے دوسرے ساتھی) وہاں موجود نہ ہونے کے سبب بچ گیا''۔

ہاپکنسن کی بیوی نے اپنے شوہر کی ہلاکت کی خبر سن کر کہا تھا کہ میں اس بہادر کا دیدار کرنا چاہتی ہوں جس نے میرے شوہر کو بھری کچہری میں گولی ماری ہے اور اس شجاعانہ انداز میں خود سپردگی کی ہے۔

اس واقعہ کے بعد کناڈا میں ہندوستانیوں کو کسی نے تحقیر آمیز لہجہ میں خطاب نہیں کیا۔

مقدمہ چلنے کے پر آپ نے بہادری کے ساتھ اقبال جرم کیا۔ سزائے موت سنائے جانے پر تو آپ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔ لطف کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پھانسی کے دن تک آپ کا وزن تیرہ پاؤنڈ بڑھ گیا تھا۔

پھانسی کے دن جیل کے باہر محبت وطن کے آخری دیدار کے لئے کناڈا میں موجود ہندوستانیوں کا انسانی سمندر امڈ پڑا۔ اس سمندر میں گورے لوگوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ آئین کے مطابق مرنے سے قبل پادری یا پروہت کا ملنا ضروری تھا۔ جو بھی ہو بھائی مت سنگھ جی اندر گئے۔ ایشور بھجن کے بعد آپ نے اپنا آخری پیغام دیا۔ الفاظ عام ہیں مگر اعلیٰ جذبات اور حب الوطنی سے پر ہیں۔ آپ نے کہا:

''باہر جا کر سبھی ہندوستانیوں سے اور خاص کر ملکی کارکنوں سے کہہ دینا کہ اس غلامی اور ماتحتی کے عذاب سے محفوظ رہنے کے لئے شدید جدوجہد کریں۔ مگر کام تبھی ہو سکے گا جب ان میں علاقہ واریت اور مذہبی تعصب پسندی بالکل نہ ہو۔ نہ ماجھے مالوے اور دوآبے* کے مسائل اٹھیں اور نہ ہندو مسلم اور سکھ مختلف مذاہب کا سوال اٹھا۔ اور جو مجھے پیار کرنے والے رشتہ دار یا ساتھی ہیں ان سے تو میری خصوصی اپیل ہے''۔

بات کرتے کرتے مت سنگھ کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ اس پر آپ بہت ناراض ہوئے۔ آپ نے کہا۔ اچھا میرا حوصلہ بڑھانے آئے تھے آپ ہی رونے لگے۔ ذرا سوچئے تو سہی پھر ہماری کیا حالت ہونی چاہئے۔ اور ایسی موت تو کہیں قسمت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس پر مسرت اور رغبت نہ ظاہر کر کے اس طرح افسوس کرنا تو بالکل نامناسب ہے۔

آخر میں وہی گھڑی آ گئی۔ وہ! دیکھو تو وہ پاگل کتنی رغبت کے ساتھ پھانسی کے تختہ کی جانب بڑھ رہا ہے۔ خوف اور فکر تو اس کے پاس سے ہو کر نہیں گزری۔ آخر یہ لفظ گاتے ہوئے ''ہری لیش رے من! گائے لے جو سگوی ہے تیرا'' آپ پھانسی کے تختہ پر جا کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد کیا ہوا قارئین خود ہی سمجھ لیں۔ گرو گوبند سنگھ کا معتقد سر دھڑ تلی محبت کی گلی میں محبت

---

*دوآب ستلج اور ویاس کا درمیانی علاقہ ہے۔ مالوا ستلج کے پہلے کا (فیروز پور وغیرہ) صوبہ ہے۔ ماجھا راوی اور ویاس کے درمیان کا (لاہور اور امرتسر) حصہ ہے۔ سکھوں میں ان علاقوں کا تنازعہ بہت دنوں سے چلا آ رہا ہے۔

کھیلنے آیا تھا' سر دے گیا۔

لاش کے آخری دیدار کے لئے انسانی ہجوم پہلے سے ہی باہر منتظر تھا۔ آخر کار نہایت شان وشوکت کے ساتھ جلوس نکالا گیا۔ آج اندر دیوتا بھی اپنے پر قابو نہ رکھ سکے' خوب بارش ہونے لگی۔ مگر جلوس کم نہ ہوا۔ یہاں تک کہ انگریز خواتین بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑ سکیں۔ آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد ایک ہفتہ تک گردوارہ میں اتسو منایا گیا۔

-کوود

شری کاشی رام

آپ انہیں نامعلوم سات رشیوں میں سے ایک ہیں جنہیں انصاف پسند سرکار نے فیروز پور ضلع میں ایک گاؤں کے پاس ہلاک کئے جانے والے تھانیدار کے قتل کے جرم میں ہمیشہ کے لئے ہندوستان کی گود سے اٹھالیا تھا اور آخر میں حقیقی مجرم مل جانے پر محض اتنا کہہ کر "جو سات انسان پہلے پھانسی پر لٹکائے گئے تھے' وہ حقیقی مجرم نہیں تھے اور اصل مجرم تو یہ ہے' جسے آپ پھانسی دے رہے ہیں' اپنی ذمہ داری سے پلہ جھاڑ لیا۔ خیر۔

پنڈت کاشی رام جی کی پیدائش امبالہ ضلع کے 'بڑی منڈولی' نامی گاؤں میں بھادو سدی دوادشی' سنوت 1938 میں شری پنڈت گنگارام جی کے گھر ہوئی۔ گھر والوں نے دس سال کی ہی عمر میں آپ کی شادی کر دی مگر آزادی کی شراب پینے والوں کو بیوی بچوں کی محبت گھر پر نہیں روک سکتی۔ خیر' پٹیالہ سے انٹرینس پاس کرنے کے بعد آپ گھر سے اس طرح باہر ہوئے کہ پھر 1914 میں چند گھنٹوں کے لئے ہی اپنے گاؤں میں واپس آئے۔ اسی غم میں آپ کی بیوی کی وفات بھی ہو گئی۔

تعلیم ختم کر کے کچھ دن تار کا کام سیکھنے کے بعد آپ امبالہ ضلع دفتر میں تیس روپے ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ بعد میں کچھ دن دہلی میں 60 روپے ماہانہ پر نوکری کر کے آپ ہانگ کانگ چلے گئے اور آخر میں امریکہ جا کر ایک بارود کے کارخانہ میں 200 روپے) ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ مگر بعد میں اسے بھی غلامی کہہ کر چھوڑ دیا اور ایک ٹاپو کی سونے کی کان کا ٹھیکہ لے لیا۔

(آپ کو کاشی رام کے ساتھ ہی پھانسی ہوئی۔ آپ انہیں سات میں سے ایک ہیں جنہیں بعد میں جج نے خود بے گناہ تسلیم کیا تھا۔ تلاش بسیار کے بعد بھی آپ کے حالات زندگی دستیاب نہیں تھے)

اسی درمیان امریکہ سے ہندوستان واپس آنے کی لہر چل پڑی اور آپ بھی ایک جتھے کے ساتھ 25 یا 26 نومبر 1914 میں ہندوستان واپس آ گئے۔ ملک واپسی کے بعد ایک بار پھر اسی جگہ کو دیکھنے کی آرزو سے جہاں کی دھول میں کھیل کر آپ کا بچپن بیتا تھا' وہ اپنے گاؤں پہنچے۔ یہ خبر بجلی کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی اور آپ سے ملنے کے لئے ایک اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی۔ آپ نے موقع دیکھ کر وہیں غدر سے متعلق ایک تقریر کر ڈالی۔

چند گھنٹے مکان میں ٹھہرنے کے بعد یہ کہہ کر کہ لاہور نیشنل بنک میں میرے تیس ہزار روپے جمع ہیں' انہیں لینے جا رہا ہوں' آپ پھر گھر سے باہر ہو گئے۔ گاؤں والوں کے لئے آپ کا یہ آخری دیدار تھا۔ وہ دوبارہ وہاں لوٹ کر نہ آئے۔

لاہور آنے پر کچھ ساتھیوں سمیت فیروز پور بھیجے گئے۔ وہاں پولیس سے تصادم ہو گیا۔ گولی چلی اور تھانیدار مارا گیا۔ بعد میں جنگل میں تیرہ ساتھیوں میں سے سات گرفتار ہو گئے۔ کچھ مارے گئے اور بقیہ فرار ہو گئے۔ ان سات میں سے ایک

ہمارے ہیرو بھی تھے۔

پانچ ماہ بعد فیروز پور عدالتی ڈرامہ کے بعد آپ ساتوں افراد کو جدا کر دیا گیا۔ مگر بعد میں یہ کہہ کر کہ مشری گاؤں کے پاس ہونے والے ڈاکے قتل وغیرہ سبھی باتوں کی ذمہ داری انہیں لوگوں پر ہے۔ سب کو پھانسی دے دی گئی۔

جن کے لئے انہوں نے اپنا سب کوڑی کی طرح لٹا دیا اور جن کے دکھوں سے نڈھال ہو کر روتی ہوئی ضعیف ماں کی اکلوتی گود کو سونی کر کے انہوں نے سنیاسی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ انہیں گاؤں والوں نے ان کی پھانسی کے بعد یہ کہہ کر خوشی منائی کہ سرکار بہادر نے ڈاکوؤں کو پھانسی پر چڑھا کر ہم پر بہت احسان کیا ہے۔ مگر شورش پسندوں کی زندگی میں یہ تو ایک معمولی سی بات ہے۔ ان کا تو مقصد ہی Unwept, unhonoured and unsung جانا ہے۔ دنیا اسے کس نام سے پکارتی ہے؟ انہیں اس پر غور کرنے کا تو موقع ہی نہیں ملتا اور نہ کبھی وہ اس کی پروا کرتے ہیں۔ وہ دنیا کے سامنے واہ واہی لینے کے خیال سے کبھی اس راستہ پر نہیں آتے۔ وہ تو محض اپنے آپ کو ہی مطمئن دیکھنا چاہتے ہیں۔

پنڈت جی لاہور سنٹرل جیل میں بند تھے۔ والد نے آ کر آہ و زاری شروع کر دی۔ "بیٹا کیا تمہیں اس بڑھاپے پر ذرا بھی ترس نہیں آتا۔ تمہاری ماں تمہارے غم میں ابھی سے پاگل ہو گئی ہے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ بڑے ہو کر تم کچھ سکھ پہنچاؤ گے مگر نہیں جانتا تھا کہ تم اتنے بے درد ہو۔ تم نے ہمارا ذرا بھی خیال نہیں کیا۔ اب ہم باقی زندگی کس کے سہارے بسر کریں"۔

عبادت گزار نے ایک طویل سانس لی اور کہا۔ "پوجیہ ور! اس بے کار کے مایا جال سے کیا ہوگا؟ اس دنیا میں نہ کوئی کا بیٹا ہے اور نہ کوئی کسی کا باپ۔ یہ سب محض دلی جذبات ہیں لہٰذا اس کے لئے بیکار اپنے آپ کو رنجیدہ نہ کریں۔ رہی بات کھانے پینے کی تو جس خالق المخلوق نے ہمیں پیدا کیا ہے، اسے ہر وقت ہر جگہ اپنی سبھی مخلوق کا خیال ہے۔ میری عمر کے سبھی ہندوستانیوں کو اپنا ہی بیٹا سمجھ کر صرف اسی پر یقین کریں"۔

بھائی کو آتا ہوا دیکھ کر آپ نے کہا۔ "خبردار! آنکھوں میں آنسو نہ لانا۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے اور اس طرح مرنے پر مجھے وطن پرستوں کے قدموں میں جگہ ملے گی۔ میں اسی کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں"۔

آخر میں گھر والوں نے پھر بھی نہ مانا اور آپ کے لئے اپیل کی مگر اس کے فیصلہ سے قبل ہی آپ کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔

—قیدی

شری گندھا سنگھ

لاہور ضلع کے 'کچر من' نامی گاؤں میں آپ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت لوگ انہیں بھائی بھگت سنگھ کے نام سے پکارتے تھے۔ بعد میں سکھ دھرم اختیار کر لینے کے بعد آپ کا نام رام سنگھ رکھا گیا مگر وہ بھائی گندھا سنگھ کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کمسنی کے عالم میں امریکا روانہ ہو گئے۔ 1914 اور 15 میں امریکا کی غدر پارٹی میں آپ اہم لیڈر تھے اور آخر میں جب پارٹی کی جانب سے ہندوستان میں پرچار کا فیصلہ ہوا تو سب سے پہلے آپ ایک اور دوست کو ساتھ لے کر ہندوستان کی جانب چل پڑے۔ آپ کے ہندوستان آنے کے کچھ ہی دنوں بعد بج بج گھاٹ پر گولی چل گئی اور بہار سے کلکتہ کا ٹکٹ لے کر آنے والے مسافروں پر سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ امریکہ سے ہندوستان آنے والے مسافروں کو اپنے ہی ملک میں اترنا مشکل ہی نہیں

بلکہ ناممکن سا ہو گیا۔ آخر کار حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے وہ دوست کے ساتھ فوراً ہانگ کانگ آ گئے اور وہاں سے جو ہندوستانی کلکتہ کے ٹکٹ پر ہندوستان واپسی کی تیاری کر رہے تھے، ان کے ٹکٹ بدل کر بمبئی اور مدراس کے ٹکٹ لے کر جانے کو مجبور کیا۔ 1914 اور 15 میں پنجاب میں جو تھوڑی بہت شورش کی اسکیم بنائی گئی تھی، وہ انہیں ہمارے ہیرو کے ذریعہ بچائے گئے سکھوں کو لے کر ہی ہوئی تھی۔

ہانگ کانگ سے واپسی کے بعد گندھا سنگھ پوری قوت کے ساتھ ادھر ادھر گھوم کر بغاوت کا پرچار کرنے لگے۔ گرمی کے دنوں میں پورے دن پیدل چلنے کے بعد بھی وہ تھکان محسوس نہیں کرتے تھے۔ ناامیدی تو کبھی ان کو چھو کر بھی نہیں گزری۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے میدان عمل میں آنے سے قبل ہی مرنے کا درس بھی حاصل کر لیا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ امریکا سے روانہ ہوتے وقت کئی راتیں دل کو یہی سمجھانے میں گزاری تھیں کہ وہاں جا کر پھانسی یقینی ہے اور جب بار بار منع کرنے اور سمجھانے پر بھی دل نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا تو یہاں کا ٹکٹ خریدا تھا۔ خیر، مختصراً یہ کہ وہ حوصلہ مندی کی جیتی جاگتی تصویر تھے اور ان میں لامحدود حوصلہ تھا۔

ایک دن کی بات ہے کہ آپ اپنے دس پندرہ ساتھیوں سمیت فیروز پور کے 'مگھل خورد' نامی گاؤں کے نزدیک سڑک پر جا رہے تھے کہ پولیس نے آ گھیرا۔ سرکار بہادر نے انہیں خود اپنے ہاتھوں سے پالا تھا اور شاید اسی بے ہوشی میں تھانیدار صاحب نے آپ کے ایک ساتھی کو گالیاں دیتے ہوئے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ گھر پر ماں باپ نے کبھی ایک بات بھی نہیں کہی تھی۔ خیر، نوجوان اس طمانچہ کو برداشت نہ کر سکا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک آزاد ملک کی فضا میں پرورش پانے والا اور آزادی کے لئے گھر بار پر لات مار کر گلی گلی دیوانوں کی طرح گھومنے والا خوددار بھلا اس بے عزتی کو کیوں برداشت کرتا؟ دیکھتے دیکھتے گندھا سنگھ کی گولی کا نشانہ بن کر تھانیدار صاحب زمین پر گر پڑے۔ ساتھ ہی ایک ذیلدار (تحصیل وصول کرنے والا) بھی ہلاک ہوا۔ اس واقعہ کے بعد آپ کے ساتھیوں کے منتشر ہو جانے کے سبب چند لوگوں کا جنگل میں دوبارہ پولیس کے ساتھ سامنا ہو گیا۔ یہ لوگ تو مرنے کا عہد کر کے ہی گھروں سے باہر نکلے تھے، اس لئے دونوں طرف سے گولی چلنے لگی۔ بالآخر گولی بارود ختم ہو جانے کے بعد کچھ لوگ تو موقع پر ہی مارے گئے اور بقیہ سات افراد پولیس کی گرفت میں آ گئے۔ عدالتی ڈرامہ میں ان ساتوں کو بھی پھانسی کا انعام ملا اور 1914 کے سردی کے دنوں میں وہ ساتوں ساتھی دور بہت دور اپنے والد کے پاس اس ڈرامہ کا حوالہ دینے چلے گئے۔

جس ملک پر دیوانہ ہو کر انہوں نے گلی گلی کی خاک چھانی اور آخر میں اس کی چوکھٹ پر اپنا سب کچھ نچھاور کر کے اپنی جانوں تک کی قربانی دے دی۔ اسی ملک کے باشندوں نے ان کا نام تو کیا یہ بھی نہیں جانا کہ کب کہاں، کیوں اور کس ملک میں اوجھل ہو گئے۔

دن یوں ہی غلامی میں بسر ہوتے ہیں سارے
ایک آدھ تم جیسوں کے لئے بھی نہیں بھرتے

ہمارے ہیرو مسٹر گندھا سنگھ کو ابھی کچھ اور دنیا دیکھنی تھی مگر اس مرتبہ وہ پولیس کے ہاتھ نہ آئے۔ انہوں نے جگہ جگہ جا کر پھر وہی پرچار کا کام شروع کر دیا۔ اس وقت پولیس پر آپ کا اتنا رعب اور دبدبہ تھا کہ گرفتاری کا موقع ملنے کے باوجود بھی وہ آپ پر ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔

لکھنہ کے نزدیک ایک گاؤں میں دیوان ہو رہا تھا۔ وہاں پر عالم نتھا سنگھ نامی ایک ماسٹر سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ یہ

شخص لدھیانہ خالصہ ہائی اسکول میں ملازم تھا۔ یہ گندھا سنگھ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ راستہ میں ایک جگہ بہت سے آدمی کھڑے تھے۔ ان کے درمیان پہنچ کر باغی نتھا سنگھ نے آپ کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ اسی اثنا میں دوسرے لوگ بھی آپ پر ٹوٹ پڑے۔ اچانک اتنے لوگوں کے بیچ پڑ جانے کے سبب آپ کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس وقت ماسٹر نے کہا۔ ''کب اب تم گرفتار ہو گئے؟'' آپ کو گاؤں لایا گیا اور ہاتھ پیچھے باندھ کر ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

جس بہادر کا نام سن کر پنجاب پولیس کانپ اٹھتی تھی' جس کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی کسی میں بھی ہمت نہیں ہوئی اور جس کے خوف سے کتنی مرتبہ پولیس نے اسے ہاتھ میں آتے دیکھ کر بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈالا وہیں بہادر ایک اپنے ہی بھائی کی فریب دہی کے سبب ایک چھوٹی سی کوٹھری میں ہاتھ باندھے ہوئے منہ کے بل دھول میں لوٹ رہا ہے۔ آج وہ اجنبی قیدی ہے آزاد کھلاڑی نہیں۔

رات بھر اسی طرح پڑے رہنے کے بعد دوسرے دن علی الصباح پولیس کپتان نے آکر کوٹھری کا دروازہ کھلوایا۔ اس رات کے بارے میں جیل کے اندر اپنے دیگر ساتھیوں سے گرفتاری کے حالات بیان کرتے وقت آپ نے کہا تھا'' اس رات میرے ہاتھ پاؤں پھول کر جڑواں کی طرح ہو گئے تھے اور اس تکلیف کے سامنے مجھے پھانسی کی سزا بالکل سہل لگتی تھی''۔

آپ پر وہی...... تھانیدار کی ہلاکت...... کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا اور پھانسی کی سزا ملی۔ اس وقت جج نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا کہ ''جو سات آدمی پہلے پھانسی پر چڑھائے گئے تھے' وہ حقیقی مجرم نہیں تھے۔ حقیقی مجرم تو یہ ہے جسے ہم آج پھانسی دے رہے ہیں''۔ قربان جائیے ایسے انصاف پر۔

پھانسی کی سزا سنائے جانے کے بعد تو آپ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس وقت ایک انگریز سارجنٹ نے اپنے ساتھی سے کہا تھا'' آج ہم نے گندھا سنگھ کا دیدار کیا ہے۔ وہ بڑا مسرور ہے اور اس طرح سر ہلا ہلا کر باتیں کر رہا ہے جیسے اس پر نشہ طاری ہو گیا ہے''۔

8 مارچ 1916 کا دن تھا۔ صبح کے پانچ بجے تھے۔ غسل کے لئے پانی لانے والے نے کہا۔'' کیا آپ کو پتہ ہے کہ آج پھانسی دی جائے گی؟'' آپ نے بالکل عام لہجہ میں جواب دیا۔'' پھانسی میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں جس دن امریکہ سے روانہ ہوا تھا' اسی دن پھانسی ہو چکی تھی''۔

پھانسی ہونے کے بعد ایک وارڈار نے کہا تھا۔'' میں نے اپنی تیس سالہ ملازمت میں مجموعی طور پر 125 افراد کو اپنے ہی ہاتھوں سے پھانسی پر چڑھایا۔ ان میں ہر طرح کے انسان شامل تھے مگر جو حوصلہ' ولولہ اور جوش گندھا سنگھ میں دیکھا' وہ دیگر کسی میں نظر نہیں آیا۔ اس وقت ان کی شجاعت سے متاثر ہو کر جیل ملازمین بھی رو پڑے۔

-لکشمن

شری جگت سنگھ

آپ کی پیدائش' رہائش وغیرہ کا تو علم نہیں ہو سکا' ہاں اتنا ضروری معلوم ہوا ہے کہ ایک دن بہت سے سکھوں کو امریکا جاتے دیکھ کر آپ بھی وہیں چلے گئے اور غدر کی بات چھڑنے کے بعد ملک میں جدوجہد آزادی میں دو دو ہاتھ کرنے کے لئے دوبارہ واپس آ گئے۔ وہ جسمانی طور پر انتہائی مضبوط اور طاقتور تھے اور سکھوں میں بھی ان جیسا قوی الجثہ کوئی نہیں تھا۔

اس دن کرپال کی مہربانی سے بغاوت کی ساری کوششیں ناکام ہونے کے بعد ایک بار قسمت آزمائی کے لئے دوبارہ کام شروع کیا گیا۔ راس بہاری کے سبھی ساتھی تو گرفتار ہو چکے تھے۔ پولیس کے مظالم حسب سابق جاری تھے۔ ہر لمحہ آفت کا امکان رہتا تھا۔ بہرحال کسی کام سے جگت سنگھ کو دو دیگر ساتھیوں کے ہمراہ کہیں باہر روانہ کیا گیا۔

تین سکھوں کو تانگے پر جاتے ہوئے دیکھ کر پولیس نے آ گھیرا اور تھانے میں چلنے کے لئے مجبور کرنے لگے۔ وہ بہادر جانتے تھے کہ تھانے میں جانا موت کے منہ جانے کے مترادف ہے اور وہاں جا کر نام ٹھکانہ کا صحیح صحیح پتہ نہ دے سکیں گے لہٰذا آخری بار قسمت آزمائی کا فیصلہ کر کے ان تینوں نے ہی گولی چلانا شروع کیا۔

کچھ دیر تک گولی چلنے کے بعد ان میں سے ایک تو فرار ہو گیا اور ایک پولیس کے ہاتھ آ گیا۔ تیسرے شخص جگت سنگھ جس وقت پولیس کے ہاتھ سے بچ کر ایک پائپ پر پانی پینے کے بعد ہاتھ صاف کر رہے تھے تو عقب سے ان سے بھی زیادہ طاقتور ایک مسلمان نے آ کر ان کے دونوں پیر اس قدر سختی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیا کہ وہ پھر وہاں سے ہل نہ سکے۔

زمین پر گرتے ہی ان کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور لوگوں کے ساتھ مقدمہ چلنے پر ان کو بھی وہی پھانسی کا حکم ہوا اور اس طرح یہ بھی اپنا پارٹ مکمل کر کے باغیوں کے ڈرامہ کے ایک اور منظر کو ختم کر گئے۔

—سریندر

شری بنتا سنگھ دھامیا

ببر اکالی آندولن کے اہم اور دلچسپ واقعات میں شہرت یافتہ 'منڈھیر جنگ' بھی ہے۔ تین ببر اکالی ویر ایک مکان میں گھر گئے اور گھنٹوں تک لاتعداد مسلح سپاہیوں سے جنگ کرتے ہوئے دو نے تو وہیں جان دے دی اور تیسرا شخص اتنے مشکل گھیرے سے بھی صاف بچ کر نکل گیا۔ ان کا نام شری ویریام سنگھ تھا۔ مرنے والے تھے شری بنتا سنگھ دھامیا اور شری جوالا سنگھ کوٹلہ۔

شری بنتا سنگھ دھامیاں کلاں کے باشندہ تھے۔ وہیں 1900 کے آس پاس آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ بچپن سے ہی آپ شوخ مزاج تھے۔ کھیل کود میں آپ بہت تیز تھے۔ گاؤں کے اسکول میں آپ تعلیم کے لئے بٹھائے گئے۔ چار پانچ برس تک وہیں زیر تعلیم رہے۔ بعد ازاں کچھ دن گھر بار کے کام کاج میں لگے رہے۔ اس کے بعد آپ نے فوج میں ملازمت اختیار کی اور تین سال تک 55 نمبر سکھ پلٹن میں کام کرتے رہے۔ وہاں پر بھی آپ کھیل کود میں آپ سب سے آگے تھے۔ دوڑ میں تو آپ ایکتا ہی تھے۔ ان ہی دنوں کچھ لوگوں کے ربط میں آ کر آپ ڈاکہ وغیرہ میں بھی حصہ لینے لگے۔ مگر زیادہ دنوں تک اس راستہ پر نہیں چلے تھے کہ ببر اکالی آندولن اٹھ کھڑا ہوا۔ دولت پور کے شری کرم سنگھ، رام گڑھ کے شری ادوے سنگھ اور ببر اکالیوں کے پرجوش اعلانات پڑھ کر آپ بہت متاثر ہوئے اور ان میں شمولیت اختیار کر لی۔

وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ اپنے پرانے گناہوں کی تلافی محض اپنی جان قربان کرنے سے ہی ہو سکے گی۔ وہ اپنے اس داغ کو اپنے خون سے دھونے کی جدوجہد میں مصروف ہو کر میدان عمل میں آگے بڑھے۔ اس راستہ میں آ کر بھی انہیں دو ایک ڈکیتیوں میں حصہ لینا پڑا تھا مگر آپ کا مزاج یکسر بدل گیا تھا۔ 1923 میں مارچ کی دو یا تین تاریخ کو جمشیر نامی مقام کے اسٹیشن ماسٹر کے گھر ڈکیتی ہوئی تھی۔ اس وقت قیادت ان کے ہی ہاتھوں میں تھی۔ کہتے ہیں کہ کسی ذلیل شخص نے ایک خاتون پر

دست درازی کی ہمت کی۔ ادھر اس عورت سے شری بنتا سنگھ نے کھڑے ہو کر کہا۔ "ماتا! اپنے زیورات اتار کر خود ہی دے دو۔ ہم آپ کو نہیں چھوئیں گے"۔ تو اس نے روکتے ہوئے دوسرے شخص کی تحقیر آمیز ہمت کی داستان سنا' انتہائی طنزیہ اور دردبھرے لہجہ میں کہا۔ "اب اتنا مہاتما پن دکھانے سے کیا ہوگا؟"۔

بنتا سنگھ یہ سن کر آگ بگولہ ہوگئے۔ گڑاسا لے کر اس حقیر پر چلا دیا۔ گردن تو کٹ ہی گئی ہوتی مگر ایک دوسرے شخص نے بیچ میں ہاتھ روک دیا اور سب لوگوں نے بڑی درخواست کے بعد ان کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ انہوں نے کہا۔ "ایسے ذلیل افراد ہمارے آزادی کے منصوبے کو یوں ہی بدنام کر دیں گے۔ پہلے ہی بے بس اور مجبور ہو کر ڈکیتی کرنی پڑتی ہے اس پر بھی یہ اندھیر! اس طرح ہم کر ہی کیا سکیں گے؟"۔ اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ باغی بننے کے بعد ان کے مزاج میں کس قدر تبدیلی آ گئی تھی۔

پھر وہ ببر اکالی دل کے پروگرام کے مطابق کام کرتے رہے اور کئی ایک ملکی غداروں کو سزائے موت دی۔ 12-11 مارچ کو پولیس کے چاپلوس نمبردار بوٹا کو جو کہ قومی تحریک کو کچلنے میں حکومت کا خصوصی معاون تھا' اس کے گھر پر حملہ کر کے اس کو ہلاک کر دیا۔ اسی طرح ان دنوں یہ سبھی کام ہوتا رہا۔ ادھر پولیس آپ لوگوں کو پکڑنے کے لئے دوآبہ میں ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ آپ کو پکڑوانے کے لئے بہت بڑے انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ مگر آپ کو پکڑنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایک دن ایک چھوٹے سے جنگل میں چند گھوڑ سوار سپاہیوں سے آپ کا سامنا ہو گیا۔ وہ لوگ ان ہی ببر اکالی بہادروں کو مارنے یا پکڑنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ آپ نے انہیں اکیلے ہی للکارا۔ سبھی فوراً بھاگ گئے۔ "اجی ہم نہ تو آپ کو گرفتار کرنے میں راضی ہیں اور نہ مارنے میں ہی کیوں کہ آپ ہی لوگوں کی بدولت ہم لوگوں کی بھی قدر ہو رہی ہے اور تین چار گنا زیادہ تنخواہ مل رہی ہے"۔ آپ کی بہادری اور حوصلہ کے بارے میں اس طرح کی کئی باتیں عام ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن ایک چھاؤنی میں تنہا ہی گھس کر رسالے کے پہریدار کی گھوڑی اور رائفل چھین کر لے گئے تھے۔ خیر۔

اسی طرح بہت دنوں تک پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے کے بعد آخرکار 12 دسمبر 1923 کو آپ پولیس کے حصار میں آ گئے۔ بات دراصل یہ تھی کہ شام...... چہ اسی گاؤں' جو جالندھر سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے' کا ایک شخص جگت سنگھ کے شبہ میں پکڑا گیا۔ پولیس اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکی' اس لئے اسے دھمکی دے کر اور اس بات پر راضی کر کے کہ وہ ببر اکالیوں کی گرفتاری میں معاونت کرے' چھوڑ دیا گیا۔ اس کمبخت نے اکالیوں سے دوستی اختیار کر لی۔ کچھ دن پولیس حوالات میں رہنے کے سبب اسے اپنی بہادری اور جوش کی ڈینگ مارنے کا کافی موقع مل گیا تھا۔ مگر وہ تو تھا بالکل حیوان۔ اس نے ایک دن بنتا سنگھ' جوالا سنگھ اور وریام سنگھ کو اپنے گھر پر دعوت دی اور خود پولیس کو اطلاع بھیج دی۔ چند گھنٹے دن رہتے ہی فوج نے گاؤں کو گھیر لیا۔

جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ دشمنوں نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا ہے تو وہ فوراً ایک چوبارے پر جا چڑھے۔ وہ چاہتے تھے مرنا مگر بہادری کے ساتھ لڑ کر۔ وہ لڑائی کے نقطہ نظر سے ایسی جگہ تھی کہ ان تین آدمیوں نے ہی گھنٹوں پولیس کی ناک میں دم کئے رکھا۔ دونوں جانب سے خوب گولی چلی۔ سپاہیوں کی سب مشین گنیں اور رائفل بے کار ہو رہی تھیں۔ سامنے مکان کی چھت پر مشین گن چلائی گئی۔ مگر کچھ اثر نہیں پڑا۔

رحم کے اوتار اور گورے آقاؤں نے اس وقت بے نظیر جذبہ رحم کا مظاہرہ کیا۔ پمپ سے مکان پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ ادھر شری جوالا سنگھ جی گولی کا نشانہ بن چکے تھے۔ وہ بری طرح زخمی ہو گئے۔ اس وقت شری بنتا سنگھ جی مکان سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کو بھی گولی لگی اور وہ بھی زخمی ہو کر وہیں گر پڑے۔ اس وقت ان میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ

کھڑکی کے پاس جا کر دشمن پر گولی باری کرتے۔ آپ نے درد بھرے لہجہ میں کہا۔ ’’وریام سنگھ! تم تو جاؤ۔ بھائی دیکھو بچ سکو تو بچ جاؤ۔ پھر کبھی ان سے ہمارا بدلہ لینا۔ مگر ایک آخری درخواست ہماری بھی ہے کہ یہ لو ریوالور' ایک گولی سر یا سینہ پر مار دو۔ اب جیتے جی دشمنوں کے ہاتھ میں قیدی بننے کی خواہش نہیں ہوتی۔ تڑپ تڑپ کر دشمنوں کے ہاتھوں میں پل پل مرنے سے ایک بار خاتمہ کر جاؤ جی‘‘۔ وریام سنگھ کے پیارے دکھ سکھ کے پرانے ساتھی بنتا سنگھ آج زخمی ہو کر نظروں کے سامنے تڑپ رہے ہیں۔ آخری خواہش کا اظہار بھی کیا۔ کون کسی دوست کی آخری خواہش پوری کرنے سے ہچکچائے گا؟۔ مگر واہ! کتنی مشکل او رخوف ناک ہے وہ خواہش؟ اپنے عزیز کو اپنے ہی ہاتھ سے گولی مارنا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر یہ بھی تو نہیں دیکھا جاسکتا کہ دشمن انہیں چین سے مرنے بھی نہ دیں اور آخر تک انہیں بیان وغیرہ کے لئے تنگ کریں۔ تب شری وریام سنگھ جی نے ریوالور بھر کر بنتا سنگھ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے روندھی ہوئی آواز میں الوداع کہتے ہوئے کہا کہ ’’بھائی آج تک نہ جانے کتنی قتل و غارت گری کی' کتنی بار بلا خوف وخطر لوگوں پر گولیاں چلا دیں۔ مگر اپنے ہی ساتھی' سگے سے بھی زیادہ پیارے دوست پر بھی گولی چلانی پڑے گی' یہ کبھی نہیں سوچا تھا۔ نہیں' ہم سے یہ نہیں ہوگا۔ یہ لو ریوالور' جب ضرورت سمجھنا' اپنے ہاتھ سے ہی گولی مار لینا‘‘۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ دوست مر رہا ہے سامنے اپنی موت رقص کر رہی ہے۔ باہر دنا دن گولیاں چل رہی ہیں۔ وریام سنگھ ایک بار پھر بنتا سنگھ کے سر کو سینے سے لگا کر رخصت ہوئے۔ وہ ویر اس گھیرے سے آسانی سے بچ نکلا۔ ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ایک دو سپاہیوں نے پکڑنے کی کوشش کی۔ ان پر گولی چلا دی۔ زخمی کر کے وہیں گرا دیا۔ پھر ان 'بہادر سپاہیوں' کو ان کا تعاقب کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ادھر مکان جل رہا تھا اور گولی بھی برابر چلتی رہی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بنتا سنگھ کی جان گولی سے گئی یا اس آگ میں جل کر۔ اس وقت ان کی عمر 23-22 برس سے زیادہ نہ تھی۔

سیناپتی

شری رنگا سنگھ

1914-15 میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی ناکامی میں لاہور سنٹرل جیل کی قربان گاہ پر اپنی جان کی قربانی دینے والے سینکڑوں لوگوں میں سے آپ بھی ایک تھے۔ جالندھر ضلع کے خورد پور گاؤں میں شری گرودت سنگھ جی کے گھر 1885 کے قریب آپ کی پیدائش ہوئی۔ کچھ دن اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے فوجی ٹریننگ کے لئے فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ 30 نمبر کے رسالے میں 23 برس کی عمر تک نوکری کرنے کے بعد 1908 میں آپ امریکا روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد وہی پرانی داستان ہے۔ غدر پارٹی بنی' اخبار نکلا' پرچار ہوا اور آپ کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی۔ 1914 میں جب کہ بہت سے سکھ امریکا سے ہندوستان واپس آ رہے تھے تو آپ بھی جنگ میں انگریزوں سے دو دو ہاتھ کرنے کی غرض سے ملک واپس چلے آئے۔

چھ سال تک باہر رہنے کے بعد 21 دسمبر 1914 کو آپ نے دوبارہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور تقریباً ایک مہینہ مکان پر ٹھہرنے کے بعد گھر کا سارا نظم ونسق وغیرہ درست کیا اور گاؤں گاؤں جا کر غدر کا پرچار کرنے لگے۔

کہتے ہیں کہ جب 19 فروری کی بغاوت کی بات کھل گئی اور بہت سے لیڈر گرفتار کر کے لاہور سنٹرل جیل میں بند کر دیئے گئے تو جیل پر حملہ کر کے انہیں چھڑانے کے لئے کپور تھلہ کی میگزین لوٹ کر ہتھیار وغیرہ لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت پیش پیش رہنے والوں میں شری رنگا سنگھ بھی تھے۔ بعد میں وافر طاقت نہ ہونے کے سبب فیصلہ کیا گیا کہ پہلے بالا کے پل پر تعینات کئے گئے پولیس کے آدمیوں کو مار کر ان کی بندوقیں وغیرہ چھین لی جائیں اور پھر ان کو لے کر میگزین پر حملہ کیا جائے۔ خیر'

جمع ہوئے لوگوں میں سے کچھ کو اس کام کے لئے منتخب کیا گیا جس میں ہمارے ہیرو بھی تھے۔ جب سپاہیوں کو چوکنا دیکھ کر اس وقت ان پر حملہ موقوف کر دیا گیا تو آپ بہت ناراض ہوئے۔ آپ نے کہا "اگر اسی طرح اپنی طاقت کو کم سمجھ کر ہم ہر ایک کام کو چھوڑتے رہیں گے تو کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں تو انہیں تھوڑے بہت آدمیوں کو لے کر سامنا کرنا ہے"۔ بعد میں اسی پل پر حملہ کر کے یہ لوگ چار آدمیوں کو ہلاک کر کے ان کی بندوقیں چھین لے گئے۔

آخر میں جب 26 جون 1915 کی شب آپ ایک شربت والے کی دکان پر سو رہے تھے تو پولیس نے پتہ لگ جانے پر اچانک حملہ کر دیا۔ گرفتار ہو جانے پر آپ کے خلاف سازش کرنے کے جرم میں مقدمہ چلا اور عدالت سے پھانسی کی سزا ملی۔ اس طرح لاہور سنٹرل جیل میں افسوس ناک ڈرامہ کے ایک اور نظارہ کے بعد اس پر ہمیشہ کے لئے پردہ پڑ گیا۔

شری ویر سنگھ

آپ کی ولادت بھووال ضلع ہوشیار پور میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام سردار بوٹا سنگھ تھا۔ آپ 1906 میں کناڈا چلے گئے تھے۔ خیر' ایک تو آزاد ملک' پھر آندولن کی شدت' آپ بھی اس لہر سے بچ نہ سکے۔ نظریات تو جاگزیں ہو ہی چکے تھے۔ ان ہی دنوں کاما گاٹا مارو کے واقعہ' ڈیپوٹیشن کی ناکامی اور جنگ چھڑ جانے کے سبب چاروں طرف سے غدر کی ہی آواز سنائی دینے لگی۔ سخت محنت کی کمائی کے روپے کو غدر کے کام میں دے کر لوگوں نے ہندوستان کی جانب آنا شروع کر دیا۔ اس وقت شاید ہی کوئی ایسا بچا ہو جس نے اس کام میں حصہ نہ لیا تھا۔ ہر جگہ یہی سننے میں آتا تھا کہ چلو ملک چل کر آزادی کے لئے جنگ کریں۔ خیر' انہیں سب باتوں سے متاثر ہو کر آپ بھی ہندوستان واپس آ گئے اور ادھر ادھر گھوم کے غدر کا پرچار شروع کر دیا۔

6 جون 1915 کے ایام تھے۔ آپ چیٹھی گاؤں میں ایک کنوئیں پر غسل کر رہے تھے کہ پولیس نے گھیر لیا۔ گرفتار کر کے آپ لاہور لائے گئے اور دوسرے کیس میں 100 آدمیوں کے ساتھ آپ پر مقدمہ چلایا گیا۔ آپ پر میگزین پر حملہ کرنے اور ڈاکہ زنی کا الزام لگا کر موت کی سزا دی گئی۔

مذکورہ 100 مجرموں میں سے آپ کے علاوہ پانچ کو پھانسی اور 42 کو تاحیات کالے پانی کی سزا دی گئی۔ اس کے ساتھ ان کی ساری جائیداد ضبط کر لی گئی۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں لاہور سنٹرل جیل کو بھی خصوصی اہمیت حاصل رہے گی۔

شری اتم سنگھ

اپنے ہی ہاتھوں شورش کا یگیہ رچ کر آخر میں اس پر ہی اپنی جان کی قربانی دینے والے متعدد دیوانوں میں سے اتم سنگھ بھی ایک تھے۔ لدھیانہ ضلع کے ہنس نامی گاؤں میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ کے والد کا نام شری جیت سنگھ تھا۔ آپ کا دوسرا نام شری رادھو سنگھ بھی تھا۔

کہاں اور کتنی تعلیم پانے کے بعد' کتنی عمر تک ملک میں رہنے کے بعد آپ کب امریکہ چلے گئے' ان سب باتوں کی تحقیق ابھی تک نہیں کی گئی ہے۔ ہاں' اتنا ضرور پتہ چلا ہے کہ امریکا میں غدر پارٹی کے آپ ایک اچھے کارکن تھے اور اسی پارٹی کے فیصلہ کے مطابق 1914 کے دسمبر مہینہ میں اپنے کچھ دیگر ساتھیوں کے ساتھ آپ ہندوستان میں غدر کا پرچار کرنے کے مقصد سے واپس آ گئے۔ آتے وقت بھی راستہ میں افواج اور دیگر ہندوستانیوں میں غدر کا پرچار کرتے آئے تھے۔

یادگار زمانہ کرتار سنگھ سے آپ کی پہلے سے ہی جان پہچان تھی۔ ہندوستان میں آ کر گندھا سنگھ' بوٹا سنگھ' ارجن سنگھ' پنگلے وغیرہ سے بھی آپ ملے اور تیز رفتاری سے کام شروع کر دیا۔

ان جنونیوں کے جوش و جنوں میں بھی پھرتی ہے۔ اس میں بھی جدت کی ایک جھلک ہے۔ خیر اس نئے جوش و ولولہ سے تحریک پا کر ایک دن جب 19 فروری 1915 میں محض پچاس آدمیوں کو ساتھ لے کر کرتار سنگھ نے برطانیہ۔ ہند کی سب سے مضبوط چھاؤنی فیروز پور پر حملہ کرنے کی جرات کی تھی تو آپ بھی ساتھ تھے۔ حالات ناساز گار ہو جانے کے سبب انہیں اس دن کامیابی بھلے ہی نہ ملی ہو مگر ان کا حوصلہ' ان کا جوش' ان کی لگن اور پر اعتمادی وغیرہ کا اندازہ اس بات سے مکمل طور پر کیا جا سکتا ہے۔

19 فروری کے عظیم پروگرام کی ناکامی کے بعد چاروں طرف سے گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ اتم سنگھ کے نام بھی وارنٹ جاری کیا گیا مگر اس وقت آپ پولیس کے ہاتھ نہ آ سکے۔ انتہائی محنت سے بنائی گئی اپنی عمارت کو اس طرح برباد ہوتے دیکھ کر وہ حیران نہیں ہوئے۔ اس وقت چند ایک کو چھوڑ کر سبھی لیڈر گرفتار ہو چکے تھے' لہٰذا آپ نے انہیں جیل سے نکالنے کے ارادے سے مسلح جدوجہد کرنی شروع کر دی۔ پہلے کپورتھلہ اسٹیٹ کے میگزین کو لوٹنے کا خیال تھا۔ مگر بعد میں بالا کے پل پر تعینات 750 کارتوس کے ساتھ 15 سپاہیوں کی سبھی رائفلیں صرف سات آٹھ پستول سے لیس باغیوں نے چھین لی تھیں۔ اس کام کو منظم کرنے میں بھی اتم سنگھ کا ہی زیادہ ہاتھ تھا۔ آپ بم بنانا بھی جانتے تھے اور ایک بار اور کچھ نہ ملنے پر آپ نے پیتل کے لوٹے سے ہی بم بنانے کا کام لیا تھا۔

ابھی جیل پر حملہ کرنے کی منصوبہ سازی ہو رہی تھی کہ 19 ستمبر 1915 کو جب آپ ایک اور ساتھی فرید پور اسٹیٹ کے مانا بکھوانا نامی گاؤں کے پاس ایک سادھو کی کٹیا میں مقیم تھے' گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت آپ نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ میرے ہاتھ میں کوئی ریوالور یا پستول وغیرہ نہیں تھا''۔ گرفتار ہونے پر دونوں نے ایک ساتھ ہی قومی گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ لاہور کے تیسری سازش کیس میں عدالت سے آپ کو پھانسی کی سزا ملی اور کچھ دنوں کے بعد اس عظیم الشان یگیہ کی ایک اور قربانی اختتام کو پہنچی۔

— تھک

ڈاکٹر ارڑ سنگھ

حب الوطنی میں سرشار ہو کر جلتی ہوئی شمع کی پہلی ہی لو پر ایک مست پروانہ کی طرح وہ اپنا سب کچھ ختم کر گئے۔ ان کے لئے تو:

زندگی ناقص تھی آخر/کرلیا مدفن پسند
سنا تھا یہ راحت کامل/اسی منزل میں ہے

ڈاکٹر صاحب کی پیدائش جالندھر ضلع کے سگوال نامی گاؤں میں ہوئی۔ شہید بھائی بنتا سنگھ بھی اسی گاؤں کے تھے اور یہ دونوں ایک ہی ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ ان میں تلاش وجستجو کا ایک خاص فن تھا۔ تھانے میں جا کر وہاں کے بھی راز لایا کرتے تھے۔ چالیس میل چلنے کے بعد بھی آپ تھکان محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کی کالی بھری ہوئی داڑھی اور موٹی آنکھیں دیکھ کر سبھی لوگ ڈر جایا کرتے تھے۔ مگر آپ بہت خوش مزاج اور جذباتی تھے۔ آپ کا رہن سہن بالکل سادہ تھا۔ آپ پنجاب سے باہر رہ کر کام کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جن دنوں پولیس شدت کے ساتھ آپ کو تلاش کر رہی تھی اس وقت بھی آپ پنجاب میں ہی گاؤں گاؤں گھوم کر پرچار کرتے رہے اور کئی بار پولیس کے ہاتھ آ کر بھی نکل گئے۔ آپ بلاناغہ صبح سویرے دعا کیا کرتے تھے کہ اے خدائے برتر! میری موت گولی لگ کر یا پھانسی پر لٹک کر ایک بہادر کی طرح ہو۔

ایک امریکی سے آپ کی بہت گہری وابستگی تھی۔ انہیں آپ اپنا گرو کہا کرتے تھے۔ ایک بار پتہ چلا کہ وہ لاہور سنٹرل جیل میں گرفتار کر کے رکھے گئے ہیں۔ بس پولیس کے سخت پہرے کے بعد بھی آپ وہاں جا پہنچے اور جیل میں جا کر ان سے ملے اور سارا بھید لے کر واپس چلے آئے۔ ایک جانب تو جگہ جگہ پر آپ کی تصویریں چسپاں ہیں اور گرفتاری پر انعام دیا جا رہا ہے، ادھر دوسری جانب آپ سرکار سے جیل جیسی جگہ پر جا کر وہاں کا سارا بھید لے رہے ہیں!

جب لاہور جیل میں آپ کا آنا جانا زیادہ ہو گیا تو کسی مخبر نے سرکار کو یہ بات بتا دی۔ ایک دن جیل کے دروازے پر کھڑے تھے کہ ایک پولیس افسر نے سوال کیا۔

''تم کون ہو''؟

''میں ارڑ سنگھ ہوں''۔

''کون ارڑ سنگھ؟''

''جس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تم تھک گئے ہو''۔

افسر کو یقین نہیں ہوا اور وہ گھوم کر چل دیا۔ اس وقت آپ کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ پھر اسے بلا کر خود اپنے آپ کو گرفتار کروا دیا۔

مقدمہ چلنے پر آپ نے سب باتیں تسلیم کر لیں۔ پولیس افسر سوکھا سنگھ نے جب آپ سے کوئی چبھنے والی بات کہی تو آپ نے ڈانٹ کر کہا، ''بزدل! تیرے جیسوں کو میں بٹیر سمجھتا رہا ہوں۔ اگر چاہتا تو ایک لمحہ میں گردن مروڑ کر نجات پا لیتا مگر بزدلوں کے لہو سے ہاتھ رنگنا میرے لئے گناہ ہے''۔ ایک اور موقع پر تھانے دار کے یہ دریافت کرنے پر کہ کیا تم مجھے اور بھی کبھی ملے تھے؟ آپ نے جواب دیا۔ ''ملنا تو کیا' تمہارے سارے کاموں کی رپورٹ میری ڈائری میں درج ہے''۔ آخر میں

عدالت سے آپ کو پھانسی کی سزا ملی۔ جیل میں آپ اور ساتھیوں کو کہانیاں سنایا کرتے تھے اور پھانسی کے دن تک کافی موٹے ہو گئے تھے۔

بے فکری اور مستانہ پن کے تو آپ زندہ پیغامبر تھے۔ جس موت کا نام سن کر لوگ کانپ اٹھتے ہیں' اسی کو سامنے دیکھ کر بھی آپ کے مستانہ پن میں فرق نہیں آیا۔ جس دن علی الصبح آپ کو پھانسی لگنی تھی' اس دن آپ گہری نیند میں سو رہے تھے۔ افسر نے آ کر جگایا اور کہا کہ چلو تمہیں پھانسی دی جائے گی۔ آپ نے کھڑے ہو کر بہ آواز بلند 'وندے ماترم' کہا اور ہنستے ہوئے پھانسی کے تختہ کی جانب چل دیئے۔

اس کے بعد وہی پھانسی کا تختہ' وہی جلاد' وہی رسی اور وہی آخری جھٹکا اور بس......

—تھک

بابو ہری نام سنگھ

روی بابو نے گرو گووند سنگھ کے وقت کے سکھوں پر ایک نظم لکھی تھی۔ اس میں آپ نے کہا تھا ''جن لوگوں نے کسی کا قرض نہیں اٹھا رکھا اور موت جن کے قدموں کی غلام ہے' ایسے بے خوف اور بیباک سکھ اٹھے ہیں''۔

انہیں بے خوف اور نڈر افراد میں سے ہمارے ہیرو ہرنام سنگھ بھی ہیں۔ آپ کی ولادت ضلع ہوشیار پور کے ساہری نامی گاؤں میں ہوئی تھی۔ والد کا نام شری لابھ سنگھ تھا۔ پڑھنے لکھنے میں آپ بہت تیز تھے مگر ہائی کلاس میں پہنچتے ہی اچانک اسکول چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ وہاں آپ کا الگ گروپ تھا جس میں شبد کیرتن ہوا کرتا تھا۔ عموماً آپ کہا کرتے تھے ''ہماری بھی کیا زندگی ہے؟ ہم اتنے گر گئے ہیں کہ دس یا گیارہ روپے کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں اور اپنی اور دوسری غلام ذاتوں کی زنجیریں جکڑنے میں مدد کرتے ہیں اس نوکری سے تو بھوکوں مرنا اچھا ہے اور اس زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ وغیرہ''۔ آپ کے ایک دو دوست ہنس کر پوچھتے'' کیوں جی' اگر آپ کا ایسا خیال ہے تو نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ تو آپ مسکرا کر جواب دیتے۔ ''جانتے تو ہو کہ روپے کے لئے نوکری نہیں کرتا ہوں۔ گھر میں ملکیت جائیداد ہے' وہیں رہ کر آرام سے گزر سکتی ہے۔ مگر..........''۔

بھلا ایسے نظریات کا حامل نوجوان کب تک نوکری کر سکتا تھا! ڈیڑھ برس کے بعد نوکری چھوڑ کر گھر چلے آئے۔ فوج میں شری بلونت سنگھ جی سے آپ کو بہت پیار تھا۔ نظریات بھی ملتے تھے اور نوکری بھی ایک ہی ساتھ چھوڑی۔

کچھ دن گھر پر رہنے کے بعد آپ برما پہنچے اور پھر وہاں سے ہانگ کانگ جا کر ٹرام کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ وہاں بہت سے ہندوستانی جو کناڈا اور امریکہ جانے کے لئے گھر سے آتے تھے' انہیں امیگریشن محکمہ والے ناامید کر کے گھر واپس لوٹا دیتے۔ ان بے چاروں کے پاس کھانے تک کو کچھ نہیں بچا تھا۔ اس وقت ہری نام سنگھ جی اپنے پاس سے ان کی مدد کر کے ان کی ہمت بندھاتے تھے۔

آہستہ آہستہ انہیں معلوم ہوا کہ امریکہ میں لوگ بڑے مزہ سے رہتے ہیں اور وہاں کے ماحول میں رہ کر معمولی سے معمولی ہندوستانی ہندوستان کو آزاد کرانے کی فکر کرنے لگتا ہے۔ جو بھی ہو' آزادی کا سبق سیکھنے کی مناسب جگہ سمجھ کر آپ ہانگ کانگ میں موجود ہندوستانیوں کو امریکا جانے کی ترغیب دینے لگے۔ ضرورت پڑنے پر آپ ان کی مدد بھی کر دیتے۔

آخر میں یکم دسمبر 1907 کو جب کہ آپ کی عمر بیس سال سے کم ہی تھی، آپ بھی امریکا روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر ایک سال تک وکٹوریہ نگر میں رہنے کے بعد ہندوستان میں اسکول وغیرہ تعلیمی کام میں خرچ کرنے کے لئے پیسہ جمع کر کے بھیجنے لگے۔

یکم جنوری 1908 میں آپ کناڈا ریاست ہائے متحدہ چلے گئے اور وہاں سیئیٹل نگر کے ایک اسکول میں پڑھنے لگے۔ تین سال پوری کوشش سے حصول علم ہوتا رہا۔ انہیں دنوں کناڈا میں واقع ہندوستانیوں نے ڈیڑھ لاکھ روپے کے سرمایہ سے ایک انڈین ٹریڈنگ کمپنی کھولی اور سہولت کے لئے ایک انگریز منیجر بھی رکھ لیا۔ کمپنی کے حصہ داروں میں ہمارے ہیرو بھی تھے۔ کام خوب ہونے لگا۔ کمپنی نے اچانک اس قدر ترقی کی کہ گورے سرمایہ داروں سے دیکھا نہ گیا۔ انہوں نے انگریزوں کو اپنی جانب کر لیا اور اس نے بے ایمانی شروع کر دی۔ ہری نام سنگھ اس کی چالاکی تاڑ گئے اور اس پر نظر رکھنے لگے۔ انہیں پھنسانے کا ارادہ ہونے لگا۔ مگر آپ کے ایک انگریز دوست ریمسبرگ، (Remisburg) جو کہ وہاں مجسٹریٹ تھے، یہ حالت دیکھ کر انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ صاحب ریاست ہائے متحدہ کے باشندہ تھے اور ان کے پاس ہی رہ کر آپ نے تین سال تعلیم حاصل کی تھی۔

کچھ دن بعد آپ دوبارہ کناڈا چلے گئے اور وہاں سے ایک 'دی ہندوستان' (The Hindustan) نامی انگریزی اخبار نکالنا شروع کر دیا۔ آپ بڑے شعلہ بیاں رائٹر تھے۔ کنیڈین ہندوستانیوں پر آپ کا خاص اثر تھا۔ سرکار کو یہ اچھا نہیں لگا اور ان پر بم بنانے، سکھانے اور بغاوت کی تشہیر وغیرہ کا الزام لگا کر 48 گھنٹے کے اندر کناڈا سے نکل جانے کا فرمان جاری کر دیا۔ بڑی خراب حالت تھی۔ فوراً ریمسبرگ کو تار دیا گیا۔ انہوں نے کنیڈین سرکار کو تار دیا کہ انہیں ملک بدر نہ کیا جائے۔ میں انہیں ساتھ لینے کے لئے آرہا ہوں اور اپنی پرائیویٹ کشتی لے کر انہیں ساتھ لے آئے۔ کچھ دنوں بعد آپ کو دوبارہ کناڈا جانے کی اجازت مل گئی۔ 20 مارچ 1911 سے آپ ریاست ہائے متحدہ میں برکلے یونیورسٹی میں پڑھانے لگے۔ غدر اخبار میں بھی آپ ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔

ادھر دو حضرات بھائی گرودت سنگھ اور بھائی دلیپ سنگھ ایک بم کیس میں گرفتار کئے گئے، اُدھر کا ماگاٹا مارو جہاز بندرگاہ پر آ پہنچا۔ ہری نام سنگھ اپنے دیگر رفقاء کے ساتھ بابا گرودت سنگھ اور دیگر مسافروں سے صلاح و مشورہ کرنے گئے اور وہیں گرفتار ہوئے۔ بقیہ ساتھی تو رہا کر دیئے گئے مگر آپ کو رہائی نہیں ملی۔ انہیں دوبارہ ملک بدر کرنے کا فرمان جاری ہوا۔ کچھ دن کے جھگڑے کے بعد یہ جان کر کہ اس بات کوئی کامیابی نہیں ملے گی، آپ ہندوستان آنے والے ایک جہاز پر سوار ہو گئے اور چین، جاپان اور سیام وغیرہ میں غدر پارٹی کا کام کرتے ہوئے آپ برما پہنچے۔ یہ 1915 کے دن تھے۔ سنگاپور کی بغاوت ختم ہونے کے بعد بہت سے غدر لیڈر برما پہنچے۔ ارادہ تھا کہ اکتوبر 1915 میں بقر عید کے دن بغاوت کی جائے اور بکروں کی جگہ گورے حکمرانوں کی قربانی کی جائے مگر بعد میں 25 ستمبر کا دن متعین کیا گیا۔ انہیں سب خواہشات میں دن رات مصروف رہ کر وہ سخت محنت کر رہے تھے کہ آپ ایک دن مانڈلے میں گرفتار کر لئے گئے۔ مقدمہ چلا اور آپ کو سزائے موت دی گئی۔ ابھی جیل میں ہی بند تھے اور پھانسی نہیں دی گئی تھی کہ آپ جیل سے فرار ہو گئے۔ مگر جلد ہی گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔

آپ کی درخواست پر آپ کی بیوی نے آپ کے چھوٹے بھائی سے شادی کر لی۔ بابو ہری نام سنگھ انتہائی آزاد مزاج اور مضبوط دل کے آدمی تھے۔ آپ عام طور پر 'ہندی ہے ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا' اور 'مرنا بھلا ہے اس کا جو اپنے لئے جئے' وغیرہ مصرعے گنگناتے رہتے تھے۔

شری بھاگا سنگھ' شری ہرینام سنگھ اور شری بلونت سنگھ ان تینوں میں بے پناہ پیار تھا۔ تینوں کا رہن سہن' کھانا پینا اور کام کاج ایک ساتھ ہی ہوتا تھا۔ اس وقت یہ تینوں غدر تحریک کی جان تھے۔ ایک ایک کر کے ان تینوں نے ہی ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے قربانی دی۔ ملک کے لئے وہ جئے اور ملک کے لئے ہی وہ مر بھی گئے۔ محبت کا کتنا حسین نظارہ ہے؟

-نا معلوم

شری سوہن لال پاٹھک

1914 کی بات ہے۔ امریکہ کی غدر پارٹی کی جانب سے سبھی ملکوں میں غدر پرچار کے لئے آدمی بھیجے جا رہے تھے۔ جو بھی ہو پاٹھک جی بھی اسی پارٹی کی طرف سے برما تشہیری کام کے لئے بھیجے گئے۔ 1914 کی ابتدا میں ہی آپ بینکاک آئے اور کچھ دن وہاں پر غدر کا کام شروع کرنے کے بعد رنگون آ پہنچے۔ یہاں منظم طور پر اپنا مرکز بنا کر سوہن لال نے اس دن کی فضول امید سے جب کہ پورے ہندوستان میں ایک ہی ساتھ ایک بار قتل و غارت گری کا تانڈو رقص شروع ہو جائے گا' سپاہیوں میں بغاوت کا پرچار بہت تیزی کے ساتھ شروع کر دیا۔

21 فروری آئی اور نکل گئی۔ راز کھل جانے سے اس دن بلوہ نہ ہو سکا اور چاروں طرف گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ مگر شورش پسندوں کی زندگی میں یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ ان کی زندگی تو ناکامیوں کی زندگی ہے۔ وہ تو 'Karmanyewadhikarastey' کا سبق پڑھ کر میدان عمل میں آئے تھے۔ خیر' سوہن لال اس پر بھی پریشان نہیں ہوئے اور انہوں نے نئے جوش اور ولولہ کے ساتھ بغاوت کی منصوبہ سازی شروع کر دی۔

ایک دن اگست 1915 میں جب کہ میمیو کے توپ خانے میں غدر کا پرچار کر رہے تھے' ایک جمعدار نے انہیں گرفتار کرا دیا۔ تین پستول اور 270 کارتوس پاس ہوتے ہوئے بھی نہ جانے سوہن لال نے اس وقت ان کا استعمال کیوں نہیں کیا۔

پاٹھک جی جیل میں بند تھے۔ حکام کے آنے پر دوسرے قیدیوں نے تو جھک جھک کر سلام کرنا شروع کر دیا مگر آپ کا جوش جنوں کچھ الگ ہی تھا۔ کہا۔ ''جب میں انگریزوں کی حکومت کو ناانصاف اور ظالم مانتا ہوں تو ان کی جیل کے قاعدے قانون کیوں تسلیم کروں''۔

حکام کے آنے پر کھڑا ہونا بھی شاید ان کے پروگرام کے باہر تھا۔ ہاں ایک بات ضرور تھی' وہ کبھی کسی کے ساتھ برا سلوک نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی ان سے کھڑے ہو کر بات کرتا تو آپ بھی اس سے کھڑے ہو کر ہی بات کرتے تھے۔ ایک مرتبہ برما کے لارڈ صاحب جیل دیکھنے آئے۔ جیلر نے سوہن لال سے درخواست کی کہ ان کی آمد پر کھڑے ہو کر استقبال کر لینا۔ جب آپ اس کے لئے راضی نہیں ہوئے تو جیلر نے ایک اور چال چلی۔ جس وقت لارڈ صاحب جیل میں آئے تو جیلر پہلے سے ہی پاٹھک جی کے پاس جا کر کھڑے کھڑے ان سے باتیں کرنے لگا۔ آپ بھی کھڑے ہو کر اس سے باتیں کرنے لگے اور لارڈ کے آنے پر انہیں دوبارہ کھڑا ہونا نہیں پڑا۔ اپنی دو گھنٹے کی گفتگو میں لارڈ نے بہت درخواست کی کہ تم معافی مانگ کر سزائے موت سے بری ہو جاؤ' مگر آپ نے ایک نہ سنی۔

آخر میں پھانسی کے دن ایک انگریز مجسٹریٹ نے آ کر دوبارہ آپ سے معافی مانگنے کی درخواست کی۔ ایسے وقت میں جیل کے سبھی ملازم سوہن لال کا منہ دیکھ کر جواب کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس دیوانے پجاری نے

مسکراتے ہوئے کہا۔"معافی مانگنی ہے کہ تو انگریز مجھ سے معافی مانگیں۔میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔حقیقی مجرم تو وہی ہیں۔ہاں اگر میری مکمل رہائی کا وعدہ کرو تو تمہاری بات پر غور کر سکتا ہوں"۔

جواب ملا۔یہ تو اختیار سے باہر کی بات ہے۔

"تو پھر اب تاخیر کیوں کرتے ہو؟ تم اپنی ذمہ داری پوری کرا اور مجھے اپنی ذمہ داری پوری کرنے دو"۔

دیکھتے ہی دیکھتے تختہ کھنچا اور رسی کے جھٹکے کے ساتھ ہی یہ منظر بھی غائب ہو گیا۔

-سبودھ

بھائی رام سنگھ

پنڈ تولیتاں، ضلع جالندھر میں آپ کی پیدائش ہوئی۔آپ کے والد کا نام شری جیون سنگھ تھا۔چھوٹی عمر میں ہی 1907 یا آٹھ میں آپ کناڈا چلے گئے تھے۔یہاں پر انہیں تجارت وغیرہ میں اچھی کامیابی ملی اور وہ وہاں کے ہندوستانیوں میں سب سے زیادہ مالدار شمار کیے جانے لگے۔مگر اس کے باوجود آپ کا نرم مزاج تھے اور اپنی دولت کو قوم کی دولت کہا کرتے تھے۔آپ دل کھول کر عطیہ کرتے تھے۔دیوان کے لنگر وغیرہ کا خرچ انہیں کے روپے سے ہوتا تھا۔

1914 میں کناڈا میں موجود ہندوستانیوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔کاما گاٹا مارو کا واقعہ، تجارت میں سست روی، گرودوارے میں دو لیڈروں کی ہلاکت وغیرہ نے حالات کو یکسر بدل دیا۔غلامی کی زیادہ ٹھوکریں برداشت نہ کرنے کے سبب لوگ ملک واپس آنے لگے۔رام سنگھ جی بھی اسی خیال سے کناڈا سے یونائیٹڈ اسٹیٹ آگئے۔یہاں آنے کے بعد لوگوں نے ہندوستان نہ آکر آپ سے وہیں رہ کر کام کرنے کی اپیل کی۔

ان دنوں غدر پارٹی کا کام کاج پنڈت رام چندر نامی شخص کے ہاتھ میں تھا۔انہوں نے قاعدے قانون کو بالائے طاق رکھ کر پارٹی پر اپنا ہی دبدبہ جمائے رکھا۔سبھی کام ان کی مرضی پر منحصر تھا۔ان کو ہمیشہ یہی فکر رہتی تھی کہ کوئی اچھا کام کرنے والا امریکہ میں نہ ٹھہر پائے۔خیر، اسی خیال سے رام سنگھ کو بھی وہاں سے نکالنے کی آپ نے ایک چال چلی۔جوتے میں ایک کاغذ کو سل کر رام سنگھ کو دیتے ہوئے کہا۔"اسے ہندوستان میں کسی خاص شخص کے پاس لے جانا ہے۔یہ اتنا ضروری ہے کہ آپ کے سوا اور کسی پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔خیر، آپ ہندوستان روانہ ہو گئے۔آتے وقت منیلا میں چند دیگر پرانے کارکنوں سے ملاقات ہوئی۔اس نے رام چندر کا اصلی خاکہ بتا کر یہ بھی کہا کہ اس وقت ہندوستان جانا موت کے منہ میں جانا ہے۔بوٹ کھولنے پر اس میں عام چھپے کاغذ کے علاوہ کچھ اور نہ نکلا۔جو بھی ہو آپ چین جاپان ہوتے ہوئے امریکا واپس چلے گئے۔

اس وقت رام چندر اور دیگر لوگوں میں کافی لڑائی ہوئی۔کافی جدوجہد کے بعد بھی لڑائی ختم ہونے کی امید نہ دیکھ کر انہوں نے 1916 میں کیلی فورنیا کے سیکرومنٹ نامی شہر میں ایک میٹنگ کی اور نئے آفیسر چن کر پارٹی کا کام شروع کر دیا۔رام چندر نے اسے غیر قانونی کہہ کر ایک اور میٹنگ بلائی مگر اس نے بھی اسی رام سنگھ والی کمیٹی کو ہی اتفاق رائے سے تسلیم کر کے اس میں مزید تین لوگوں کا اضافہ کر دیا اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ سات دن کے اندر ہی پرانے لوگ اس نئی کمیٹی کو سارے کام کا چارج دے دیں اور اگر ایسا نہ ہو تو کمیٹی بہ زور طاقت سبھی چیزوں پر قابض ہو جائے۔مگر اس کے بعد بھی چارج نہیں ملا۔پریس پر قبضہ کرتے وقت وہ لوگ پولیس بلا لائے۔پولیس کے آنے پر رام سنگھ نے سبھی احوال بیان کیا۔آخر وہ ایک آزاد ملک کی پولیس

تھی۔خیر'ان لوگوں نے خود ہی تالہ توڑ کر پریس پر نئی کمیٹی کا قبضہ کرا دیا۔
اس کے بعد چاروں طرف گھوم گھوم کر اپنے تنظیمی کام کو ختم کیا۔اس وقت لوگوں نے آپ کو سنٹرل کمیٹی کا صدر بنانا چاہا۔ مگر یہ کہہ کر میں نے ہی اسے بنایا ہے اور میں ہی اس کا چیف بن جاؤں' یہ درست نہیں ہے۔آپ نے مذکورہ عہدہ کو قبول نہیں کیا۔مگر پھر بھی آپ کا سارا وقت اسی کام میں گزرتا رہا۔
اسی درمیان امریکہ نے بھی جنگ عظیم میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی غدر پارٹی کے اہم کارکنوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔کہا گیا تھا کہ ان لوگوں کے سبب ہی برطانیہ کے تئیں امریکہ کی غیر جانب داری میں فرق آ گیا تھا۔خیر' جو بھی ہو'رام سنگھ جی اسی جرم میں گرفتار ہوئے۔کچھ دنوں کے بعد پنڈت رام چندر بھی پکڑے گئے۔اس وقت آپ نے پنڈت جی سے کہا کہ باہر ہمارا جو بھی اختلاف رہا ہو'یہاں پر ہمیں ایک ساتھ مل کر ہی چلنا مناسب رہے گا۔مگر وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور آخر میں یہی بات زور پکڑ گئی۔مقدمہ چلنے پر اخباروں نے اس بات پر کہ رام چندر جی کی پارٹی نے ایسا کہا اور دوسری پارٹی نے ایسا' خوب مضامین وغیرہ لکھنا شروع کر دیا۔پارٹی کی بدنامی ہوتے ہوئے دیکھ کر رام سنگھ نے ایک بار پھر کوشش کی کہ پارٹی بندی دور ہو جائے اور سب لوگوں کا مقدمہ ایک ہی ساتھ چلے مگر اس بار بھی کامیابی نہیں ملی۔
کیس جیوری کے سپرد کیا گیا اور جس وقت جج صاحبان دوپہر کو ظہرانہ کے لئے گئے تو رام سنگھ نے عدالت میں ہی ریوالور نکال کر رام چندر پر فائرنگ کر دی۔جس وقت رام چندر کو گرتا دیکھ کر آپ نے ہاتھ نیچا کر لیا تھا' سامنے بیٹھے ہوئے کوتوال نے رام سنگھ پر گولی چلا دی۔اس طرح امریکا کے بیچ عدالت میں ہونے والے ایک اور شہیدی منظر کا اختتام ہو گیا۔
اس بات کی تہہ میں کچھ بھی نہ رہا ہو مگر یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ رام سنگھ نے یہ کام غدر پارٹی کی بدنامی برداشت نہ کرنے کے سبب ہی کیا تھا۔

-بھانو

شری بھان سنگھ

پھانسی پر چڑھ کر جان دینے والے شورش پسند اگر ملک کے لئے فخر کی چیز ہیں تو ان لوگوں کی اہمیت بھی کسی طرح کم نہیں جو مسلسل ظالموں کے ذریعہ ناقابل ذکر تکالیف برداشت کرتے ہوئے لمحہ لمحہ جان دیتے ہیں۔ان کا نام عام لوگ نہیں جان پاتے' ان کا خفیہ کام ہی اہم ہوتا ہے اور انہیں کی قربانی زیادہ عظمت کی حامل ہوا کرتی ہے۔
ایسے ہی ہمارے ہیرو شری بھان سنگھ بھی تھے۔آپ کی ولادت سنیت نامی گاؤں ضلع لدھیانہ میں ہوئی تھی۔پہلے آپ رسالے(گھوڑسوار فوج) میں بھرتی ہوئی تھے۔مگر بعد میں نوکری چھوڑ کر امریکا چلے گئے۔کیلی فورنیا میں رہ کر 1911 کے سبھی سیاسی کاموں میں آپ بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تھے۔
باقی وہی پرانی داستان ہے۔غدر پارٹی بنی' غدر اخبار نکلا' تنظیم سازی ہوئی' اور آخر میں جنگ عظیم چھڑتے ہی لوگ ملک لوٹنے لگے۔سب سے پہلے کوریا اور توشامارو جہاز آ گئے تھے۔انہیں میں آپ بھی چل دیئے۔آتے ہی امیگرینٹس آرڈی ننس (Imigrants Ordinance) کے شکار بن گئے۔راستہ میں آپ غدر کا پرچار کرتے ہوئے آئے تھے۔
29 اکتوبر 1914 کو آپ کلکتہ پہنچتے ہی گرفتار کر لئے گئے۔نومبر کے آخر تک منٹگمری جیل میں بند رکھے جانے کے

بعد ایک دن آپ کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے سبب کچھ ساتھی آپ پر ہی شک کرنے لگے۔ مگر آپ نے اپنی مستعدی سے دوبارہ سب پر اپنی مقبولیت و معتبریت بنالی۔ کام جاری رہا اور آخر میں بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ بغاوت کے ناکام ہوتے ہی چاروں طرف گرفتاریوں کا بازار گرم ہو گیا۔ ہمارے ہیرو پر ڈکیتی اور قتل کا کوئی ثبوت نہ ہونے کے باوجود انہیں تا عمر کالے پانی کی سزا ملی۔

آپ انڈمان لائے گئے۔ یہاں کے جیلر اور دیگر حکام کو اپنی شقی القلبی پر بڑا ناز تھا اور نتیجہ کے طور پر قیدیوں اور آفسران میں ہمیشہ ہی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ ایک بار کوئی میلہ تھا۔ اس دن مٹھائی تقسیم ہوئی۔ سیاسی قیدیو کو بھی پیش کی گئی۔ کچھ لوگ مٹھائی کھا آئے۔ شری بھانا سنگھ جی نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا' بہت ناراض ہوئے۔ شورش پسندوں کے سنجیدہ پیار کے سبب ہی وہ اس طرح اپنے معاونین پر غصہ ہوئے تھے اور انہوں نے خاموشی کے ساتھ سب کچھ برداشت کر لیا۔ سبھی نے معافی مانگی۔ اس بات کا علم حکام کو ہوا۔ آپ کو کسی آفیسر نے گالی دے دی۔ آپ یہ برداشت نہ کر سکے۔ اس دن کوٹھری میں بند ہونے کے سبب سب کچھ خاموشی سے برداشت کرنا پڑا۔ اگلے دن سے آپ نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر جیلر نے چھ مہینے کے لئے ڈنڈا بیڑی پہنا کر کال کوٹھری میں بند کر دیا۔ ساتھ ہی آدھی خوراک کی سزا بھی دی۔ آدھی خوراک والے کو وافر مقدار میں پانی بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ اس گرم جزیرہ میں یہ سزا کس قدر نا قابل برداشت ہوتی ہے' یہ ہم لوگ کیا جانیں گے؟۔

نہ جانے کس نشہ میں مست ہو کر باغی ان سب نا قابل ذکر مصائب کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں! کس سچے جذبہ سے اس لائق ہو پاتے ہیں کہ اپنی زندگی کا کوئی آرام بھی انہیں لالچ دے کر راستہ سے گمراہ نہیں کر پاتا۔ چالیس برس سے زیادہ عمر کے بھان سنگھ نے اس تپش میں کم خوراک اور تھوڑے پانی کی سزا کو بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔ اس بہادر کو محبت کا نشہ پاگل کئے رہتا تھا۔ ایک دن آپ نے گانا شروع کر دیا' متر پیارے نوحال مریداں دا کہنا!' جیلر نے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ مگر ایشور بھجن سے بھی محروم کرنے کا اختیار اسے کس نے دیا؟ بھان سنگھ اب اس کا حکم کیوں ماننے لگے۔ انہوں نے گنگنانا جاری رکھا۔ آپ دوسری منزل کی کوٹھری میں قید تھے۔ اب انہیں تیسری منزل کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ کوٹھری کیا تھی' ایک خاصا تنگ صندوق تھا۔ ڈھائی مربع فٹ کی کوٹھری بھی کیا ہو سکتی ہے؟ مگر گنگنانا پھر بھی بند نہیں ہوا۔ بے درد آفیسر نے اس مرتبہ آپ کو بری طرح پیٹا۔ ہڈیاں توڑ ڈالیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا تھا؟ سیاسی قیدیوں کے ساتھ کئے جانے والے یہ غیر انسانی مظالم ان کے لئے نا قابل برداشت تھے اور انہیں کے ہاتھ جان دے کر وہ ایک طاقت ور تحریک وجود میں لانا چاہتے تھے۔

گانا بند نہ ہوتا دیکھ کر آفیسر دوبارہ مارنے گیا۔ اس بار بقیہ گروپ کو بھی پتہ چل گیا۔ روٹی کھانے کا وقت تھا۔ سبھی اس کوٹھری کی جانب دوڑے۔ مگر بیرکوں کے دروازے بند کر دیئے گئے اور اندر اس انمول رتن کو بری طرح پیٹا گیا۔ آج وہ شیر پنجرے میں بند تھا' زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ سب برداشت کرنا پڑا۔ جو بہادر بڑے جوش اور ولولہ سے ملک کی جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کے خیال سے آیا تھا' وہاں آج ناکام' قیدی بن کر اس طرح پٹ رہا تھا۔ اس وقت ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی' یہ ہم لوگ کیا سمجھیں گے؟ آخر میں انہیں وہی آدھی خوراک' کال کوٹھری اور ڈنڈا بیڑی کی سزا ملی۔ دیگر قیدیوں نے بھی کام چھوڑ دیا اور انہیں بھی سزا دی گئی۔

بھان سنگھ جی کو بری طرح مارا گیا۔ حالت سنگین ہو گئی۔ منہ میں پانی نہ جاتا تھا۔ بچنے کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ جیل کے اندر ان کی موت نہ ہو اس لئے انہیں باہر کے اسپتال میں بھیج دیا گیا۔ وہاں چند روز کے بعد اپنی زندگی کا سفر ختم کر کے دور اپنے عزیز دوستوں کے پار مریداں دا حال' کہنے چلے گئے۔

-دھنیش

شری ادھم سنگھ

امرت سر ضلع کے کسیل نامی گاؤں میں اودھم سنگھ کا جنم ہوا۔ شورش پسند اکثر زندگی کے آخری ایام میں ہی دنیا کے سامنے آتے ہیں۔ خیر' اودھم سنگھ کے عہد طفولیت کی باتوں کا علم نہ ہوسکا۔ محض اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ تجارت کے سلسلے میں وہ امریکہ چلے گئے تھے اور وہیں پر جب 'غدر' اخبار کے ذریعہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا اعلان کیا گیا تو آپ نے بھی اس میں شمولیت اختیار کرلی۔ 1914 میں جنگ عظیم چھڑتے ہی امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں نے ملک میں واپس آنا شروع کردیا۔ ایک دن امریکہ سے آنے والے ایک جہاز کے ہندوستانی ساحل پر لگتے ہی اس کے 350 ہندوستانی مسافروں میں سے سب کے سب گرفتار کرلئے گئے۔ ہندوستان میں پیدا ہوکر وہیں کے دانہ پانی سے پرورش پانے والے ان چند ہندوستانیوں کو اپنے ہی ملک کی صاف ستھری ہوا سے محروم کرکے سرکار نے پنجاب کی مختلف جیلوں میں گھٹ گھٹ کر دم توڑنے کے لئے مجبور کردیا۔ ان 350 مسافروں میں ہمارے ہیرو اودھم سنگھ بھی تھے۔

1915 کے اپریل ماہ میں پنجاب میں عظیم شورش کا پروگرام ناکام ہوجانے کے بعد لاہور فرسٹ سازش کیس کے نام سے مقدمہ چلایا گیا۔ آخر انصاف ہی تو ٹھہرا جو اودھم سنگھ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے سے پہلے ہی گرفتار کرلئے گئے' انہیں بھی اس معاملہ میں پھنسایا گیا۔ عدالت سے تاعمر کالے پانی کی سزا ملنے پر چند سال انڈمان جیل میں رکھنے کے بعد 1912 میں آپ کو مدراس کی بیلاری جیل لایا گیا۔ پنجاب کے دیگر سیاسی قیدیوں سے علاحدہ ایک دوسرے احاطہ کی سنسان کوٹھری میں اکیلے رہ اودھم سنگھ زندگی کے بقیہ دن گزار رہے تھے کہ ایک دن جب علی الصبح حکام نے آکر ان کی کوٹھری کا معائنہ کیا تو اودھم سنگھ غائب تھے۔ چاروں طرف تلاشی ہونے لگی مگر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد بھی نہ تو کسی کو اودھم سنگھ کا پتہ چلا اور نہ کوئی سمجھ سکا کہ کوٹھری کا تالا جوں کا توں بند رہنے کے بعد پولیس کی سخت پہریداری سے کب' کیسے اور کدھر سے نکل گئے۔

اودھم سنگھ جیل سے نکل کر کابل پہنچے مگر کسی شاعر کے مطابق ''بری ہوتی ہے لوگی دل کی''۔ خیر انہوں وہاں چین نہ آیا اور وہ دوبارہ آگئے اور کچھ دن کام کرنے کے بعد دوبارہ واپس چلے گئے۔ ادھر پولیس کو بھی آپ کے بغیر چین نہ تھا۔ زوروں کے ساتھ تلاشی ہونے لگی اور نوٹس بھی نکالا گیا۔ کئی بار موت کے منہ میں آکر بحفاظت نکل جانے کے بعد ایک دن جب آپ دوبارہ ہندوستان آرہے تھے تو سرحد پر انہیں گولی ماردی گئی اور وہ پھر ملک واپس نہ آسکے۔ گولی کس نے ماری' یہ آج تک ایک راز کی بات ہے۔

۔پنچم

شری خوشی رام

1919 کا سال بھی ہندوستانی تاریخ میں زندہ وجاوید رہے گا۔ جنگ کے انعام میں رولٹ ایکٹ نافذ ہونے پر ایک عظیم تحریک چھڑ گئی جس کے نتیجہ میں جلیان والا اور مارشل لا تک کی نوبت آپہنچی۔ اس وقت لوگ بہت خائف اور پریشان تھے۔ اچانک ایسی سنگین صورت حال کا ان کو سامنا کرنا ہوگا' یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ مگر ایسے برے وقت میں بھی ہمارے ہیرو شری خوشی رام جی جیسے بہادر اپنی جان پر کھیل کر اپنا نام زندہ وجاوداں کرگئے۔

آپ ایک غریب کنبہ میں 27 ساون سنوت 1957 میں پیدا ہوئے تھے۔والد کا نام لالہ بھگوان داس تھا۔ذات کے اروڑہ تھے۔ پیدائش کے تھوڑے ہی دنوں بعد والد کا انتقال ہوگیا۔آپ کی پیدائش پنڈی سید پور' ضلع جھیلم میں ہوئی۔والد کے فوت ہوجانے کے بعد لاہور نواں کوٹ کے یتیم خانہ میں آپ کی پرورش ہوئی۔آپ جسمانی لحاظ سے بہت حسین اور قوی تھے۔بہت طاقت ور تھے۔ پیدائش پر جنم پتری لکھنے والے پنڈت نے کہا تھا یہ بچہ ہاتھی کی طرح بلوان اور طاقت ور ہوگا اور اس کا نام امر رہے گا۔اس وقت آپ کا نام بھیم سین رکھا گیا مگر بعد میں 'خوشی رام' کے نام سے ہی وہ مشہور ہوئے۔

12 اپریل کو لاہور کی بادشاہی مسجد میں ایک عظیم جلسہ ہوا۔لاتعداد لوگوں جم غفیر تھا۔تقریریں کی گئیں اور خوب جوش بڑھا۔جلسہ ختم ہوا اور لوگ شہر کی جانب جلوس کی شکل میں چل دیئے۔پرچم ہمارے ہیرو کے ہاتھ میں تھا۔کوئی ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہی ہیرا منڈی بازار ہے۔یہیں وہ شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے۔آگے فوج کھڑی تھی۔اس وقت فوج کی قیادت نواب محمد علی (برکت علی) کے ہاتھ تھی۔حکم ہوا' سب لوگ منتشر ہوجاؤ۔جلوس نہیں نکلنے دیا جائے گا۔جلوس کے لیڈر خوشی رام نے کہا۔''جلوس نکلے گا اور ضرور نکلے گا اور جائے گا بھی اسی راستہ سے''۔نواب نے آسمان میں گولی چلانے کا حکم دیا۔لوگ خوف سے ادھر ادھر بھاگنے لگے تب شیر کی طرح گرج کر خوشی رام نے کہا۔'بھاگ کر خواہ مخواہ بزدل کیوں بنتے ہو؟ مرنا تو ایک ہی دن ہے پھر بہادروں کی طرح کیوں نہ مرو۔بڑے شرم کی بات ہے کہ آج گیدڑوں کی طرح بھاگ کر جان بچانے کی فکر میں گرتے پڑتے بھاگ رہے ہو۔تم لوگوں کو شرم آنی چاہئے۔وغیرہ وغیرہ''۔لوگ رک گئے۔نواب نے پھر کہا۔''جلوس منتشر کردو''۔خوشی رام اسی طرح گرج کر بولے۔''نہیں یہ نہیں ہوگا۔ہمارا جلوس اسی طرح چلے گا''۔وہ آگے بڑھے اور ادھر سے گولی چلی۔اس بار گولی ہوا میں نہیں گئی' سیدھی خوسی رام کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ایک گولی لگی' خوشی رام دو قدم آگے بڑھے۔ایک اور لگی' وہ اور آگے بڑھے۔اس طرح ایک ایک کر کے سات گولیاں ان کے سینہ میں پیوست ہوگئیں۔مگر وہ بہادر اسی طرح آگے بڑھتا چلا گیا۔آٹھویں گولی پیشانی پر دائیں جانب اور نویں بائیں طرف لگی۔اب سنبھلنا مشکل ہوگیا اور وہ ختم نہ ہونے والی نیند سو گئے اور پھر کبھی نہ اٹھے۔

اس دن ان کی لاش کے ساتھ لوگوں کا سمندر امڈ پڑا۔موجودہ اخباروں کی رپورٹ تھی کہ ان لوگوں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔خوشی رام حیات جاوداں حاصل کر گئے۔وہ آج اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کا نام' کام اور حوصلہ آج بھی زندہ ہے۔

بومیلی جنگ کے چار شہدا

مشہور ببر اکالی تحریک کے موت سے کھیلنے والے متعدد رتنوں میں سے شری کرم سنگھ جی' شری اودے سنگھ جی' شری بشن سنگھ جی اور شری مہندر سنگھ جی بھی ہیں۔میدان عمل میں قدم رکھنے کے بعد انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنا تک گوارہ نہیں کیا۔عزیز ملک کو ٹھوکر در ٹھوکر لگتے دیکھ کر وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے۔کناڈا میں ہندوستانیوں پر کئے گئے مظالم' کاما گاٹا مارو حادثہ' بج بج کا مرڈر کیس' جلیاں والا کا دردناک نظارہ' مارشل لا اور گرو کے باغ میں نہتھوں پر لاٹھی چارج وغیرہ باتوں کو وہ مزید برداشت نہ کر سکے۔اس وقت غلامی کے طوق کو توڑ پھینکنے کے لئے مجبوراً جس راستہ کا انہوں نے انتخاب کیا' درج ذیل کہانی اس کی محض ایک جھلک ہے۔

مذکورہ چاروں بہادروں میں سے شری کرم سنگھ دولت پور کے' اودے سنگھ رام گڑھ جھگیاں کے' بشن سنگھ منگت کے اور شری مہندر سنگھ پنڈوری گن سنگھ کے رہنے والے تھے۔ جس وقت کشن سنگھ گرگجن نے ببر اکالی آندولن کی بنیاد رکھی' تو ان چاروں نے ہی پرامن عدم تعاون تحریک کو چھوڑ کر اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ بہادری میں چاروں ایک سے بڑھ کر ایک تھے اور یہ لوگ ہمیشہ ہی کٹھن اور مشکل کام کو ہی پسند کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد کرم سنگھ اور اودے سنگھ اہم کارکنوں میں شمار کیے جانے لگے۔

اکالی مت اختیار کر لینے کے بعد کرم سنگھ جی نے گاؤں گاؤں ھوم کر تقریر کرنا شروع کر دیا۔ آپ میٹنگوں میں جا کر لوگوں کو سمجھاتے کہ ہم پر آئے دن جو بھی مظالم ڈھائے جا رہے ہیں' ان سب کی اہم وجہ ہماری اپنی ہی کمزوری ہے اور جب تک ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر غلامی کو دور نہیں کرتے' تب تک اسی طرح ٹھوکریں کھاتے رہیں گے وغیرہ۔ کچھ ہی دن کام کر پائے تھے کہ گرفتاری کے سامان ہونے لگے۔ وارنٹ نکلنے پر آپ فرار ہو گئے اور کام کرتے رہنے پر بھی آخر وقت تک پولیس کے ہاتھ نہ آئے۔

کرم سنگھ صرف سپاہی ہی نہیں بلکہ وہ ایک اچھے مقرر اور بہترین گانا بھی گاتے تھے۔ 'ببر اکالی' نامی اخبار ان کی ہی ادارت میں نکلتا تھا۔ ایک مدہوش عاشق کی طرح اگر انہیں کسی بات کی فکر تھی تو اپنے کام کی۔ وہ رات دن کام کر کے بھی نہیں تھکتے تھے۔ آج کسی دربار میں تقریریں ہو رہی ہیں تو کل غداروں کو سزا دینے کا قانون بن رہا ہے اور پرسوں روپیہ لے کر ہتھیار خریدنے کے لئے کہیں دور جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔

ادھر پولیس بھی آپ کو بے قراری کے ساتھ تلاش کر رہی تھی۔ جگہ جگہ پولیس کے لوگ تعینات تھے۔ انعامات کا بھی اعلان کیا گیا مگر وہ پھر ہاتھ نہیں آئے۔

اودے سنگھ جی سے آپ کا بہت قریبی تعلق تھا۔ اکثر و بیشتر وہ لوگ ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ فرار بھی دونوں ساتھ ہی ہوئے اور آخری وقت میں بھی دونوں نے ساتھ ہی ساتھ لڑ کر جان دی۔ محبت اور دوستی کی کتنی روشن مثال ہے؟

پولیس کو ببر اکالیوں کے بارے میں بھید دینے کے جرم میں اودے سنگھ نے 14 فروری 1923 کو ہیئت پور میں دیوان کو ہلاک کر ڈالا۔ آپ کا کہنا تھا کہ میں دشمن کو چھوڑ سکتا ہوں مگر گھر کے بھیدی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے بعد 27 مارچ 1923 کو اسی جرم میں آپ دونوں ساتھیوں نے کچھ اور ساتھیوں کو لے کر بائیول پور کے ہزارا سنگھ کا قتل کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی چند غداروں کو ان کے جرم کی سزا ان لوگوں نے دی۔ سزا کا قانون صرف موت ہی نہیں تھا۔ جرم کم ہونے پر اس کی جائیداد لے کر یا ناک کان کاٹ کر بھی چھوڑ دیا جاتا تھا۔

ایک دن جب یہ چاروں بہادر کپورتھلہ اسٹیٹ کے بومیلی گاؤں کے پاس سے ہو کر گزر رہے تھے تو کسی مخبر نے پولیس سپرنٹنڈنٹ مسٹر اسمتھ کو اس بات کی خبر دے دی۔ بس اسی لمحہ فوج کے چھ پیدل سپاہی اور کچھ سوار لے کر ان کا تعاقب کیا۔ ایڈیشنل پولیس کے سب انسپکٹر فتح خاں کو بھی پچاس آدمی لے کر دوسری جانب بھیجا گیا۔ مسٹر اسمتھ کو تعاقب کرتے دیکھ کر ان لوگوں نے چونتا صاحب کے گرودوارے میں جو نزدیک ہی تھا' پناہ لینے کا ارادہ کیا۔ مگر پیچھے سے گولی چل رہی تھی۔ آخر کار یہ لوگ دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے گرودوارہ کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی تک فتح خاں کے آدمی ایک طرف چھپ کر کھڑے تھے۔ مگر گولی چلنے کی آواز سن کر وہ لوگ بھی باہر آ گئے۔ گرودوارہ کے چاروں جانب ایک نالہ تھا' یہ چاروں بہادر اسمتھ کی مسلح فوج کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے اس نالہ کے قریب پہنچ گئے اور پانی میں گھسے ہی تھے کہ پیچھے سے کچھ دور کھڑے ہوئے

فتح خاں کے آدمیوں نے بھی گولی باری شروع کر دی۔ ایک جانب تو مسلح فوج اور دوسری جانب چار آدمی اور وہ بھی فوج کے درمیان۔ بھلا وہ کب تک مقابلہ کر سکتے تھے۔ خیر' کچھ دیر اسی طرح سامنا کرنے کے بعد اودے سنگھ اور مہندر سنگھ گولی کھا کر پانی میں گر گئے۔

کرم سنگھ نے کسی طرح نالہ کو پار کر گئے اور دوسرے کنارے سے ران تک پانی میں کھڑے ہو کر دشمنوں پر گولی چلانے لگے۔ فتح خان نے دوسرے کنارے سے آواز دے کر کہا۔ "خود سپردگی کردو" مگر اس بہادر نے تو مرنے اور مارنے کا عہد کر لیا تھا۔ اس نے 'نہ' کہتے ہوئے فتح خان پر گولی چلائی۔ بدقسمتی سے نشانہ خطا کر گیا اور دوسرے لمحہ ہی وہ بہادر بھی پیشانی پر گولی کھا کر ہمیشہ کے لئے اسی پانی میں گر گیا۔

جس وقت کرم سنگھ نالے کی دوسری جانب سے فوج کے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر رکھی تھی' اس وقت بشن سنگھ جی جو ابھی نالہ کے اسی کنارے پر تھے' موقع پا کر قریب کی ناریل کی جھاڑی میں چھپ گئے۔ ناریل کے ہلنے پر شک ہوا اور دو آدمی وہاں دیکھنے کے لئے بھیجے گئے۔ ان کے پاس آتے ہی 'ست شری اکال' کے نعرے کے ساتھ ہی بشن سنگھ نے ان پر حملہ کر دیا اور تلوار کے پہلے ہی وار میں ایک کو بری طرح زخمی کر دیا۔ دوسرے کے کچھ دور ہٹ جانے پر جب آپ نالے کو پار کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو اس دوسرے سپاہی نے ان پر گولی چلا دی اور اس طرح آپ بھی اپنے تین دوسرے ساتھیوں کی طرح اسی نالے میں گر گئے۔

یہ واقعہ یکم ستمبر 1923 کا ہے۔

-مدھوسین

شری دھنا سنگھ

پنجاب کے بابئل پور نامی ایک گاؤں میں ان کا بچپن گزرا۔ وہ جسمانی طور پر بہت طاقت اور خوب رو تھے۔ شجاعت او ولولہ تو ان کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا اور خوف خود ان سے ڈرتا تھا۔ گرو کے باغ میں اکالیوں پر کیئے گئے مظالم کو دیکھ کر آپ پرامن تحرک کے مخالف ہو گئے۔ ان ہی دنوں آپ جیسے نظریات رکھنے والے چند دیگر بہادر بھی ملک کو غلامی کے طوق سے نجات دلانے کے غور و خوض میں کوئی دوسری راہ اختیار کر رہے تھے۔ بس' ببر اکالی تحریک کی بنیاد پڑی اور آپ نے بھی اسی میں شمولیت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پرچار کا کام اور تنظیم کے ساتھ ہی غداروں کو سزا دینے میں بھی آپ نے کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ پولیس کے ساتھ مل کر جس وقت پٹواری ارجن سنگھ اکالیوں کو ہر طرح سے نقصان پہنچا رہا تھا۔ اس کو ہلاک کرنے کی دونوں کوششوں میں آپ کا بہت ہاتھ تھا۔ بعد میں 10 فروری 1923 کو تین دیگر ساتھیوں کو ساتھ لے کر آپ نے رانی تھانہ کے بشن سنگھ نامی ضلع دار کو پولیس کا مخبر ہونے کے سبب مار ڈالا۔ اس کام میں آپ کے ساتھ پھانسی پانے والے سنت شری سنگھ بھی تھے۔ بعد میں ایک نوٹس کے ذریعہ اس بات کا اعلان کیا گیا کہ بشن سنگھ کو محض 'اصلاح' کے لئے ہلاک کیا گیا۔

شری بنتا سنگھ دھامیا کے ذریعہ مارے جانے والے 'بوٹا' لمبر دار کے قتل میں بھی آپ شامل تھے۔ کہتے ہیں کہ اس لمبر دار نے کتنے ہی معصوم اکالی بہادروں کو یوں ہی پولیس کے جال میں پھنسا دیا تھا اور اسی سبب اس کی اصلاح کی ضرورت سمجھ کر ان

لوگوں نے یہ کارنامہ انجام دیا۔

اس کے کچھ ہی دنوں بعد 19 مارچ 1923 کو تین اور ساتھیوں کو ساتھ لے کر مستری لابھ سنگھ نامی شخص کی 'اصلاح' کی۔ اور پھر 27 مارچ 1923 کو بائبل پور گاؤں کے 'ہزارہ' نامی شخص کو جس نے پولیس کو آپ کے بارے میں بہت ساری باتیں بتا رکھی تھیں' جا مارا اور اس قتل کے بارے میں 'ببر اکالی' نامی پرچہ میں اس طرح لکھا گیا تھا۔ ''انعام xx آج 27 مارچ کو بائبل پور کے ہزارہ سنگھ کو زمین کے تین اسکوائر یعنی تین گولیاں دی گئیں۔

اسی طرح غداروں اور ملک دشمنوں کو ان کے جرم کا انعام دیتے اور تحریک کا پرچار کرتے ہوئے دن گزر رہے تھے کہ ایک دن 25 اکتوبر 1923 کو آپ پولیس کے حصار میں آ گئے۔ آج تک بھارت میں جتنی شورش برپا کرنے کی کوششیں ہوئیں' ان سبھی کی ناکامی کے پس پردہ اپنے بھائیوں کی غدارانہ حرکتیں تھیں۔ خیر' آپ جوالا سنگھ نامی ایک دوسرے شخص کے پاس لڑکے دلیپ سنگھ کی گرفتاری کے بارے میں پوچھتا چھ کرنے گئے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ دلیپ سنگھ پر انہیں جوالا سنگھ کی مہربانی ہوئی ہے۔ جوالا سنگھ نے دھنا سنگھ کو ایک گنے کے کھیت میں بٹھا دیا اور خود کسی بہانے سے جا کر پولیس سب انسپکٹر گلزار سنگھ کو اطلاع دے دی کہ دھنا سنگھ کسی خاص مقام پر موجود ہے۔ اس پر دنوں نے ہوشیار پور جا کر پولیس سپرنٹنڈنٹ مسٹر ہارٹن کو اس کی اطلاع دی۔ سنتے ہی ہارٹن نے جوالا سنگھ سے دھنا سنگھ کو ہوشیار پور کے منہانا نامی گاؤں کے کرم سنگھ کے چوبارے میں لا کر ٹھہرانے کو کہا۔ جوالا سنگھ نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے روز رات کو یہ دونوں ہی کرم سنگھ کے یہاں بیلوں کے باڑے میں چارپائیوں پر سوئے۔ آدھی رات کا وقت تھا' جوالا سنگھ پولیس کو آتا دیکھ کر بھاگ گیا۔ پولیس باڑے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ دھنا سنگھ بھی اٹھ کر اسی سمت چل پڑے جدھر جوالا سنگھ گیا تھا۔ پولیس والوں نے' جنہیں کہ پہلے شخص کو دانستہ نکل جانے دیا تھا' آپ کو چاروں جانب سے گھیر لیا۔ اس وقت مجموعی طور پر 40 آدمی تھے۔ محصور ہو جانے کے بعد آپ ابھی اپنا ریوالور نکال ہی رہے تھے کہ پولیس سب انسپکٹر گلزارہ سنگھ نے آپ پر لاٹھی چلا دی۔ اچانک اس حملہ سے بچنے کی ناکام کوشش میں دھنا سنگھ جی اپنے کو سنبھال نہ سکے اور زمین پر گر گئے۔ اب کیا تھا' فوراً ہی لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے اور بہت مشکل کے بعد آپ کو پکڑنے میں کامیاب ہوئے۔ ہتھکڑی لگنے کے بعد بھی آپ نے کئی بار اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش تھی۔ خیر آپ کو ایک جگہ بٹھا کر دو تین پولیس والوں نے ہتھکڑی کی زنجیر پکڑ لی اور دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھا رکھا۔ خوف بڑی چیز ہے' لہٰذا اس پر بھی تسلی نہ ہونے پر ایک آدمی نے پیچھے سے آپ کی دونوں کلائیاں بھی پکڑ لیں۔

وقت کی رفتار بھی نرالی ہے۔ جو دھنا سنگھ ابھی چند گھنٹوں قبل قوم کی تعمیر کا خواب دیکھ رہے تھے' وہی دھنا سنگھ مجرم بن کر اپنی قسمت کے نپٹارے کے لئے ایک دوسرے کا منہ دیکھیں گے؟ تو کیا دھنا سنگھ گرفتار ہو گیا؟ نہیں' بھلا یہ بھی کبھی ممکن ہے! انہوں نے مرنے کی قسم کھائی تھی' نہ کہ گرفتار ہونے کی۔ خیر' جس وقت پولیس والے پکڑ کر کھڑے تھے' کہ اچانک آپ نے ایک ایسا زوردار جھٹکا دیا کہ ہاتھ نیچے آ گیا اور ساتھ ہی کمر کے پاس چھپے ہوئے بم میں کہنی کی ایک ایسی چوٹ ماری کہ یکا یک دھماکہ ہو گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے چاروں جانب بھگدڑ مچ گئی اور جہاں دھنا سنگھ بیٹھے تھے' وہاں خون' گوشت اور ہڈیوں کے ذخیرہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں بچا ہوا تھا۔ ساتھ ہی پولیس کے بھی پانچ آدمی تو جان سے مارے گئے اور تین بہت بری طرح زخمی ہو گئے جن میں سے مسٹر ہارٹن اور ایک کانسٹبل اسپتال میں بعد میں زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے اور اس طرح یہ بہادر کھلاڑی اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ گیا۔

-چتر انن

شری وریام سنگھ ڈھگا

شری وریام سنگھ جی کی پیدائش دھگانامی گاؤں، ضلع ہوشیارپور میں تقریباً 1892یا93 میں ہوئی۔آپ بہت مضبوط اور طاقت ور شخص تھے۔جسم گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔آپ بھی فوج میں بھرتی ہوگئے تھے۔بہت دنوں تک وہیں پر فوجی ٹریننگ حاصل کرکے ملازمت اختیار کی۔اس دوران ایک دن کسی گھریلو دشمن سے انتقام لینے کے لئے شام کی حاضری دے کر آپ چلے گئے۔بیس میل کے فاصلے پر بھاگتے ہوئے گئے۔اس شخص کو قتل کرکے اپنے نام کا اعلان کرکے صبح کی حاضری تک پلٹن میں پھر آگئے۔اس لئے آپ کے خلاف ادھر کچھ بھی نہ ہوسکا۔بھلا فوج کے رجسٹر بھی جھوٹ ہوسکتے ہیں؟ بعد میں آپ ڈاکو بن گئے۔دوآبے میں آپ بڑے مشہور ڈکیت تھے۔چاروں جانب آپ کے نام کا رعب ودبدبہ تھا۔

مگر ببر اکالی جتھے کے بنتے ہی آپ اس میں شامل ہوگئے اور شری بلونت سنگھ جی کے ساتھ مل کر بھی کاموں میں حصہ لینے لگے۔

اس دن 12 دسمبر 1923 کو جب بنتا سنگھ منڈیر نامی گاؤں میں محصور ہوگئے تو آپ بھی ان کے ساتھ تھے۔مگر مکان میں آگ لگنے پر ہمت کرکے حصار سے فرار ہوگئے تھے۔آپ کو دیکھتے ہی سپاہیوں کی جان سوکھ جاتی تھی۔

اس کے بعد آپ دور لائل پور چلے گئے۔ادھر ایک رشتہ دار کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔بچپن سے اسی رشتہ دار نے آپ کی پرورش کی تھی۔مگر حرص، لالچ اور خودغرضی انسان کی انسانیت تک کو برباد کردیتی ہے۔وریام سنگھ جی سے کہا گیا۔''ہتھیار گاؤں سے باہر کھیتوں میں رکھ دیجئے تاکہ کسی کو شک نہ ہوسکے''۔گاؤں میں لے گئے، کھانا وغیرہ کھلایا۔رات تاریک تھی۔ کھانا کھاتے ہی کہا۔''جاتا ہوں، ہتھیار دور چھوڑ کر دل میں نہ جانے کیا ہونے لگتا ہے''۔لوٹ کر ہتھیار والے مقام کی جانب چل دیئے۔مگر فوج نے تو پہلے ہی سے اس جگہ کا محاصرہ کررکھا تھا۔پولیس سپرنٹنڈنٹ مسٹر ڈی گیل مہاشے پہلے آرمی آفیسر رہ چکے تھے۔بڑے حوصلہ مند اور بہادر تھے۔ان کا ارادہ انہیں زندہ گرفتار کرنے کا تھا۔مگر اس بہادر نے ارادہ کررکھا تھا لڑکر مرنے کا۔چاروں سمت سے فوج گھیرے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔آپ بھی سب کچھ تاڑ گئے۔ایک مقام پر کھڑے ہوکر سوچنے لگے کہ کیا جائے تو کیا؟ مسٹر ڈی گیل نے بہ آواز بلند کہا۔''وریام سنگھ! خودسپردگی کردو''۔وریام سنگھ نے جواب دیا۔ ''ارے! ہمت ہے تو ایک بار ہتھیار لے لینے دو، پھر دو دو ہاتھ ہو ہی جائے''۔مگر یہ راجپوتانہ شان کی باتیں وہاں کہاں؟ مسٹر ڈی گیل نے آپ کو پیچھے سے پکڑ لیا۔دونوں ہاتھ قابو میں آگئے۔اپنی کرپان نکال کر وریام سنگھ نے اس کے بازوؤں کو بری طرح زخمی کرکے اسے زمین پر گرادیا۔خرگوشوں میں اس وقت وہ شیر گھرا ہوا تھا۔دشمن زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے مگر آپ کی کرپان دیکھ کر سب دل مسوس کررہ جاتے تھے۔کئی بار دو چار سپاہی آگے بڑھے مگر زخمی ہوکر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔

آخر کار مسٹر ڈی گیل نے ان پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔چاروں جانب سے گولیوں کی برسات شروع ہوگئی۔اس طرح سینے پر گولیاں کھاکر وہ بہادر سورگ کی جانب چل پڑے۔

ان کی لاش لائل پور لے جائی گئی۔ ہزاروں مرد عورت دیدار کے لئے وہاں جمع ہوگئے۔ یہ واقعہ 8 جون 1924 کا ہے۔

۔بھوشن

شری کشن سنگھ گرگج

آپ جالندھر ضلع کے وارنگ نامی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام شری فتح سنگھ تھا۔ کچھ وقت تک اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہو گئے اور پھر مارچ 1921 تک 35 نومبر سکھ رسالے میں حولدار کے عہدے پر کام کرتے رہے۔

جلیاں والا باغ کے حادثہ کے بعد ملک میں عدم تعاون کی وسیع لہر چل پڑی اور اسی سے متاثر ہو کر آپ نے بھی ملازمت سے استعفادے دیا۔ آپ نے گرفتار ہونے پر تحریری بیان میں کہا تھا: ''جب میں فوج میں نوکری کر رہا تھا تبھی سردار اجیت سنگھ کی نظر بندی دہلی کے رکاب گنج گردوارے کے توڑے جانے' بج بج میں بے گناہ مسافروں پر گولی چلانے' رولٹ ایکٹ اور جلیاں والا باغ کے حادثہ اور مارشل لا وغیرہ باتوں کے سبب میرے دل میں نفرت جنم لینے لگی اور آخر میں غلامی کے بوجھ کو مزید نہ برداشت کرنے کے سبب میں نے سرکاری نوکری چھوڑ کر قومی تحریک میں حصہ لیا''۔

ابھی پچھلے زخم بھر بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور گہری چوٹ سے جان نکلنے لگی۔ 21 فروری 1920 کی ننکانہ صاحب کے حادثہ کے بعد آپ نے اکالی دل میں حصہ لینا شروع کر دیا اور اپریل میں مذکورہ گروپ کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ مگر اس طرح چپ چاپ پولیس کے ہاتھوں مار کھانا آپ کو اچھا نہ لگا اور انہوں نے خفیہ تنظیم کے تحت کام کرنا شروع کر دیا۔

ابھی کام شروع ہی ہوا تھا کہ دو افراد کی نااحتیاطی کے سبب کئی راز کھل گئے۔ چھ آدمی تو گرفتار کیے گئے مگر آپ اور چار دیگر ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو گئے۔ کچھ دن مالوا میں جند اسٹیٹ کے مستوآن نامی مقام پر رہ کر آپ 1921 کی سردی میں دوبارہ دوآبہ واپس آ گئے۔ آتے ہی آپ نے 'چکرورتی دل' جو بعد میں 'ببر اکالی دل' کے نام سے مشہور ہوا' کے بنانے کا اعلان کیا اور گاؤں گاؤں جا کر تقریریں کرنی شروع کر دیں۔ کشن سنگھ ایک اچھے مقرر تھے۔ خیر' لوگوں پر ان کی باتوں کا کافی اثر پڑتا تھا۔ کہتے ہیں کہ گرفتاری کے وقت تک آپ نے کل 327 تقریریں مختلف مقامات پر کیں۔

جس وقت کپورتھلہ اسٹیٹ اور جالندھر ضلع میں کشن سنگھ جی اپنے کام کو بڑھا رہے تھے' ٹھیک اسی وقت ہوشیار پور ضلع میں دولت پور کے کرم سنگھ اور اودے سنگھ جی جو کہ بعد میں بومیلی کے پاس پولیس کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے' اسی طرح کے خیالات کی تشہیر کر رہے تھے۔ آخر میں ان دونوں پارٹیوں کے انضمام کے بعد کام مزید شدت اختیار کر گیا۔ بم' ریوالور اور بندوقیں جمع کی گئیں اور جگہ جگہ مراکز قائم کیے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وافر طاقت حاصل ہونے کے بعد فوج کی مدد سے 1857 کی طرح غدر سے ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔ یہ لوگ گھر کے بھیدی کو قطعی معاف نہیں کرتے تھے۔

'ببر اکالی' لوگ مخبروں کو قتل کر کے ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ خیر' بہتوں کی 'اصلاح' اور کام کو کافی توسیع دینے کے بعد آخر میں راز کھل گیا اور گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ کشن سنگھ بھی گرفتار کر کے لاہور لائے گئے۔ مقدمہ چلنے کے بعد آپ نے سبھی باتیں تسلیم کر لیں اور کہا: ''میں سرکار کا سخت ترین دشمن تھا اور جیسے بھی ہو' انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لئے ہی یہ سب کچھ کیا''۔ عدالت سے آپ کو پھانسی کی سزا ملی اور ایک دن لاہور سینٹرل جیل میں وہ بھی اسی جانی پہچانی رسی سے لٹکا دیے گئے۔

—موہن

شری سنتا سنگھ

آپ لدھیانہ ضلع کے 'ہریوں خورد' نامی گاؤں کے باشندہ تھے۔ والد کا نام صوبہ سنگھ تھا۔ سنتا سنگھ کے عہد طفولیت اور تعلیم کے بارے میں کچھ خاص معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ ہاں 1920ء کے فروری مہینے میں آپ 54 نمبر سکھ رسالے میں بھرتی ہوئے اور دو سال تک ملازمت کے بعد 26 جنوری 1922 کو وہاں سے استعفادے دیا۔ فوج میں ملازمت کرنے کے پہلے آپ خالصہ ہائی اسکول لدھیانہ میں قرقی کا کام بھی کر چکے تھے۔

ملازمت ترک کرنے کے بعد اکالیوں کے ایثار اور طاقت سے متاثر ہو کر آپ نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا اور کچھ ہی دنوں میں اپنی دانائی اور کام سے وابستگی کے سبب تحریک کے اہم لیڈروں میں شمار کئے جانے لگے۔ فیصلہ سناتے ہوئے جج نے آپ کے بارے میں کہا تھا۔''اکالیوں کے چند کاموں کو چھوڑ کر اس ملزم نے سبھی میں حصہ لیا ہے اور اس سازش میں کشن سنگھ اور کرم سنگھ کے بعد اسی کا زیادہ ہاتھ تھا''۔

مقصد کی حصولیابی میں خلل پہنچتا دیکھ کر آپ نے بشن سنگھ جیل دار کو تنہا ہی جا کر ہلاک کر دیا۔ اس کے علاوہ بوٹا' لابھ سنگھ' رالا اور دتو' صوبےدار گینڈا سنگھ اور نوگل شمع کے نمبردار وغیرہ ملک کے غداروں کو ان کے جرم کی سزا دینے میں آپ شامل تھے۔

آخر میں اپنے ہی ایک رشتہ دار کی دھوکہ دہی سے آپ ایک دن گرفتار ہو گئے۔ عدالت سے چند سوال کئے جانے پر آپ نے کہا۔''اس سرکار سے مجھے کسی طرح کے انصاف کی امید نہیں' لہٰذا میں ایک بھی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔

آخر میں آپ نے اقبال جرم کر لیا۔ انہوں نے کہا''اگرچہ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ اقبال جرم کے بعد میرا کیس مزید خراب ہو جائے گا مگر پھر بھی میں نے جو کچھ کیا' وہ بھلائی کے لئے کیا۔ خیر میں اس میں سے ایک بات کو بھی چھپانا نہیں چاہتا''۔

عدالت سے آپ کو پھانسی کی سزا ملی اور 27 فروری 1926 کو لاہور سنٹرل جیل میں آپ پانچ ساتھیوں سمیت تختہ دار پر جھول گئے۔

شری دلیپ سنگھ

ترن دلیپ! بزدلی کے اس دور میں ہندوستان کی خوابیدہ گناہ گار روح کو مشتعل کر کے اچانک تم کس خلا میں جا ملے؟ 17 برس کی چھوٹی عمر میں کس نشہ میں چور ہو کر تم نے وہ سب کام کئے تھے؟ وہ عملی مہارت' وہ حوصلہ' وہ جوش اور وہ لگن تم نے اتنی جلد کہاں سے حاصل کی تھی؟ یہ سب باتیں شاید بہت کچھ سر مارنے کے بعد بھی آج کے ہم بزدلوں کی سمجھ میں نہیں آسکیں گی!

دھمیاں کلاں ضلع ہوشیار پور میں شری لابھ سنگھ جی کے گھر اس بہادر کا جنم ہوا۔ تھوڑا بڑا ہونے پر اسکول میں بٹھائے جانے کے بعد سے ہی بچہ نے اپنی مہارت کا ثبوت دینا شروع کر دیا۔ دلیپ پڑھنے لکھنے میں بہت اچھے نہ ہونے پر بھی اپنے ساتھیوں میں سب کے عزیز تھے۔ اپنی منشا کے مطابق کام لے لینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

1922 کا زمانہ تھا۔ ابھی لڑکپن کے کھیل کود کے دن ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ اس نازک دل کو گہرا زخم پہنچا۔ ننکانہ صاحب حادثہ اور اکالیوں پر کئے گئے مظالم نے اس جذباتی دل کو بالکل بے قرار کر دیا۔ بس مارچ 1923 میں لاڈ پیار سے پالے گئے اس بچہ دلیپ سنگھ نے گھر بار پر لات مار کر اکالی مت کی تعلیم حاصل کی۔

اس کے بعد آپ نے کیا کارنامے انجام دیئے' اس بارے میں عدالت میں فیصلہ سناتے وقت آپ سے متعلق کہے گئے جج کے الفاظ کو یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ جج نے فیصلے کے وقت کہا تھا:

"This accused, young as he is appears to have established a record for himself second only to that of Santa Singh accused, as to the offences in whic he has been concerned in connection with this conspiracy. He is implicated in the murders of Buta Lumberdar, Labh Sing Mistri, Hazara Singh of Baiblapur, Ralla and Dittu of Kaulgarh, Ata Mohammad Patwari, in the 2nd and 3rd attempts on Labh Singh of Dhadda Fateh Singh, and in the murderous attack on Bishan Singh of Sandhara.

اسی طرح کام کرتے ہوئے ایک دن سنتا سنگھ کے ساتھ 'کندی' نامی مقام پر کچھ پرچے تقسیم کرنے کے لئے جارہے تھے کہ اچانک پولیس نے گھیر لیا۔ 12 اکتوبر 1923 کو ترن دلیپ زنجیروں میں بندھ کر ملتان جیل لائے گئے۔ بچہ سمجھ کر لوگوں نے چاہا کہ خوف زدہ کر کے کچھ باتیں معلوم کرلی جائیں' مگر امیدوں پر پانی پھرتا ہوا دیکھ کر ان کی برہمی کی انتہا نہیں رہی۔ بھلا ایک چھوٹے سے لڑکے کی گستاخی وہ لوگ کیوں برداشت کرنے لگے۔ بس مار پڑنے لگی۔ کبھی کبھی درمیان میں کچھ لالچ بھی دیا گیا مگر آخر میں اسی ایک خاموشی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آیا۔

کہتے ہیں کہ شری دلیپ سنگھ بہت معصوم اور حسین تھے۔ عمر تو محض 17 برس کی تھی ہی۔ آپ کے بچپن اور معصومیت پر مسٹر ٹیپ (Tapp) سیشن جج حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں پھانسی کی سزا دی جائے۔ مگر بھی گواہوں کی گواہی آپ کے خلاف سن کر آپ پریشان ہو گئے تھے اور کسی بھی طرح یہی چاہتے تھے کہ شری دلیپ سنگھ کے خلاف کچھ نہ لکھیں۔ کئی دن تک یہی کھینچ تان چلی' آخر کار ایک دن شری دلیپ سنگھ ہاتھ باندھ کر جج صاحب کے ساتھ جا کر کھڑے ہو گئے اور کہا۔ "آپ کے اس نظر کرم کے لئے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں لیکن برائے مہربانی پہلے بیان لکھ لیجئے۔ میں نے یہ سب کچھ کیا ہے اور اگر آج بری ہو جاؤں تو بھی یہی سب کچھ کروں گا۔ مگر مجھے زندہ رکھنے کے لئے آپ کیوں اصرار کر رہے ہیں؟ میں تو پھانسی پر لٹک کر جان دیئے جاتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مجھے ایشور کی مہربانی سے جو انسانی جسم جیسی انوکھی چیز ملی ہے' اسے ابھی تک میں نے کسی طرح بھی ناپاک نہیں کیا اور چاہتا ہوں کہ آج اسی طرح اس مقدس جسم 'ماں' کے قدموں پر پیش کر دوں۔ کون کہہ سکتا ہے' کچھ دن زندہ رہا تو یہ تقدس قائم رہے یا نہیں اور پھر اس ایثار کی ساری اہمیت اور حسن جاتا رہے"۔

جج حیران ہو کر ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ خیر فیصلہ سنائے جانے پر انہیں پھانسی کی سزا ملی۔

27 فروری 1926 کا دن تھا۔ کائنات کی پہلی سورج کی سرخ شعاعوں کے ساتھ خدا نے اس نوجوان سنیاسی کی پاک زندگی پر اپنی مہر ثبت کر دی۔

خوں کے حرفوں سے لکھا جائے گا تیرا واقعہ
مجھ کو بھولے گی نہ یہ پرغم کہانی ہائے ہائے

-کرپل

شری نند سنگھ

آپ کی پیدائش 1895 میں جالندھر ضلع کے گھوڑیال نامی گاؤں میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام گنگا سنگھ جی تھا۔ چھوٹی عمر میں والدین کا سایہ سر سے اٹھنے کے سبب آپ کی پرورش راولپنڈی میں اپنے بڑے بھائی کے پاس پائی۔ یہ بچپن سے ہی بڑے پھرتیلے تھے اور کھیل کود میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ 15 برس کی عمر میں شادی ہو جانے کے بعد آپ کچھ وقت تک بڑھئی کا کام کرتے رہے اور پھر بصرہ چلے گئے۔

ننکانہ صاحب واقعہ کے بعد اکالی تحریک نے شدت اختیار کر لی اور آپ بھی اس میں حصہ لینے کی خواہش لے کر ملک واپس آ گئے۔ اس وقت گرو کے باغ ستیہ گرہ میں انہیں بھی چھ مہینے کی سزا بھگتنی پڑی تھی۔ جیل میں مار بھی اچھی کھانی پڑی۔ خیر' یہیں سے آپ کے خیالات میں تبدیلی شروع ہو گئی۔ اس نوجوان باضمیر شخص نے دیکھا کہ اس طرح بے رحم پولیس والوں کا ڈنڈا کھانے سے کام نہیں چلے گا۔ خیر' جیل سے باہر آتے ہی آپ نے کشن سنگھ کے ببر اکالی دل میں شمولیت اختیار کر لی۔ انہوں نے اب مار کھانے کی بات چھوڑ کر مرنے اور مارنے کی قسم لی۔

ستیہ گرہ میں سزا ہونے پر آپ کے بھائی نے معافی مانگ کر رہائی پانے کا مشورہ دیا۔ کہا۔ ''بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ لڑکے کی شادی کرنی ہے۔ اس لئے اگر ان حالات میں آپ بھی جیل چلے گئے تو کچھ بھی نہیں ہو سکے گا''۔ اس پر آپ نے جواب دیا۔ ''اگر بڑے بھائی کے بغیر شادی ہو سکتی ہے تو میرے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ ان شادی جیسے گھریلو معاملات کے لئے میں قوم کا کام روکنا نہیں چاہتا۔

ببر اکالی آندولن میں حصہ لینے کے بعد سے گاؤں کا صوبیدار گیندا سنگھ آپ کو بہت تنگ کرنے لگا۔ وہ ان کی سبھی باتوں کی اطلاع پولیس کو دیتا تھا۔ خیر' ایک دن آپ نے اسے ہلاک کر دیا۔ پولیس 11 دن تک گاؤں والوں کو تنگ کرتی رہی تب آپ نے ان لوگوں سے کہا۔ ''جو کچھ کیا ہے میں نے کیا ہے۔ تم لوگ خواہ مخواہ ان لوگوں کو کیوں تنگ کرتے ہو''۔

آپ کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا۔ اور پھانسی کی سزا ہوئی۔ سزا سنائے جانے کے بعد آپ نے گھر والوں سے کہا۔ ''تم لوگ میری فکر نہ کرنا۔ میں بری موت نہیں مر رہا ہوں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میری جان ملک کے کام آ رہی ہے۔ میں نے عمارت کی بنیاد ڈال دی ہے۔ اب یہ ملک کا فرض ہے کہ اگر وہ آزاد ہونا چاہتا ہے تو اس بنیاد پر مکان بنا کر کھڑا کرے''۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ مرنے کے بعد ہم سب کو ایک ہی آگ پر جلانا اور راکھ کو راوی میں ڈال دینا۔

آخر میں 27 فروری 1926 کو لاہور سنٹرل جیل میں پانچ ساتھیوں کے ساتھ آپ کو پھانسی دے دی گئی اور ان کے عزیزوں نے ان کی خواہش کے مطابق سب کی ایک ہی چتا پر آخری رسومات ادا کیں۔

-نٹ ناتھ

شری کرم سنگھ

آپ کے والد کا نام شری بھگوان داس تھا۔ قوم کے سنار تھے اور جالندھر ضلع کے منکو نامی گاؤں میں آپ کا گھر تھا۔ بچپن کھیل کود میں گزرا اور گھر کے غریب ہوتے ہوئے بھی آپ کا دل دنیاوی کاموں میں کم لگتا تھا۔ کم عمری سے ہی انتہائی شوخ

وچنچل تھے اور کبھی کسی کی سخت بات برداشت نہیں کرتے تھے۔

عدم تعاون تحریک کے دنوں میں آپ نے آزادی کا سبق پڑھا اور کشن سنگھ کے ببر اکالی دل بننے کے بعد آپ نے اس میں شمولیت اختیار کرلی۔

گیندا سنگھ صوبیدار کی ہلاکت میں آپ بھی شامل تھے۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک پرچار کا کام کرنے کے بعد آپ 12 مئی 1923 کو گرفتار کرلئے گئے۔

مقدمہ چلنے پر آپ نے کہا۔"عدالت کی مکمل کارروائی ایک ڈرامہ کی مانند ہے اور جج لوگ پولیس کے ہاتھ میں کھلونے کی طرح ہیں۔ خیر، میں کسی طرح کا بیان یا صفائی وغیرہ نہیں دینا چاہتا"۔ جیل میں بیان لینے کے لئے آپ کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا گیا اور اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ ساری بات پولیس کو بتادیں۔ مگر آپ نے کسی بھی بات کا جواب دینے سے انکار کردیا۔

عدالت نے آپ کو پھانسی کی سزا دی اور 27 فروری 1926 کو لاہور سینٹرل جیل میں پانچ دیگر ساتھیوں کے ساتھ آپ کو پھانسی دی گئی۔

-پربھات

Caption

لالہ لاجپت رائے

راج گرو، بھگت سنگھ اور سکھ دیو کی شہادت کے بعد

لاہور میں شائع شدہ پوسٹر

سائمن کمیشن کی مخالفت کرنے پر

پولیس کی لاٹھیوں سے زخمی لالہ لاجپت رائے

کرتار سنگھ سرابھا　　　　　　　شچیندر ناتھ سانیال　　　　　　　یتندر ناتھ داس

سکھ دیو اور ان کی ماں رلّی دیوی

راج گرو اور ان کی ماں پاروتی دیوی

چندر شیکھر آزاد اور ان کی ماں جگرانی دیوی

شہید بھگت سنگھ کے ذریعہ 'مہارتھی' میگزین کے ایڈیٹر کو ہندی میں بھیجا گیا خط

شہید بھگت سنگھ کے ذریعہ سینٹرل جیل لاہور سے

چھوٹے بھائی سردار کلتار سنگھ کو

3 مارچ 1931 کو تحریر کیا گیا خط

بٹوکیشور دت کے دستخط

جو بھگت سنگھ نے لئے تھے۔

پنجاب کے داخلہ سکریٹری کے ذریعہ محکمہ داخلہ

نئی دہلی کو ارسال کردہ تار۔ اس میں بھگت سنگھ،

راج گرو اور سکھ دیو کو ایک روز قبل پھانسی کا

حکم جاری کیا گیا ہے۔

سزائے موت کا وارنٹ اور موت کا تصدیق نامہ

شہید بھگت سنگھ کی ماں ودیاوتی جی کو 'مادر پنجاب' کے اعزاز سے نوازا گیا۔

اس موقع پر ان کے لڑکے اور لڑکیاں

ایک شہید کی جیل نوٹ بک

بھگت سنگھ کے ذریعہ جیل میں (31-1929)
مطالعہ کے دوران اخذ کردہ
نوٹس اور اقتباسات

اصل انگریزی میں: مدیر
بھوپندر آہوجہ

جیسے ہی ہم نوٹ بک کھولتے ہیں اولین صفحہ پر انگریزی میں تحریر ہے:
''بھگت سنگھ کے لئے
چار سو چار (404) صفحہ...''
نیچے ایک دستخط ہے اور اس پر 12/9/29 کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ واضح ہے کہ یہ تفصیل جیل حکام کے ذریعہ بھگت سنگھ کو نقل دینے کے وقت کی ہے۔ اس کے نیچے بھگت سنگھ کے دو مکمل اور دو مختصر دستخط ہیں۔ صفحہ کے اوپری دائیں کنارے پر بھی انگریزی میں بھگت سنگھ کا نام تحریر ہے۔ (دیکھیے سامنے کا صفحہ)
جیل رول بک کے واقف کار جانتے ہوں گے کہ جب بھی کوئی قیدی لکھنے کے لئے کاپی مانگتا ہے تو جیل حکام کو کاپی کے شروع اور آخر میں ایسا لکھنا پڑتا ہے اور قیدی کو بھی حاصل کرتے وقت وہاں دستخط کرنا پڑتا ہے۔ بھگت سنگھ کے دستخط (انگریزی میں) ٹائٹل صفحہ پر بھی موجود ہیں اور 12/9/29 کی تاریخ کے ساتھ کاپی کے آخر میں بھی۔
نوٹ بک کی جو ڈپلی کیٹ/ دستی تحریر کی کاپی جی پی کمار ہوجہ کو گروکل اندر پرستھ میں ملی۔ اس میں نیچے بائیں کونے پر انگریزی میں یہ بھی تحریر تھا:...... ''کاپی شہید بھگت سنگھ کے بھتیجے ابھے کمار سنگھ کے ذریعہ تیار''۔
یہ نوٹ بک عام اسکولی کاپی کی سائز کی تھی تقریباً 6.75x8.50 انچ یا 1750x21 سینٹی میٹر۔

-بھوپندر آہوجہ

صفحہ 2(2)[1]
زمین کی پیمائش[2]
جرمن 20 ہیکٹر-50 ایکڑ یعنی 1 ہیکٹر برابر ڈھائی ایکڑ

1۔ نوٹ بک کے صفحات کا شمار ٹائٹل سمیت کیا گیا ہے۔ بریکٹ میں دی گئی تعداد ان صفحات کی ہے جن پر لکھا ہوا ہے۔
2۔ نوٹ بک کے صفحہ 2 پر زمین کی پیمائش سے متعلق صرف انہیں دو اکائیوں ہیکٹر اور ایکڑ کا آپسی تناسب درج ہے۔

صفحہ 6(3)

ملکیت سے نجات۔ 'ملکیت سے آزادی'...... جہاں تک چھوٹے سرمایہ کار اور کسان جائیداد رکھنے والوں کا سوال ہے' 'ملکیت سے نجات' بن گئی۔

شادی خود بہ خود پہلے کی طرح ہی جسم فروشی کی قانونی طور پر تسلیم شدہ شکل 'روایتی پردہ' بنی رہی......

(سوشلزم سائنٹفک اینڈ یوٹوپیا)[1]

ذہنی غلامی۔ ''ایک ہمیشہ رہنے والی حکومت نے انسانی سماج کی اسی طرح تخلیق کی جیسی آج وہ ہے اور 'عمدہ ترین' اور 'اقتدار' کے تئیں خود سپردگی کی خواہش سے ہی 'نچلے' طبقات پر نافذ کیا گیا ہے''۔ واعظین حضرات وعظ اسٹیج اور پریس کی طرف سے دیئے جانے والے ان پیغامات نے آدمی کے دماغ کو مسحور کر رکھا ہے اور یہ استحصال کے سب سے مضبوط ستونوں میں سے ایک ہے۔

(اوریجن آف دی فیملی میں ٹرانسلیٹر کا کردار)[2]

صفحہ 7(4)

اینگلس کی تحریر کردہ اوریجن آف دی فیملی......

قدیم سماج کی تاریخ میں ایک معقول نظام پیش کرنے کی کوشش سب سے پہلے مارگن نے کی۔[3]

وہ اسے تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے:

1۔ غیر تمدنی 2۔ بربریت 3۔ تمدنی۔

1۔ غیر تمدنی۔ دوبارہ تین ادوار میں منقسم:

1۔ نچلی 2۔ درمیانی 3۔ اعلی

1۔ غیر تمدن کی ذیلی صورت۔ نسل انسانی کا ارتقائی عہد۔

1۔ پیڑوں پر رہنا 2۔ خوراک تھی پھل' گری پھل اور کند مول 3۔ موزوں ترین بولی کا فروغ اس عہد کی اہم حصولیابی۔

2۔ عہد وسطی۔ 1. آگ کی تحقیق 2. بطور غذا مچھلی کا استعمال 3. شکار کے لئے پتھر کے اوزاروں کی ایجاد۔ 4. انسانی گوشت خوری عمل میں آجاتی ہے۔[4]

3۔ بہترین عہد۔ 1 تیر اور کمان' کمہاری نہیں 2۔ دیہی بستیاں 3۔ گھر بنانے میں عمارتی لکڑی کا استعمال۔ 4۔ کپڑے بنے جانے لگے۔

غیر تمدنی عہد میں تیر اور کمان ویسے ہی تھے جیسے بربریت کے عہد میں لوہے کی تلوار اور تمدنی عہد میں آتشیں اسلحہ یعنی اقتدار اعلی کی حصولیابی کا ہتھیار۔

1۔ فریڈرک اینگلس کی تخلیق 'سوشلسٹ' تخیلاتی اور سائنسی۔

2۔ فریڈرک اینگلس کی تخلیق 'کنبہ' ذاتی ملکیت اور حکومت کی لوٹ کھسوٹ۔

3۔ لوئس ایچ مورگن (1818-1881) امریکی ماہر سماجیات 1877 میں شائع شدہ کتاب 'قدیم سماج۔

4۔ یہاں حاشیہ پر نوٹ۔ وینیسن = شکار سے حاصل کیا ہوا حیوانی گوشت۔

صفحہ 8(5)

2۔بربریت:

1۔خراب حالت:1۔کمہار کے کام کی شروعات۔پہلے لکڑی کے برتنوں پر مٹی کی پرتیں چڑھائی جاتی تھیں لیکن بعد میں مٹی کے برتن ایجاد کر لئے گئے۔

2۔نسل انسانی دو واضح طبقوں میں منقسم:

(الف)مشرقی،جو مویشی پالتی تھی اور اناج پیدا کرتی تھیں۔

(ب)مغربی،جن کے پاس صرف 'مکئی' تھی۔

2۔عہد وسطی

(الف)مغربی عرض البلد:یعنی امریکہ میں وہ خوردنی فصلیں اگاتے تھے (کھیتی اور سینچائی)'اور گھر بنانے کے لئے اینٹ پکاتے تھے۔

(ب)مشرقی:وہ دودھ اور گوشت کے لئے مویشی پالتی تھیں۔اس عہد میں کوئی کھیتی نہیں۔

3۔اعلی عہد:

1۔خام لوہے کو پگھلانا۔

2۔دستاویزات لکھنے کے لئے رسم الخط کا فروغ اور دستاویز سازی کے لئے اس کا استعمال:اس عہد میں بہت ساری ایجاد ہوتی ہیں۔یونانی شخصیات کا یہی زمانہ ہے۔

3۔بڑے پیمانے پر مکئی کی کھیتی کے لئے جانور لوہے کے ہل کھینچتے ہیں۔

4۔جنگلوں کی کٹائی،اور لوہے کی کلہاڑیاں اور لوہے کے کدال زیر استعمال آنے لگے۔

5۔بڑی حصولیابیاں:(الف)لوہے سے بنے اعلیٰ درجہ اوزار،(ب)دھونکنی،(ج)ہتھ چکی(د)کمہار کا چاک(ہ)تیل اور شراب نکالنا(و)دھاتوں کی ڈھلائی(ز)گاڑی اور رتھ(ح)سمندری جہاز سازی[صفحہ 9(6)](ط)انتہائی خوب صورت عمارتیں(ک)شہر اور قلعوں کی تعمیر(ل)ہومر عہد اور مکمل متھک(جھوٹ)شاستر

ان حصولیابوں کے ساتھ ہی یونان کا تیسرا عہد'تمدن' میں داخل ہو جاتا ہے۔مختصراً:

1۔غیر تمدنی:خاص طور پر تیار شدہ قدرتی مصنوعات سازی کا عہد:انسانی دانشوری،مہارت خاص طور پر:اس منصوبہ سازی میں معاون ثابت ہونے والے اوزاروں کا ایجاد کرتی ہیں۔

2۔بربریت:مویشی پروری،زراعت اور ایجنٹوں کے ذریعہ فطری زرخیزیت بڑھانے کے جدید طریقوں کا علم حاصل کرنے کا عہدہ۔

3۔تمدنی:قدرتی مصنوعات کے وسیع تر استعمال سیکھنے کا 'مینوفیکچرنگ کا' اور آرٹ کا عہد۔

اس طرح ہمیں انسانی ارتقا کے تین اہم حالات سے عموماً ہم آہنگ ہو کر کنبہ کی تین صورتیں بنتی ہیں:

1۔غیر تمدنی عہد میں:نوجوانوں کی شادی۔

2۔عہد بربریت میں:مشترکہ کنبہ

3۔تمدنی عہد میں:ایک شادی کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ اور ناجائز جنسی تعلقات اور طوائف کا کام۔مشترکہ کنبہ اور ایک

شادی کے درمیان بربریت کے عروج کے دور میں داسیوں پر مردوں کی حکومت اور کئی عورتوں سے شادی کے عہد میں داخلہ۔
(صفحہ 90)

صفحہ 10(7)

شادی کی خرابیاں

خصوصاً: طویل چاہت، تقریباً دس معاملات میں سے نو میں، ناجائز جنسی تعلقات کا ایک ماہر تربیتی اسکول ہوتا ہے۔
(ص۔91)

سماج وادی انقلاب اور شادی کے ادارے[1]

اب ہم ایک ایسے سماجی انقلاب کی جانب بڑھ رہے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک شادی کی حالیہ معاشی بنیا داسی یقین کے ساتھ مٹ جائے گی جس یقین کے ساتھ ایک شادی کے تکملہ طوائف کے کام کی معاشی بنیاد مٹ جائے گی۔ ایک شادی کی رسم ایک شخص کے، وہ بھی مرد کے ہاتھوں میں ڈھیر ساری سی دولت جمع ہو جانے کے سبب اس خواہش کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی خواہش تھی کہ وہ یہ دولت کسی دوسرے کی اولاد کے لئے نہیں، محض اپنی اولاد کے لئے چھوڑ جائے۔ اس ضرورت کے لئے عورت کا کسی ایک کا ہو کر رہنا ضروری تھا، مرد کا نہیں، اس لئے عورت کا کسی ایک کا ہو کر رہنے سے مرد کے اعلانیہ یا خفیہ طور پر کثیر زوجیت میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی تھی۔

مگر آنے والے سماجی انقلاب مستقل پدری دولت جائیداد کے زیادہ تر حصہ کو یعنی پیداوار کے وسائل کو سماجی ملکیت بنا دے گی اور ایسا کر کے ملکیت کی وراثت کے بارے میں اس ساری فکر کو ختم کر دے گی۔ مگر ایک شادی چوں کہ معاشی اسباب سے وجود میں آئی تھی اس لئے کیا ان اسباب کے مٹ جانے پر بھی وہ مٹ جائے گی؟

(ص91)[2]

صفحہ 11(8)

''بھر دو پیالہ ہے پر یہ مرے، جو دور کرے
آج وگت کے دکھ اوآ گت کے بھے کو

کل؟ کیوں، کل ہو سکتا میں ہو جاؤں
سات ہزار برسوں کے کل کا اتیت

....

یہاں گھنے گاچھ کے نیچے، ساتھ میں روٹی
مدرا کی صراحی، شاعری کی کتاب۔ اور تم

1۔ اصل نوٹ بک میں حاشیہ پر تحریر۔

2۔ خاندان، ذاتی ملکیت اور اقتدار کا آغاز۔ اینگلس

گا رہی ہے بغل میں مرے اس نرجن بیہڑ میں
اب تو سورگ بنا یہ نرجن بیہڑ ہی !

-عمر خیام

اسٹیٹ

اسٹیٹ کی خواہش ہے بزور طاقت استعمال کی ایک عام حکومت جو اپنے اراکین کے پورے گروہ سے علاحدہ ہو چکی ہو۔
-(اینگلس)(ص116)[1]

اسٹیٹ کا آغاز

عہد قدیم میں قبائل کے درمیان ہونے والی جنگوں کے ذریعہ زیر ہوتے ہوئے نیا روپ اختیار کر کے روزی روٹی کے وسائل کے طور پر ڈھور ٔداس اور دھن دولت لوٹنے کے لئے زمین اور پانی کے راستے سے باقاعدہ حملے ٔمختصر طور پر دھن دولت کی دنیا میں سب سے بڑی چیز سمجھا جانے لگا اور قدیم گوتر سماج کے اداروں اور رسومات کا غلط استعمال کیا جانے لگا تاکہ دھن دولت کی جبراً لوٹ کو جائز ٹھہرایا جا سکے۔۔اب محض ایک چیز درکار تھی: ایسے ادارہ کی جو نہ صرف علاحدہ علاحدہ افراد کی کی نئی حاصل کی گئی ملکیت کو گوتر نظام کی قدیم فرقہ وارانہ روایات سے تحفظ دلا سکے جو ذاتی مالکانہ حق کو جس کی پہلے زیادہ اہمیت نہیں تھی ٔ نہ صرف مقدس قرار دے اور اس تقدیس کو انسانی سماج کا انتہائی نصب العین اعلان کر دے بلکہ جو ملکیت کی حصولیابی اور اس لئے دھن دولت کے بڑھتے رہنے کے نئے اور

صفحہ 12(9)

فروغ پاتے ہوئے طریقوں پر عام لوگوں کی منظوری کی مہر بھی ثبت کر دے: ایسے ادارہ کی ٔ جو نہ صرف سماج میں نئی طبقاتی تقسیم کو بلکہ ملکیت دار طبقہ کے ذریعہ ملکیت سے محروم طبقہ کے استحصال کئے جانے کے اختیار کو اور ملکیت سے محروم طبقہ پر ملکیت دار طبقہ کی حکمرانی کو بھی دوام بخش دے۔

اور یہ ادارہ بھی وجود میں آیا۔اسٹیٹ کی ایجاد ہوئی۔

(ص130-129)[2]

1۔کنبہ ٔذاتی ملکیت اور حکومت کی لوٹ کھسوٹ۔اینگلس

2۔کنبہ ٔذاتی ملکیت اور حکومت کی لوٹ کھسوٹ۔اینگلس

ایک اچھی سرکار کی تعریف: ''اچھی سرکار خود حکمرانی کا متبادل کبھی نہیں ہو سکتی''۔

-ہیزی کیمپبل بینرمین[1]

''ہمیں یقین ہے کہ سرکار کی صرف ایک ہی شکل ہے' چاہے اسے جس نام سے بھی پکارا جائے جس میں حتمی کنٹرول عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے''۔

-ارل آف بالفور[2]

مذہب

''مذہب کے تئیں میرا اپنا نظریہ وہی ہے جو لیوکریشس کا ہے۔ میں اسے ڈر سے پیدا ہونے والی ایک بیماری کی شکل میں اور نسل انسانی کے لئے ایک نا قابل ذکر تکلیف کی شکل میں جانتا ہوں۔ لیکن میں اس کا منکر نہیں کہ اس نے تہذیب وتمدن میں بھی چنداں رول ادا کئے ہیں۔ اس نے ابتدائی عہد میں پچانگ نزدھارن میں مدد کی اور اسی کے سبب مصر کے نجومیوں نے گرہن کا حساب و کتاب اتنی ہوشیاری کے ساتھ کیا کہ ان کے بارے میں پیشین گوئی کرنے کے اہل ہو گئے۔ ان دو خدمات کو تو میں ماننے کے لئے تیار ہوں لیکن اور مزید کسی کے بارے میں نہیں جانتا۔

برٹرینڈ رسیل[3]

صفحہ 13(10)

سخی شہنشائیت: مونٹے گیو۔ چیمس فورڈ[4] نے حکومت برطانیہ کو ایک ''سخی شہنشائیت'' کہا ہے اور برٹش لیبر پارٹی کے سامراجیہ وادی لیڈر ریمزے میک ڈونالڈ[5] کے مطابق ''ایک سخی شہنشائیت'' کی کسی ملک پر حکمرانی کی تمام کوششوں میں' محکوم کو کچل ڈالا جاتا ہے۔ وہ برتاؤ کے قابل شہری نہیں' تابع دار رعایا بن جاتے ہیں۔ ان کا ادب' ان کا فن' ان کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے''۔

حکومت ہند

ہندوستان کے وزیر خارجہ آنریبل ایس مونٹے گیو نے ہاؤس آف کامنس میں 1917 میں کہا ''حکومت ہند جدید مقاصد کے لئے کسی بھی کام کے لائق ہونے کے نقطہ نظر سے انتہائی قدیم اور دقیانوسی ہے۔ حکومت ہند حمایت کے لائق نہیں''

1۔ نامعلوم۔

2۔ غالباً: آرتھر جیمس' فرسٹ ارل آف بالفور (1930-1848) برطانوی سیاست داں اور وزیر اعظم (1905-1902)۔

3۔ عظیم ریاضی داں اور فلسفی برٹرینڈ آرتھر ولیم رسیل (1972-1872)

4۔ ہندوستان میں آئینی اصلاحات سے متعلق مونٹے گیو چیمس فورڈ رپورٹ (1918) جس کی بنیاد پر حکومت ہند ایکٹ 1919 کے تحت دوہری حکومت لاگو ہوئی۔ ایڈون سموئل مونٹے گیو (1924-1877) 1917 سے 1922 تک ہندوستانی امور کے برطانوی وزیر خارجہ اور لارڈ چیمس فورڈ 1916 سے 1920 تک ہندوستان کے وائسرائے رہے۔

5۔ جیمس ریمزے میک ڈونالڈ (1937-1866): برطانوی سیاست اور برٹش لیبر پارٹی کے بانی ممبر 24-1923 میں اور 35-1929 میں برطانیہ کے وزیر اعظم رہے۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت

ڈاکٹر رتھ فورڈ[1] کے الفاظ "ہندوستان میں برطانوی حکومت جس طرح چلائی جارہی ہے وہ دنیا میں حکومت کی سب سے ذلیل اور سب سے غیر اخلاقی نظام......ایک ملک کے ذریعہ دوسرے کا استحصال.......ہے"۔

آزادی اور انگریز لوگ

"انگریز لوگ آزادی سے خود اپنے لئے ہی پیار کرتے ہیں۔ وہ ناانصافی کی سبھی کارروائیوں سے نفرت کرتے ہیں، سوائے ان کے جو وہ خود کرتے ہیں۔ وہ ایسی آزادی کے متوالے ہیں کہ کانگو میں دخل اندازی کرتے ہیں اور بیلجئیم کے لوگوں پر شرم شرم چیختے ہیں لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی ایڑیاں ہندوستان کی گردن پر ہیں"۔

-ایک آئرش مصنف[2]

صفحہ 14 (11)

بھیڑ کا انتقام

"اب آیئے ہم دیکھیں کہ کیسے لوگ اس طریق پر سزا دینے کے نظریہ کے قائل ہوئے۔" وہ اسے انہی حکومتوں سے سیکھتے ہیں جن کے ماتحت وہ جی رہے ہیں اور بدلہ میں وہی سزا دیتے ہیں جس کو برداشت کرنے کے وہ عادی ہو چکے ہیں۔ سولی پر معلق سر، جو برسوں تک ٹیمپل بار کے اوپر لگے رہے، پیرس میں سولی پر لٹکائے جانے والے سروں کے خوف ناک مناظر سے ذرا بھی مختلف نہیں تھے۔ پھر بھی انگریز سرکار نے یہی کیا۔ شاید کہا جا سکتا ہے کہ اس سے آدمی کو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کہ مرنے کے بعد اس کا کیا کیا جاتا ہے لیکن زندہ لوگوں کو فرق پڑتا ہے، اس سے یا تو ان کے جذبات شکستہ ہو جاتے ہیں یا ان کے دل پتھر ہو جاتے ہیں اور دونوں ہی صورتوں میں انہیں سبق ملتا ہے کہ جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ کیسے سزا دیں۔

"تب کلہاڑی سے جڑ پر ہی وار کرو اور حکومتوں کو انسانیت سکھا دو۔ یہ ان کی خونخوار سزائیں ہی ہیں جو نسل انسانی کو گمراہ کرتی ہیں......انسانوں کے سامنے پیش کئے جانے والے ان دردناک مناظر کا اثر سنجیدگی کو ختم کرنے یا انتقام کے لئے بھڑکانے کی شکل میں سامنے آتا ہے اور ضمیر کے بجائے دہشت کے ذریعہ حکومت کرنے کی اسی نیچ، ذلیل اور جھوٹے عقیدہ کے ذریعہ وہ نظیر بن جاتے ہیں"۔

(رائٹس آف مین (ص 32) ٹی پین)[3]

(ص 15 (12)

بادشاہ اور جمہوریت

ملک نے لوئی 14 کے خلاف نہیں بلکہ حکومت کے بے مہار اصولوں کے خلاف بغاوت کی۔

1۔نامعلوم۔2۔نامعلوم

3۔تھامس پین کی تصنیف 'دی رائٹس آف مین': انگریز مصنف اور مبلغ تھامس پین (1809-1737) امریکی جدوجہد آزادی اور فرانسیسی انقلاب میں اپنے ناقابل فراموش رول کے لئے پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

یہ اصول بنیادی طور پر اس سے نہیں بلکہ کئی صدی قبل قائم ابتدائی نظام سے وجود میں آیا اور اپنی جڑیں اتنی گہرائی میں پیوست کر چکا تھا کہ ختم نہیں کیا جا سکتا تھا اور طفیلی اور لٹیروں کا گندگی سے بھرا اصطبل بھی اتنا نفرت انگیز طور پر گندہ تھا کہ ایک مکمل انقلاب کے علاوہ کوئی بھی چیز اس کو صاف نہیں کر سکتی تھی۔ جب کوئی کام کرنا لازمی ہو جاتا ہے تو اسے پوری لگن اور قوت کے ساتھ کرنا چاہئے یا اسے کرنا ہی نہیں چاہئے...... بادشاہ اور جمہوریت دو علاحدہ علاحدہ چیزیں تھیں اور مذکورہ (یعنی بادشاہ) یا اس کے اصولوں کے ہی خلاف یہ بغاوت ہوئی اور انقلاب آیا۔

(صفحہ 19)[1]

فطری اور شہری حقوق

انسان سماج میں اس وجہ سے داخل نہیں ہوا کہ وہ پہلے سے بھی بدتر ہو جائے بلکہ اس لئے کہ اس کے حقوق پہلے سے بھی زیادہ بہتر طریقہ پر محفوظ ہوں۔ اس کے فطری حقوق ہی اس کے سبھی شہری حقوق کی بنیاد ہیں۔

فطری حقوق وہ ہیں جو انسان کے جینے کے حق سے تعلق رکھتے ہیں (دانشورانہ ذہنیت وغیرہ)

شہری حقوق وہ ہیں جو انسانی سماج کے ایک ممبر ہونے سے تعلق رکھتے ہیں۔

(صفحہ 44)[2]

صفحہ 16(13)

شہنشاہ کی تنخواہ

ایک فرد کی تربیت و پرداخت کے لئے کسی ملک کے عام محصولات میں سے دس لاکھ اسٹرلنگ سالانہ دینے کی بات کرنا غیر انسانی ہے جب کہ ہزاروں لوگ جو اس میں حصہ داری کے لئے مجبور کئے جاتے ہیں، کی پریشانی اور بدحالی سے نبرد آزما رہو رہے ہیں۔ حکومت جیلوں اور شاہی محل کے درمیان یا کنگالی اور شان و شوکت کے مابین کسی سمجھوتے کی شکل میں نہیں ہوتی، یہ اس لئے تشکیل نہیں کی جاتی کہ ضرورت مند سے اس کی دمڑی بھی لوٹ لی جائے اور خستہ حالی مزید بڑھا دی جائے۔

(صفحہ 204)[3]

'مجھے آزادی دو یا موت'

"...... معاملہ کو بے وزن کرنا بے کار ہے، شرفاء حضرات امن امن کا شور و غل مچا سکتے ہیں لیکن کسی قسم کا امن نہیں۔ جنگ تو درحقیقت شروع ہی ہو چکی ہے۔ اب آئندہ طوفان جو شمال سے اٹھ کر ہمارے کانوں تک پہنچ رہا ہے، گونجتے ہوئے اسلحوں کے تصادم کا ہے۔ ہمارے برادران تو پہلے سے ہی میدان جنگ میں ہیں۔ ہم یہاں بے کار کیوں کھڑے ہیں؟ آخر کار شریف لوگ چاہتے کیا ہیں؟

1۔ دی رائٹس آف مین سے۔

2۔ ایضاً۔

3۔ ماخذ نامعلوم۔

وہ کیا کریں گے؟ کیا زندگی اتنی پیاری یا امن اتنا شیریں ہے کہ اسے زنجیروں اور غلامی کی قیمت پر بھی خرید لیا جائے؟"۔
روکو اسے' اے قادر المطلق۔ میں نہیں جانتا کہ دیگر لوگ کون سے راستہ کا انتخاب کریں گے۔ لیکن جہاں تک میری بات ہے' مجھے 'آزادی' دو یا 'موت'۔

-پیٹرک ہینری[1]

مزدور کا حق

'جو کوئی بھی محنت شاقہ سے کوئی شئے پیدا کرتا ہے' اسے یہ بتانے کے لئے کسی خدائی پیغام کی ضرورت نہیں کہ پیدا کی گئی شئے پر اسی کا حق ہے'۔

-رابرٹ جی انگرسول[2]

صفحہ 17 (14)

"لوگوں کے سر قلم کر دیئے جانے کو تو ہم خوف ناک عمل تصور کرتے ہیں مگر ہمیں زندگی بھر برقرار رہنے والی موت کی اس خوفناکی کو دیکھنا نہیں سکھایا گیا ہے جو غریبی اور مظالم کے ذریعہ وسیع آبادی پر تھوپ دی گئی ہے"۔

-مارک ٹوین[3]

شورش پسندی

"......ادب کے انتخاب میں شورش پسندوں اور بغاوت کرنے والوں کو بھی جگہ مل جاتی ہے اور اگر اس کی کچھ چیزیں قارئین کو محض رنج وغم کا سبب محسوس ہوں تو بھی میں کہنا چاہوں گا کہ اس کے لئے ادب کے وقف کردہ انتخاب کنندگان کو الزام نہیں دینا چاہئے' یہاں تک کہ تخلیق کار کو بھی الزام نہیں دیا جانا چاہئے۔ اسے (یعنی قاری کو) خود اپنے آپ کو الزام دینا چاہئے کہ اس نے ان حالات کی موجودگی میں خاموشی اختیار کر لی ہے جس کی وجہ سے اس کے سماج کے لوگ پاگل پن اور نا امیدی کی انتہائی چوٹی پر جا پہنچے ہیں"۔

-اپٹن سنکلیئر "بھومیکا" 19
کرائی فار جسٹس

بوڑھا مزدور

"......وہ (بے روزگار بوڑھا مزدور) عمر سے' فطری طور پر اور حالات سے نبرد آزما تھا' سماج' قانون اور نظام کا سارا بار اس کے اوپر آن پڑتا ہے' اسے اپنا وقار اور آزادی کھو دینے پر مجبور کر رہا تھا......اس نے فارموں کے دروازے کھٹکھٹائے اور وہ صرف انسان میں ہی اچھائی پا سکا۔ قانون اور نظام میں نہیں' بلکہ صرف انسان میں ہی"۔

-رچرڈ ریفریز (80)[5]

1۔ پیٹرک ہینری (1736-1790): امریکی جدوجہد آزادی کے لیڈروں میں سے ایک' شعلہ بیان مقرر اور ممبر پارلیمنٹ۔
2۔ امریکی وکیل' مقرر اور مصنف (1832-1899)
3۔ حقیقی نام سیموئیل لینگھارن کلیمنس (1835-1910) مشہور امریکی ناول نویس اور طنز نگار۔
4۔ مشہور امریکی ناول نویس اور سماجی مصلح (1878-1968)
5۔ انگریز نیچرلسٹ اور ناول نویس (1848-1887)

صفحہ 18 (15)

غریب مزدور

''......اور ہم لوگ' جنہوں نے اس کام کو انجام دینے کا بیڑہ اٹھایا' اس دنیا میں حقیر رہے۔ ایک تاریک قسمت' ایک بڑے بے رحم نظام نے کاٹ چھانٹ کر ہمارے وجود کا ڈھانچہ متعین کر دیا۔ ہم اس وقت بے عزت ہوئے جب ہم سب سے زیادہ استفادہ کے لائق تھے' ہمیں اس وقت خارج کر دیا گیا' جب ہماری ضرورت نہیں تھی اور ہمیں اس وقت فراموش کر دیا گیا' جب ہمارے اوپر مصائب کا پہاڑ ٹوٹا ہوا تھا۔ ہمیں بنجر صاف کرنے کے لئے' اس کی ساری پیچیدگیوں کو دور کرنے کے لئے اور اس کے عالمی ثقافتی حصار کو ریزہ ریزہ کرنے کے لئے بھیج دیا جاتا۔ ہم جہاں بھی کام کرتے' وہاں ایک دن نیا شہر وجود میں آتا اور جب یہ وجود کے عمل میں ہوتا تب اگر ہم میں سے کوئی وہاں چلا جاتا تو اسے 'نامعلوم پتہ والا فرد' کہہ کر گرفتار کر لیا جاتا اور سرپھرا آوارہ قرار دے کر اس پر مقدمہ چلایا جاتا۔

-(پیٹرک میک گل کی تخلیق 'چلڈرن آف دی ڈیڈ اینڈ' سی جے 48 سے ماخوذ)[1]

اخلاقیات

اخلاقیات اور مذہب اس شخص کے لیے صرف الفاظ ہیں جو روزی روٹی کا بندوبست کرنے لئے گندے نالے میں مچھلی پکڑتا ہے اور سردی کی رات میں خون منجمد کر دینے والی سردلہر سے بچاؤ کے لئے سڑکوں پر پیپوں کے عقب میں پناہ لیتا ہے''۔

-ہورلیس گریلے (128)[2]

بھوک

''حکمراں کے لئے مناسب یہی ہے کہ اس کے دورِ حکمرانی میں کوئی بھی آدمی سردی اور بھوک سے متاثر نہ رہے۔ آدمی کے پاس جب زندہ رہنے کے معمولی وسائل بھی نہیں ہوتے تو وہ اپنی اخلاقیات کو برقرار نہیں رکھ سکتا''۔

-کونکو ہوشی

(جاپان کا بودھ فقیر 14 ویں صدی' ص 135)

صفحہ 19 (16)

نجات

ارے منشیو! کرتے ہو گرو وکتی
کہ تم سنتی ہو مکت اور ویر پتروں کے
پر یدی سانس ایک بھی داس دھرا پر
تو کیا سچ مچ تم ہو مکت اور ویر؟
یدی تم کو احساس نہیں جب

1۔ نامعلوم

2۔ امریکی جرنلسٹ اور سیاست داں (1872-1811)

بیڑی پیڑا دیتی ایک بھائی کو
تو کیا سچ مچ تم نہیں ادھم داس
جو قابل نہیں مکت ہونے کے
کیا ہے وہ سچی مکتی جو توڑے
زنجیریں بس اپنی خاطر
اور بھلا دے سنگ دل ہو کر
کہ مانوتا کا قرض ہے ہم پر؟
نہیں سچی مکتی تبھی ہم بانٹیں
سب زنجیریں جو پہنے ہیں اپنے بھائی
اور بھاؤ، کرم سے لگ کر
ہوں اوروں کی مکتی میں تتپر
داس ہوئے وہ جو بھے کھاتے ہیں سور دینے میں
گرے ہوئے اور دُربل کی خاطر
داس تو وہ جو نہیں چنیں گے
گھرنا، ڈانٹ اور گالی
اور دُبک کر منہ موڑیں گے
سچ سے اس پر سوچ ضروری:
داس تو وہ جو ہمت نہ کریں
دو یا تین بھی ہوں گر سچ کے حق میں

۔جیمس رسل لاویل (ص 189)[1]

(صفحہ 20(17)

بھرے پڑے ہیں شبھر اور نرمل آبھا کے رتن گھنیرے
ساگر کے گہن اگادھ گھور میں
کھلتے ہیں بہو تیرے پھول اُن دیکھے لجا رُن ہوتے
اور لٹا دیتے اپنی سگندھ نرجن بیار میں[2]

ایجاد

اب تک یہ سوال برقرار ہے کہ کیا اب تک کی گئی سبھی ایجادات کسی آدمی کی روزمرہ کی سخت محنت سے پُر زندگی کو آسان بنا سکی ہیں۔

۔جے ایس مل[3]، ص 199

1۔امریکی شاعر، مضمون نگار اور ایڈیٹر (1819-91)
2۔انگریز شاعر تھامس گرے (1716-7) کی تخلیق 'ایلیجی ریٹین ان اے کنٹری چرچ یارڈ' سے ماخوذ۔
3۔جان اسٹوورٹ مل، انگریز مضمون نگار اور روادار فلسفی (1808-73)

بھیک

زمین پر اس شخص سے زیادہ قابل نفریں اور نامناسب اور کوئی نہیں ہے جو بھیک دیتا ہے۔ اور اسی طرح اس شخص سے زیادہ قابل رحم اور کوئی نہیں جو اسے قبول کرتا ہے۔

۔میکسم گورکی[1]، ص204

آزادی

وہ مردہ جسم نوجوانوں کے
وہ شہید جو جھول گئے پھانسی کے پھندے سے
وہ دل جو چھلنی ہو گئے بھورے سیسے سے
سرد اور نشپند جو وہ لگتے ہیں، زندہ ہیں اور کہیں
اپادھت اوج کے ساتھ
وہ زندہ ہیں دوسرے نوجوانوں میں، او راجاؤ!
وہ زندہ ہیں دیگر بندھو جن میں، پھر سے تمہیں چنوتی دینے کو تیار
وہ پاک ہو گئے موت سے
شکشت اور سمّت

(صفحہ 21 (18)

دفن نہ ہوتے آزادی پر مرنے والے
پیدا کرتے ہیں مکتی بیج، پھر اور بیج پیدا کرنے کو
جسے لے جاتی دور ہوا اور پھر بوتی ہے اور جسے
پوشت کرتے ہیں ورشا جل اور ہم
دیہہ مکت جو ہوئی آتما اسے نہ کر سکتے وی چھن
استر شستر اتیاچاری کے
بلکہ ہوا سے رمتی دھرتی پر مرمر کرتی
بتیاتی، چوکسی کرتی

۔والٹ وہٹمین[2]، ص268

نجات کی فکر

اگر کوئی ایسی چیز ہو جو نجات کی فکر کو برداشت نہ کر سکے تو وہ جہنم میں جائے۔

۔وینڈیل فلپ[3]، ص271

1۔ مشہور روسی انقلابی مصنف

2۔ والٹ وہٹمین (92-1819): مشہور امریکی شاعر، نظم کا وسیلہ نا معلوم ہے

3۔ وینڈیل فلپس (1884-1811): امریکی مقرر، مصلح اور غلامی مخالف تحریک کا سرگرم رکن۔

4۔ ہینرک ابسن (1906-1828) ناروے کا مشہور ڈرامہ نگار

اسٹیٹ

''اسٹیٹ دفع ہو جائے! میں ایسے انقلاب میں حصہ لوں گا۔ اسٹیٹ کے پورے تخیل کو نیست و نابود کر دو' آزاد انتخاب اور روحانی بھائی چارے کو ہی کسی اتحاد کی واحد سب سے اہم شرط ہونے کا اعلان کرو اور تب ہی تم ایک ایسی آزادی کا آغاز کرو گے جو بامقصد ہو گی۔

—ہینرک ابسن[1] ص 273

ظلم

''ظلم یقینی طور پر ایک عقل مند آدمی کو پاگل بنا دیتا ہے''۔

صفحہ 22 (19)

شہید

جو آدمی اپنے ساتھی انسانوں کے ذریعہ کیے جانے والے مظالم کی مخالفت کرنے کی کوشش میں' اپنی جان پر کھیلتے ہوئے اپنی پوری زندگی نچھاور کر دیتا ہے' وہ مظالم اور ناانصافی کے خلاف سرگرم اور بے لوث حامیوں کے مقابلہ میں ایک سنت ہے بھلے ہی اس کی مخالفت اس کی اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ دوسری زندگیاں بھی کیوں نہ برباد ہو جائیں۔ ایسے شخص پر پہلا پتھر مارنے کا وہی حق دار ہوتا ہے جس نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو۔

–(ص 287)[2]

نچلا طبقہ

جب تک کوئی نچلا ورگ ہے' میں اس میں ہی ہوں
جب تک کوئی اپرادھی تو ہے' میں اس میں ہی ہوں
جب تک کوئی جیل میں قید ہے' میں آزاد نہیں ہوں

–یوجین بی ڈیبس[3] (144)

سب کے خلاف ایک

(چارلس فوریئے: 1772-1837)[4]

موجودہ سماجی نظام ایک مضحکہ خیز مشینری ہے جس میں سمپورن کے انش اس سمپورن کے خلاف تصادم میں سرگرم ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سماج کا ہر طبقہ' مفاد عامہ کے بجائے ہر طرح سے' اپنے ذاتی حقوق کو مقدم رکھتے ہوئے دوسرے طبقہ کی بدقسمتی کی قیمت پر' اپنے مفاد کا خواہاں ہے۔ 'وکیل' خاص طور سے مالداروں کے درمیان' مقدمہ بازی اور مقدمات کی آرزو کرتا ہے۔ ڈاکٹر بیماری کی خواہش رکھتا ہے۔ (اگر ہر شخص بغیر کسی بیماری کے مرنے لگے تو یہ (ڈاکٹر) خود بخود برباد ہو جائیں گے جیسے اگر سبھی تنازعات بات چیت سے حل ہو جائیں تو (وکیل) برباد ہو جائیں گے۔ فوجی جنگ چاہتا ہے تاکہ اس کے آدھے ساتھی مر جائیں اور اس کی ترقی یقینی ہو جائے۔ آخری رسومات ادا کرانے والا کفن دفن کی تمنا رکھتا ہے' اجارہ دار اور جمع خور' اناج کی قیمت دگنی تین گنی کرنے کے لئے قحط چاہتے ہیں معمار' بڑھئی' راجگیر آگ زنی پسند کرتے ہیں تاکہ سینکڑوں گھر جل کر خاک ہو جائیں اور ان کا کاروبار چلتا رہے۔

(صفحہ 202)

1۔ نامعلوم۔ 2۔ نامعلوم۔ 3۔ یوجین ڈیبس (1926-1855): امریکی سوشلسٹ لیڈر ذریعہ نامعلوم

4۔ فرانسوا میری چارلس فوریئے (1873-1772): فرانسیسی سوشلسٹ مصنف: ذریعہ نامعلوم

صفحہ 23(20)

جدید اصول

سماج قتل، ذلیل یا ٹھگ کو نظر انداز کر سکتا ہے مگر وہ جدید اصول کی تشہیر کو کبھی معاف نہیں کرتا۔

–فریڈرک ہیری سن[1] (ص 327)

شجر آزادی

شجر آزادی کا وقتاً فوقتاً وطن پرستوں اور ظالموں کے خون سے سینچا جانا ضروری ہے۔ یہی اس کی فطری کھاد ہے۔

–تھامس جیفرسن[2] (ص 332)

شکاگو کے شہید

اب کوئی بھلے یہ کہے کہ اس نے بڑی غلطی کی لیکن اگر اس کی غلطی دس گنا بھی زیادہ بڑی ہوتی تو بھی اسے اس کی قربانی ذہن سے اتار ہی ڈالے گی......

چلئے ہم یہ مکمل طور پر تسلیم کر لیتے ہیں کہ انہوں نے اپنی نظر میں مخالفت کا جو سب سے اچھا طریقہ اختیار کیا، وہ خیال پوری طرح غلط اور ناممکن تھا، مان لیا کہ انہوں نے کارروائی کا سب سے بہتر راستہ اختیار نہیں کیا۔ لیکن وہ کیا اسباب تھے جس نے انہیں اپنے موجودہ سماجی نظام کی مخالفت کے لئے مشتعل کیا؟ وہ اور ہزاروں لوگ جوان کے ساتھ کھڑے تھے، برے آدمی نہیں تھے، بدعنوان نہیں تھے، خون کے پیاسے نہیں تھے، سنگ دل نہیں تھے اور نہ ہی خود غرض یا پاگل تھے۔ تو وہ کیا چیز تھی جس نے اس قدر شدید اور گہرے ردعمل پر مجبور کیا......؟

کسی نے بھی اس سیدھی سی بات پر غور نہیں کیا کہ انسان اپنے آپ کو کسی مخالفت کے لئے بغیر اس یقین کے جمع نہیں کرتے کہ کوئی نہ کوئی چیز ایسی ہے جس کی انہیں مخالفت کرنی ہے اور نہ کسی بھی منظم سماج میں وسیع مخالفت ایسی چیز ہے جس کے لئے گہری تفتیش درکار ہے۔

–چارلس ایڈورڈ رسیل[3] (333)

صفحہ 24(21)

انقلابی کی وصیت

''میں اپنے دوستوں سے یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ وہ میرا کم سے کم ذکر کریں گے یا بالکل بھی نہیں کریں گے کیوں کہ جب آدمی کی تعریف ہونے لگتی ہے تو اسے انسانوں کے بجائے دیو مورتی جیسا بنا دیا جاتا ہے اور یہ نسل انسانی کے مستقبل کے لئے بہت بری بات ہے......صرف عمل پر ہی غور کرنا چاہئے، اسی کی تعریف یا مذمت کرنی چاہئے، خواہ وہ کسی نے بھی کیا ہو۔ اگر لوگوں کو اس سے مفاد عامہ کی تحریک ملتی نظر آئے تو وہ ان کی تعریف کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ مفاد عامہ کے لئے نقصان دہ ہو تو اس کی مذمت بھی کر سکتے ہیں تا کہ اس کو دہرایا نہ جا سکے''۔

1۔ فریڈرک ہیریسن (1923-1831) مشہور قانون ساز: تاریخ، سیاست اور ادب پر کئی کتابوں کا مصنف۔

2۔ تھامس جیفرسن (1826-1743): امریکہ کے تیسرے صدر امریکی جدوجہد آزادی کے معروف لیڈر اور آئین سازوں میں سے اہم۔

3۔ نامعلوم

''میں چاہوں گا کہ کسی بھی موقع پر میری قبر کے قریب یا دور کسی بھی طرح کی سیاسی یا مذہبی نمائش نہ کی جائے کیوں میں سمجھتا ہوں کہ مردہ کے لئے خرچ کئے گئے اوقات کا بہتر استعمال ان لوگوں کی زندگی سدھارنے میں کیا جا سکتا ہے جن میں سے بہت سے لوگوں کو اس کی شدید ضرورت ہے''۔

-فرانسسکو فریر[1] کی وصیت

اسپینی معلم (1909-1859) جسے مذہبی لوگوں نے بارسیلونا فسادات کے بعد عداوت کے سبب ایک سازش کے تحت پھانسی دے دی۔

عطیہ

'میرے پیچھے آؤ' عیسیٰ مسیح نے دولت مند نوجوان سے کہا۔لیکن اپنے پیشہ میں مصروف رہنا اور اپنی کچھ دولت کو عطیہ میں دینا موازنہ کے طور پر آسان تھا۔سخاوت ہر عہد میں رائج رہی ہے۔عطیہ غریبی کے باغی تیور کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ چناں چہ: سخی دولت مند آدمی اپنے جیسے دولت مندوں کا ہی دوست ہوتا ہے اور انہیں کا ممنون ہوتا ہے۔اس کے لئے مہذب سماج کے سبھی دروازے کھلے ہوتے ہیں' اس لئے انہوں نے (یعنی عیسیٰ مسیح نے) بھکشا دان کو سماج کے گہرے زخموں کی مرہم پٹی کی شکل میں منظوری دینے سے انکار کر دیا...... سخاوت کو انصاف کے ایک متبادل کے طور پر انہوں نے قطعاً ترجیح نہیں دی۔

ص25 (22)

عطیہ دوہرا کلنک ہے۔یہ عطیہ کنندگان کو سنگ دل اور حاصل کرنے والے کو نرم دل بناتا ہے۔یہ غریبوں کے استحصال سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہے کیوں کہ یہ انہیں استحصال کا شکار بننے پر راضی کرتا ہے۔یہ غلامی کے جذبات کو وجود میں لاتا ہے جو اخلاقی قتل کے مترادف ہے۔عیسیٰ مسیح نے بے انتہا دولت کے لئے صرف ایک ہی اجازت دی تھی اور وہ یہ کہ اسے انقلابی تشہیر کے لئے وقف کر دیا جائے تاکہ بعد میں بے پناہ دولت کی تجمیع ہمیشہ کے لئے ناممکن ہو جائے۔

بک وہائٹ' پادری' ولادت 1870 یو ایس اے' ص353[2]

نجات کی جنگ

فوجوں کی طاقت ایک دکھائی دینے والی چیز ہے
سوسپشٹ' اور دلیش کال میں آبدھ
لیکن کون کھوج سکتا اس شکتی کی سیماؤں کو
جسے ایک بہادر جنتا کی پرکٹ کر سکتی ہے
یا چاہے تو' چھپا سکتی ہے کتی یدھ میں
بھڑک اٹھے نیائے سنگت پرتی رودھ کا۔کوئی پاؤں پیچھا نہیں کر سکتا

1۔قدیم نام فرانسسکو فریر گوآردی (1909-1859): اسپینی ماہر تعلیم جو بعد میں سوشلسٹ بن گئے۔اگرچہ انہوں نے تشدد کی مخالفت کی تھی پھر بھی انہیں گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا اور پھانسی دے دی گئی جسے بعد میں عدالتی قتل نام سے موسوم کیا گیا۔

2۔تفصیل دستیاب نہیں۔

کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی اس جان لیوا جگہ کو
یہ طاقت چاہے تو اڑان بھرے پنکھ لگا کر
پر چنڈوایو کی بھانتی یا سوئے مندوایو کی بھانتی
اپنی ڈراؤنی گپھاؤں میں سال در سال
پھیلاتی مٹی سے جنمے اس وچار کو نکٹ اور دور
نہیں باندھ سکتی کوئی بھی کلا۔ اس سوکشم طاقت کو
جو پھوٹتی زمین سے جل دھارا کی بھانتی
اور پالیتی ہر کونے میں ایک ہونٹھ
جو اس کی قدر کرے

-ڈبلیو وڈرسورتھ[1]

صفحہ 26(23)

لائٹ بریگیڈ کا حملہ

آدھا لیگ آدھا لیگ
آدھا لیگ اور
موت کی گھاٹی میں
بڑھ چلے چھ سو ویر
'بڑھے چلو لائٹ بریگیڈ!
بھر لو بندوقیں! وہ بولا
موت کی گھاٹی میں
بڑھ چلے چھ سو ویر
'بڑھے چلو لائٹ بریگیڈ'
کیا کوئی تھا گھبرایا؟
نہیں، گو کہ معلوم تھا سینکوں کو
کسی نے کر دی تھی بھاری بھول
ان کا کام نہیں تھا اتر دینا
ان کا کام نہیں تھا سوال پوچھنا
انہیں تھا بس لڑنا اور مر جانا

1۔ ولیم وارڈ سورتھ (1850-1750): مشہور انگریز شاعر۔ عالم نوجوانی میں جمہوریت پسند باغی اور فطرت کا شاعر۔ عشقیہ شاعری کا مشہور نام۔

موت کی گھاٹی میں
بڑھ چلے چھ سو ویر
توپیں ان کے دائیں بازو
توپیں ان کے بائیں بازو
توپیں ان کے ٹھیک سامنے
دھنتیں اور گرجتیں
گولہ باری کی آندھی میں
بڑھ چلے نڈر وہ سیدھے
موت کے جبڑوں کے بھیتر
نرک کے منھ کے بھیتر
بڑھ چلے چھ سو ویر
چمکاتے سب ننگی تلواریں
ہوا میں جب ان کو لہراتے
کاٹتے جاتے توپچیوں کو
حملہ کرتے سینا پر، جب کہ
ساری دنیا چکراتی

صفحہ 27(24)

پل پڑے توپ کے دھوئیں میں
بڑھ چلے توڑ کر مورچہ
قزاق اور روسی سپاہی
کھا کر تلوار کی چوٹیں
چھتر بھتر ہو جاتے
توپیں ان کے دائیں بازو
توپیں ان کے بائیں بازو
توپیں ان کے پیچھے سے
دھنتیں اور گرجتیں
گولہ باری کی آندھی میں
بھلے گرے اشو اور نائک
پھر بھی وہ اتنا اچھا جوجھے

کہ ہو کر موت کے جبڑوں سے
لوٹے وہ نرک کے منہ سے
جو بھی تھے بچے رہ گئے
چھ سو میں سے بچے رہ گئے
کب ہو سکتا دھومل ان کا لیش؟
ارے وہ ان کی وکٹ چڑھائی
ساری دنیا چکراتی
آدر اس حملے کو
آدر لائٹ بریگیڈ کو!
سریشٹ چھ سو ویروں کو

-لارڈ ٹینسن[1]

نوٹ: ص 27 (24) کے آخر میں یہ تین شعر اردو میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ کس شاعر کے ہیں، یہ واضح نہیں ہے۔ شعر درج ذیل ہیں:

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو غم کی گھڑی کو بھی خوشی سے گزار دے

سجا کر میت امید ناکامی کے پھولوں سے
کسی ہمدرد نے رکھ دی میرے ٹوٹے ہوئے دل میں

چھیڑ نا اے فرشتے! تو ذکر غم جاناں
کیوں یاد دلاتے ہو بھولا ہوا افسانہ

صفحہ 28 (25)

فطری حقوق

ہم بیٹے ہیں ان پتروں کے جنہوں نے مات دی تھی
تخت و تاج اور بلشالی[2] کے اتیا چار کو

1۔ لارڈ الفریڈ ٹینسن (1892-1809): مشہور انگریز سوشلسٹ شاعر۔ ہندوستانی طلبا کی ایک سے زیادہ نسل نے اپنی کتابوں میں یہ نظم پڑھی ہے۔ موت کی وادی کی جانب گامزن بھگت سنگھ اور ان کے انقلابی ساتھیوں کے لئے یہ نظم بہت معنی رکھتی ہے۔

2۔ انگریزی میں الفاظ غیر واضح۔

انہوں نے چنوتی میدانِ جنگ سے اور پھانسی کے تختہ سے
اپنے جنم سدھ ادھیکار کے لئے۔ہم بھی یہی کریں گے
انہوں نے دی تھی چنوتی میدان جنگ میں اور پھانسی کے تخت سے
اپنے جنم سدھ ادھیکار کے لئے۔ہم بھی یہی کریں گے

۔جے کیمپبیل[1]

نصب العین کی عظمت

ارے! بیکار کی نفرت کے لئے نہیں
نہ سمان کے لئے، نہ ہی اپنی ہی پیٹھ پر شاباشی کے لئے
بلکہ لکشیہ کی مہما کے لئے
کیا جو تم نے، بھلایا نہیں جائے گا

۔آرتھر کلاگ[2]

روح کی ابدیت

اگر تمہیں کبھی ایک ایسا آدمی مل جائے جو ابدیت میں یقین رکھتا ہو تو بس سمجھ لو کہ اب تمہاری کوئی بھی آرزو باقی نہیں رہ جائے گی۔تم اس کی ساری چیزیں لے سکتے ہو۔اگر تم چاہتے ہو تو جیتے جی اس کی کھال اتار سکتے ہوں اور وہ اسے بخوشی اتارنے دے گا۔

۔اپٹن سنکلیئر 403 سی جی[3]

خدائی ظالم

ایک ظالم حکمراں کے لئے لازم ہے کہ وہ ظاہری طور پر مذہب کے تئیں غیر معمولی عقیدت کا مظاہرہ کرے۔عوام ایک ایسے حکمراں کی بدسلوکی کے تئیں کم سوچتے ہیں جسے وہ خدا سے ڈرنے والا اور مقدس مانتے ہیں۔دوسرے وہ آسانی سے اس کی مخالفت بھی نہیں کرتے کیوں کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ دیوتا بھی حکمراں کے ساتھ ہے۔[4]

صفحہ 29(26)

فوجی اور غور وخوض

"اگر میرے فوجی سوچنا شروع کردیں تو ان میں سے کوئی بھی فوج میں نہیں رہے گا"

۔فریڈرک مہان[5] ص562

شہید ہوئے جو عظیم ترین بہادر

مارے گئے ہیں سروشریشٹھ ویر، دفنا دیئے گئے وہ
چپ چاپ ایک نرجن بھومی میں

1۔قیاس: آئرش شاعر جوزف کیمپبیل (1879-1944)ان کی نظمیں لوک کتھاؤں پر مبنی تھیں۔

2۔آرتھر ہج کلاگ (1819-1861):ایک انگریز شاعر

3۔قیاس: 'کرائی فار جسٹس' کا اختصار۔

4۔صفحہ کا گوشہ پھٹنے کے سبب ماخذ کا پتہ نہیں۔

5۔پرشا کا فریڈرک (1712-1786):ترقی پذیر ڈکٹیٹر حکمراں کے طور پر مشہور۔

کوئی آنسو نہیں بہے ان پر
اجنبی ہاتھوں نے انہیں پہنچا دیا قبر میں
کوئی صلیب نہیں، کوئی گھیرا نہیں، کوئی سمادھی لیکھ نہیں
جو بتا سکے ان کے گوروشالی نام
گھاس اُگ رہی ہے ان پر، ایک دُربل پتّی
جھکی ہوئی، جانتی ہے اس رہسیہ کو
بس ایک ماتر ساکشی تھیں اُچھلتی لہریں
جو پرچنڈ آگھات کرتی ہیں تٹ پر
لیکن وہ پرچنڈ لہریں بھی نہیں لے جا سکتیں
الوداع کے سندیش
ان کے سودُر گھر تک

–وی این فگنر [1]

قیدخانہ

''تارے نہیں، دیش نہیں، کال نہیں
ٹھہراؤ نہیں، بدلاؤ نہیں، نیکی نہیں، بدی نہیں
بلکہ خاموشی اور ایک نشپند سانس
جو نہ جیون کی، نہ مرتیو کی''

–دی پریزنر آف چلون [2]

صفحہ 30 (27)

الزام ثابت ہونے کے بعد

اپنی سزا سن لینے کے فوراً بعد سزا پانے والے شخص کا دماغ کئی معنوں میں اس آدمی کے دماغ کی طرح ہو جاتا ہے جو موت کی دہلیز پر جھول رہا ہوتا ہے۔ خاموشی اور داخلی تحریک سے اب وہ ان سبھی چیزوں سے بالاتر ہو جاتا ہے جنہیں اسے چھوڑ جانا ہے اور وہ پورے عزم مصمم کے ساتھ سامنے نظر رکھتے ہوئے اس سچائی سے تحریک پا کر پوری طرح محتاط ہو جاتا ہے جو لازمی طور پر وجود میں آنے والی ہوتی ہے۔

–وی این فگنر

قیدی

''گھٹن ہوتی ہے اس نیچی، گندی چھت کے نیچے
نچڑتی جا رہی ہے میری طاقت سال در سال

1۔ویرا نکولائیوانا فگنر (1942-1852) روسی خاتون انقلابی اور شہید، زارشاہی کے خلاف اعلان جنگ کرنے والی اولین روسی خواتین میں سے ایک۔ ان کی یادداشتیں سات جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔

2۔معروف انگریزی شاعر لارڈ بائرن (1824-1788) کی اس نظم میں جینوا جھیل کے پاس چلون کے قلعہ میں قید ایک محب وطن فرانسوا دی بونیوار کے جیل کے حالات کا ذکر ہے۔

اچھوت کرتے ہیں مجھے۔ یہ پتھریلا فرش
یہ لوہ زنجیروں سے بندھی میز
یہ کھاٹ، یہ کرسی، بندھی ہوئی زنجیر سے
دیواروں کے ساتھ، تابوت کے پٹروں کی بھانتی
اس پرستھائی، موک، مردہ خاموشی میں
خود کو بس ایک لاش ہی سمجھا جا سکتا ہے"

-این اے موروزوو

گندی دیواریں، جیل کے خیالات
کتنے اندھیارے اور اداس ہو تم
کتنا مشکل ہے کہ بندی ہو کر یہ رہنا
اور دیکھنا سپنے آزادی کے دنوں کے

-موروزوو

صفحہ 31(28)

"ہر چیز یہاں ہے کتنی خاموش، بے جان، پھیکی
ورشوں گزر جاتے ہیں یوں ہی، کچھ پتہ نہیں چلتا
ہفتے اور دن کٹتے ہیں بڑی مشکل سے
دیتا ہے صرف اوب ان کا یہ سلسلہ"

-موروزوو

لمبی قید سے ہمارے خیال ہو جاتے ہیں منحوس
بھاری پن محسوس ہوتا ہے ہماری ہڈیوں میں
یترنا کی پیڑا سے، لمحے لگتے ہیں انت ہین
چار ڈگ چوڑی اس کوٹھری میں

ہمیں جینا ہے پوری طرح اپنے ہم سفر بھائیوں کے لئے
ہمیں دینا ہوگا اپنا سروسوان کے لئے
اور انہیں کی خاطر لڑنا ہوگا بدنصیبی کے خلاف

-موروزوو

1۔ نکولوئی الیکوانڈر موروزوو (1946-1854): روسی انقلابی، مصنف، شاعر اور سائنس داں: 1880 میں لندن میں مارکس سے ملاقات اور کمیونسٹ اعلامیہ کا روسی زبان میں ترجمہ کا ذمہ 1875 سے 1878 تک، اور 1881 سے 1905 تک تقریباً 25 برسوں تک جیل کی سزا کے دوران کیمیکل سائنس، فزکس، ریاضی اور علم نجوم پر 28 کتابوں کے علاوہ نظمیں اور کہانیاں بھی سپردِ قلم کیں۔

2۔ یہ اشعار اردو میں تحریر کیے گئے ہیں:

تجھے ذبح کرنے کی خوشی' مجھے مرنے کا شوق
میری بھی مرضی وہی ہے جو مرے صیاد کی ہے
آئے مجھے آزاد کرنے
آخر لوگ آئے مجھے آزاد کرنے
میں نے نہ پوچھا کیوں اور نہ سوچا کہاں
میرے لئے تو کل ملا کر ایک ہی تھا
بندھے رہنا یا بندھن مکت ہونا
میں نے نراشا سے پیار کرنا سیکھ لیا تھا
اور اس طرح انت: جب وہ پرکٹ ہوئے
اور اتار ڈالے مرے سارے بندھن
یہ بھاری دیواریں بن چکی تھیں مرے لئے
ایک سنیاس آشرم پوری طرح اپنا

-دی پریزنر آف چلون

صفحہ 32(29)

''اور ہم سماہت کئے گئے ہیں ایک مشن دے کر
ہم نے ایک کٹھن اسکول پاس کیا' لیکن حاصل کرلیا
اونچا گیان
بِرواسن جیل' اور مشکل دنوں کی بدولت
ہم جان گئے ہیں اور قیمت سمجھتے ہیں سچائی اور آزادی کی
دنیا کی''

-پریزنر آف شلوسیلبرگ[1]

ایک بچہ کی موت اور تکلیف

'ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس نے نہ تو کوئی اچھا کام کیا نہ برا۔ وہ بیمار پڑ گیا' وہ طویل عرصہ تک انتہائی مصائب سے دوچار رہا تب تک جب تک کہ نا قابل برداشت تکلیف سے جاں بحق نہیں ہوگیا۔ کیوں؟ کیا وجہ تھی؟ فلسفیوں کے لئے یہ ایک لاینحل پہیلی ہے۔[2]

ایک انقلابی کے دماغ کی ساخت

''جو شخص کبھی بھی عیسی مسیح کی زندگی سے متاثر رہا ہے جنہوں نے ایک اصول کے نام پر مصائب' تحقیر اور موت کا ذکر کیا'

1۔ لینن کے زیر اثر علاقہ میں واقع شلوسیل برگ قصبہ کے نزدیک ایک جزیرہ پر پیٹر گریٹ کی فوج کا تعمیر کردہ قلعہ جسے بعد میں جیل میں بدل دیا گیا۔ اس جیل میں متعدد دسمبرسٹ انقلابی شورش پسند یا کوزن پولش محب وطن لوکاسوسلاگ، نارشل ووگلوروکی اور لینن کے بھائی الیکزینڈر کو مقید کیا گیا تھا۔ (لینن کے بھائی کو بھی پھانسی دی گئی۔ 2۔ ذرائع معلوم نہیں۔

جس نے انہیں کبھی ایک اصول اور ان کی زندگی کو مجموعہ غم مانا ہے' وہی اس انقلابی کے دماغ کی ساخت کو سمجھ سکتا ہے جسے سزا دی گئی ہے اور عوام کی آزادی کے لئے کام کرنے کے جرم میں زندہ ہی قبر میں ڈال دیا گیا ہے"۔

-ویرا این فگنر

حقوق

حقوق مانگو نہیں' بڑھ کر لے لو۔ اور انہیں کسی کو بھی نہ دینے دو۔ اگر مفت میں تمہیں کوئی حق دیا جاتا ہے تو سمجھ لو کہ اس میں کوئی نہ کوئی راز ضرور ہے۔ غالب امکان یہی ہے کہ کسی غلط بات کو الٹ دیا گیا ہے"۔[1]

صفحہ 33(30)

کوئی دشمن نہیں؟

تم کہتے ہو' تمہارا کوئی دشمن نہیں؟
افسوس! میرے دوست' اس شیخی میں دم نہیں
جو شامل ہوتا ہے فرض کی لڑائی میں
جسے بہادر لڑتے ہی ہیں
اس کے دشمن ہوتے ہی ہیں۔ اگر نہیں ہیں تمہارے
تو وہ کام ہی کچھ ہے جو تم نے کیا ہے
تم نے جھوٹی قسمیں کھانے والے ہونٹ سے پیالہ نہیں چھینا ہے
تم نے کبھی کسی غلطی کو ٹھیک نہیں کیا ہے
تم کائر ہی بنے رہے لڑائی میں

-چارلس میکے' 747[2]

بچہ مزدوری

گوریّے کا بچہ گوریے کو دانہ نہیں چگاتا
چوزہ مرغی کو چگا نہیں کراتا
بلی کا بچہ بلی کے لئے چوہے نہیں مارتا
یہ مہا نسا تو صرف منشیہ کو نصیب ہے
ہم سب سے بدھیمان' سب سے بلوان نسل ہیں
ہم قابل تعریف ہیں
اک ماتر زندہ پرانی
جو جیتا ہے اپنے بچوں کی محنت پر

-شارلوٹ پارکنس گل مین 3

1۔ صفحہ پھٹا ہوا' ذریعہ نا معلوم

2۔ غالباً اسکاٹ رائٹر و شاعر چارلس میکے (1889-1814)

3۔ صفحہ کا ذیلی حصہ پھٹا ہوا۔ ذریعہ پڑھنے کے لائق ہیں۔

صفحہ 34(31)

کوئی طبقہ نہیں، کوئی سمجھوتہ نہیں

سوشلسٹ تحریک کے دوران ایک ایسا وقت آ رہا ہے اور ممکن ہے وہ وقت آ چکا ہے جب سدھری ہوئی حالتیں یا ادا کردہ اجرتیں مزدوروں کے مطالبات کا جواب نہیں رہ جائیں گی۔ اور اس وقت یہ چیزیں ایک عام دماغ کے لئے ایک تحقیر کے علاوہ کچھ نہیں ثابت ہوں گی۔ آج پوری دنیا میں جو سوشلسٹ تحرک چل رہی ہے، وہ بہتر اجرتوں، اصلاح شدہ سرمایہ دارانہ نظام یا سرمایہ دارانہ منافع میں حصہ دار بننے کے لئے نہیں چل رہی ہے۔ یہ چل رہی ہے اجرتوں اور منافع کے خاتمہ کے لئے اور سرمایہ دارانہ نظام اور ذاتی سرمایہ داروں کے خاتمہ کے لئے۔ اصلاح شدہ سیاسی ادارے، سرمایہ اور محنت کے مابین سمجھوتہ کرانے والی کونسلیں، من مانے طریقے اور خصوصی اختیارات جو سرمایہ داروں کی خیراتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں، ان میں سے کوئی بھی چیز اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی جو اقتدار کے تختوں اور ممبر پارلیمنٹ کو متزلزل کر رہا ہے۔ جو لوگ دبے کچلے ہیں اور جو لوگ ان کی پشت پر سوار ہو کر آگے بڑھے ہوئے ہیں، اب ان دونوں کے درمیان کوئی امن و سکون نہیں رہ سکتا۔ اب طبقات کے مابین کوئی میل ملاپ نہیں ہو سکتا، اب تو طبقات کا صرف خاتمہ ہی ہو سکتا ہے۔ جب تک پہلے انصاف نہ ہو، تب تک خیر سگالی کی بات کرنا بے تکی اور فضول ہے اور جب تک اس دنیا کی تعمیر کرنے والوں کا اپنی محنت پر اختیار نہ ہو، تب تک انصاف کی بات کرنا بے کار ہے۔ دنیا کے مزدوروں کے مطالبات کا جواب ان کی محنت کی پوری کمائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

۔جارج ڈی ہیرن[1]

صفحہ 35(32)

سرمایہ دارانہ نظام کی تباہیاں[2]

آسٹریلیا کے بارے میں معاشی تخمینہ، تھیوڈور ہرٹز کا[3] (1886) کے ذریعہ ہر کنبہ =40 مربع فٹ میں 5 کمروں پر مشتمل مکان 50 برسوں تک چلنے کے قابل[4]

مزدوروں کے کام کرنے کی عمر 50-16 = (سال)

اس طرح ہمارے پاس ہیں 5,000,000 (مزدور)

615,000 مزدوروں کی محنت = محنت کا 12.3 فی صد 22,000,000 افراد کا کھانا پیدا کرنے کے لئے وافر ہے۔

آمد و رفت گاڑیوں کی مختلی لاگت سمیت عیش و آرام کے لئے صرف =6.33 فی صد مزدوروں کی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دستیاب محنت کا 20 فی صد ہی پورے براعظم کی پرورش کے لئے کافی ہے۔ بقیہ 80 فی صد سماج کے سرمایہ دارانہ نظام کے سبب استحصال شدہ اور برباد ہو جاتا ہے۔

صفحہ 36(33)

ژار شاہی حکومت اور بولشیوک حکومت[5]

1۔ ذریعہ نا معلوم۔

2۔ یہ عنوان جلی حروف میں لکھا گیا ہے۔

3۔ ذریعہ نا معلوم

4۔ مکان کے رقبہ میں کچھ گڑبڑ ہے، تخمینے غیر واضح ہیں۔

5۔ وسیلہ کا پتہ نہیں۔

بریزیئر ہنٹ[1] کا کہنا ہے کہ بولشیوکوں نے اپنے دورِ حکمرانی کے اولین چھ مہینوں میں 4500 افراد کو سزائے موت دی جن میں سے زیادہ تر کا جرم چوری اور سٹہ بازی تھا۔

1905 کے انقلاب کے بعد ژار کے وزیر استولپین نے بارہ مہینوں کے دوران 32,773 افراد کو موت کی سزا دی۔

صفحہ 37(34)

سماجی اداروں کا استقلال

''ہر نسل کے شکوک وشبہات میں سے ایک شک یہ ہے کہ وہ جن سماجی اداروں کے تحت جی رہی ہوتی ہیں، وہ کچھ خاص معنوں میں 'فطری' نا قابل تبدیل اور مستقل ہیں۔ پھر بھی لاتعداد ہزاروں برسوں سے 'سماجی ادارے مسلسل وجود میں آ رہے ہیں' ترقی کر رہے ہیں' ساقط ہوتے رہے ہیں' عام ضرورتوں کے مطابق دوسرے بہتر اداروں بالترتیب ختم کیے جاتے رہے ہیں...... اس وقت سوال یہ نہیں ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب بدلے گی یا نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ کیسے بدلے گی؟

یہ 'منظم حالات سازی کے ذریعہ بالترتیب: اور خاموشی کے ساتھ نئی شکل لے سکتی ہے۔ یا حالات سازی کے بجائے کوئی اشتعال انگیز ردعمل وجود میں آ سکتا ہے۔ تو یہ دھماکہ کے ساتھ گر سکتی ہے اور نسل انسانی کو سماجی شورش اور غیر منظم حالات کی ذیلی سطح سے ایک جدید تہذیب کی تعمیر کا دشوار کن کام سونپ سکتی ہے جس میں گزشتہ نظام کی صرف خامیاں نہیں بلکہ اس کی جغرافیائی' دانشورانہ اور اخلاقی حصولیابیاں بھی نہیں رہیں گی۔

-پی آئی ڈ کے آف کیپ سویلائزیشن[4]

صفحہ 38(35)

سرمایہ دارانہ نظام اور کمرشیلائزیشن

جاپانی طلبا کے ایک اجلاس میں رویندر ناتھ[5] کا خطاب:

''جاپان میں آپ کی اپنی صنعت تھی' وہ کس قدر ذمہ دارانہ جذبہ سے ایمان دار اور سچی تھی' اسے آپ اس کی مصنوعات سے' ان کی سطح اور تعداد سے' چھوٹی چھوٹی اشیاء کے تئیں ان کے دھیان دینے سے جان سکتے ہیں جن پر شاید ہی کوئی نکتہ چینی کی جا سکے۔ مگر آپ کی سرزمین پر جھوٹ کی ایک لہر دنیا کے اس حصہ سے باہر آ چکی ہے جہاں تجارت صرف تجارت ہے اور ایمانداری کو محض سب سے عمدہ پالیسی تصور کیا جاتا ہے۔ کیا آپ کو کبھی شرم نہیں محسوس ہوتی جب آپ ان تجارتی اشتہاروں

1۔ نامعلوم۔

2۔ پیوتر آکاردیئے وچ استولپین (1862-1911): 1906 سے 1911 تک ژار کی کابینہ کا صدر اور وزیر داخلہ۔

3۔ نامعلوم۔ ایسے کئی خیالات کی طرح یہ حاشیہ پر اوپری کنارے کی طرف تحریر ہے۔

4۔ وسیلہ نامعلوم۔

5۔ رویندر ناتھ ٹھاکر (1861-1941) تقریر کی جگہ' وقت اور دیگر تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔

کو دیکھتے ہیں جو نہ صرف پورے شہری علاقہ کو جھوٹ اور بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں بلکہ ان سبز علاقوں پر بھی حملہ کرتے جا رہے ہیں جہاں کسان ایمانداری سے محنت کرتے ہیں اور ان پہاڑ کی چوٹیوں کو اپنے حملے کا نشانہ بناتے جا رہے ہیں جو صبح صادق کی اولین روشنی کا استقبال کرتے ہیں......اپنی بھدی سجاوٹوں کی بربریت کے ساتھ یہ کمرشیلائزیشن پوری انسانیت کے لئے ایک بھیانک مصیبت ہے کیوں کہ یہ مہارت کے اوپر طاقت کے اصول کو تھوپ رہا ہے۔اس کی حرکات متشدد ہیں اور اس کا شوروغل بے سرا اور کرکش ہے۔یہ اپنی ہی بربادی کی جانب بڑھ رہے ہیں کیوں کہ یہ اسی انسانیت کو کچل کر برباد اور غیر فطری بنا رہے ہیں جس پر وہ خود کھڑے ہیں۔

صفحہ 39(36)

یہ خوشی کی قیمت پر دولت پیدا کرنے کی سخت مشقت میں لگا ہوا ہے......یوروپ کی موجودہ تہذیب کی اہم توقعات یہی ہیں کہ شیطان پر اسی کا واحد اختیار رہو"۔

سرمایہ دارانہ سماج

''سیاسی معاشیات کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص جہاں تک ممکن ہو کم از کم ایثار کر کے دولت حاصل کر لینا چاہتا ہے"۔

-نا سین سینئر [1]

صفحہ 40(37)

مذہب کے تعلق سے کارل مارکس کا نظریہ

انسان مذہب کو بناتا ہے، مذہب انسان کو نہیں بناتا۔مذہب در حقیقت انسان کی ہی ضمیری بیداری اور ضمیری جذبہ ہے جس نے یا تو ابھی تک اپنے آپ کو پایا نہیں ہے یا (اگر اپنے آپ کو پایا بھی ہے تو) اپنے آپ کو دوبارہ کھو دیا ہے۔لیکن آدمی کوئی ایسی غیر مرئی چیز نہیں جو دنیا سے باہر کہیں پالتی مار کر بیٹھی ہوئی ہو۔انسان کی دنیا انسانوں 'راج' سماج کی دنیا ہے۔یہ اسٹیٹ، یہ سماج مذہب پیدا کرتا ہے، ایک الٹی عالمی بیداری پیدا کرتا ہے کیوں کہ یہ خود ایک الٹی دنیا ہے۔مذہب اسی دنیا کا ایک عام اصول ہے، اس کا وشوکوشی سار سنگرہ ہے، ایک مقبول شکل میں مدلل ہے، اس لئے مذہب کے خلاف جدوجہد اس دنیا کے خلاف ایک مبینہ مہم ہے، جس کی روحانی خوشبو مذہب ہے۔

[صفحہ 41(38)]

مذہب مصیبت زدہ شخص کی آہ ہے، ایک بے قلب دنیا کا احساس ہے، بالکل اسی طرح جیسے یہ بے روح حالات کی روح ہے۔یہ انسان کے لئے افیم ہے۔[2]

لوگ حقیقت میں اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ مذہب کا خاتمہ کر کے اس کی فرضی خوشی سے نجات حاصل نہ کر لیں، یہ خواہش کہ لوگ اس سراب سے خود کو اپنی ہی خاطر آزاد کریں، یہ خواہش ہے کہ ان حالات کو ہی ختم کر دیں جسے اس سراب کی ضرورت ہوتی ہے۔

1۔نامعلوم

2۔اصل میں بولڈ

مذمت کا ہتھیار ہتھیاروں کی مذمت کی جگہ نہیں لے سکتا۔ جسمانی طاقتوں کو لازمی طور سے جسمانی طاقتوں کے ذریعہ ہی اکھاڑ پھینکنا چاہئے لیکن اصول بھی جب عوامی فرقوں میں رچ بس جاتے ہیں تو ایک جسمانی طاقت بن جاتی ہے۔[1]

صفحہ 42(39)

انقلاب یوٹوپیائی نہیں

ایک ابتدائی تبدیلی لانے والا انقلاب یعنی نسل انسانی کی نجات جرمنی کے لئے کوئی یوٹوپیائی خواب نہیں ہے: یوٹوپیائی تو ایک جزوی ایک ناپاک سیاسی انقلاب کا عقیدہ ہوتی ہے جو (سرمایہ دارانہ نظام کی) عمارت کے ستون کو قائم رکھے گی۔[2]

''عظیم اس لئے عظیم ہیں کیوں کہ
ہم گھٹنوں پر ہیں
آؤ اٹھ کھڑے ہوں''[3]

صفحہ 43(40)

اسٹیٹ کے بارے میں ہربرٹ اسپینسر[4] کا نظریہ

''بھلے ہی یہ سچ ہو یا نہ ہو کہ انسان معصوم پیدا ہوا اور گناہ سے بھر گیا لیکن یہ لازمی طور پر سچ ہے کہ سرکار کا وجود جارحیت سے اور جارحیت کے ذریعہ ہوا''۔

انسان اور نسل انسانی

''میں ایک انسان ہوں''۔
اور ان سبھی چیزوں سے میرا سروکار ہے جو نسل انسانی کو متاثر کرتی ہیں''۔

-رومن ڈرامہ نگار[5]

انگلینڈ کی حالت کا تجزیہ

''اچھے لوگو، انگلینڈ میں حالات اس وقت تک اچھے نہیں ہو سکتے جب تک اچھائیاں عام نہیں ہو جاتیں اور جب تک شریف لوگوں کے ساتھ برے لوگ بھی بنے رہتے ہیں۔ وہ جنہیں ہم لارڈ کہتے ہیں، کس حق سے ہم سے بہتر ہیں؟ کس بنیاد پر وہ اس کے قابل بنے ہوئے ہیں؟ وہ کیوں ہمیں غلام بنائے ہوئے ہیں؟ اگر ہم سبھی ایک ہی باپ اور ماں آدم وحوا کی اولاد ہیں تو وہ یہ کیسے کہتے یا ثابت کرتے ہیں کہ وہ ہم سے عظیم یا بہتر ہیں؟ اگر وہ اپنے فائدے کے لئے ہم سے محنت نہیں کراتے تو وہ اپنی شان وشوکت میں کیا خرچ کرتے ہیں؟ وہ خود تو مخمل پہنتے ہیں اور اپنے آپ کو فرکوٹوں اور شاہی لبادوں میں گرم رکھتے

1۔ ہیگلی کے انصاف کی مذمت کی کوشش، کارل مارکس سے ماخوذ

2۔ وسیلہ واضح نہیں۔ 3۔ اصل میں یہ لائنیں صفحہ پر ترچھے لکھی ہوئی ہیں۔

4۔ ہربرٹ اسپنسر (1820-1903): انگریز فلسفی، اہم تخلیقات: دی پرنسپلس آف سائکلوجی اور فرسٹ پرنسپل۔ 5۔ نامعلوم

ہیں جب کہ ہم بوسیدہ اور پھٹے پرانے کپڑو میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس تو شراب' لذیذ کھانا اور ڈبل روٹی ہیں اور ہمارے پاس جئی کی لٹی' گھاس پھونس اور پانی۔ ان کے پاس فرصت ہی فرصت ہے اور عمدہ گھر بھی' اور ہمارے پاس ہے تکلیف اور مشقت' کھیتوں میں بارش اور آندھی پھر یہ ہماری محنت ہی ہے جس کے بل بوتے پر وہ راج کرتے ہیں"۔

-فرائر آف واٹ ٹیلرس ریبیل [1]

صفحہ 44(41)

انقلاب اور طبقہ

سبھی طبقات اقتدار کی حصولیابی کے لئے انقلابی ہی بنتے ہیں اور مساوات کی باتیں کرتے ہیں اور سبھی طبقے جب اقتدار حاصل کر لیتے ہیں تو تنگ دل بن جاتے ہیں اور تسلیم کر لیتے ہے کہ مساوات محض ایک خواب رنگیں ہے۔ سارے طبقات صرف ایک کو۔ مزدور طبقہ کو چھوڑ کر کیوں کہ جیسا کہ کامتے [2] کے بقول "سچ کہا جائے تو مزدور طبقہ ایک طبقہ ہوتا ہی نہیں' بلکہ وہ تو سماجی گروپوں کا ایک جزو ہوتا ہے"۔ لیکن مزدور طبقہ کا وقت' یعنی سبھی لوگوں کے اتحاد کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔

ورلڈ ہسٹری فار ورکرس صفحہ 47' رائٹر: الفریڈ وارٹن [3]

صفحہ 45(42)

سر ہینری مین [4] نے کا قول ہے:

"انگلینڈ کی بیشتر زمین وکیلوں کی غلطی سے اس کے موجودہ مالگان کے ہاتھ میں چلی گئی ہے جن غلطیوں کے نتیجہ میں چھوٹے چھوٹے جرائم پر بھی پھانسی کی سزا دے دی گئی"۔

"قانون مجرم قرار دیتا ہے اس مرد یا عورت کو
جو چراتے ہیں عام آدمی کی مرغیاں
لیکن چھوڑ دیتا ہے بڑے مجرموں کو
جو چرالیتے ہیں مرغیوں سے عام آدمی کو ہی" [5]

صفحہ 46(43)

جمہوریت

جمہوریت' اصولی طور پر سیاسی اور قانونی مساوات کا ایک نظام ہے۔ لیکن ٹھوس اور جائز کارروائی میں' یہ بے بنیاد اور

1۔ الفاظ واضح نہیں۔ اگلا صفحہ پھٹا ہوا۔ وسیلہ نامعلوم

2۔ آگست کامتے (1857-1798) فرانسیسی مفکر

3۔ نامعلوم

4۔ قائم: برطانوی مورخ اور آئین ساز سر ہینری سمر مین (1888-1822) ہندوستان میں 1863 سے 1869 تک کونسل کے رکن اور کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

5۔ نامعلوم۔

جھوٹ (واہمہ) ہے کیوں کہ کوئی مساوات اس وقت تک نہیں ہو سکتی، یہاں تک کہ سیاست اور قانون کی رو سے بھی نہیں، جب تک کہ معاشی طاقت میں عدم مساوات منہ پھاڑ کر کھڑی رہے گی، جب تک کہ حکمراں طبقہ مزدروں کے روزگار، ملک کے پریس اور اسکولوں پر اور رائے ہموار کرنے اور ظاہر کرنے کے سبھی وسائل پر اپنا تسلط جمائے رکھے گا، جب تک یہ سبھی تربیت یافتہ پبلک گروپوں پر اپنا حق برقرار رکھے گا اور انتخابات کو متاثر کرنے کے لئے بے پناہ دولت خرچ کرتا رہے گا، جب کہ قانون حکمراں طبقہ کے ذریعہ بنائے جاتے رہیں گے اور عدالتوں میں اسی طبقہ کے اراکین صدارت کرتے رہیں گے، جب تک وکیل پرائیویٹ پریکٹیشنر بنے رہیں گے اور اپنی قانونی مہارت کی سب سے زیادہ فیس دینے والوں کو فروخت کرتے رہیں گے اور عدالتی کارروائی تکنیکی اور مہنگی بنی رہے گی، تب تک قانون کے سامنے یہ محض نام کی مساوات کھوکھلی مذاق بنی رہے گی۔

ایک سرمایہ دارانہ نظام میں، جمہوریت کا پورا نظم مزدور طبقہ کو تکلیف پہنچا کر حکمراں اقلیتی طبقہ کو حکومت میں بنائے رکھنے کا کام کرتی ہے اور جب برژوا حکومت کو عوامی اداروں سے خطرہ محسوس ہوتا ہے تو ایسے اداروں کو اکثر بے رحمی کے ساتھ کچل دیا جاتا ہے۔

فرام مارکس ٹو لینن

-رائٹر: مارس ہلکویٹ[1] صفحہ 58

جمہوریت "ہر ایک طبقہ یا پارٹی سے متعلق ہر ایک شخص کے لئے مساوی حقوق اور سبھی سیاسی اختیارات میں حصہ داری" یقینی نہیں بنا سکتی (کاؤتسکی)۔ یہ تو موجودہ اقتصادی عدم مساوات کے لئے مبینہ سیاسی اور قانونی کھلواڑ کی اجازت دیتی ہے...... اس طرح سرمایہ داری کے ماتحت جمہوریت عام علامتی جمہوریت (امورت) بلکہ خاص برژوا جمہوریت...... یا جیسا کہ لینن نے اس کا نام رکھا ہے "برژوا طبقہ کے لئے جمہوریت ہوتی ہے۔[2]

صفحہ 47(44)

لفظ انقلاب کی تعریف

"انقلاب کے بارے میں جو ایک رائے ہے، کو اس لفظ کی پولیس یا تعریف کے معنی میں یعنی مسلح بغاوت کے معنی میں نہیں لینا چاہئے۔ اگر کسی پارٹی کے پاس دوسرے، کم خرچیلے، اور متوقع زیادہ محفوظ طریقے استعمال کرنے کی گنجائش ہے اور تب بھی وہ اصول کے ناطے بغاوت کا ہی طریقہ اپناتی ہے تو اسے پاگل ہی کہا جائے گا۔ اس معنی کے لحاظ سے سماجی لوگ کبھی بھی اصول کے ناطے انقلابی نہیں رہا۔ ایسا یہ صرف اسی معنوں میں ہے کہ یہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ جب اسے سیاسی حکمرانی حاصل ہو جائے گی تو اس کا استعمال موجودہ نظام کو برقرار رکھنے والے پروڈکٹ سسٹم کو ختم کرنے کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے نہیں کرے گا"۔

کارل کاؤتسکی[3]

1۔ امریکی سوشلسٹ۔

2۔ پیرے کا ذریعہ اور حوالہ جاتی حصہ پھٹا ہوا ہے۔ غالباً: مارس ہلکویٹ کی کتاب سے ماخوذ۔

3 کارل کاؤتسکی (1938-1854) جرمن سماجی عوامی تحریک اور سکنڈ انٹرنیشنل امور کا ایک لیڈر۔ ابتدا میں مارکسسٹ تھے لیکن بعد میں مارکسسٹ سے غداری کی اور مزدور تحریک میں کاؤتسکی واد کے اصول کار بن گئے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بارے میں چند حقائق اور تخمینے[1]

5	آدمی	1000	لوگوں کے لئے روٹی پیدا کر سکتے ہیں۔
1	آدمی	250	لوگوں کے لئے سوتی کپڑا پیدا کر سکتا ہے۔
1	آدمی	300	لوگوں کے لئے اونی کپڑا پیدا کر سکتا ہے
1	آدمی	1000	لوگوں کے لئے بوٹ اور جوتے پیدا کر سکتا ہے۔

آئرن ہیل 2 صفحہ 78

15,000,000 لوگوں انتہائی غریبی (میں) زندگی بسر کر رہے ہیں جو اپنی مزدوری کی اہلیت کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتے۔

3,000,000 بچہ مزدور۔

بعد ازاں: انگلینڈ[3]

قبل از جنگ تخمینے (!)

انگلینڈ کی مجموعی پیداوار	2000,000,000 (فی سال)
غیر ملکی سرمایہ سے منافع	200,000,000
	2200,000,000
آبادی کے 1/9 ویں حصہ نے لیا 1/2	= 1100,000,000
آبادی کے 2/9 ویں حصہ نے لیا بقیہ کا 1/3 یعنی	1100,000,00 300,000,000

(تفصیلات کا باقی حصہ پھٹا ہوا)

صفحہ 48 (4)

انٹرنیشنل[4]

اٹھ جاگ پرتاڑت دھرتی کے
اٹھ جاگ بھوک کے بندی
نیائے کی بجتی رن بھیری
ایک بہتر دنیا جنمے

1۔ یہ اور آئندہ آنے والا انگلینڈ سے متعلق عنوان جلی حروف میں تحریر ہے۔

2۔ جیک (جان) گرفتھ (1916-1876) کا ناول 'آئرن ہیل' جو 1908 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں سرمایہ دارانہ نظام کے خون چوسنے اور ظالمانہ کردار اور اس کے خلاف مزدوروں کی جدو جہد کو انتہائی موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ 3۔ ذریعہ کا نامعلوم۔ 4۔ یوجنی پوتیئے کے ذریعہ پیرس کمیون (1971) کے دوران فرنچ میں لکھا گیا یہ گیت 'انٹرنیشنل' نام سے پوری دنیا کا جدو جہد کا گیت بن گیا۔

اب باندھ سکے نہ ہم کو پرمپرا کی بیڑی
ارے! اٹھو! غلاموں جاگو! اب کرنی نہیں غلامی!
اب نئی نیو پر بنے گی دنیا
ہم اب تک رہے نہ کچھ بھی اب سب کچھ ہوں گے
(ایضاً)

یہ ہے آخری سنگھرش آؤ ہولیں او یکل
کل مانو جاتی بنے گی
انٹرنیشنل
دیکھو ان کو جو بیٹھے ہیں مہامنڈت
ریلوں، کھانوں، دھرتی کے راجا!
شرم کو ہی رہے لوٹتے یہ
بس اس کے سوا کیا کیا ہے؟
دفن ہیں جنتا کی محنت کے پھل
کچھ کی مضبوط تجوریوں میں
دینا ہو گا اسے واپس
ہے یہ جنتا کا حق
(ایضاً)

ایک جٹ ہوں کارخانوں کھیتوں کے محنت کش
پارٹی ہم سب کی جو کام کریں
یہ دھرتی ہے ہماری جنتا کی
یہاں نہ جگہ کام چور کی
لیکن یدی یہ گھرنت شکاری پکشی
ہمارے آسمان سے ایک صبح ہو جائیں غائب
سورج کی آبھا تب بھی بنی رہے گی
(ایضاً)

صفحہ 49(46)

مارسیئز [1]

او محنت کے بیٹو، جاگو، گورو حاصل کرو
سنو، سنو وہ کوئی کوئی آواز یں کہ تم جاگو

1۔ لا مارسیئز: فرانس کا قومی ترانہ۔ 24 اپریل 1792 کو تخلیق کیا گیا۔ فرانسیسی انقلاب کے تحفظ کے لئے حالت جنگ میں مصروف فوجیوں کے لئے اس کی موسیقی ترتیب ایک فرانسیسی کپتان کلود جوزف دی لل نے دی۔ مارسیئز سے پیرس کی طرف مارچ کرنے والے فوجیوں نے جب اسے پہلی بار گایا تو ایسا ولولہ اور جوش پیدا ہوا کہ لوگ امڈ پڑے۔ ایک فرانسیسی جنرل نے ایک بار پیغام بھیجا تھا کہ اس کے پاس فوری مارسیئز بھیجا جائے کیوں کہ اس کی طاقت کئی بٹالین کے برابر ہے۔

بچے، بیوی، اور پُراتن پتر تمہارے
دیکھو تم ان کے آنسو، اور سنو تم ان کی چیخیں
کیا گھرنت نرنکش شاسک کرتے رہیں شرارت
لے بھاڑے کے ٹٹو اور غنڈوں کے جتھے
کرتے رہیں دھار کو سنتر ست اور ویران
جب کہ شانتی اور آزادی کا بہتا رہے خون؟
(کورس)
آؤ شستر سنبھالیں، پنکتی بدھ ہو جائیں
کھیت سینچتے ان کے خوں سے آگے بڑھتے جائیں
بے پناہ ایشیائی اور شان و شوکت کی
جرات کرتے ہیں اُدھم اتر پت نرنکش
سورن اور ستا کی ان کی بھوک اُپر بمت
بھوگتے اور بیچتے دھوپ ہوا بھی
ہم ڈھوتے ان کا بھار بن کے لدو گھوڑے
وہ کہیں کہ ان کے داس انہیں دیوتا مانیں
لیکن انسان سے بڑھ کر اور کون ہیں؟
پھر وہ کب تک ٹکے رہیں گے، کب تک ماریں گے ہم کو؟
(پھر وہی کورس)
اے آزادی! مانو کیا تیار سکے گا تم کو
انو بھو کر لینے کے بعد تمہاری دلکش لو کو؟
کیا روک سکیں گی تم کو نہ خانو کے پھاٹک اور سلاخیں
یا کیا کوڑے باندھ سکیں گے تیرے ادات جیوٹ کو؟
لمبے عرصے سے بلکھ رہی ہے دنیا
چلا رہے ہیں جھوٹ کی کٹار نرنکش
لیکن آزادی ہے تلوار اور ڈھال ہماری
اور ویرتھ ہے ان کی ساری کلاکاری
(پھر وہی کورس)

صفحہ 50(47)

موقع پرستی کا آغاز

قانون کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کام کرنے کا امکان نے سکنڈ انٹرنیشنل کے وقت میں مزدور پارٹیوں کے اندر اثر واد کو جنم دیا۔

—لینن، کولیپس آف II انٹ۔ نے[1]

1۔ لینن کی کتاب سکنڈ انٹرنیشنل کا سقوط

غیر قانونی کام

''کسی ملک میں جہاں برژوا طبقہ یا ہر انقلابی سماجی لوگ اقتدار میں ہیں' کیمونسٹ پارٹی کو اپنے قانونی اور غیر قانونی کاموں کے درمیان تال میل رکھنا لازمی طور پر سیکھ لینا چاہئے اور قانونی کام کو ہمیشہ اور لازمی طور پر غیر قانونی پارٹی کے موثر کنٹرول میں ہی رہنا چاہئے''۔

-بخارن[1]

سکنڈ انٹرنیشنل کے نشانوں کے ساتھ دغا

سوشلسٹ اور محنت کے اس وسیع ادارہ کو ایسی پر امن سرگرمیوں کے مطابق بنا دیا گیا اور جب مصیبت آئی تو بہت سے لیڈر اور عوامی فرقے کے بڑے حصے اپنے آپ کو اس نئی صورت حال کے موافق بنانے میں ناکام ثابت ہوئے......یہی وہ ناگزیر حالات تھے جو بہت حد تک دوسرے انٹرنیشنل کے ترک اعتماد کا سبب بنے۔

مارکس ٹو لینن صفحہ 140 (مارس ہلکویٹ)[2]

'دی سینکس ورڈ بک' (1906)[3]

ایمبروس پر یرس[4] رقم طراز ہے:

''گریپ شاٹ[5] (تعریف)۔ایک دلیل جسے آنے والے امریکی سوشلسٹ کے مطالبات کے جواب میں تیار کیا جارہا ہے''۔

صفحہ 51(48)

مذہب' قائم شدہ نظام کا حامی

غلامی

1835 میں پریسی ٹیرین چرچ کی جنرل اسمبلی نے تجویز پاس کی کہ: غلامی قدیم وجدید دونوں ہی ٹیسٹامنٹوں میں منظور شدہ ہے اور اسے خدائے مطلق نے ممنوع نہیں قرار دیا ہے''۔

دی چارلسٹن بیپٹسٹ ایسوسی ایشن نے 1835 میں درج ذیل فرمان جاری کیا:

''مالکوں کے ذریعہ اپنے غلاموں کے وقت کا استعمال کرنے کے حق کو سبھی چیزوں کے خالق نے واضح طور پر منظوری دے رکھی ہے جو اپنی مرضی سے جس چیز پر چاہے ملکیت کا حق نافذ کرسکتا ہے''۔

ورجینیا کے میتھاڈسٹ کالج کے ایک پروفیسر ریورنڈ ای ڈی سائمن' ڈاکٹر آف ڈیوائنٹی نے تحریر کیا:

''ہولی رٹ (عیسائی مذہب) کے صحائف میں واضح طور پر غلاموں کے اوپر حق ملکیت اور اس حق سے متعلق روزمرہ کی باتوں کا تذکرہ ہے۔تو مجموعی طور پر بات یہی ہے' خواہ ہم خود خدا کی قائم کردہ یہودی پالیسی کو دیکھیں یا سبھی عہد میں نسل

1۔نکولائی ہوانووچ بخارن (1938-1888) روسی سماج جنوادی پارٹی کارکن۔

2۔امریکی سوشلسٹ 3۔اور 4۔نامعلوم 5۔بندوق کے چھرے

انسانی کے یکساں خیالات اور عمل کو لیں یا نیو ٹیسٹامنٹ اور اخلاقیات کی قانونی بندشوں سے متعلق ہدایات کو دیکھیں: ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ غلامی غیر اخلاقی نہیں ہے۔ جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ افریقی غلام قانونی طور پر خرید پر بندھوا بنائے جاتے تھے تو ان کے بچے کو بندھوا بنا کر رکھنے کی بات بھی یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ میں غلامی موجود ہے اس کا قیام درست تھا"۔

ہنری وان ڈائک [1] اسّے ان اپلی کیشن (1905) میں رقم طراز ہے:

"بائبل کی تعلیم ہے کہ خدا دنیا کا مالک ہے۔ وہ اپنی مرضی سے عام قوانین کے مطابق ہر آدمی کو اس کا حصہ دیتا ہے"۔

صفحہ 52(49)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بارے میں تخمینے

تعداد فوج 50,000 تھی۔

اب یہ 300,000 ہے۔

دولت مندوں کے پاس 67 ارب کی دولت ہے

تجارت میں مصروف مجموعی افراد میں سے

پھر بھی ان کے پاس مجموعی دولت کا 70 فی صد ہے۔

تجارت میں مصروف افراد میں سے

29 فی صد اوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں

ان کے پاس مجموعی دولت کا 25 فی صد ہے =24 ارب

تجارت میں مصروف لوگوں میں سے بقیہ 70 فی صد

پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے پاس

مجموعی دولت کا صرف 4 فی صد یعنی 4 ارب ہے

لوسین سینٹل کے مطابق 1900 میں

تجارت میں لگے مجموعی لوگوں میں سے

=250, 251 دولت مند حکمرانوں سے متعلق تھے۔

=8429,845 درمیانی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

=20,395,137 پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

آئرن ہیل [2]

رائفلیں

"تم کہتے ہو کہ اراکین اور سرکاری عہدوں پر تمہاری اکثریت ہوگی لیکن تمہارے پاس رائفلیں کتنی ہیں؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وافر سیسہ تمہیں کہاں سے مل سکتا ہے؟ جہاں تک بارود کی بات ہے، کیمیکل مرکبات، مشینی مرکبات سے بہتر

1۔ نامعلوم 2۔ اور

ہوتے ہیں' یہ بات میری مان لو"۔

آئرن ہیل' صفحہ 198[1]

صفحہ 53(50)

اقتدار[2]

ایک سوشلسٹ لیڈر نے دولت مند حکمرانوں کی ایک میٹنگ سے خطاب کیا اور ان پر سماج کو خراب کرنے کا الزام لگایا گیا اور اس طرح دکھی انسانیت کے سامنے موجود سبھی دشواریوں اور مصائب کی سبھی ذمہ داری انہیں پر تھوپ دی۔ بعد میں ایک سرمایہ دار (مسٹر وکسن) اٹھ کھڑا ہوا اور اسے اس طرح سے خطاب کیا:[3]

"اس پر ہمارا جواب یہ ہے۔ ہمارے پاس تمہارے اوپر برباد کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ جب تم اپنے مضبوط ہاتھ ہمارے محلوں اور دولت کی طرف بڑھاؤ گے تب ہم دکھادیں گے کہ ہماری کیا طاقت ہے۔ بم گولوں کی گڑگڑاہٹ اور مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ سے اہم اپنا جواب دیں گے۔ ہم تم انقلابیوں کو اپنی ایڑیوں تلے پیس ڈالیں گے اور تمہارے چہروں کو مسخ کردیں گے۔ یہ دنیا ہماری ہے۔ ہم اس کے مالک ہیں اور یہ ہماری ہی رہے گی۔ جہاں تک محنت کی بات ہے یہ تو جب سے تاریخ شروع ہوئی تبھی سے دھول چاٹتا رہا ہے اور میں نے تاریخ کو صحیح طریقہ پر پڑھا ہے۔ اور یہ تب تک دھول چاٹتا رہے گا جب تک ہمارے جانشینوں کے ہاتھ میں اقتدار رہے گا"۔

"ایک لفظ ہے۔ اقتدار۔ یہ سبھی لفظوں کا بادشاہ ہے۔ ایشور نہیں' دھن دولت نہیں' بلکہ اقتدار۔ اپنی زبان پر رکھ لو اور تب تک رکھے رہو جب تک کہ یہ اسے جھنجھنانے نہ لگے"۔

"" مجھے جواب مل گیا"۔ ارنسٹ (اس سوشلسٹ لیڈر)[4] نے مخلصانہ جذبہ سے کہا کہ "صرف یہی جواب دیا جاسکتا تھا۔ اقتدار۔ ہم مزدور طبقہ کے لوگ اسی کی تشہیر تو کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں اور اپنے تجربات سے بخوبی جانتے ہیں کہ سچ کی' انصاف کی' انسانیت کی کوئی بھی اپیل کبھی تمہیں چھو نہیں سکتی۔ تمہارے دل بھی تمہاری ایڑیوں کی طرح ہی سخت ہیں جن سے تم غریبوں کے چہرے کچلتے ہو۔ اس لئے تو ہم نے اقتدار کی تشہیر کی ہے لیکن چناؤ کے دن ہمارے ووٹ کی طاقت تم سے تمہاری سرکار چھین لی جائے گی"۔ "اگر انتخاب کے دن تمہیں اکثریت' بھاری اکثریت مل جائے تو بھی اس سے کیا فرق پڑنے والا ہے"۔ مسٹر وکسن تپاک سے بولا۔

"مان لو اگر ووٹ پیٹی میں تمہاری جیت کے باوجود ہم تمہیں اقتدار سونپنے سے انکار کردیں تو؟"۔

صفحہ 54(51)

"ہم نے اس بارے میں بھی سوچ رکھا ہے"۔ ارنسٹ نے جواب دیا۔ "اور اس کا جواب ہم تمہیں گولیوں سے دیں گے۔ اقتدار' تمہیں نے اسے لفظوں کا بادشاہ کہا ہے۔ بہت اچھا! اقتدار' دیکھیں گے اسے۔ اور جس دن ہم چناؤ میں فتح حاصل کرلیں گے۔ اور تمہارے اس آئینی اور پرامن طریقہ پر حاصل کردہ اقتدار کو ہمیں سونپنے سے انکار کردو گے تو تمہارے اس

1۔ جیک لنڈن کا ناول۔

2۔ عنوان کا بقیہ حصہ چھٹا ہوا ہے۔ 3۔ بھگت سنگھ کے الفاظ۔ 4۔ بریکٹ میں بھگت سنگھ کے الفاظ۔

سوال کے جواب میں کہ ہم کیا کریں گے' اس دن میں بتا دوں گا کہ ہم تمہیں اس کا جواب دیں گے۔ ہم بم گولوں کی گڑگڑاہٹ اور مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ سے اپنا جواب دیں گے"۔

"تم ہم سے بچ نہیں سکتے۔ یہ درست ہے کہ تم نے تاریخ کا صحیح طریقہ پر مطالعہ نہیں کیا۔ یہ صحیح ہے کہ مزدوروں کی تاریخ ابتدا سے ہی ڈھول جاتی آ رہی ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ جب تک تمہارے اور تمہارے وارثین کے ہاتھ میں اقتدار رہے گا' اس وقت تک مزدور ڈھول جاتا رہے گا۔ میں تم سے متفق ہوں۔ تم نے جو کچھ کہا کہ ان ساری باتوں سے میں متفق ہوں۔ اقتدار ہی فیصلہ کن ہوگا اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے' یہی تو طبقاتی جدوجہد ہے۔ جیسے تمہارے طبقہ نے قدیم زمین دارانہ نظام کو تہ و بالا کیا' بالکل اسی طرح میرا طبقہ' مزدور طبقہ' تمہارے طبقہ کو نیست و نابود کر ڈالے گا۔ اگر تم اپنی حیاتی سائنس اور اپنی سوشل سائنس کا بھی اسی طرح مطالعہ کرو جس طرح تم تاریخ پڑھتے ہو تو تم دیکھو گے کہ میں نے جس حشر کا ذکر کیا ہے' وہ ناگزیر ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس میں ایک سال لگے گا' دس برس لگیں گے یا ہزار برس لگیں گے' یہ طے ہے کہ تمہارا طبقہ خاک میں مل جائے گا اور یہ اقتدار کے ذریعہ ہی ہوگا۔ ہم محنت کش اس لفظ کو اس قدر رٹ چکے ہیں کہ ہمارے ذہن و دماغ اس سے گونج رہے ہیں۔ اقتدار۔ یہ ایک بادشاہی لفظ ہے"۔

جیک لنڈن کی تخلیق کردہ آئرن ہیل (صفحہ 88)

صفحہ 55(22)

تخمینے [1]

انگلینڈ

1922 -بے روزگاروں کی تعداد= 1,135,000

1926 -یہ 11/4 سے 11/2 ملین کے درمیان
یعنی 1,250,000 سے 1,500,000 کے درمیان رہی ہے۔

انگریز مزدور لیڈروں کی اعتماد شکنی

1911 سے 1913 تک کا سال عام طور پر کان کن مزدور' ریل کارکن اور ٹرانسپورٹ مزدوروں کی بے نظیر طبقاتی جدوجہد کا وقت تھا۔ اگست 1911 میں ریلوے میں قومی بہ الفاظ دیگر عام ہڑتال برپا ہوگئی تھی۔ ان دنوں برطانیہ پر انقلاب کا دھندلا سا سایہ منڈلا رہا تھا۔ لیکن لیڈران نے اس آندولن کو بے اثر کرنے کے لئے اپنا پورا زور لگا دیا۔ ان کا ارادہ "وطن پرستی" کا تھا۔ یہ حرکت اگادر کے اس واقعہ کے وقت کی جا رہی تھی جس نے جرمنی کے ساتھ جنگ کا خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ جیسا کہ آج بخوبی معلوم ہے' وزیر اعظم نے مزدور لیڈروں کو ایک خفیہ میٹنگ میں بلایا اور ان سے مادر وطن کے تحفظ کی اپیل کی۔ اور لیڈروں و بورژوا طبقہ کو مضبوط بنانے کی حتی الامکان کوشش کی اور اس طرح فسطائی قتل عام کے لئے راستہ ہموار کیا گیا۔

(صفحہ 3) ہو ویئر از برٹین گوئنگ؟[2]

1۔ ماخذ نامعلوم۔

2۔ تراتسکی کی تصنیف ہو ویئر از برٹین؟

ٹراٹسکی[1]

صفحہ 56(53)

اعتماد شکنی

صرف 1920 یعنی 'سیاہ جمعہ' کے بعد ہی تحریک حدود میں واپس آئی' جب کان کنوں' ریل ملازموں اور ٹرانسپورٹ کارکنوں کی سہ رکنی رابطہ کمیٹی کے ممبروں نے عام ہڑتال کے ساتھ دھوکہ دہی کر دی۔

(صفحہ 3)[2]

اصلاح کے لئے انقلاب کا خطرہ ضروری ہے

......برطانوی بر ژوا طبقہ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ایسے اقدامات (اصلاحات) کے ذریعہ انقلاب کو موخر کیا جا سکتا ہے۔لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصلاحات کو بھی نافذ کرانے کے لئے صرف آہستہ آہستہ کام کرنے کا اصول ہی کافی نہیں ہے اور یہ کہ انقلاب کا ایک حقیقی خطرہ ضروری ہے۔

(صفحہ 29)[3]

سماجی اتحاد

......ایسا ممکن ہے۔ایک بار جب ہم ایک ایسے خصوصی اختیار یافتہ طبقہ کا صفایا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں جو رنگ منچ سے ہٹنا نہ چاہتا ہو تو طبقاتی جدوجہد کی بنیادی وجہ اس میں مخفی دکھائی دے۔لیکن نہیں میک ڈونالڈ[4] سماجی اتحاد کے تئیں بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے۔لیکن کس کی؟ مزدور طبقہ کا اتحاد تو بر ژوا طبقہ کے خلاف کشمکش سے اس کے داخلی ارتباط کا ظہور ہوتا ہے۔

میک ڈونالڈ جس سماجی اتحاد کا درس دیتے ہیں'وہ استحصال کنندوں کے ساتھ استحصال ہونے والے کا اتحاد' یا بہ الفاظ دیگر استحصال برقرار رکھنے کے علاوہ مزید کچھ نہیں ہے۔[5]

انقلاب ایک مصیبت

'روس کے انقلاب نے' میک ڈونالڈ کے قول کے مطابق ''ہمیں عظیم درس دیا۔اس نے دکھا دیا کہ انقلاب ایک بربادی اور مصیبت کے سوا اور کچھ نہیں ہے''۔

[صفحہ 57(54)]

انقلاب تو مصائب کو ہی جنم دیتا ہے لیکن برطانوی جمہوریت نے تو سامراجیہ وادی جنگ کو جنم دے دیا......جس کی بربادی کا موازنہ انقلاب کے مصائب سے تو لازمی طور پر کیا ہی نہیں جا سکتا۔پھر بھی جس انقلاب نے زارشاہی' زمین دارانہ

1۔لیو ورٹراٹسکی: لیب دویدووچ ٹراٹسکی (1940-1879) لینزم کے کٹر مخالف۔روسی سماجی جمہوری مزدور پارٹی (بولشیوک) کی چھٹی کانگریس میں (1971) بولشیوک پارٹی کے رکن ہو گئے۔اکتوبر انقلاب میں اہم حصہ داری۔انقلاب کے بعد کئی سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

2اور3۔ایضاً

4۔غالباً جیمس ریمزے میکڈونالڈ (1937-1866) برٹش لیبر پارٹی کے لیڈر اور دومرتبہ وزیراعظم 5۔ہو بیٹرا زبر مین گوئنگ؟

نظام اور برژواطبقہ کو اکھاڑ پھینکا' چرچ کو ہلا کر رکھ دیا' 13 کروڑ لوگوں کے ایک ملک یا ممالک کے ایک مجموعے میں ایک نئی زندگی دوڑائی اس کے سامنے یہ اعلان کرنے کے لئے کہ انقلاب ایک مصیبت کے علاوہ کچھ نہیں۔ ایسے ہی بہرے کانوں اور بے شرم چہروں کی ضرورت ہے۔

(صفحہ 64)

پر امن؟

کب اور کہاں حکمراں طبقہ نے پر امن ووٹنگ کے ذریعہ کبھی اقتدار اور ملکیت سونپی ہے اور وہ بھی خاص طور سے برطانوی برژواطبقہ نے جو صدیوں سے دنیا میں لوٹ پاٹ کرتا آیا ہے؟

(صفحہ 66)

سوشلزم کا نصب العین: امن

یہ ایک بلا تنازعہ سچائی ہے کہ سوشلزم کا نصب العین ترجیحی طور پر طاقت کے سب سے بھونڈے اور خونی اشکال کو ختم کرنا ہے اور پھر اس کے بعد اس کے اور چھپی ہوئی اشکال کو بھی ختم کرنا ہے۔

(صفحہ 80)

ہو یئر از برٹین گوئنگ؟ 'ٹراٹسکی'

امن عالم کا نصب العین

1۔ سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنا۔

2۔ انسانیت کی خدمت کے لئے فطرت کا کنٹرول۔

بخارن نے ایسے ہی اس کی تعریف کی ہے۔

صفحہ 58(55)

آدمی اور مشینری

دی یونائیٹڈ ٹرسٹیڈ اسٹیڈ بیورو آف لیبر کا کہنا ہے:

- مشین پر کام کر کے ایک آدمی ایک گھنٹہ 34 منٹ میں سن کا بارہ پونڈ کا پیکٹ تیار کر سکتا ہے۔
- اگر آدمی مشین پر نہیں بلکہ صرف اوزاروں سے کام کرے تو اتنے ہی کام میں 140 گھنٹہ' 55 منٹ کا وقت لگے گا۔

(تناسب- 140.55 : 1.34 منٹ)

- مشین پر کام کر کے 100 جوڑی جوتے بنانے میں 234 گھنٹے 25 منٹ لگتے ہیں۔

3۔ ایضاً۔ 4۔ مذکورہ بالا

- ہاتھ سے اس میں 1831 گھنٹے 40 منٹ لگیں گے۔
- مشین پر کام کرنے پر محنت کی لاگت 6.55 $ آتی ہے۔
- ہاتھ سے...... 457.79 $ آتی ہے۔
- مشینی محنت کے ذریعہ 500 گز چارخانہ دار کپڑا تیار کرنے میں 73 گھنٹے لگتے ہیں۔
- دستی محنت کے ذریعہ اس میں 5844 گھنٹے لگتے ہیں۔
- مشینی محنت کے ذریعہ 100 پونڈ سلائی کا سوتی دھاگہ 39 گھنٹے میں تیار ہوتا ہے۔

بعدازاں: زراعت

- ایک صحت مند شخص ہنسوا سے ایک ایکڑ فصل دن (12 گھنٹے) میں کاٹ سکتا ہے۔
- ایک مشین اسی کام کو 20 منٹ میں کردیتی ہے۔
- چھ آدمی موسل سے 60 میٹر گیہوں کی منڈائی آدھے گھنٹے میں کرسکتے ہیں۔
- ایک مشین اتنے ہی وقت میں 12 گنا زیادہ کام کرسکتی ہے۔

''مشینری کے استعمال سے انسانی محنت کی تاثیر سے ہونے والی بڑھوتری ......رائی کے معاملے میں 150 فی صد سے لے کر 150 فی صد سے لے کر جو کے معاملے میں 2244 فیصد تک ہوجاتی ہے......''۔

صفحہ 59(56)

......اور اس کی آبادی کا مال و اسباب: (1850-1912)2

1850 میں مجموعی مال اسباب تھا	فی شخص	مجموعی آبادی
$ 7,135,7580,000	$ 308	12,191,876=
1860 $ 16,159,616,00	$ 514	31,443,321=
1870 $ 30.068,518,00	$ 780	38,558,371=
1880 $ 43,642,000,000	$ 870	50,155,783=
1890 $ 65,037,091,000	$ 1,036	62,947,714=
1900 $ 88,517,307,000	$ 1165	75,994,575=
1904 $ 104,104,202,000	$ 1318	82,466,551=
1912 $ 187,139,071,000	$ 1965	9540503=

مشینری استعمال کے اسباب۔

مشین اپنی فطرت میں سماجی ہے جیسے کہ اوزار ذاتی تھا۔[3]

''ہمیں خراب کپڑا دو، لیکن ہمیں بہتر آدمی دو''۔ ایمرسن[4] کا کہنا ہے۔

''ناتوانی امراض سے مرتے بچوں کے کی جان کی حفاظت کرو، پھر اس کے بعد کپڑے کی تجارت کو ترجیح دو، صفحہ 81 آدمی کو مشین پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ مشین کو لازمی طور پر نسل انسانی کی خدمت میں لگنا چاہئے جب کہ ابھی بھی اس صنعتی نظام میں نسل انسانی پر بڑا قہر برپا ہونے کا خطرہ منڈلانے لگا ہے۔

-پاورٹی اینڈ ریچیز (صفحہ 81) اسکاٹ نیئرنگ[5]

1۔ مآخذ نامعلوم۔ 2۔ مآخذ نامعلوم۔ 3۔ نامعلوم۔ 4۔ غالباً مشہور انگریز شاعر، مفکر اور مضمون نگار رالف والڈو ایمرسن (1803-1882) 5۔ نامعلوم

صفحہ 60(57)

آدمی اور مشینری

سی نین فورڈ ہینڈرسن اپنی تخلیق 'رے ڈے' میں رقم طراز ہے:

"یہ صنعتی ادارہ جو بھی اداروں میں سب سے قدیم ہے' نسل انسانی کے چیزوں کو من مانا طرز سے آزاد کرانے کی غرض سے منظم اور فروغ پائی لیکن اب یہ خود اس سے بڑا من مانا طرز بن چکا ہے جو سبھی آبادی کو غلاموں کی حالت میں ایسے غلامی کی شکل میں دھکیلتی جارہی ہے جو طویل اور تھکا دینے والے گھنٹوں تک کام کرتے ہوئے ڈھیروں اشیاء پیدا کرتے رہنے کے گناہ گار ہیں جب کہ وہ جو چیزیں پیدا کرتے ہیں' خود انہیں کے اثر سے متاثر ہونے پر مجبور ہیں"۔

-پاور پیچیز' (صفحہ 87)[1]

آدمی مشینری کے لئے نہیں ہے

آدمی نے فولاد اور آگ کے میل سے چیز پیدا کی ہے اور جسے مشین کہا ہے' اسے لازمی طور پر ہمیشہ انسان کا مالک نہیں بلکہ خدمت گار ہونا چاہئے۔ نہ تو مشین اور نہ ہی مشین کے مالک کو نسل انسانی پر حکمرانی کا اختیار ہے۔

سامراجیت

سامراجیت ترقی کے اس مرحلہ کا سرمایہ دارانہ نظام ہے جس میں اجارہ داریوں اور مالیاتی سرمایہ نے اقتدار اعلیٰ کی تاثیر حاصل کرلی ہے' ایکسپورٹ پونجی انتہائی اہمیت حاصل کرچکی ہے' بین اقوامی ٹرسٹوں نے دنیا کی تقسیم کا آغاز کردیا ہے اور سب سے بڑے سرمایہ دار ممالک نے زمین کے سبھی جغرافیائی رقبہ کا آپس میں بٹوارہ پورا کرلیا ہے۔

۔لینن[2]

(صفحہ 61(58)

آمریت

آمریت ایک اقتدار ہے جو براہ راست طاقت پر مبنی ہوتی ہے اور کسی قانون سے بندھی ہوئی نہیں ہوتی۔

پسماندہ طبقہ کی انقلابی حکمرانی ایک ایسا اقتدار ہے جو برژوا طبقہ کے خلاف اور اس کے اوپر' پسماندہ طبقہ کے ذریعہ طاقت کی بدولت نافذ کی جاتی ہے۔ اور جو کسی قانون سے وابستہ نہیں ہوتی۔

-پرولی ریوو[3] (صفحہ 18) لینن

انقلابی آمریت

انقلاب ایک کارروائی ہے جس کے تحت آبادی کا ایک طبقہ دوسرے طبقوں پر رائفلوں' سنگینوں' بندوقوں اور ایسی ہی دیگر اقتدار پسند اقدامات کے ذریعہ اپنی خواہش تھوپتا ہے اور جو فریق فاتح ہوتا ہے' وہ اپنی حکومت لازمی طور پر اس خوف کے ذریعہ

1۔نامعلوم

2۔وی آئی لینن' سامراجیت' سرمایہ دارانہ نظام کی انتہائی حالت۔

3۔لینن کی تخلیق 'پسماندہ طبقہ کا انقلاب اور غدار کاؤتسکی' سے ماخوذ۔

قائم کرتا ہے جسے اس کے ہتھیار ردعمل کرنے والوں میں پیدا کرتے ہیں۔ اگر پیرس کے کمیون نے برژوا طبقہ کے خلاف مسلح عوام پر اعتماد نہیں کیا ہوتا تو وہ اپنے آپ کو چوبیس گھنٹے سے بھی زیادہ قائم رکھ سکا ہوتا؟ اس کے برعکس کیا ہماری یہ مذمت جائز نہیں ہے کہ کمیون نے اس حکومت کا بہت ہی کم استعمال کیا؟

الیف اینگلس[1]

برژوا جمہوریت

برژوا جمہوریت بمقابلہ زمین دارانہ نظام ایک عظیم تاریخی ترقی کے باوجود ایک بہت ہی محدود، بہت ہی پرفریب ادارہ، صاحب ثروت افراد کے لئے جنت اور دبے کچلے اور غرباء کے لئے ایک جال اور چھلاوا کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا۔

۔لینن (صفحہ 28)[2]

صفحہ 62(59)

محنت کا استحصال اور اسٹیٹ

"صرف قدیم اور زمین داری نہیں بلکہ آج کا نمائندہ اسٹیٹ بھی سرمایہ کے ذریعہ اجرتی محنت کے استحصال کا ایک سامان ہے۔

۔اینگلس[3]

آمریت

"چوں کہ اسٹیٹ صرف ایک عارضی ادارہ آمریت ہے، جس کا استعمال اپنے دشمنوں کا بزور طاقت خاتمہ کرنے کے لئے انقلاب میں کیا جاتا ہے، اس لئے عوام کے آزاد اسٹیٹ کی بات کرنا بالکل بکواس ہے جب کہ پسماندہ طبقہ کو اسٹیٹ کی ضرورت رہتی ہے تب تک اس کی ضرورت آزادی کے حق میں نہیں بلکہ اپنے مخالفین کا خاتمہ کرنے کے لئے پڑتی ہے اور جیسے ہی آزادی کی بات کرنا ممکن ہو جاتا ہے، ویسے ہی اس کا وجود اپنے آپ میں ختم ہو جاتا ہے"۔

بیبل کو لکھے اینگلس کے خط سے

28 مارچ 1875

پست حوصلہ اصول پسند

پست حوصلہ اصول پسند کے لئے اور بغیر کچھ پست حوصلگی کے شاید ہی آدمی موثر ثابت ہو سکے۔ یہ تقریباً طے بات ہے کہ دنیا کو خوش حال بنانے کی کوشش میں اسے اپنے مخالفین کی نفرت کے لائق بننا ہوگا اور نا امید بھی ہونا پڑ سکتا ہے۔

۔برٹرینڈ رسل

1۔فریڈرک اینگلس (1820-1895) 'اقتدار کے بارے میں' سے ماخوذ

2۔مزدور انقلاب اور غدار کاؤتسکی' سے اخذ کردہ 3۔کنبہ' ذاتی ملکیت اور اسٹیٹ کی شورش زدگی' سے ماخوذ۔

4۔اگست بے بیلے (1840-1913) جرمن اور بین اقوامی مزدور تحریک کے ایک معروف لیڈر۔ 1867 سے جرمن مزدور انجمنوں کی لیگ کے لیڈر پہلے انٹرنیشنل کے رکن 1867 سے رائیکسٹگ (جرمن ممبر پارلیمنٹ) کے رکن جرمن سماجی جنواد کے بانیوں میں سے ایک مارکس اور اینگلس کے دوست اور معاون سکنڈ انٹرنیشنل کے اہم لیڈر۔

صفحہ 63(60)

لیڈر

کارلائل رقم طراز ہے۔ ''کوئی بھی وقت برباد نہیں ہوا ہوتا اگر کوئی بڑا آدمی مل جاتا جو کافی سمجھ دار اور نیک ہوتا جس میں اتنی سمجھ داری ہوتی کہ وہ درست طور پر جان لے کہ وقت کا تقاضا کیا ہے: جس میں اتنی شجاعت ہوتی کہ وقت کے لحاظ سے صحیح راستے پر قائدانہ رول ادا کر سکتا تب تو ان کی بدولت کوئی بھی وقت نجات کا وقت ہو سکتا ہے۔

مطلق العنانی

کاؤتسکی نے 'پرولیتاریت ڈکٹیٹرشپ' عنوان سے ایک کتابچہ لکھا جس میں اس نے بولشیوکوں کے ذریعہ برژوا طبقہ کے لوگوں کو ووٹ دینے کے حق سے محروم کیے جانے کی مذمت کی۔ اس پر لینن نے اپنی 'پرولیتارین ریوولیوشن' (صفحہ 77) میں تحریر کیا:

''مطلق العنانی! ذرا سوچیں تو اس اظہار غم میں کمینے پن کی کس ذلت آمیز سطح پر اتر کر برژوا طبقہ کی چاپلوسی کی گئی ہے اور کتنی احمقانہ باتیں کی گئی ہیں۔ جب کہ صدیوں سے مزدوروں کا استحصال کرنے کے لئے' غریب لوگوں کے ہاتھ پاؤں باندھے رکھنے کے لئے اور عوام کے سادہ لوح اور محنت کش فرقہ کے راستے میں ایک سوا رچن ڈالنے کے لئے' پوری طرح سے برژوا اور اس میں بھی سرمایہ دار ممالک کے نکتہ چیں قانون ساز ہی قانون بناتے آئے ہیں اور متعدد روایات اور قوانین پر سینکڑوں صحائف اور ان کی تشریحات تحریر کرتے آئے ہیں' جہاں اتنا سب کیا گیا ہے' وہاں برژوا روا داروں اور مسٹر کاؤتسکی کو کوئی 'مطلق العنانی' نہیں دکھائی دیتی۔ تب تو یہ سب قانونی نظام ہے۔ یہ سب اس لئے سوچا اور لکھا گیا ہے کہ کیسے غریبوں کو دبائے رکھ کر نچوڑتا رہا جائے۔ ہزاروں برژوا وکیل اور سرکاری اہل کار قوانین کی ایک تشریح کرتے رہتے ہیں کہ مزدور اور اوسط کسان ان کے خاردار تاروں کے حصار کو کبھی نہیں توڑ سکیں۔ بیشک یہ کوئی مطلق العنانی نہیں ہے۔ یہ ان گندے یا منافع خور استحصال کرنے والوں کا من مانا پن نہیں ہے جو عوام کا خون پی رہے ہیں۔ اوئے یہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ تو 'خالص جمہوریت' ہے جو دن بہ دن خالص تر ہوتی جا رہی ہے۔'

[صفحہ 64(16)]

لیکن جب سامراجی جنگ کے ذریعہ سرحد پار کے اپنے بھائیوں سے علاحدہ کرنے دیئے جانے والے محنت کش اور استحصال شدہ عوام نے تاریخ میں پہلی بار اپنی سوویتیں تشکیل کر لی ہے' جب انہوں نے سیاسی تعمیر کے لئے مزدوروں سے اور ان طبقات سے اپیل کی ہے جنہیں برژوا طبقہ مصیبت اور جڑ بنائے رکھتا تھا اور جب سے وہ ایک نیا مزدور اسٹیٹ بنانے کے کام میں مصروف ہیں' اور مبینہ طور پر جاری جنگ کے دوران خانہ جنگی کے شعلوں میں جب وہ ''استحصال کرنے والوں سے پاک اسٹیٹ' کے بنیادی اصول بنانے لگے تو برژوا طبقہ کے بھی شرپسند عناصر اور خون چوسنے والوں کے بھی گروہ کاؤتسکی کے سر میں سر ملا کر مطلق العنانی کی چیخ و پکار مچانے لگے ہیں۔

(لینن) صفحہ 78 -77[2]

1۔ تھامس کارلائل (1881-1795): برطانوی مصنف اور مضمون نگار۔

2۔ لینن 'مزدور انقلاب اور غدار کاؤتسکی۔

پارٹی

لیکن یہ واضح ہو چکا ہے کہ جب تک انقلاب کی قیادت کرنے کے لئے ایک اہل پارٹی نہ ہو اس وقت تک کوئی انقلاب ممکن نہیں ہو سکتا۔

(صفحہ 15 لیسنس آف اکتوبر 1971)[1]

مزدور انقلاب کے لئے پارٹی ایک ناگزیر چیز ہے۔
(صفحہ 17 ایضاً۔ رائٹر ٹراٹسکی)

صفحہ 65(62)[2]

اس کے (محنت کش آدمی کے) لئے قانون، اخلاق اقدار مذہب یہ سب اس کے (مزدور طبقہ کے) لئے نانا برژوا محض پیشگی اپیل ہے جن کی آڑ میں اتنے ہی برژوا خود غرض گھات لگائے رہتے ہیں۔

کارل مارکس۔ منشور[3]

صفحہ 67(64)

1۔ لیون ٹراٹسکی کی کتاب 'لیسنس آف اکتوبر 1917' سے ماخوذ۔

2۔ صفحہ کا بالائی حصہ تقریباً دو تہائی پھٹا ہوا ہے۔

اس میں صرف پی کے دت (بٹوکیشور دت) کا ترچھا دستخط ہے۔

اور مورخہ 12.7.30 دوبارہ درج ہے۔

3 کمیونسٹ اعلامیہ۔

نوٹ بک میں صفحہ 66(63) نہیں ہے۔ اس صفحہ یعنی نوٹ بک صفحہ 67(64) پر درمیان میں بی کے دت کا تاریخ سمیت (12.7.1930) دستخط ہے۔

اس کے نیچے بھگت سنگھ کی تحریر میں صفحہ کے نیچے دائیں طرف یہ تفصیل درج ہے:

شری بی کے دت کا اس جیل سے فائنل
ڈیپارچر سے چار دن قبل کوٹھری نمبر 137
سنٹرل جیل لاہور میں 12 جولائی 30
کو لیا گیا آٹوگراف

اس کے نیچے بھگت سنگھ کے دستخط ہیں۔ ان اندرجات کے علاوہ نوٹ بک میں اور کسی اندراج میں تاریخ نہیں ہے۔

نوٹ بک میں صفحہ 68(65) نہیں ہے۔

صفحہ 69(66)

کمیونسٹوں کا نصب العین

'کمیونسٹ اپنے نظریات اور نصب العین چھپانے سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ کھلے عام اعلان کرتے ہیں کہ ان کا نشانہ صرف سبھی موجودہ سماجی صورت حال کو بزور طاقت اکھاڑ پھینکنے کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ حکمراں طبقہ کو کمیونسٹ انقلاب کے خوف سے تھرّانے دو۔ مزدوروں کے پاس اپنی بیڑیوں کے سوا کھونے کو کچھ نہیں۔ جیتنے کے لئے اس کے سامنے پوری دنیا ہے۔

''دنیا کے مزدورو ں ایک ہو!''

کمیونسٹ انقلاب کا نشانہ

''ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مزدور طبقہ کا انقلاب میں پہلا قدم' مزدور اور پسماندہ طبقہ کو اٹھا کر حکمراں طبقہ کی حالت میں لانا ہے' عوامی لڑائی جیتنا ہے۔ مزدور اپنے سیاسی اثر کا استعمال برژوا طبقہ سے آہستہ آہستہ کرکے سارا سرمایہ غصب کرنے' پیداوار کے سبھی ساز و سامان کو مملکت کے یعنی حکمراں طبقہ کی شکل میں منظم مزدور طبقہ کے ہاتھو میں مرکوز کرنے اور پیداواری طاقتوں میں پوری طرح اور جلد از جلد اضافہ کرنے کے لئے کرے گا۔

کمیونسٹ مینی فیسٹو[2]

صفحہ 70(67)

کارل مارکس کی غلطیاں نکالنا

......اور یہ لازمی معلوم ہوتا ہے کہ ترآتسکی اس سے وابستہ تھے جسے جرمن 'حقیقی سیاست' کا اسکول کہا کرتے تھے۔ اور کسی بھی نظریہ کے تئیں بالکل ویسے ہی معصوم تھے جیسے کہ بسمارک۔ اور اس لئے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ترآتسکی بھی اتنے

1۔ کیمونسٹ مینی فیسٹو کا آخری پیرا 2۔ کیمونسٹ مینی فیسٹو

انقلابی نہیں ہیں کہ کہہ سکیں کہ مارکس نے ایک غلطی کی تھی بلکہ وہ ایک یا زیادہ صفحات معنی کو غلط ٹھہرانے کے کام میں یعنی یہ ثابت کرنے میں لگانا ضروری سمجھتے ہیں کہ مقدس کتابوں میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب اس سے بالکل مختلف ہے۔

ٹراٹسکی کی تخلیق 'دلسنس آف اکتوبر 1917' تمہید

تمہید اے سوسن لارینس کے ذریعہ تصنیف کردہ

عوام کی آواز

ہمیں جتنی سرکاروں کے بارے میں معلومات ہے وہ سب کی سب خاص طور پر عوام کے تئیں رنجیدہ ہو کر ہی حکومت کرتی رہی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہی ملک کے سیاسی روب سے باخبر اس یا اُس طبقہ کی اقلیت سرکاریں ہی رہی ہیں۔ لیکن جب یہ شیطان (یعنی عوام) جاگ جائے گا تو اس کی مرضی نافذ ہوگی لیکن سب سے بڑی بات ہے کہ یہ وقت رہتے جاگے گا یا نہیں۔

دیباچہ [2]

صفحہ 71(68)

لینن نے جولائی 1917 میں تحریر کیا "یہ اکثر ہوتا ہے کہ جب واقعات اچانک موڑ لیتے ہیں تو ایک لیڈنگ پارٹی بھی کچھ وقت تک کے لئے اس نئی صورت حال کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو پاتی۔ وہ وہی پرانے جملے دہراتی ہے جو اس نئی صورت حال میں بے معنی ہو چکے ہوتے ہیں اور جس تناسب سے واقعات میں 'غیر متوقع' تبدیلی ہو چکی ہوتی ہے اسی تناسب سے ان کی معنویت بھی 'غیر متوقع طور پر' ختم ہو چکی ہوتی ہے"۔

لیسنس آف اکتوبر (صفحہ 17)[3]

جنگی مہارت اور پالیسی

جیسے جنگ میں ویسے ہی سیاست میں بھی جنگی مہارت کا مطلب ہے الگ الگ کارروائی کرنے کا فن، پالیسی کا مطلب ہے فتح یاب ہونے یعنی اقتدار پر حقیقی قبضہ کا فن۔

صفحہ (18)[4]

پرچار اور کارروائی

اور جب مزدور طبقہ کی پارٹی تیاری سے یعنی پرچار اور اور تنظیم اور تحریک سے آگے بڑھ کر اقتدار کے لئے حقیقی جدوجہد کے میدان میں اترتی ہے اور بورژوا طبقہ کے خلاف ایک حقیقی عوامی بغاوت کرتی ہے تو ایک اچانک تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں پارٹی کے اندر ایسے عناصر جو اولوالعزم نہیں ہوتے، یا شکی یا سمجھوتہ کرنے والے یا بزدل ہوتے ہیں، وہ عوامی بغاوت کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ اپنی مخالفت کو جائز ٹھہرانے کے لئے اصولی دلائل تلاش کرتے ہیں اور انہیں یہ دلیلیں اپنے کل کے مخالفین کے درمیان بالکل پختہ طور پر مل بھی جاتی ہیں۔

1۔ 1925 میں پہلی بار شائع شدہ۔

2 ایضاً

3 اور 4-1926 میں شائع شدہ ٹراٹسکی کی کتاب لیسنس آف اکتوبر 1971 سے ماخوذ۔

ترآتسکی 19[1]

صفحہ 72(69)

''اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو پرانے فارمولوں سے نہیں بلکہ نئے حقائق سے روبرو کریں''۔
لینن (صفحہ 25)[2]

وہ ہمیشہ ہی مستقبل کے لئے ماضی سے لڑتے رہے۔
......لیکن ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب سوچنے کی یہ عادت' کہ دشمن زیادہ بڑا طاقتور ہے' فتح کی راہ میں اہم رکاوٹ بن جاتی ہے۔

ترآتسکی صفحہ 48[4]

......لیکن ایسے حالات میں ہر ایک پارٹی کے پاس اپنا لینن تو ہوگا نہیں۔
......اہم لمحات کو گنوا دینے کا کیا مطلب ہوتا ہے......؟
جنگی مہارت کا سارا فن اسی میں ہے کہ جب حالات سب سے زیادہ موافق ہوں تو اس لمحہ کے مطابق کارروائی کی جائے۔
حالات نے ایسا اتفاق پیدا کیا تھا اور لینن نے کہا تھا کہ مشکل کو کسی نہ کسی صورت میں حل کرنا ضروری ہے۔لینن نے بار بار کہا ''ابھی یا کبھی نہیں'۔

صفحہ 25[5]

صفحہ 73(70)

ایک انقلابی پارٹی کی طاقت ایک محدود دائرہ تک بڑھتی ہے لیکن اس کے بعد اس کا الٹا بھی ہو سکتا ہے......[6]
''ہچکچانا جرم ہے''......اکتوبر کے آغاز میں......(لینن نے)......لکھا۔سوویتوں کی کانگریس کا انتظار کرنا اور رسم ادائیگی کا ایک بچکانا کھیل کھیلنا ہے۔رسم ادائیگی کے ساتھ ایک تحقیر آمیز کھیل کھیلنا ہے' یہ انقلاب کے ساتھ دھوکہ دہی ہے''۔

موزوں لمحہ

سیاست میں وقت ایک اہم جز ہے اور انقلاب میں تو یہ ہزاروں گنا زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔چیزیں جو آج کی جا سکتی ہیں' کل نہیں کی جا سکتیں۔ہتھیار لے کر اٹھ کھڑا ہونا' دشمن کو شکست دینا' اقتدار پر قابض ہونا آج ممکن ہو سکتا ہے اور کل ناممکن ہو سکتا ہے۔لیکن آپ کہہ سکتے ہیں کہ اقتدار پر قبضہ کرنے کا مطلب تو تاریخ کے رخ کو موڑنا ہوتا ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ایسی چیز محض 24 گھنٹے کی تاخیر پر منحصر ہو؟ ہاں جب مسلح عوامی بغاوت کا وقت آ جاتا ہے تو واقعات سیاست کے طویل پیمانوں سے نہیں بلکہ جنگ کے چھوٹے پیمانوں سے ناپے جاتے ہیں۔اس میں چند ہفتے' چند دن یا یہاں تک کہ کبھی کبھی ایک دن کی تاخیر کا مطلب انقلاب کا ایثار ہو سکتا ہے' گھٹنے ٹیک دینا ہو سکتا ہے۔

1۔4.3.2 اور 5 ترآتسکی کی کتاب لیسنس آف اکتوبر 1917 سے ماخوذ۔

2۔آخری لفظ اصل میں غیر واضح ہے لیسنس آف اکتوبر 1971 سے ماخوذ۔

سیاسی چال بازی، خاص طور سے انقلاب میں، ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔ آپ دشمن کو دھوکہ دے سکتے ہیں لیکن اس سے آپ کے پیچھے چلنے والے عوام گمراہ ہو سکتے ہیں۔

صفحہ 74(71)

تذبذب

لیڈروں کی جانب سے دکھائی جانے والی اور ان کے حامیوں کے ذریعہ محسوس کیا جانے والا تذبذب سیاست میں عام طور پر نقصان دہ ثابت ہوتا ہے اور مسلح عوامی بغاوت کی حالت میں تو یہ ایک جان لیوا خطرہ ہے۔

جنگ

......''جنگ جنگ ہے'' خواہ جو بھی ہو، اس میں کوئی ہچکچاہٹ یا وقت کا زیاں نہیں ہونا چاہئے۔

نااہل لیڈر

......ایسے لیڈروں کی دو قسمیں ہیں جو پارٹی کو ایسے وقت میں پیچھے کھینچنے کا رجحان رکھتے ہیں جب اسے سب سے تیز رفتار سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک قسم ایسے لیڈروں کی ہے جن کا رویہ انقلاب کے راستے میں ہمیشہ ہی بے پناہ مصیبتیں اور رکاوٹیں دیکھنے کا ہوتا ہے اور جو انہیں دیکھ کر محتاط اور غیر محتاط طور پر ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مارکسزم کو توڑ مروڑ کر اس طرح اس کی تعریف کرنے نکلتے ہیں کہ انقلابی کارروائی کیوں ناممکن ہے۔

دوسری قسم کے لیڈر محض سطحی تحریک چلانے والے ہوتے ہیں۔ وہ جب تک رکاوٹوں سے متصادم ہو کر اپنا سر نہیں پھوڑ لیتے، تب تک انہیں کبھی رکاوٹیں نظر نہیں آتیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بس تقریر جھاڑ کر ہی حقیقی مصائب سے نجات پا لیں گے۔ وہ ہر چیز کو انتہائی امید کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور جب سچ مچ کچھ کرنے کا وقت ہوتا ہے تو ٹھیک اسی وقت پالا بدل لیتے ہیں۔

صفحہ 80[2]

صفحہ نمبر 75 سے 100 نوٹ بک کی ہمیں دستیاب شدہ کاپی میں نہیں تھے۔

اگلا صفحہ 101(74) ہے۔ مدیر

صفحہ 101(74)

معاشیات[3]

قیمت

''1 پاؤ مکا = ک/لوہے کی قیمت۔ یہ تجزیہ ہمیں کیا بتاتا ہے؟ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ دو مختلف اشیاء۔ میں مکا پاؤ بھر میں اور لوہے کی قیمت میں۔ مساوی خوبی والی کوئی چیز دونوں میں مشترکہ طور پر موجود ہے۔ اگر چہ ان دونوں چیزوں کو یقیناً کسی ایسی

1۔ مذکورہ بالا سبھی مثالیں غالباً ٹراٹسکی کی کتاب لیسنس آف اکتوبر 1917 سے ماخوذ ہے۔

2۔ غالباً لیسنس آف اکتوبر 1917

2۔ حاشیہ پر نوٹ کیا ہوا۔

تیسری چیز کے برابر ہونا چاہئے جو خود نہ تو پہلی چیز ہو اور نہ ہی دوسری چیز ...... اب آیئے ہم ان دونوں مصنوعات میں سے ہر ایک کے اندر پوشیدہ اس تیسری بچی ہوئی چیز پر غور کریں، یہ ہر ایک پروڈکٹ میں ایک ہی غیر مادی سچائی کی شکل میں، ایکسار انسانی محنت، یعنی اس محنت کے محض ایک ذخیرہ کی شکل میں پوشیدہ ہے جس میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس محنت کے خرچ کئے جانے کی نوعیت کیا رہی ہے۔ اب یہ ساری چیزیں ہمیں بتاتی ہیں کہ مذکورہ مصنوعات کی پیداوار میں انسانی محنت صرف کی گئی یعنی کہ اس میں محنت نظر آتی ہے۔ جب ہم اس سماجی عنصر یعنی محنت کو اس کے علاحدہ علاحدہ مظہر دیکھتے ہیں تو لوگوں کے لئے وہی 'قیمت' کہلاتی ہیں۔

مارکس۔ پونجی انگریزی ترجمہ (صفحہ 3,4,5)

✓ قانون

''بہر حال، سماج قانون پر منحصر نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو ایک قانون کا گھڑا ہوا قصہ ہے۔ اس کے برعکس قانون کو لازمی طور سے سماج پر مبنی ہونا چاہئے۔ اسے لازمی طور پر سماج کی بھلائی اور ضرورت کا اظہار ہونا چاہئے اور اسے صنعتی پیداوار کی خواہش کے بجائے پیداوار کی سماجی اور بغیر کوئی نقصان کئے بغیر سے مادی پیداواری طریقہ سے نکلنا چاہئے۔ اس وقت میرے ہاتھ میں نیپولین کا ضابطہ ہے لیکن اس نے جدید شہری سماج کو نہیں پیدا کیا ہے۔ 18ویں صدی میں پیدا ہوئے اور 19ویں صدی ترقی کردہ سماج اس کتاب میں محض ایک قانونی ظہور کے طور پر پوشیدہ ہے۔ جب یہ سماجی حالات کے مطابق نہیں رہ جائے گا تو یہ محض ردی کاغذ کا پلندہ ہی ثابت ہوگا...... زندگی کے بدلتے حالات کے ساتھ ساتھ قانون بھی لازمی طور پر بدلتے رہے ہیں۔ مگر سماجی ترقی کی نئی ضروریات اور توقعات کو درکنار کر کے (زمانہ کی پکار کے لحاظ سے) پرانے قانون کو بنائے رکھنا دراصل عام لوگوں کے حقوق کے خلاف کچھ خاص حقوق کی پر فریب حمایت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے''۔

مارکس (کالون کی جوری عدالت میں)[2]

✓ عوام

''عوام ایک ایسے بھاری بھرکم اور بے میل حیوان کی طرح ہوتے ہیں جو اپنی ہی طاقت سے ناواقف ہوتا ہے اور اس لئے بوجھ ڈھوتے ہوئے کوڑے ڈنڈے کھاتا رہتا ہے۔ یہ اس بچہ کے ذریعہ بھی ہانک لیا جاتا ہے جسے وہ جب چاہے دھکے مار کر پھینک سکتا ہے۔ لیکن یہ اس بچے سے ڈرتا ہے اور اس لئے یہ اس کی ساری حرکتوں کو جھیلتا رہتا ہے۔ اور کبھی محسوس نہیں کرتا کہ وہ بچہ خود اس سے کتنا ڈرتا ہے۔ بے نظیر ہے الوگ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے آپ کو پھانسی دے دیتے ہیں اور خود بچیل چلے جاتے ہیں اور خود ہی اپنے اوپر جنگ اور موت کا قہر برپا کر لیتے ہیں۔ کس لئے؟ بس ایک دمڑی کے لئے جو انہیں تمام

1۔ اصل میں عنوان کے بائیں طرف 'صحیح' (✓) کا نشان۔

2۔ 1948 میں مارکس کے اور ان کے اخبار کو لے کر کولون (جرمنی) میں ایک مشہور مقدمہ چلا۔

مئی 1848 میں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس نے ساتھیوں کی مدد سے نیو رائنش زائٹنگ (Neue Rheinische Zeitung) نامی ایک سیاسی ڈیلی اخبار نکالا۔ مارکس اس کے مدیر تھے۔ یہ یوروپ میں انقلابی اتھل پتھل کا دور تھا۔ نومبر 1848 میں جب پرشا کے بادشاہ نے نیشنل اسمبلی کو تحلیل کر دیا تو مارکس اور ان کے ساتھیوں نے عوام سے ٹیکس نہ دینے کی اپیل کی اور مسلح مخالفت کی وکالت کی۔ کولون کی گھیرابندی کر لی گئی اور ان کا اخبار بند کر دیا گیا۔ مقدمہ کے دوران مارکس نے اپنے دلائل سے جیوری کو ہی ملزم قرار دیا۔ انہیں بری کر دیا گیا لیکن پرشا سے ملک بدر کر دیا گیا۔

دمڑیوں میں سے ایک ہوتی ہے جنہیں وہ خود ہی بادشاہ کو دے چکے ہوتے ہیں جب کہ دھرتی اور آسمان کے درمیان جو کچھ ہے سب تو ان کی ہے لیکن وہ اسے نہیں جانتے اور اگر انہیں کوئی یہ بتا دے تو اس آدمی کو گرا کر مار ڈالیں گے۔

توماسو کیمپانیلا[1]

صفحہ 102 (75)

مارکسزم بنام سوشلزم

(1908-12)

رائٹر ولادیمیر جی سکھوچ

پی ایچ ڈی کولمبیا یونیورسٹی

وہ ایک ایک کر کے مارکس کے سارے مارکس کے سارے اصولوں کی مذمت کرتے ہیں اور ان سبھی کو خارج کرتے ہیں:

1۔ قیمتوں کا اصول

2۔ تاریخ کا اقتصادی تذکرہ

3۔ دولت کا تھوڑے سے ہاتھوں' یعنی سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں پہنچنا' درمیانی طبقہ کا پوری طرح خاتمہ اور مزدور طبقہ کا سیلاب۔

4۔ بڑھتی غریبی کا اصول جس کے نتیجے کے طور پر

5۔ جدید اسٹیٹ اور سماجی انتظام کا لازمی بحران

وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مارکس واد صرف انہیں بنیادی اصولوں پر مبنی ہیں اور انہیں ایک ایک کر کے خارج کرتے ہوئے نتیجے کے طور پر کہتے ہیں کہ جلد پھوٹ پڑنے والی ساری دھندلی توقعات ابھی تک بے قیمت ثابت ہوئی ہیں۔ درمیانی طبقہ کم نہیں ہو رہا ہے بلکہ بڑھ رہا ہے۔ دولت مند طبقہ کی تعداد بڑھ رہی ہے اور پیداوار اور صارفین کا نظام بھی حالات کے مطابق بدل رہا ہے' اگرچہ مزدوروں کی حالت میں سدھار کر کے کسی بھی طرح کے سنگھرش کو موخر کیا جا سکتا ہے۔ سماجی انتشار کا سبب غریبی نہیں بلکہ صنعتی مراکز پر غریب طبقوں کی مرکزیت ہے جس کے ناطے طبقاتی بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اس لئے یہ سب چل پوں ہے۔[2]

صفحہ 103 (76)

لیس مزریبلس کا کردار

جب تک قانون اور روایت کی بدولت ایک ایسی سماجی بدحالی موجود رہے گی جس میں تہذیب کے اندر جہنم بنتے رہیں گے اور قدرتی نظام کے ساتھ انسانی نظام کا الجھاؤ ہوتا رہے گا۔ جب تک اس عہد کے تین مسائل' غریبی کے سبب انسان کی

1۔ توماسو کیمپانیلا (1568-1639): اطالوی شاعر اور فلسفی۔ سٹی آف سن میں یوٹوپیا کا خاکہ۔ اطالوی میں عشقیہ نظمیں لکھیں۔

2۔ بھگت سنگھ کی کتاب پر درج نکتہ چینی۔

بدحالی' بھوک کے سبب عورت کی بدحالی اور جہالت کے سبب بچوں کی کمزوری حل نہیں ہوتی' جب تک کچھ علاقوں میں سماجی گھٹن موجود رہے گی' بہ الفاظ دیگر ایک اور بھی وسیع نظریہ سے' جب تک اس سرزمین پر جہالت اور بدحالی برقرار رہے گی تب تک ایسی کتابیں رائیگاں ثابت نہیں ہوں گی۔

وکٹر ہیوگ[1]

جج کی تعریف

جج (اپنے فیصلے سے) جو تکلیف پہنچاتا ہے' اگر وہ خود اس کے تئیں بے رحم ہو تو وہ انصاف کرنے کا اختیار کھو بیٹھتا ہے۔"

رویندر ناتھ ٹھاکر[2]

"لیکن مخالفت میں آواز نہ اٹھانے والی شہادت جو کر پانے میں ناکام رہ جاتی ہے' اسے انصاف پسند اور مخالفت میں اٹھنے والی آواز کو طاقتور بنا ڈالتی ہے اور ظالم کو مزید نقصان پہنچانے میں ناکام کر دیتی ہے"۔

"مذہب بدلے جانے کے بجائے مار ڈالے جاؤ" اس وقت ہندوؤں کے درمیان یہی صدا عام تھی۔ لیکن رام داس[4] اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا "نہیں! تبدیلِ مذہب سے بہتر ہے مار ڈالے جانا--- یہ کہنا بہت اچھا ہے لیکن اس سے بھی بہتر ہے یہ کوشش کرنا کہ نہ تو مارے جاؤ اور نہ ہی مذہب بدلو ہو بلکہ خود تشدد پسند طاقتوں کو مار ڈالو۔ اس میں اگر مرنا ہی ہو تو مار دیئے جاؤ لیکن فتح کے لئے مارتے ہوئے مرو' انصاف کی جیت کے لئے مرو"۔

ہندو پد پد شاہی صفحہ 82-181

صفحہ 104 (77)

سبھی قانون ساز مجرموں کی طرح متعارف

عہد قدیم سے لے کر لائیکرگس[5]' سولون[6]' محمد[7]' نپولین[8] وغیرہ تک انسان کے لئے جو بھی قانون ساز اور حکمراں ہوئے ہیں' وہ سب کے سب مجرم رہے ہیں کیوں کہ نئے قانون بنا کر فطری طور پر انہوں نے ان پرانے قوانین کو ختم کر دیا جنہیں سماج عقیدت کے طور پر تسلیم کرتا تھا اور جو اسلاف سے وراثت میں ملے ہوئے تھے۔

1۔ وکٹر ہیوگو (1885-1802): فرانسیسی شاعر' ڈرامہ نگار' ناول نویس اور اور رومانزم کا موجد: لیس میزربلس ان کا 1862 میں تحریر کردہ ایک کلاسک ناول ہے۔

2۔ اس کا وسیلہ دستیاب نہیں۔

3۔ نامعلوم۔

4۔ مشہور مراٹھا سنت اور شیواجی کے پرمحرک گرو۔

5۔ لائیکرگس: قدیم اسپارٹا (یونان) کا آئین ساز۔ اس کی سوانح حیات تحریر کرنے والے پلوٹارک کے مطابق وہ آئین ساز تھا اور ہیرودوتس کے مطابق اس نے ساری روایات بدل ڈالیں۔

6۔ سولون (639 عیسٰی قبل مسیح۔559): قدیم ایتھنس (یونان) کا سیاست داں جس نے محدود جمہوریت دینے کے لئے ایتھنس کے قانون میں ترمیم کی اور اراضی اصلاحات نافذ کیا۔

7۔ حضرت محمد (632-570ء) کا تذکرہ عرب ممالک میں رائج پرانے قوانین اور رسومات کے مقام پر اسلامی قوانین کے بانی کے طور پر کیا گیا ہے۔

8۔ نپولین بوناپارٹ (1821-1769) نے نپولین صحیفہ (سنہتا) تیار کیا جسے یورپ میں نافذ کیا گیا۔

(صفحہ 205) جرم و سزا۔ دوستووسکی[1]

برک[2] کا قول ہے "ایک سچا سیاست داں ہمیشہ اس بات پر سوچتا رہتا ہے کہ کیسے وہ اپنے ملک میں موجود وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرے۔

صفحہ 105 (78)

قانونیات[3]

قانون:

1 قانونی تجویز — جس شکل میں وہ موجود ہے
2۔ قانون کی تاریخ — جس شکل میں اس کا فروغ ہوا
3۔ علم قانون — جیسا اسے ہونا چاہئے

1۔ اصول — فلسفہ — علم قانون کے لئے
2۔ عام — علم قانون — بنیاد مہیا کرنا

1۔ تجزیاتی
2۔ تاریخی — علم قانون
3۔ علم اخلاق

تجزیاتی علم اخلاق: قانون کے اول اصول کی وضاحت کرتا ہے۔ اس کا موضوع ہے:

(الف) شہری قانون کی ساخت

(ب) شہری اور دیگر قوانین کے درمیان ربط

(ج) متنوع اجمالی افکار جو قانون کے نظریات جیسے مملکت، اقتدار اعلیٰ اور عدلیہ کو جمع کرتے ہیں۔

(د) قانون کے قانونی وسائل اور قانون سازی کا اصول وغیرہ۔

(ہ) قانون کی سائنسی درجہ بندی

(و) قانونی اختیارات

(ز) قانونی (شہری اور فوج داری) ذمہ داری کا اصول

(ح) دیگر قانونی نظریات

صفحہ 106 (79)

2۔ **تاریخی علم قانون:** قانون، قانونی نظریات کے ظہور اور فروغ کو متعین کرنے والے عام اصولوں کا مطالعہ کرتا ہے۔

یہ تاریخ ہے۔

3۔ **علم اخلاق کا علم قانون**۔ یہ قانون کے متعلق انصاف کے اصولوں سے منسلک ہے۔

1۔ مشہور روسی ناول نویس میخائلوچ دوستووسکی (1821-1881) کا مشہور زمانہ ناول 'جرم و سزا' جو 1866 میں شائع ہوا۔

2۔ ایڈمنڈ برک (1729-1797) برطانوی سیاست داں اور مصنف۔

3۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بھگت سنگھ نے علم قانون سے متعلق وسیع مطالعہ کا خاکہ تیار کیا تھا جو نوٹ بک کے آئندہ کئی صفحات تک جاری ہے۔

قانون اور انصاف

قانون اور علم اخلاق کے رموزات کی مکمل مذمت تجزیاتی علم قانون کو ایک بے جان سسٹم میں تبدیل کر سکتی ہے۔

انگلینڈ میں

دو الگ الگ 'قانون' اور انصاف' مسلسل اس بات کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی چیز نہیں بلکہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ لیکن ان کے استعمال میں ان دونوں کے درمیان موجود حقیقی اور انتہائی قریبی تعلق اکثر آنکھ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

اور جزیرہ میں

[ریجیٹ: رائٹ (حقوق) = ڈرائٹ: لا (قانون)]

جزیروں کا لسانی اسلوب' قانون' اور 'حقوق' کے درمیان فرق کو چھپاتا ہے جب کہ انگریزی کا لسانی اسلوب ان کے مابین تعلق کو چھپتا ہے۔

صفحہ 107 (80)

قانون

''ہم کسی بھی قسم کے اس ضابطہ یا اصول کو قانون کا نام دے دیتے ہیں جس کے ذریعہ کارروائیوں کا تعین کیا جاتا ہے۔

(ہوکر)1

''قانون عام معنوں میں کارروائی سے متعلق ضابطہ کو مخصوص کرتا ہے اور یہ کبھی نوعیت کی کارروائی پر بلا امتیاز نافذ ہوتا ہے' خواہ وہ مدلل ہوں یا غیر مدلل' ذی حیات سے متعلق ہوں یا غیر ذی حیات سے۔ اس لئے ہم رفتار کے' استاذ کی روشنی کے' فزکس کے' فطرت کے اور ملکوں کے قوانین کی بات کرتے ہیں''۔

(بلیک اسٹون)2

قانون کی اقسام

1۔ لازمی قانون

2۔ طبعی قانون یا سائنسی قانون

3۔ فطری یا اخلاقی قانون

4۔ رائج قانون

5۔ روایتی قانون

6۔ عملی یا تکنیکی قانون

7۔ بین اقوامی قانون

8۔ شہری قانون یا مملکت کا قانون

1۔ حاشیہ: انگریز ماہر دینیات رچرڈ ہوکر (1600-1554) جس نے دی لا آف ایکسلوزی ئیٹیکل پالیسی میں ہمنگلوم کے اصول کو لکھا۔

2۔ حاشیہ: سر ولیم بلیک اسٹون (1780-1723): انگریز آئین ساز جس نے کمنٹریز آن دی لاز آف انگلینڈ (1769-1765) لکھی' جو انگریزی قانون کے اصول پر ایک مستند کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

صفحہ 108 (81)

لازمی قانون کی منظوری 1۔ سزا' جنگ وغیرہ

1۔ لازمی قانون کا مطلب ہے کہ کارروائی کا قانون' جو کسی ایسے اقتدار کے ذریعہ لوگوں پر لاگو کیا جاتا ہے جو بزور طاقت اس کی تابع داری کرالیتا ہے۔

''قانون ایک حکم ہے جو فرد یا افراد کو ایک لازمی انضباط کے لئے مجبور کرتا ہے''۔

(آسٹن)[1]

سماج کی ظاہری اخلاقیات بھی لازمی قانون کے دائرے میں آتی ہے۔

ہابس کا نظریہ

انسان اور ہتھیار ہی قوانین کی طاقت اور سہارا ہے۔

(ہابس)[2]

2۔ طبعی قانون کی جاری کارروائیوں کا اظہار ہے (اخلاقی قانون یا ضمیر کا قانون کارروائیوں ایسا اظہار ہے جیسا اسے ہونا چاہئے۔

3۔ قدرتی یا اخلاقی قانون کا مطلب ہے قدرتی طور سے صحیح یا غلط کا اصول' یعنی سبھی درست کارروائیوں سمیت فطری انصاف کا اصول۔

انصاف کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہری اور فطری

فطری انصاف وہ انصاف ہے جو حقیقی اور سچا ہو۔

ظاہری انصاف' انصاف کی وہ شکل ہے جس میں اسے سمجھا جاتا ہے' قبول کیا جاتا ہے اور اظہار کیا جاتا ہے۔

صفحہ 109 (28)

4۔ رائج قانون: ایسا کوئی بھی ضابطہ یا ضوابط کا نظام ہے جس کے دائرہ میں رہنے کے لئے لوگ متفق ہوتے ہیں۔ متفق ہونے والے فریق کا اتفاق ہی قانون ہے۔

5۔ روایتی قانون: انسانوں کے ذریعہ حقیقت میں کی جانے والی کارروائی کا کوئی بھی قانون جو ذاتی کارروائی کی کسی حقیقی شکل کا اظہار ہے۔ روایت ان لوگوں کا قانون ہے جو اسے مانتے ہیں۔

6۔ عملی یا تکنیکی قانون: اس کے دائرہ میں ایسے ضابطے آتے ہیں جو عملی مقاصد کی حصولیابی کے لئے ہوتے ہیں۔ کھیلوں میں 'رائج قانون' اور 'عملی قانون' دونوں ہی آتے ہیں جن میں پہلے قسم کے قانون کے تحت وہ ضابطے آتے ہیں جن پر کھلاڑیوں کا اتفاق ہے اور دوسرے قسم کے قوانین کے تحت وہ ضابطے آتے ہیں جو کھیل کو کامیاب بناتے ہیں یا کھیل کو کامیابی سے چلانے کے لئے ہوتے ہیں۔

1۔ جان آسٹن (1611-1680): برطانوی فلسفی سیاست داں مفکر

2۔ تھامس ہابس (1689-1588) انگریز فلسفی' سیاست داں مفکر۔ مملکت کی موجودگی کے سماجی سمجھوتے کے اصول کا ہیرو۔ شہنشاہیت کی مطلق العنانی کا قائل تھا۔ لیوین (1651) ان کی مشہور تصنیف ہے۔

7۔بین اقوامی قانون: اس کے دائرہ میں وہ قانون آتے ہیں جو اقتدار اعلیٰ کو خوش حال مملکتوں کے باہمی تعلق اور ایک دوسرے کے تئیں طرز عمل کی پابندی کرتے ہیں۔

(1) ایکسپریس قانون (معاہدے وغیرہ)

(2) روایتی قانون

پھر دو اقسام میں منقسم:

(1) عام قانون (سبھی ممالک کے مابین)

(2) خصوصی قانون (دو یا زیادہ ملکوں کے درمیان)

8۔شہری قانون: مملکت یا ملک کا قانون، جو عدالت میں استعمال ہوتا ہے۔

صفحہ 110 (83)

سزا

سیاسی جرم: ہم قانون سازوں کے بڑے فرقہ کی اس فکر سے متفق ہیں کہ بھلے ہی عام طور پر اس شخص پر سخت کارروائی نہیں کی جانی چاہئے جو ایسی مجرمانہ سازش میں شامل رہا ہو، جس سازش کو انجام نہیں دیا گیا ہو، پھر بھی مملکت کے خلاف کئے گئے بڑے جرم کے سلسلے میں اس قانون میں ایک گنجائش رکھی جانی چاہئے، اس کی وجہ ہے کہ مملکت کے خلاف کئے جانے والے جرم کی خاصیت یہی ہوتی ہے کہ اگر ان میں مجرم کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ سزا سے تقریباً صاف بچ جاتا ہے۔ قاتل قتل کرنے کے بعد قتل کرنے کے مقابلے کہیں زیادہ خطرے میں ہوتا ہے۔ لیکن باغی جب سرکار کا تختہ پلٹ دیتا ہے تو وہ خطرے سے باہر ہو جاتا ہے۔ چوں کہ سزا دینے والا قانون ایک کامیاب باغی کے خلاف ناکارہ ثابت ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اسے بغاوت کی پہلی شروعات کے خلاف طاقت ور اور سخت بنایا جائے۔

(II ایل سی سی ججمنٹ 1906، صفحہ 120)

صفحہ 111 (84)

سزا: خواب جو سزائے موت کا سبب بنا: جب ماریسز نے خواب دیکھا کہ اس نے ڈائیونیسیس[2] کا گلا کاٹ دیا ہے، تو بے مہار حکمراں نے اسے سزائے موت دے دی، جس کے پیچھے اس کی دلیل یہ تھی کہ اگر اس نے دن میں ایسے سوچا نہ ہوتا تو رات میں یہ خواب کبھی نہیں دیکھتا۔

سزائے موت اور ڈریکو کا قانون: ڈریکو[3] کے قانون میں تقریباً سبھی طرح کے جرم جیسے معمولی چوری سے لے کر مذہبی بغاوت اور قتل کے لئے مساوی سزائے موت کا قانون تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس کی واضح تشریح جو ڈریکو نے کی تھی، وہ یہ کہ چھوٹے موٹے جرم کی تو یہی سزا ہونی چاہئے اور بڑے جرائم کے لئے اس سے بڑی سزا وہ سوچ نہیں سکا۔

1۔وسائل اور تفصیلات دستیاب نہیں۔

2۔ڈائیونیسیس دی ایلڈر (367-430 عیسیٰ قبل مسیح) سسلی کا یونانی لیڈر جو 400 عیسیٰ قبل مسیح میں سائیریکیوس کا مطلق العنان حکمراں بنا۔

3۔ڈریکو عیسیٰ قبل مسیح ساتویں صدی، ایتھنس (یونان) کا سیاست داں، جس نے روایتی قانون کو نئے سرے سے وضع کیا۔ چھوٹے اور بڑے جرم کے لئے سزائے موت دینے کے لئے بدنام اس کا قانون (ڈریکونین لا) آج بھی ایسے کالے قانون کے لئے بطور محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔

سزا کو بہت سے فلسفیوں نے ایک ضروری برائی تسلیم کیا ہے۔

مملکت اور انسان: مملکت اپنے آپ میں کوئی نصب العین نہیں ہے اور انسان قانون یا مملکت کے لئے نہیں بلکہ یہی انسان کے لئے ہوتے ہیں۔

صفحہ 112(85)

انصاف

مملکت کی طبعی طاقت کے لئے ایک سیاسی فرقہ کے اندر اختیار بنائے رکھنا۔

اس نے اس ذاتی انتقام کی جگہ لے لی ہے جب لوگ غلطیوں کا انتقام خود یا اپنے رشتہ داروں کے تعاون سے لے لیا کرتے تھے۔ان دنوں 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کا اصول کام کرتا تھا۔

دیوانی اور فوج داری انصاف

شہری انصاف حق کا نفاذ کرتا ہے۔فوج داری انصاف غلطیوں کے لئے سزا دیتا ہے۔

ایک آدمی اپنے بقائے کا یا اس سے غلطی طریقہ سے ہڑپ لی گئی ملکیت کو دوبارہ واپس پانے کا دعوی کرتا ہے۔یہ دیوانی (انصاف کا معاملہ) ہے۔

فوج داری کے معاملات میں مدعا علیہ پر غلطی کرنے کا الزام ہوتا ہے۔عدالت اس ملزم کو فرائض کی عدم تعمیل کے جرم میں اور اختیارات کے غلط استعمال کے جرم میں سزا دیتی ہے۔جس میں اگر قتل کا جرم ہے تو پھانسی اور اگر چوری کا جرم ہے تو جیل کی سزا دیتی ہے۔

[صفحہ 113(86)]

دیوانی اور فوج داری دنوں اقسام کی کارروائی میں غلطی کی شکایت درج کی جاتی ہے۔

دیوانی (کارروائی) میں حقوق کا دعوی کیا جاتا ہے۔

دیوانی انصاف کا مقصد' ابتدائی طور پر شاکی اور اس کے حقوق سے ہوتا ہے (کارروائی) میں غلطی کا الزام لگایا جاتا ہے۔

فوج داری (انصاف) کا مدعا علیہ اور اس پر لگے الزامات سے

فوج داری انصاف کے مقاصد

سزا

یہ غیر جانب دار ''مجرمان' جیسے سیاسی افراد کے معاملات میں مفید نہیں ہوسکتی۔یہ ان کے لئے ایک برا سودا ثابت ہوسکتی ہے۔

1۔روک تھام: قانون کا اہم مقصد گناہ گار شخص کو ایک نظیر بنانا اور اس جیسے سبھی افراد کو تنبیہ کرنا ہے۔یہ ہر جرم کو'جرم کرنے والے کے برے جذبہ' کو ثابت کرتا ہے۔(ارادے کی تبدیلی)

2۔روکنے والا: دوسرے معاملات میں یہ روکنے والا یا نا اہل ثابت کرنے والا ہے۔اس کا خاص مقصد مجرم کو نا کام کرکے اسے دوبارہ غلط کام کرنے سے روکنا ہے۔

سزائے موت کا جواز

ہم قاتلوں کو پھانسی محض اس لئے نہیں دیتے کہ یہ دوسروں کو (قتل کرنے سے) دنیا سے ختم کرتی ہے بلکہ اسی وجہ سے جس سبب سے ہم' مثال کے طور پر سانپ کو مار ڈالتے ہیں' کیوں کہ ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ اس دنیا میں موجود رہنے کے بجائے اس سے باہر ہو جائیں۔

3۔اصلاحی: جرم کردار پر ارادوں کے غالب آ جانے کے سبب کئے جاتے ہیں اور وہ یا تو ارادوں کے بدلاؤ یا کردار کے بدلاؤ سے روکے جا سکتے ہیں۔

روکنے کے لئے سزا پہلے معاملہ میں دی جاتی ہے (کچھ الفاظ غیر واضح جب کہ اصلاحی (سزا) دوسرے معاملہ میں دی جاتی ہے)۔

(صفحہ 114(87)

'اصلاحی اصول' کے پیروکار صرف انہی سزاؤں کی حمایت کرتے ہیں جو مجرم کی تعلیم اور اس کی اصلاح کے لئے کارآمد ہوتی ہیں اور باقی ان سبھی (سزاؤں) کو تسلیم نہیں کرتے ہیں جو خیر خواہانہ طور پر صرف روک تھام کے لئے یا نامناسب ہوتی ہیں۔ان کی نظر میں موت کوئی مناسب سزا نہیں ہے۔ 'ہمیں اپنے مجرموں کا علاج کرانا چاہئے' ان کا قتل نہیں'۔ پٹائی اور دیگر جسمانی سزاؤں کی ظلم و بربریت کی نشانی کہہ کر مذمت کی جاتی ہے۔وہ ایسی سزاؤں کو' سزا کاٹنے والے اور سزا دینے والے دونوں کو ہی نیچے گرانے والی اور بے خوف تصور کرتے ہیں۔

سخت سزا کا انجام: مجرموں کو خطرناک اور بد حوصلہ طبقہ پیدا ہو جاتا ہے۔

مملکت کی طاقت کے استعمال کی کارروائی جتنی اہل ہوتی ہے' وہ سبھی عام انسانوں کو خطرناک راستوں (پر جانے) سے روکنے میں اتنی ہی کامیاب ہوتی ہے' لیکن قانون توڑنے والوں میں کمی کا تناسب بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔

4۔انتقامی سزا: سب سے بھیانک اصول: ایسی سوچ رکھنے والے لوگ درحقیقت قدیم اور تمدنی ادوار کی بربرآمیز ذہنیت کے قائل ہیں۔

یہ انتقام یا بدلے کے اس فطری رجحان کو تسکین پہنچاتی ہے جو صرف غلطی کا شکار ہوئے فرد میں ہی نہیں موجود رہتی بلکہ وسیع پیمانے پر سماج میں اس کے تئیں ہمدردی کی شکل میں بھی موجود رہتی ہے۔

اس نظریہ کے مطابق یہ درست اور مناسب ہے کہ برائی کا بدلہ برائی سے لیا جائے۔آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کا قدرتی انصاف ایک راست اور اپنے آپ میں مکمل قانون تصور کیا جاتا ہے۔سزا خود میں ایک مقصد بن جاتی ہے۔

صفحہ 115(88)

سزا ایک برائی

سزا اپنے آپ میں ہی ایک برائی ہے اور اسے صرف ایک اہم مقصد کی حصولیابی کے وسیلہ کے طور پر ہی مناسب ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

لیکن انتقامانہ اصول کے حامی اس طرح دلیل دیتے ہیں: گناہ دولت سزا برابر بے گناہی۔

''اس نے انصاف کے قانون کی جس غلطی کا ارتکاب کیا ہے' اس سے اس کے اوپر ایک قرض

1۔حاشیے پر لکھا ہوا۔

عائد ہو گیا' اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ قرض ادا کر دیا جائے .....سزا کا پہلا مقصد ختم کئے گئے قانون کو تسکین بخشنا ہے"۔

Peine forte et dure: تکلیف دے کر موت......جس کا فیصلہ درج ذیل طور پر دیا گیا:

"کہ تمہیں پھر اسی جیل میں واپس لے جایا جائے جہاں سے تم آئے تھے' یعنی کہ اسی لمبی کال کوٹھری میں جس کے اندر کوئی روشنی نہ جاسکے' پھر تمہیں وہاں ننگے فرش پر پیٹھ کے بل لٹایا جائے' صرف تمہاری کمر میں ایک کپڑا لپٹا رہے' جب کہ بقیہ سبھی جسم ننگے رہیں' کہ تمہارے جسم پر لوہے کا ایک اتنا بھاری بوجھ رکھا جائے جتنا کہ تم برداشت کر سکو اور پھر اس سے بھی زیادہ بڑا کہ تم پہلے دن کھانے کے لئے موٹی سے موٹی روٹیوں کے سوائے اور کوئی چیز نہ دی جائے' دوسرے دن جیل کے پھاٹک کے سب سے نزدیک کے گڈھے میں جمع پانی کے تین گھونٹ دیئے جائیں' تیسرے دن پھر پہلے جیسا کھانا دیا جائے اور ایسی روٹیاں اور ایسا پانی ایک ایک دن کے وقفہ سے تب تک دیا جائے جب تک کہ تم مر نہ جاؤ"۔[1]

یہ سزا مرد و خواتین دونوں کو مساوی طور پر ان سبھی نوع کے جرائم کے لئے دی گئی جو غیر معمولی نہیں تھے"۔[2]

صفحہ 116 (68)

غیر ملکی غلامی

غیر ملکی جوے کی غلامی ممالک کے خاتمے کے سب سے طاقتور اسباب میں سے ایک ہے۔

پروفیسر اے ای راس[3]

جمہوریت کا اثر اور غیر ملکی حکومت

ایک غیر ملکی عوام کے اوپر ایک جمہوریت کی کارروائیاں جتنی جھپٹ مار اور خوف ناک ہوتی ہیں' اتنی اور کسی بھی حکومت کی نہیں ہوتیں۔

-لالہ جی[4]

شادی

ڈاکٹر ٹیگور[5] کا ماننا ہے کہ زمانہ قدیم سے لے کر آج تک شادی کا نظام صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں عورت و مرد کے سچے ملن کے راستے میں ایک رکاوٹ بنی ہوئی ہے جو کہ محض اسی وقت ممکن ہے جب سماج اس قدر اہل ہو جائے کہ وہ عورت کو گھر میں تعمیری کام کرنے سے روکے بغیر' ان کی خاص قابلیت کو تعمیری کارناموں میں لگانے کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کر سکے۔

1۔ذریعہ کا پتہ نہیں۔

2 حاشیے پر نوٹ کیا ہوا اور نشان زد۔

4۔لالہ لاجپت رائے (1865-1928)' لاہور میں سائمن کمیشن کی مخالفت کرنے پر برطانوی پولیس نے بے رحمانہ لاٹھی چارج کیا اور اسی میں گہری چوٹ لگنے کے نتیجے میں لالہ جی کی موت ہو گئی۔ان کی موت اور پنجاب کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے بھگت سنگھ اور ان کے انقلابی ساتھیوں نے برطانوی پولیس افسر سانڈرس کا گولی مار کر قتل کر دیا۔

5۔رابندر ناتھ ٹھاکر۔

صفحہ 117 (90)

شہری اور انسان

اسپارٹ کا رہنے والا پیڈارکٹیز تین سو کی کونسل میں داخلہ کے لئے وارد ہوا مگر اسے واپس کر دیا گیا۔ وہ اس خوشی میں چلا گیا کہ 300 سپارٹ کے باشندے اس سے بہتر تو تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ سچا تھا۔

وہ ایک سچا شہری تھا۔

ایک اسپارٹ کی رہنے والی ماں کے پانچ بیٹے فوج میں تھے۔ ایک غلام آیا۔ کانپتے ہوئے اس نے خبر پوچھی۔

''تمہارے پانچوں بیٹے مارڈالے گئے''۔

ادنیٰ غلام' کیا تم سے میں نے یہ پوچھا تھا؟''

''ہم نے فتح حاصل کر لی ہے''۔ وہ دیوتاؤں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے دوڑتی ہوئی مندر چلی گئی۔

وہ ایک سچی شہری تھی۔

ایمیلی صفحہ 8 [1]

زندگی اور تعلیم

لوگ صرف اپنے بچے کی زندگی کی سلامتی کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں لیکن اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ اگر وہ انسان ہے تو اسے خود بھی اپنی زندگی کی سلامتی کے بارے میں واقفیت ضروری ہے تاکہ وہ قسمت کے تھپیڑوں کو سہ سکے' خوش حالی اور غریبی کا بہادری سے مقابلہ کر سکے' ضرورت پڑنے پر آئس لینڈ کے درمیان یا مالٹا کی تپتی چٹانوں پر رہ سکے۔ بیکار ہی تم موت کے خلاف خیر مناتے ہو' اسے مرنا تو ہے ہی اور بھلے ہی تم اپنی احتیاطی کے سبب اسے نہ مرنے دینا چاہو لیکن یہ مغالطہ ہی ہے۔

اسے موت سے بچنے کے بجائے جینے کی تعلیم دو: زندگی سانس لینا نہیں بلکہ عمل کا نام ہے۔ اپنی اندریوں کا' اپنے دماغ کا' اپنی صلاحیت کا اور اپنے وجود کو بیدار رکھنے والے ہر حصہ کا استعمال کرنا ہے۔ زندگی کا مطلب عمر کی طوالت میں کم جینے کے بہتر طریقے میں زیادہ ہے۔ ایک آدمی سو برس جینے کے بعد قبر میں جا سکتا ہے لیکن اس کا جینا بے معنی بھی ہو سکتا ہے۔ بہتر ہوتا' وہ جوان ہی مر گیا ہوتا۔

ایمیلی صفحہ 10

صفحہ 118 (91)

سچ

سچ کوئی خزانہ نہیں عطا کرتا اور عوام کوئی سفیر یا پروفیسر کا عہدہ یا پنشن نہیں عطا کرتی۔

روسو 122

1۔ ایمیلی۔ فرانسیسی فلسفی جیاں جاک روسو (1778-1712) کا ناول۔ 1762 جس میں یہ اصول وضع کیا گیا ہے کہ بچے کو تہذیب کے برے اثرات سے بچانے کے لئے ایک قدرتی ماحول میں فروغ کا پورا موقع دیا جانا چاہئے۔

ایس سی[1]

جرم اور مجرم

''......پختہ نظریہ دے کر جرم کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ لوگ جیسا سوچتے ہیں' اس سے اس کا فلسفہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہے۔ یہ تو تسلیم شدہ بات ہے کہ نہ تو کوئی قید' نہ کوئی کال کوٹھری اور نہ کوئی سخت محنت کا سسٹم ہی کسی مجرم کی اصلاح کر سکتا ہے۔ سزا کے یہ قوانین صرف اسے سزا دیتے ہیں اور سماج کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ کہ وہ اور جرم نہیں کرے گا۔ قید' قانون اور سخت سے سخت مشقت اسے کسی طرح متاثر نہیں کرتے' سوائے اس کے کہ ایسے افراد میں انتہائی نفرت' ممنوع کام کو مزید دلچسپی سے کرنے کی چاہ اور ایک خوف ناک نافرمانی کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ اس لئے میرا پختہ یقین ہے کہ یہ کال کوٹھری کا روایتی نظام دکھاوا اور کینہ پر منتج ہوتا ہے۔ یہ مجرم سے اس کی طاقت نچوڑ لیتا ہے اور اسے کمزور اور خائف کر کے اس کے ضمیر کو بے کیف کر دیتا ہے۔ اس طرح بالآخر اسے معافی تلافی اور اصلاح کے ایک نمونے کے طور پر ایک بے جان یادگار کی شکل میں ہی پیش کرتا ہے''۔

دی ہاؤس آف ہیڈ صفحہ 17

فیدور دوستوسکی[2]

صفحہ 119 (92)

خواہش بنام تسلی

اگر ایک بیدار نظام کی طاقتیں اس کی خواہشات کے مساوی ہوتیں تو وہ پوری طرح خوش ہوتا۔ لیکن صرف اپنی خواہشات کو محدود کرنا ہی کافی نہیں ہے' کیوں کہ اگر وہ ہماری طاقتوں سے کم ہے تو ہماری صلاحیتوں کا ایک حصہ یوں ہی بیکار چلا جائے گا اور اس وقت ہم اپنے پورے وجود سے بھی لطف اندوز نہیں ہو پائیں گے۔ اسی طرح اپنی طاقتوں کی محض توسیع بھی کافی نہیں ہے کیوں کہ اگر ہماری خواہشات بھی بڑھ جائیں تو ہم مزید دکھی ہو جائیں گے۔ حقیقی سکون تو اپنی خواہشات اور اپنی طاقتوں کے درمیان فرق کو کم کرنے میں مخفی ہے۔

ایمیلی-44

صفحہ 120 (93)

''برژوا انقلاب کے وجود کا آغاز رائج نظام حکومت میں پہلے سے موجود حالات سے ہوتا ہے''۔

''برژوا انقلاب عام طور پر اقتدار پر قبضہ کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن مزدور انقلاب کے لئے اقتدار پر قبضہ تو محض شروعات ہے' اقتدار جب قبضہ میں آ جاتا ہے تو وہ قدیم معاشیات کی شکل اور ایک نئی معاشیات کی تشکیل کے لئے بطور کیا استعمال کیا جاتا ہے''۔

1۔ روسو کی کتاب سوشل کانٹریکٹ: اس میں ایک ایسی آئیڈیل مملکت کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں اقتدار اعلیٰ پوری عوام میں پوشیدہ تھا۔ اس کے افکار 1789 کے فرانسیسی انقلاب کی ایک اہم محرکاتی قوت بنے۔

2۔ فیودور میخائلووچ دوستووسکی (1821-1881) کا ناول دی ہاؤس آف ڈیڈ جو خود ان کی قید کے تجربات کی بنیاد پر 1861 میں تحریر کیا گیا۔

''ابھی بھی دو بھاری بھرکم اور انتہائی مشکل کام باقی ہے۔(ایک ملک یعنی-روس میں موجودہ نظام حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے بعد بھی)۔

''سب سے پہلا کام ہے کہ داخلی تنظیم۔

''دوسرا اہم مسئلہ عالمی انقلاب کے بین اقوامی مسائل کو حل کرنے کا' عالمی انقلاب کو آگے بڑھانے کا ہے''۔(جس کے حل کیئے بغیر کمیونسٹ نظام حکومت بین اقوامی سرمایہ دارانہ نظام کے خطرے کے خلاف تحفظ نہیں کر سکتی)

صفحہ 2 22-21

صفحہ 21(91)

اگر مظلوم طبقہ کو آبادی کی اکثریت کی حمایت حاصل کرنی ہے تو اس کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ کہ وہ برژوا طبقہ کو اکھاڑ پھینکیں اور حکومت پر قبضہ کرے۔

2۔ دوسرے' اس پرانے مملکتی نظام کو توڑ کر سوویت حکومت کی تشکیل اور ایک جھٹکے میں اس اثر کو ختم کر دینا ضروری ہے' جس سے برژوا طبقہ اور طبقاتی تعاون کے نچلا برژوا طبقہ حامی محنت کش (غیر مزدور) عوام کے اوپر ڈالتے رہتے ہیں۔

3۔ تیسرے' مظلوم طبقہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس اثر کو مکمل طور پر اور حتمی شکل میں نیست و نابود کر دے' جسے برژوا طبقہ اور برژوا سمجھوتہ کرنے والی اکثریت کے محنت کش (غیر مظلوم) عوام کے اوپر ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ استحصال کرنے والوں کی قیمت پر ان فرقوں کی معاشی ضروریات کی انقلابی تسکین کے ذریعہ کیا جانا چاہیئے۔

-نکولائی لینن صفحہ 23

''مظلوم طبقہ کو قیادت'' کا مطلب ہے عوام کی کمیونسٹ پارٹی کے ذریعہ رہنمائی اور ہدایت۔ اگرچہ پارٹی کا کافی اثر اور کنٹرول ہے پھر بھی اتنا ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اپنی رہنمائی کے علاوہ عوام کی 'آرزو' بھی کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے ضرورتی ہوتی ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مزدوروں کے بڑے طبقوں کو بیدار کرنے کے لئے کچھ لوگوں کی قیادت اور رہنمائی ضروری ہے اور یہ پارٹی ہی ہو سکتی ہے۔ پارٹی کے پاس پارٹی کو پسماندہ مزدوروں کے ساتھ جوڑنے کے لئے 'ٹریڈ یونین' ہیں' سیاسی میدان میں بھی محنت کش عوام کو اس سے جوڑنے کے لئے سوویتیں ہیں۔

(صفحہ 122(95)

معاشی شعبہ میں خاص طور سے کسان طبقہ کو جوڑنے کے لئے' کوآپریٹیوز' ہیں ہونہار پیڑھی کے درمیان سے کمیونسٹوں کو ٹرینڈ کرنے کے لئے 'یوتھ لیگ' ہے۔ بالآخر پارٹی خود ہی مظلوم طبقہ کی قیادت کے تحت ایک واحد رہنما طاقت ہے''۔4

1۔ لینن کی تخلیقات سے ماخوذ۔

2۔ اور 3۔ لینن کی تخلیقات سے ماخوذ۔

4۔ لینن کی تخلیقات سے۔

صفحہ 123(96)

تخمینہ: آمدنی میں عدم مساوات

پیداوار

جنگ سے قبل یونائیٹڈ کنگڈم کی (انگلینڈ)

سالانہ پیداوار	2000,000,000 پونڈ
غیر ملکی سرمایہ کاری سے فائدہ	200.000,000 پونڈ
میزان	2200,000,000 پونڈ

تقسیم

مجموعی آبادی کے 1/9	یعنی کم از کم سالانہ اوسط
سرمایہ کاروں یا برژوا نے لے لیا	آمدنی 160 پونڈ
مجموعی پیداوار کا 1/2	یعنی 1100,000,000 پونڈ
مجموعی آبادی کے 2/9	یعنی اوسط آمدنی 160 پونڈ

نچلے برژوا طبقہ نے بقیہ نصف کا 1/3 یا سالانہ سے کم

مجموعی کا 1/9 لے لیا	یعنی 300,000,000 پونڈ
آبادی کے 2/3 یعنی جسمانی	اوسط آمدنی 60 سالانہ

محنت کرنے والے یا مزدوروں کو باقی ملا 800,00,000 پونڈ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ: 1890 میں

مجموعی پیداوار کا 40 فی صد (پیداوار کے) وسائل کے مالکوں کو ملا

مجموعی پیداوار کا 60 فی صد بھی مزدوروں کو دیا گیا۔[1]

صفحہ 124(97)

زندگی کا مقصد

''زندگی کا مقصد دل کو کنٹرول میں رکھنا نہیں بلکہ اس کا باکردار فروغ ہے' بعد از مرگ نجات حاصل کرنا نہیں بلکہ اس دنیا میں ہی اس کا بہتر استعمال کرنا ہے محض خدا سے لو لگانے میں ہی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی کے حقیقی تجربات میں بھی سچ' خوشی اور حسن کا مشاہدہ کرنا ہے' سماجی ترقی کچھ لوگوں کی کامیابی پر نہیں بلکہ کثیر لوگوں کی خوش حالی پر انحصار کرتی ہے اور مکمل جمہوریت یا ہمہ گیر بھائی چارہ تو محض اسی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے جب سماجی سیاسی اور صنعتی زندگی میں مساوی مواقع حاصل ہوں''۔[2]

1۔ ذریعہ نامعلوم۔

2۔ ذریعہ نامعلوم۔

نوٹ بک میں صفحہ 125 سے 164 نہیں

ہمیں دستیاب کاپی میں صفحہ (97) کے بعد صفحہ (100) ہے۔ نوٹ بک کے اگلے حصے میں بھگت سنگھ کے "مملکت کا علم" (مجوزہ) کے مطالعہ کا خاکہ پیش ہے۔ مدیر

صفحہ 165 (100)

علم مملکت

قدیم نظام مملکت: روم[1] اور اسپارٹا[2]، ارسطو[3] اور پلیٹو[4]: مملکت کے تئیں لوگوں کی ماتحتی ان قدیم نظام مملکت، اسپارٹا اور روم کی اہم خصوصیت تھی۔ ہیلاس[5] میں یا روم میں شہریوں کو بس چندنجی اختیارات حاصل تھے۔ اس کا طرز عمل بہت حد تک عوامی سنسرشپ کے ماتحت تھا اور جو مذہب کے سرکاری نمائندوں کے ذریعہ نافذ کردہ ہوتا تھا۔ صرف سچے شہری اور خود مختار ادارے کے خصوصی اختیار یافتہ ارکان جو طبقہ اشرافیہ سے متعلق ہوا کرتے تھے، جن کے لئے جسمانی مشقت غلام کرتے تھے اور جن کے پاس کوئی شہری حقوق نہیں تھے۔

سقراط

اس ضمن میں سقراط[6] کی اس دلیل کو پیش کیا جاتا ہے کہ کوئی بھی شہری مملکت میں داخل ہونے کے بعد اگر اپنی مرضی سے شہر میں رہنے لگے تو اسے حکومت کی ماتحتی قبول کرنی چاہئے، خواہ اسے اس کے قوانین نامناسب ہی کیوں نہ لگیں۔ اسی طرح، اس بنیاد پر کہ اگر وہ جیل سے فرار ہو جائے، تو حکومت کے ساتھ اس کا معاہدہ ختم ہو جائے گا، وہ حکومت کے ذریعہ عائد کی گئی غیر منصفانہ سزا جھیلنے کے لئے بھی تیار رہے۔

پلیٹو: سماجی معاہدہ

وہ سماج اور حکومت کی ابتدا کو باہمی ضرورتوں کے طور پر شمار کرتا ہے کیوں کہ انسان الگ الگ رہ کر بھی اپنی مختلف النوع ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہے۔ وہ ایک طرح کے مثالی اسپارٹا کا تصور کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "ایک مثالی ریاست میں، فلسفیوں کو حکومت کرنی چاہئے اور شہریوں کو اس نظام میں جو سماج کے برتر لوگوں کے ذریعہ چلایا جا رہا ہو، کا لازمی طور پر فرماں بردار ہونا چاہئے۔ وہ شہریوں کی بیدار تعلیم و تربیت پر زور دیتا ہے۔

1۔ قدیم رومن جمہوریہ اور سلطنت

2۔ یونان کی قدیم ریاست

3۔ ارسطو (322-384 قبل مسیح): یونانی فلسفی اور پلیٹو کا شاگرد، سکندر کا معلم، اس نے بہت سارے موضوعات پر لکھا، جن میں سے سیاست اور شعریات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

4۔ پلیٹو (347-427 عیسیٰ قبل مسیح): یونانی فلسفی اور سقراط کا شاگرد اور آئیڈیل اسٹیٹ (مثالی ریاست) کے یوٹوپیا کے طور پر ری پبلک کا مصنف، جس میں اس نے ایک فلسفی راجا اور قابل قبول ریاستی نظام قائم کیا تھا۔

5۔ ہیلاس: قدیم یونان

6۔ سقراط (399-469 ق م): یونانی فلسفی جسے نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے الزام میں زہر کا پیالہ پی کر خودکشی کر لینے کی سزا دی گئی۔

ارسطو

ارسطو وہ پہلا شخص تھا جس نے سیاست کو حکومت سے مبرئ کیا۔ حالاں کہ وہ محتاط بھی تھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا نہ ہو جائیں۔ اس کی دلیل تھی ''زیادہ تر لوگ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر کام کرتے ہیں اور اسی لئے ریاست کے لئے ضروری ہے کہ وہ انہیں تاعمر ڈسپلن میں رہنے کی تربیت دے جیسا کہ اسپارٹا میں ہے۔ جب تک سیاسی سماج کی تشکیل نہیں ہو جاتی تب تک مبنی بر انصاف نظام حکومت قائم کرنا ممکن نہیں ہو سکتا...... لیکن اس کے لئے لازمی ہے کہ عمدہ قانون سازی اور آئین سازی کے کسی اعلیٰ نظام کی تلاش کی جائے۔

(صفحہ 166، 101)

ریاست کا تخم خاندان یا کنبہ میں ہوتا ہے۔ کئی کنبوں میں اشتراک سے دیہی کمیونٹی وجود میں آئی (جس کے رکن پدری نظام کے ماتحت ہوتے ہیں۔

''کئی گاؤوں کو ضم کر کے مملکت کی تعمیر ہوئی جو قدرتی، آزاد اور خود کفیل تنظیم تھی۔

''لیکن جہاں کنبہ فرد واحد کے ذریعہ محکوم ہو جاتا ہے، وہیں آئینی حکومتوں کے تحت فرد آزاد ہوتا ہے اور حکمرانوں کے مساوی حقوق رکھتا ہے۔

فطری اور سماجی طور پر دوستی اور باہمی مفاد کے تحت اتحاد تشکیل پاتا ہے۔ انسان اپنے عادات و اطوار سے ایک سیاسی (سماجی) ذی روح ہے۔

ریاست ایک جائے امان سے کہیں زیادہ ہے، جس سے لوگ وابستہ ہو سکتے ہیں یا بلا کسی تردد کے اسے چھوڑ سکتے ہیں لیکن آزادی یا شہریت کے بغیر انسان غیر معتبر، غیر مہذب اور ایک شہری سے مختلف کوئی شئے ہوتا ہے۔

پلیٹو

پلیٹو نے ریاست کی تشکیل کی قیاس آرائی ایک ایسے ادارے کے طور پر کی تھی، جس کے رکن عوامی نصب العین کے حصول کے لئے متفقہ طور پر مجتمع ہوں۔

ارسطو

ارسطو کا کہنا تھا کہ جہاں آزادی اور مساوات ہو، وہاں یکے بعد دیگرے نظام حکومت بدلتے رہیں لیکن سب سے بہتر یہی ہے کہ اگر ممکن ہو تو وہی لوگ ہمیشہ حکومت کرتے رہیں۔

پلیٹو کی اشتراکیت کے خلاف اس کی پلیٹو کی دلیل باقاعدہ قانون کے ذریعہ مقرر کردہ ذاتی ملکیت کے حق میں تھی، جس کے پیچھے اس کا نظریہ یہ تھا کہ ریاست میں صرف ایک اخلاقی اتحاد ہی ممکن یا لازمی ہے۔

(حکومتوں کی اقسام)

اس نے حکومتوں کو شاہی نظام، امرائی حکومت اور جمہوری نظام حکومت نیز بالترتیب ان کی مسخ شدہ اشکال جیسے آمرانہ نظام، مطلق العنانی اور جمہوری نظام میں تقسیم کیا، جس کی بنیاد یہ تھی کہ ان میں اقتدار اعلیٰ ایک یا چند یا کئی لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور ان کا مقصد مفاد عامہ یا حکمرانوں کا ذاتی مفاد ہوتا ہے اور اس میں آزادی، مال و اسباب، ثقافت اور آمریت پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔

سبھی نظام حکومت کے تین حصے ہوتے ہیں (1) مقننہ (2) انتظامیہ (3) اور عدلیہ۔ شہریت کا تعین نہ تو رہائش

سے ہوتا ہے نہ ہی قانونی اختیارات رکھنے سے بلکہ عدلیہ پر یقین اور اس میں شراکت سے ہوتا ہے۔

اخلاق کی ایک لازمی سطح حاصل کرکے کئی لوگوں کو نظام حکومت چلانا چاہئے کیوں کہ علاحدہ علاحدہ ذاتی طور پر کم صلاحیت کے باوجود وہ مشترکہ طور پر چند منتخب افراد سے کہیں زیادہ ذہین اور باصلاحیت ہوتے ہیں۔ لیکن سبھی مشاورتی اور عدلیہ کی کارروائیوں کو کنٹرول کرنے کے باوجود انہیں اعلیٰ ایگزیکٹو عہدوں سے الگ ہی رکھنا چاہئے۔ سب سے عمدہ حکومتی نظام وہ ہے جس میں بہت امیر اور بہت غریب کے درمیان کا متوسط طبقہ حکومت کرے وجہ یہ ہے کہ اس طبقہ کی زندگی سب سے زیادہ پائیدار ہوتی ہے اور یہ سب سے باضمیر اور ساتھ ہی آئینی کارروائیوں میں سب سے اہل بھی ہوتا ہے۔

(صفحہ 167(102)

حقیقتاً اسی کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ خود مختاری کو شہریوں کے بڑے طبقہ میں مخفی ہونا چاہئے' جس میں بلاشبہ غلام نہیں آتے۔

جمہوریت ذاتی آزادی کے معاملے میں یکساں خیال کی حامل ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ سبھی شہریوں کو حکومت کے عہدوں پر براجمان ہونے یا منتخب ہونے کے لئے اور ہر ایک سب پر اور سبھی ہر ایک پر حکومت کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔

ارسطو بھی پلیٹو کی طرح جمہوری نظام کو حکومت کی ایک بگڑی ہوئی شکل تصور کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ دیگر کسی طرح کی ریاست کے مقابلے بڑی ریاستوں کے لئے زیادہ مناسب ہے۔

استوئک ازم سنیسزم (Cynicism)

اپیکیورس نواز: اپیکیورس[1] کا کہنا تھا" انصاف بذات خود کچھ نہیں ہے۔ یہ سب باہمی نقصانات کو روکنے کے لئے (انصاف کی بنیاد کے طور پر) محض مفاہمت کی ایک ترکیب ہے"۔

استوئک: (ازم)

فلسفی زے نوں (260-340 قبل مسیح)[2] کا ایک شاگرد جس نے ایتھنس کے استوا پائکلائٹ (پینٹڈ پورچ) نامی باغ میں شعبۂ فلسفہ کا اپنا ادارہ قائم کیا۔ بعد میں کیٹو دی ینگر[3]' سینکا[4]' مارکوس آری لیئس[5] رومن استوئک ازم کے حامی ہوئے۔ 'استوئک' لفظ کا مطلب ہے' وہ شخص جو خوشی یا غم کے جذبہ سے مبرّیٰ ہو۔

استوئک نواز قدیم فلسفہ کی ایک شاخ ہے' جو زندگی اور ذمہ داری کے تئیں اپنے نظریات میں اپیکیورس کے نظریات کا سخت مخالف ہے اور سکھ یا دکھ کے جذبہ سے لاتعلق ہے۔

1۔ اپیکیورس (270-341 قبل مسیح) یونانی فلسفی' جو مانتا تھا کہ روحانیت سے زندگی خوشگوار بنائی جاسکتی ہے۔ اخلاق حصول اطمینان کا ایک وسیلہ ہے۔

2۔ جینو: یونانی فلسفی جو روحانیت اور فطرت کے ساتھ زندگی گزارنے کا حامی تھا۔

3۔ کیٹو دی ینگر (46-95 عیسی قبل مسیح): رومن فلسفی' جو استوئکوادیوں کا محافظ سنت تھا۔

4۔ سینکا: پورا نام لیوسیس اینئس سینکا (4-65 قبل مسیح): رومن مصنف' سیاست داں اور رومن بادشاہ نیرو کا معلم' جس نے استوئک ازم پر کئی مضامین اور المیہ ڈرامے بھی تحریر کئے۔ کچھ عرصہ کے لئے وہ ایک طرح سے روم کا حکمراں رہا' بعد ازاں اسے خودکشی کرنے کی سزا ملی۔

5۔ مارکس آریلیس اینٹونیس: (121-180 مسیح): رومن فلسفی اور بادشاہ (161-180 مسیح تک) اس نے 'میڈی ٹیشنس' نام سے ایک کلاسک استوئک ازم پر مبنی ایک صحیفہ تصنیف کیا۔

سنیسزم
فلسفیوں کا ایک گروپ جس کی تشکیل آتھنس کے اینٹیستھینز [1] نے (پیدائش 444 قبل مسیح) کی تھی، جس کی خواہش کی خصوصیت مال و دولت، فن، سائنس اور تفریح کے خلاف ایک ظاہر نفرت کے طور پر تھی۔ انہیں سینیک (خبط)، ان کے روکھے اور ناخروس رویہ کے سبب کہا جاتا ہے۔ سینسزم کبھی کبھی انسانی جذبہ کے تئیں جذبہ ہتک کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اپیکیورس ازم
اپیکیورس (270-341 قبل مسیح) ایک یونانی فلسفی تھا، جس کی تعلیم تھی کہ سکھ ہی حقیقی شئے ہے۔ اپیکسور سوادی اسے کہا جاتا ہے کہ جو کھانے پینے اور موج مستی میں یقین رکھتا ہے۔

168(103)

رومن نظام ریاست
رومنوں نے سیاسی اصولوں میں کم ہی ایسا اضافہ کیا، جس کی کوئی اہمیت ہو۔ لیکن ایک بہت اہم میدان یعنی علم قانون میں انہوں نے دلچسپ اور بیش قیمت اضافے کئے۔

جس سیویک۔ جس جینٹیم
جمہوریت کے تحت شہری قانون (جس سیویک) کے علاوہ جس جینٹیم (ملک کا قانون) نام سے متعدد قوانین اور اصول وجود میں آ چکے تھے جو اٹالوی قبائل میں رائج عام خصوصیات کو منعکس کرتے تھے۔

جس نیچرل
عظیم رومن جیورس کنسلٹس (علم قانون کے ماہر)، (اسٹوئک وادیوں کے خیالات سے تحریک پاکر) آہستہ آہستہ قانون فطرت (جس نیچرل) کو جس جینٹیم کی مثل ماننے لگے۔
ان کی تعلیم تھی کہ یہ قانون الہامی اور معتبر تھا اور یہ خاص ریاستوں کے قوانین سے اپنی عظمت اور اہمیت کے اعتبار سے کہیں برتر تھا۔ قانون قدرت کو حقیقت میں وجودی تصور کیا جاتا ہے اور اسے شہری قانون سے مربوط سمجھا جاتا ہے۔
اینٹونیائی عہد [2] میں جب رومن قانون اپنی حد تک ترقی کر چکا تھا اور اسٹوئک ازم اصول زیادہ موثر ہو چکے تھے تب قانون دانوں نے سیاسی اصولوں کے طور پر نہیں بلکہ قانون کے طور پر یہ اصول تسلیم کیا کہ "سبھی انسان پیدائشی طور پر آزاد ہوتے ہیں"۔
اور یہ کہ قانون قدرت کے اعتبار سے سبھی انسان برابر ہوتے ہیں، جس کا مطلب یہ تھا کہ اگرچہ شہری قانون میں طبقاتی اختلافات کا جواز تھا مگر قانون قدرت کے لحاظ سے بنی نوع انسان برابر تھے۔

1۔ آنٹستھینیز (365-444 قبل مسیح)، سقراط سے متاثر یونانی فلسفی۔ اس کی سادہ زندگی اور تعلیمات نے غریبوں کو اپنی طرف راغب کیا۔

2۔ روم کا بادشاہ اینٹونینس پائس (161-86) کا دور حکمرانی (161-138 ء) اس کا دور حکمرانی امن اور بہترین انتظامیہ کا عہد تصور کیا جاتا ہے۔

رومن نظام مملکت میں سماجی معاہدہ

اگرچہ رومن قانون سازنے شہری سماج کے وجود کے طور پر کسی معاہدہ کو تسلیم نہیں کیا تھا پھر بھی ان میں مجوزہ حقوق اور فرائض کو ایک تخیلاتی مگر غیر موجود معاہدہ سے چلانے کا ایک رجحان موجود تھا۔

خودمختاری کے معاملے میں شہری کمیٹیاں ٹریبورا[1] میں ایک جگہ جمع ہو کر جمہوریت کے سنہرے ایام میں بااقتدار بن کر کام کرتے تھے۔

سامراجیہ کے تحت خودمختاری بادشاہت میں مخفی تھی اور بعد کے جیورس کنسلٹس کے مطابق لیکس ریژیاں[2] کے مطابق اعلیٰ کمان ہر بادشاہ کو اس کا اقتدار شروع ہوتے ہی سونپ دیتی تھی اور اس طرح حکمرانی کرنے اور قانون سازی کے سارے اختیارات اسے سونپ دیئے جاتے تھے۔[3]

صفحہ 169(104)

عہد وسطیٰ

ٹامس اکیوناس

ٹامس اکیوناس[4] (1226-1274) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عہد وسطیٰ کے سیاسی اصولوں کا بانی تھا۔ اس نے رومن قانون سازوں کی تقلید کرتے ہوئے ایک قانون فطرت کو قبول کیا' جس کے قانون انسانی روح میں الہامی طور پر ڈالے گئے (مانے گئے) اور اس کے ساتھ ہی اس نے ان واضح قوانین کو بھی منظوری دی جو مختلف ریاستوں میں مختلف ہوا کرتے تھے۔

اس کا کہنا تھا کہ قانون سازی کرنے والی طاقت جو کہ خودمختاری کی لازمی خصوصیت ہوتی ہے' عوامی فلاح و بہبود کے لئے ہونی چاہئے اور یہ کہ اس مقصد کی حصول یابی کے لئے اسے عوام یا اس کے نمائندہ' بادشاہ' سے متعلق ہونا چاہئے۔ اسے بادشاہ' اعلیٰ طبقہ کے افراد اور عوام کی مشترکہ حکومت عمدہ معلوم ہوتی تھی' جس میں سب سے بااقتدار پوپ ہو۔

پادوا کا مارسیلیو[5]

(وفات 1328)

معاہدہ کا عقیدہ

اپنی تخلیق 'ڈیفنسر پیسس' میں پادوا کے مارسیلیو نے عوام پر مبنی اقتدار اعلیٰ کے اصولوں کی حمایت کی اور الہامی

1۔ حکومتی یا شاہی کمیٹی' جو بادشاہ کے ذریعہ تشکیل پاتی تھی۔ 2۔ ریاستی قانون۔

3۔ ان نوٹس سے ظاہر ہے کہ بھگت سنگھ نے یونانی اور رومن فلسفہ پر مبنی ریاست کے فلسفہ کو سمجھنے کی خاطر سنجیدگی سے مطالعہ کیا تھا۔

4۔ ٹامس اکیوناس (1226-1274): اطالوی فلسفی۔ 5۔ پادوا کا مارسیلیو (وفات 1328): اٹلی کے پادوا شہر کا باشندہ' سیاسی اصول کار جس نے چرچ اور ریاست کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنے کو لے کر بادشاہ لوئی چہارم کے لئے ڈیفنسر پیسس نام کی تصنیف کی' جو کافی متنازعہ ثابت ہوئی۔

حکومت کے تئیں ان پوپ نواز فریب کی مخالفت کی جو فالسوڈ کریٹلس پر مبنی تھے۔

(عوام کی خودمختاری)

چوں کہ انسانوں نے شہری زندگی اپنے باہمی مفاد کے لئے اختیار کی‘ اس لئے قانون بھی شہریوں کی تنظیم کے ذریعہ ہی بنائے جانے چاہئیں۔ قانون جب تک ان لوگوں کے ذریعہ نہیں بنائے جاتے‘ جن کے مفاد براہ راست ان سے متاثر ہوتے ہیں اور جنہیں معلوم ہے کہ ان کی ضروریات کیا ہیں‘ تب تک نہ تو وہ سب سے اچھے کہے جاسکتے ہیں اور نہ ہی پابندی سے ان کی تعمیل کی جاسکتی ہے۔

اس نے دعوے کے ساتھ کہا کہ قانون بنانے کی طاقت عوام میں مخفی ہوتی ہے اور مقننہ کا کام انتظامیہ کی تشکیل ہے لیکن وہ اسے بھی تبدیل یا مسترد کرسکتی ہے۔

نشاۃ ثانیہ۔ اصلاح

نشاۃ ثانیہ میں علم کے سبھی شعبے بیدار ہوگئے اور لیک سے منسلک جو فلسفہ ہزاروں برسوں سے مذہبی علوم کی تقلید کرتا آرہا تھا‘ اب اس کا مقام فطرت اور انسان کے نئے فلسفہ نے لے لیا‘ جو زیادہ رواداری پر مبنی‘ قابل قبول اور سمجھ میں آنے والا تھا۔

بیکن[1] نے انسانوں کو ماضی سے قدرت اور حقیقت کی جانب لوٹنے کی اپیل کی۔

فلسفہ کی ابتدا لازمی طور پر اجتماعی تشکیک سے ہونی چاہئے لیکن جلد ہی اس میں عدم تشکیک کا گزر ہوجاتا ہے: انسانوں میں اصول فلسفہ کا وجود۔ بیداری کا وجود!

کارت ازم فلسفہ

عہد اصلاح میں ذاتی سچائی پر یقین اور فرد کی حکمرانی کی جس زور و شور سے اپیل کی گئی‘ وہی کارت ازم فلسفہ کی بنیاد بنا۔

کارت ازم فلسفی رینے دی کارت[2] (1596-1650) اور اس کے فلسفہ سے متعلق۔

صفحہ 170 (105)

عہد جدید

عہدِ اصلاح کے بعد پوپ کا اقتدار ختم ہوگیا اور حکمراں اور عوام دونوں کے ذہن آزادی کی لہر سے آشنا ہوگئے۔ لیکن اس سے ایک غیر یقینی صورت حال بھی پیدا ہوگئی۔ اس نئی صورت حال سے نپٹنے کے لئے کئی مفکرین نے ریاست سے متعلق غور وفکر شروع کردیا۔ افکار کی مختلف شقیں وجود میں آگئیں۔

میکیاویلی

1۔ روجر بیکن (1215-1292) سائنسی تجربات پر یقین رکھنے والا انگریز دانشور۔ ممکنہ فرانسس بیکن (1561-1626): انگریز فلسفی اور سیاست داں کی کسی تخلیق سے ماخوذ۔

2۔ فرانسیسی فلسفی اور ریاضی داں۔ کارت ازم فلسفہ بیداری اور مادہ کے مضمرات پر مبنی ہے جو کارت کی تخلیق ڈسکورس آن میتھڈ (1673) میں اس کے اس قول سے واضح ہے: کاگنیٹو ارگوسم (Congnito ergo sum) یعنی میں سوچتا ہوں‘ اس لئے میں ہوں“۔

میکیاویلی۔ اس مشہور اطالوی سیاسی مفکر نے حکومت کی جمہوری شکل کو سب سے بہتر سمجھا لیکن ریاست کی اس شکل کے استحکام پر شبہ ہونے کے سبب اس نے ایک بااختیار جمہوری حکومت کو محفوظ رکھنے کے اصول بنائے اور اسی وجہ سے اس نے 'دی پرنس' کی تخلیق کی۔

مرکزیت پر مبنی حکومت کی اس کی حمایت کا یورپ کے سیاسی اصولوں اور منظرنامہ پر کافی اثر پڑا۔

میکیاویلی شاید اولین مصنف تھا جس نے خالص سیکولر نقطۂ نظر سے سیاست پر غور کیا۔

دیگر مفکرین

قرار اور سمجھوتہ (عہد و پیماں)

دیگر مفکرین میں سے بیشتر نے قرار یا معاہدہ کے اصول کی حمایت کی۔ رومن قانون میں (قرار) افراد کے درمیان ایک معاہدہ کا نتیجہ ہوا کرتا تھا اور اس کا دائرہ سمجھوتے سے چھوٹا ہوا کرتا تھا جب کہ سمجھوتہ قرار کے ساتھ ساتھ ایک پابند عہد ذمہ داری بھی ہوتا تھا۔

ایسے مفکرین کے دو علاحدہ علاحدہ گروپ تھے۔ پہلا گروپ خدا اور انسان کے درمیان قرار کے یہودی عقیدے پر مبنی اصول کا معتقد تھا جو رومن سمجھوتے کے عقیدہ کی تکمیل تھا۔ یہ حکومت اور عوام کے درمیان ایک غیر تحریر شدہ سمجھوتہ پر عمل پیرا تھا۔

دوسرا یا ماڈرن گروپ افراد کے درمیان ایک قرار کے ذریعہ سیاسی سماج کی تشکیل سے متعلق ہے۔ فکر کی اس نہج کے اہم مفکر ہوکر[1] ہابس[2]، لاک[3] اور روسو[4] تھے۔

عوامی آزادی کے حمایتی

ہیوجنات[6]

ا۔ وِنڈیسئے کونٹرا ٹائرینّاس[7] (1576) ہیوجنات لینگوئٹ کی تخلیق۔ اس میں دلیل دی گئی تھی کہ بادشاہ اپنی

1۔ دی پرنس: 1527 میں اطالوی سیاسی مفکر میکیاویلی کے ذریعہ تحریر کردہ مشہور کتاب، جس میں اقتدار حاصل کرنے کے اقدامات کا تفصیلی تذکرہ اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ میکیاویلی اور اس کی کتاب نے اپنے اور بعد کے عہد میں بھی سیاست پر کافی اثر ڈالا۔

2۔ رچرڈ ہوکر (1600-1554) انگریز مذہب داں۔ 3۔ تھامس ہابس (1679-1588) لیواتھن کے خالق۔ انگریز فلسفی

4 جان لاک (1707-1632): انگریز فلسفی اور ایک معاملہ فہم۔ اس نے سماجی معاہدہ کے ہابس کے اصول کی مذمت کی جو شاہی نظام کے حامی تھے۔ 1689 میں اپنی مشہور تصنیف 'ٹو ٹریٹائز آن گورنمنٹ' لکھی، جس نے بعد میں امریکی آئین سازوں کو متاثر کیا۔ اس کی دوسری کتاب 'اسے کنسرننگ ہیومن انڈر اسٹینڈنگ' ہے، جو اینڈرک تجربہ پر مبنی تعلیم کے اصول کے حق میں ہے۔ 5۔ جیاں جاک روسو (1778-1712) 'سوشل کنٹریکٹ' کے خالق، فرانسیسی فلسفی۔

6۔ ہیوجینات: یہ نام سولہویں صدی کے وسط سے فرانس کے پروٹسٹنٹوں کو دیا جانے لگا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ترس شہر میں مقامی پروٹسٹنٹ عیسائی رات میں بادشاہ ہیوگو کے دروازہ پر ملاقات کیا کرتے تھے۔ بادشاہ ہیوگو کو عوام خدائی طاقت تصور کرتی تھی۔

7۔ ونڈی سی اے کونٹرا ٹائیرنیس: ہیوبرٹ لینگوئیٹ (1581-1518) کی تخلیق، جس میں مطلق العنان اقتدار کے خلاف احتجاج کرنے کا اصول بنایا گیا تھا مگر اس کے لئے یہ لازمی بتایا گیا تھا کہ ایسا احتجاج مجموعی طور پر تشکیل شدہ حکومتی ادارے کے ذریعہ کیا جانا چاہئے۔

بادشاہت عوامی آرزوؤں اور امنگوں سے حاصل کرے اور یہ کہ اگر بادشاہ قوانین کی تکمیل میں اس عہد کو توڑدے جو اس کے اور عوام کے درمیان مشترکہ طور پر بادشاہت کی تشکیل کے وقت کیا گیا تھا تو عوام بھی ریاست کی وفاداری سے آزاد ہو جائیں گے۔

بکانن[1]

3۔ بکانن کا بھی یہی کہنا تھا کہ بادشاہ اور عوام ایک معاہدہ کے تحت باہم پابند عہد ہوتے ہیں اور یہ کہ اگر بادشاہ اسے توڑدے تو وہ اپنے اختیارات سے ہاتھ دھو دیتا ہے۔

صفحہ 171(106)

جے سوئٹ[2]

2۔ یہاں تک کہ جے سوئٹ بیلارمن[3] اور ماریعینا[4] کی بھی یہی دلیل تھی کہ بادشاہ اپنی بادشاہت عوام سے حاصل کرے، لیکن پوپ کی ماتحتی میں رہے۔

کنگ جیمس اول[5] (1609): جیمس اول نے اس اصول کو 1609 میں پارلیمنٹ میں ایک بیان دیتے ہوئے یہ کہہ کر تسلیم کیا کہ ''ایک ریاست کا ہر انصاف پسند بادشاہ یہ دیکھنے کے لئے پابند ہے کہ اس کی حکومت کی تشکیل عوام کے ساتھ اس کے قوانین کے تحت جو معاہدہ کیا جاتا ہے، وہ عوام کو بھی قابل تسلیم ہو۔

کنونشن پارلیامنٹ (1688): کنونشن پارلیامنٹ نے 1688 میں اعلان کیا کہ جیمس دوم[6] کو بادشاہ اور عوام کے درمیان بنیادی سمجھوتہ کو توڑ کر آئین کو بدلنے کی کوشش کے سبب تخت خالی کر دینا پڑا۔

بودیں[7] (1586): عہد جدید کے اولین سیاسی فلسفی اور 'ری پبلک' (1577 اور 1586) کے مصنف بودیں کا کہنا ہے کہ ''جمہوریت سمجھوتہ سے نہیں بلکہ بزور طاقت وجود میں آئی ہے''۔ قدیم شاہی حکومتوں کو فتح کر کے اکھاڑ پھینکا گیا اور اس طرح فطری آزادی کا خاتمہ ہو گیا۔

1۔ اسکاٹ مفکر جارج بکانن (1582-1506) انہوں نے اپنی تخلیق 'ڈی جیور ریگنی اپوڈ اسکوٹوس' (1579) تحریر کیا کہ بادشاہ ان حالات کا پابند ہوتا ہے، جن کے تحت اسے اقتدار اعلیٰ فراہم کیا گیا اور مطلق العنان حکمرانوں کی مخالفت اور یہاں تک کہ انہیں سزا دینا بھی مبنی بر انصاف ہے۔

2۔ جے سوئٹ: سوسائٹی آف جیسس نامی فرقہ کا رکن، اس کیتھولک مذہبی فرقہ کا قیام 1540 میں 'سینٹ اگنوشیس لیولا نے کیا۔

3۔ بیلارمن (اطالوی میں بیلارمنو) رابرٹو فرانسسکو رومولو (1621-1542)، اطالوی مذہب داں، اس کا یقین تھا کہ پوپ کے پاس ایک جابر حکمراں کو ہٹا دینے کا کامل اختیار رہتا ہے۔

4۔ جوآن ڈی ماری اینا (1624-1536): اسپین کا مورخ اور جے سوئٹ: وہ ایک مطلق العنان حکمراں کو اکھاڑ پھینکنے کو جائز تصور کرتا تھا۔

5۔ جیمس اول (1625-1602): اس نے بادشاہ کے الہامی اختیار کا اعلان کیا، جس کے سبب پارلیمنٹ سے اس کا ٹکراؤ ہوا۔

6۔ جیمس دوم (1701-1633)، برطانیہ کا بادشاہ۔ اپنی کیتھولک جانب داری اور مفاد پرستانہ حکمرانی کی وجہ سے اسے 1688 کے قابل فخر انقلاب کے بعد حکومت کو خیرباد کہہ کر فرانس بھاگنا پڑا۔

7۔ جیاں بودیں (1596-1530) فرانسیسی فلسفی۔ اس کا ماننا تھا کہ خود مختار حکمراں کے اقتدار میں عوامی پارلیمنٹ ترمیم کا حق رکھتی ہے۔

اس کے خیال سے ''خود مختاری شہریوں کے اوپر سب سے بڑی حکومت ہے''۔ وہ مانتا تھا کہ ''خود مختاری آزاد، غیر منقسم، مستحکم، غیر منتقل اور غیر جانب دار حکومت'' کی شکل ہے۔ اس نے اقتدار اعلیٰ کے تئیں اپنے عقیدے اور اس وقت کی موجودہ شہنشاہیت کو خلط ملط کر دیا۔

التھوسیس (1557-1638)[1]: وہ واضح طور پر یہ کہنے کے لئے جانا جاتا ہے کہ خود مختاری محض عوام میں ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔ بادشاہ محض اس کا مجسٹریٹ یا حکمراں ہوتا ہے اور یہ کہ خود مختاری کا اختیار منتقل نہیں ہوتا ہے۔

گروٹیئس (1625)[2]: اپنی تخلیق 'ڈی جیورے بیلی ایٹ پیرس' (1628) میں گروٹیئس کہتا ہے کہ انسانوں کے اندر ایک پر امن اور منظم سماج کی آرزو ہوتی ہے۔ لیکن وہ غیر مخالفتی اصول کو فروغ دیتا ہے۔ اور اس بات سے انکار کرتا ہے کہ لوگ ہمیشہ اور ہر جگہ با اقتدار ہوتے ہیں یا وہ کہ سبھی حکومتیں عوام کے لئے تشکیل پاتی ہیں۔ اقتدار اعلیٰ یا تو فتح سے حاصل ہوتا ہے یا مفاہمت سے لیکن وہ اس عقیدے پر زور دیتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ غیر منقسم حکومت ہے۔

ہوکر: وہ اپنی تخلیق ایکلیے سٹیکل پالیٹی۔ باب۔1 (93-1592) میں فطرت کی ایک ایسی صورت حال کو تسلیم کرتا ہے۔ جس میں سبھی انسان برابر تھے اور کسی بھی قانون کے ماتحت نہیں تھے۔ انسانی وقار کے مطابق زندگی کی آرزو اور تنہائی سے عدم دلچسپی نے انہیں 'سیاسی سماجوں' کا حصہ بن جانے کی ترغیب دی۔ فطری رجحان اور ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کے ان کے طور طریقوں پر ظاہری طور یا خفیہ مفاہمت سے چلنے والا نظام ہی حالیہ سیاسی سماجوں کے دو بنیادی اصول بنے۔ ان میں سے دوسرے اصول کو ہم 'مفاد عامہ کا قانون' کہتے ہیں۔

صفحہ 172 (107)

ریاست کا وجود

شہنشاہیت: مقنّنہ کا انتظامیہ پر بھی کنٹرول

سبھی باہمی شکایات، نقصانات اور غلطیوں کے ازالے کا واحد طریقہ کسی قسم کی حکومت یا عدلیہ کی تشکیل ہی کرنا تھا۔

وہ اس بات پر ارسطو سے متفق تھا کہ حکومت کی ابتدا شہنشاہیت سے ہوئی لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''قوانین صرف بھلائی کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ ایک انضباطی طاقت بھی رکھتے ہیں، جو حکمرانوں کی مرضی سے حاصل ہوتی ہے اور جو یا تو ذاتی طور پر یا ان کے نمائندوں کی معرفت ہمیں نظر آتی ہے''۔

''قوانین خواہ وہ کسی بھی طرح کے انسان کے لئے ہوں وہ ان کی مرضی سے ہی جائز ٹھہرائے جاتے ہیں''۔

وہ قانون، قانون نہیں ہیں جو عوام کی اجازت کے بغیر بنائے گئے ہوتے ہیں''۔

1۔ جوہانس التھیوسس (1557-1638): ایک جرمن قانون ساز اور ڈچ جمہوریہ کی سرحد پر واقع ایک امپیریل شہر ایمڈین کا چیف مجسٹریٹ۔

2۔ ہیوگو گریٹیئس (1583-1645): ڈچ قانون ساز اور سیاست داں۔ ان کی کتاب بین اقوامی قانون بنانے والی اولین تخلیق مانی جاتی ہے۔

عوام کا اقتدار

اس طرح اس نے واضح طور پر کہا کہ اقتدار اعلیٰ یا مقننہ کی طاقت بلاآخر عوام میں ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔

1620:

میفلاور (1620) پر سوار پِلگرم فادرس[1]' کا مشہور اعلامیہ: ''خدا کو حاضر و ناظر مان کر ہم سب مل کر ایک دوسرے معاہدہ کا اعلان کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک مشترک تنظیم کی شکل میں منظم کرتے ہیں۔

1647

انگلینڈ کے عوام کا معاہدہ: ایک اور مشہور پیوریٹن[2] دستاویز جو آرمی آف دی پارلیامنٹ (1647) سے پاس ہوئی' فکر کی اسی ذہنیت کا اشاریہ ہے۔

ملٹن[3]

1649 (عوام کا اقتدار)[4]

اپنی تخلیق 'ٹین یور آف کنگس اینڈ مجسٹریٹس' (1649) میں وہ بھی ایسے اصول بناتا ہے۔ وہ دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ ''سبھی انسان فطری طور پر آزاد پیدا ہوئے تھے''۔ وہ ایک ''عام تنظیم کی شکل میں ایک دوسرے کے ساتھ مرتبط ہونے کے لئے متفق ہوئے تا کہ وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے بچ سکیں اور ایک ساتھ مل کر ان چیزوں سے اپنا تحفظ کر سکیں' جو بدامنی پیدا کرنے والی ہوں یا اس طرح کے اتحاد کے خلاف ہوں۔ اسی کی بدولت قصبات' شہر اور ریاست کا وجود عمل میں آیا۔ اس وقت اپنی حفاظت کا یہ اختیار' جو بنیادی طور پر ان میں سے ہر ایک کے پاس اور مشترکہ طور پر سب میں مخفی تھا' ڈپٹیوں اور کمشنروں کی شکل میں بادشاہوں اور مجسٹریٹوں کو سونپ دیا گیا۔

راجاؤں اور مجسٹریٹوں کی حکومت اور کچھ بھی نہیں ہے' سوائے اس کے کہ یہ صرف انہیں عوام کے ذریعہ سب کی بھلائی کے یقین کے ساتھ عنایت کی گئی ہے' یہ ایک منتقل پذیر اور تفویض کردہ اقتدار ہے۔' جو ابھی بھی بنیادی طور پر اسی میں (یعنی عوام میں) پوشیدہ ہے اور جو اس کے ذریعہ فطری اصولوں کی مخالفت کئے بغیر چھینی نہیں جا سکتی۔ اس طرح قوم بادشاہوں کو منتخب کر سکتے ہیں یا ہٹا سکتے ہیں' فطری طور پر محض آزادی کے پیدائشی حق کی بنیاد پر کہ وہ کسے حکمراں بنانا سب سے عمدہ سمجھتے ہیں''۔

صفحہ 173 (108)

بادشاہوں کے الہامی اختیارات کا اصول پدری نظام حکومت کا اصول

اسی عہد میں' جہاں بہت سارے مفکرین 'عوامی اقتدار' کے ان اصولوں کا اس طرح نفاذ کرنے میں مصروف

1۔ پلگرم فادرس' انگلینڈ کے چرچ کے پیوریٹن باغیوں کا ایک گروپ جو پریشان کیے جانے سے بچنے اور شمالی امریکا میں جا بسنے کے لئے میفلاور نامی جہاز سے بھاگ نکلا۔ 2۔ پروٹسٹنٹ عیسائی فرقہ کا رکن۔

3۔ جان ملٹن (1608-1674): انگریز شاعر۔ پیراڈائز لاسٹ اور پیراڈائز ریگینڈ کے خالق۔ 4۔ موٹے الفاظ میں حاشیے پر درج۔

تھے، وہیں دوسرے اصول ساز بھی تھے، جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے تھے کہ ریاست ایک بڑا کنبہ ہی ہے، جس میں ایک کنبہ کے سربراہ کا 'پدری نظام حکومت' قائم ہوتا ہے اور اسی روایت کو قائم رکھتے ہوئے اقتدار کنبہ کے سب سے بڑے اور لائق شخص کو یا اس کے نمائندہ کو منتقل کردی جاتی ہے جو کسی ریاست میں حکومت کرنے کا اہل ہوسکے۔ اسی لئے شہنشائیت کو ایک غیر مفتوح حق پر مبنی سمجھا گیا اور بادشاہ کو محض خدا کے تئیں ہی جواب دہ قرار دیا گیا۔ اسے ہی 'بادشاہوں کا الوہی اختیار'' کہا گیا۔ اسے ہی 'پدری نظام حکومت' کہا گیا۔

تھامس ہابس

1642-1650-1651 میں تحریر کردہ اپنی متنوع تخلیقات میں اس نے شاہی حکمرانوں کے لامحدود اقتدار کے اصولوں کو عوام کے ابتدائی معاہدے کے مخالف اصول کے ساتھ وابستہ کردیا لیکن انارکزم' موک آ گیا کارینا (فرماں برداری) کے تئیں ہابس کی حمایت مذہبی قوانین پر مبنی نہ ہوکر سیکولر اور مدلل تھا۔ وہ عوام کی فلاح کو حکومت کا عظیم مقصد تصور کرتا تھا۔

(انسان ایک غیر سماجی حیوان)

ہابس کا فلسفہ سنسزم (Cynisism) پر مبنی ہے۔ اس کے مطابق انسان کی افتادِ طبع فطری طور سے اس کے ذاتی تحفظ اور فلاح کی سمت میں مائل ہوتی ہیں اور وہ ان کی حصول کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتا کیوں کہ بالآخر انسان فطری طور پر غیر سماجی ہے۔ وہ کہتے ہیں 'فطری طور پر ہر انسان اپنے جیسوں سے متصادم رہتا ہے، اور ہر ایک کی زندگی خطرے میں ہے، وہ تنہا' بے یار و مددگار، غیر محفوظ' حیوان نما اور قلیل مدتی ہے۔ اس طرح کی زندگی کا خوف ہی اسے سیاسی اتحاد سے وابستہ ہونے کے لئے مجبور کرتا ہے''۔

چوں کہ محض معاہدہ کام نہیں دیتا' اس لئے 'ایک اعلیٰ اور برتر اقتدار' حکومت' کی تشکیل کی جاتی ہے۔

('فتح' یا 'قبضہ' اور 'تنظیم' سبھی ریاستوں کی واحد بنیاد)

سماج کی تشکیل 'قبضہ' یعنی فتح کے ذریعہ یا تنظیم کے ذریعہ مثلاً باہمی سمجھوتے یا مفاہمت کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس طرح ایک بار جب شاہی حکومت قائم ہوجاتی ہے تو سبھی کو اس کا فرماں بردار ہونا لازمی ہوجاتا ہے۔۔ اس کے خلاف بغاوت کرنے والے کسی بھی فرد کو ختم کردیا جانا چاہئے۔ اسے تباہ کردیا جانا چاہئے۔

(اقتدار اعلیٰ کا لامحدود اختیار)

وہ[2] مقننہ' عدلیہ اور انتظامیہ کے مکمل اختیارات شاہی حکمراں کے حوالے کردیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: 'موثر ہونے کے لئے شاہی حکومت کو لازماً لامحدود' غیر منتقل اور غیر منقسم ہونا چاہئے۔ بیشک لامحدود اقتدار بدامنی پیدا کرسکتا ہے لیکن اس کی بدترین شکل بھی اتنی بری نہیں ہوتی جتنی کہ خانہ جنگی یا لاقانونیت۔

1۔ یہ واضح نہیں ہے کہ بھگت سنگھ کسی کتاب کے اقتباس نوٹ کر رہے تھے یا یہ ان کی اپنی رائے ہے۔

2۔ ہابس

صفحہ 174 (109)

اس کے خیال سے راج شاہی' طبقہ اشرافیہ کا نظام حکومت یا جمہوری نظام میں حکومت کو لے کر کوئی فرق نہیں ہے۔ امن اور تحفظ کی سمت میں اس کی حصول یابیاں ان کے ذریعہ حکمرانی عوام یا لوگوں کی فرماں برداری پر منحصر ہے۔ پھر بھی وہ 'راج شاہی' کو ہی زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس کے خیال میں 'محدود راج شاہی' ہی سب سے اچھی ہے لیکن وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ شاہی حکمراں کو لازماً مذہبی امور کے ساتھ ساتھ شہری معاملات سے متعلق بھی قانون بنانے چاہئیں اور یہ عزم بھی کرنا چاہئے کہ کون سے اصول نظم وضبط قائم رکھنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس طرح وہ شہنشائیت کے ایک واضح اصول کی حمایت تو کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ راجا یا شاہی حکمراں پیدا کرنے کے لئے سماجی مفاہمت کے تصور کو بھی برقرار رکھتا ہے۔

اسپنوجا:[1] (1677)

(انسان کا غیر سماجی پن)

اپنی تخلیق ٹریکٹیٹس پالٹیکل (1677) میں وہ مانتا ہے کہ ابتداً انسانوں کا سبھی اشیاء پر مساوی حق تھا' اس لئے فطری طور پر جنگ کی صورت حال تھی۔ انسانوں نے اپنے ضمیر سے تحریک پا کر اپنی طاقتوں کو عوامی حکومت کی تشکیل کے لئے مجتمع کیا۔ چوں کہ انسانوں کے پاس من مانی طاقت تھی' اس لئے اس طرح قائم اقتدار بھی ڈکٹیٹر شپ ہی تھا۔ اس کی رو سے 'حقوق' اقتدار ایک جیسے ہیں۔ اس طرح اقتدار سے لیس ہو کر شاہی حکمرانوں کو سبھی اختیارات بذات خود حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ ڈکٹیٹر شپ کی حمایت کرتے ہیں۔

پوفینڈور[2]

(لا آف نیچر اینڈ نیشنس 1672[3])

اس کے نظریہ کے مطابق انسان ایک سماجی حیوان ہے' جو کنبہ اور پرامن زندگی سے فطری رغبت رکھتا ہے۔
ایک فرد کے ذریعہ دوسرے فرد کو پہنچائے جانے والے نقصان کا تجربہ ہی شہری حکومت کی تشکیل کی تحریک دیتا ہے' جو اس طرح تشکیل پاتا ہے:

1۔ ایک کامن ویلتھ کی تشکیل کے لئے کچھ لوگوں کے درمیان ایک باہمی معاہدہ کے ذریعہ۔ 2۔ اکثریت کی اس تجویز کے مطابق فلاں حکمراں کو زمام اقتدار سونپ دیا جائے' 3۔ حکومت اور عوام کے درمیان اس معاہدہ کے ذریعہ کہ حکومت باگ ڈور سنبھالے اور عوام بھی قوانین کی پاسداری کریں۔

صفحہ 175 (110)

لاک (عوامی حکومت کے دو اصول 1690)

''کسی بھی انسان کو اقتدار سنبھالنے کا فطری حق نہیں ہوتا''۔

1۔ اسپنوجا (1677-1632): دیکارت سے متاثر ڈچ فلسفی۔ اس نے اپنی کتاب 'ایتھکس' (1677) میں یہ خیال ظاہر کیا کہ حیات انسانی خدا (یا فطرت) سے لبریز ہے۔ غیر روایتی افکار کے سبب اپنے بنیادی فرقہ سے 1656 میں نکال دیا گیا۔

2۔ پوفینڈور یا سیموئل بیرن فان پوفینڈور (1684-1632): جرمن آئین ساز اور مورخ۔ اس کا خیال تھا کہ ریاست کے قوانین فطری قانون میں ہی شامل ہیں۔ 3۔ ممکنہ طور پر پوفینڈور کی کتاب 'دی جیورے نیچوری ایٹ جینٹیئم' کا انگریزی عنوان۔

وہ فطری حالت کا یعنی حکمرانی کا حق اور اقتدار کے معاملے میں آزاد اور برابری پر مبنی ایک ایسے ماحول کا تصور کرتا ہے جو صرف فطری قانون یا ضمیر کے ہی ماتحت رہے، جو لوگوں کو ایک دوسرے کی زندگی، صحت، آزادی اور مالکانہ حقوق کے معاملہ میں نقصان پہنچانے سے روکتے ہیں۔ ایسے میں روکنے یا تلافی خسارہ کے طور پر سزا دینے کا حق ہر شخص کے پاس محفوظ ہوتا ہے۔

فطری ماحول

فطری ماحول حقیقت میں وہ ہے، جس میں لوگ باہم فیصلہ سازی کے حق کے ساتھ بغیر کسی ایک با اقتدار حکمراں کے اپنے ضمیر کی آواز کے تحت ایک ساتھ رہیں۔

نجی ملکیت

ہر شخص کا یہ فطری حق ہے کہ وہ اپنے پاس ملکیت رکھے اور قدرتی اشیاء پر اپنی ذاتی محنت سے حاصل پیداوار پر بھی اپنا حق رکھے۔ ایک عام آدمی جتنا زیادہ زمین کو جوت بو کر درست کر سکتا ہے اور کھیتی باڑی کے کام میں لا سکتا ہے اور اس سے حاصل شدہ جتنی پیداوار استعمال میں لا سکتا ہے، وہ سب اسی کی ملکیت ہے۔

ملکیت اور عوامی سماج

ان کے مطابق ''ملکیت 'عوامی سماج' '' کا تکملہ ہے۔

عوامی سماج کا فروغ

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں کو کسی طرح کا خطرہ اور ڈر لگا رہتا تھا اور اسی لئے انہوں نے عوامی آزادی کی حمایت میں اپنی فطری آزادی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ مختصراً ضرورت، سہولت اور ایک خاص رجحان نے لوگوں کو سماجی بندھن کا پابند ہونے کے لئے مجبور کیا۔

عوامی سماج کی تعریف

جو لوگ ایک کمیونٹی کے تحت منظم ہو جاتے ہیں اور جن کے پاس ایک ایسا مقبول عام قانون اور انصاف ہوتا ہے، جس میں اپیل کی جا سکے اور جسے باہمی تنازعات کو نپٹانے اور گناہ گار کو سزا دینے کا حق ہو، وہ ایک عوامی سماج میں ہوتا ہے۔

مفاہمت

دوسروں پر فتح حکومت کا 'وطیرہ' نہیں ہے۔ مفاہمت ہی کسی بھی آئینی حکومت کا وطیرہ تھی اور ہو سکتی ہے۔

مجلس قانون ساز لوگوں کی زندگی، آزادی اور ملکیت کے اوپر مکمل طور پر من مانا حق نہیں رکھتی کیوں کہ اس کے پاس صرف وہی مشترکہ حق ہوتا ہے جو سماج کی تشکیل سے قبل علاحدہ علاحدہ ممبروں کے پاس ہوا کرتا تھا اور جسے انہوں نے اپنے خاص اور محدود مقاصد کے لئے تفویض کیا ہے۔

قانون

قانون کا مقصد آزادی کا خاتمہ یا اسے روکنا نہیں بلکہ اسے تحفظ دینا اور وسعت عطا کرنا ہے۔

مقننہ

مقننہ چند لازمی مقاصد کے لئے محض ٹرسٹی اور معتمد حکومت ہے، جو کہ اگر اس میں مخفی یقین کو مجروح کرے تو ایسے قوانین عوام کے ذریعہ مسترد یا تبدیل کئے جاسکتے ہیں۔

عوامی اقتدار کی بالادستی

اس طرح اقتدار اعلیٰ ہمیشہ عوام کے پاس ہی رہتا ہے مگر وہ اس کا استعمال تب تک نہیں کرتے جب تک کہ حکومت تحلیل نہیں کر دی جاتی۔

صفحہ 176 (111)

مقننہ اور انتظامیہ

ذاتی مفاد پر مفاد عامہ کی قربانی روکنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ مقننہ اور انتظامیہ کے اختیارات الگ الگ ہاتھوں میں رہیں اور انتظامیہ مقننہ کے ماتحت رہے۔

جہاں یہ دونوں چیزیں ایک من مانے بادشاہ کے ہاتھ میں آجاتی ہیں، وہاں کوئی عوامی حکومت نہیں ہوتی کیوں کہ بادشاہ اور اس کے عوام کے درمیان کوئی ایسا قانونی اقتدار نہیں ہوتا جو دونوں کے لئے تسلیم شدہ ہو۔

آزاد سماجوں میں ریاست کی مختلف اشکال ہیں عوامی نظام، مطلق العنانی یا منتخب شاہی نظام یا پھر دیگر مخلوط نظام پر مبنی حکومت۔

انقلاب کا حق

جب حکومت سمجھوتے کے مطابق اپنی ذمہ داری پوری کرنے یعنی ذاتی اختیارات کے تحفظ میں ناکام ہو جاتی ہے تو انقلاب مبنی بر انصاف ہو جاتا ہے۔

روسو[1]

روسو[2]

مساوات

کوئی بھی شخص اتنا امیر نہیں ہونا چاہئے کہ وہ دوسرے کو خرید سکے، اور نہ ہی کوئی آدمی اس قدر غریب ہونا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے۔ عدم مساوات انارکزم کی راہ ہموار کرتی ہیں۔

جائیداد اور عوامی سماج

جس اولین شخص نے اراضی کے ایک قطعہ کی حصار بندی کر کے یہ سوچا ہوگا کہ "یہ میرا ہے" اور جسے اپنی بات پر یقین کرنے والے سیدھے سادے لوگ مل گئے ہوں گے، وہی عوامی سماج کا اصل بانی تھا۔

اگر کسی نے اس دغاباز کا پردہ فاش کر دیا ہوتا اور یہ اعلان کر دیا ہوتا کہ یہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہے اور اس

1۔اور 2 اصل کاپی میں ایسے ہی درج ہیں: دیکھیں نوٹ بک صفحہ 118 (91) کا حوالہ۔ روسو کے نیچے نشان زد کیا ہوا بھی بھگت سنگھ کا ہی ہے۔ روسو کے افکار کو بھگت سنگھ نے خصوصی اہمیت دی ہے۔

کے پھل سب کے لئے ہیں تو بنی نوع انسانی کو اس قدر جنگ، جرم اور مصائب کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

صفحہ 177 (122)

"جو آدمی مراقبہ میں رہتا ہے، وہ غیر مہذب شخص ہے"۔

عوامی قانون

کمزوروں کے استحصال اور سبھی کے عدم تحفظ کی جانب اشارہ کر کے امراء نے بڑی ہوشیاری سے امن و انصاف کے قوانین بنائے تا کہ انہیں سبھی لوگوں کے مالکانہ حقوق کی ضمانت مل سکے اور اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے انہوں نے ایک اعلیٰ حکمراں کی تقرری کی۔

لازمی طور پر سماج اور قوانین کا وجود اسی طرح عمل میں آیا ہوگا، جس نے غریبوں کو نئی بیڑیاں پہنا دیں اور امیروں کو نئی طاقت عطا کی، فطری آزادی کو مکمل طور پر ختم کر دیا اور چند خود پرست لوگوں کے فائدہ کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ملکیت اور عدم مساوات کا قانون بنایا۔ ایک چالاکی بھری لوٹ کھسوٹ کو ایک اٹل حق میں تبدیل کر دیا، اور اس طرح مستقبل کے لئے تمام بنی نوع انسانی کو محنت، غلام اور بدتری کا شکار بنا دیا[1]۔

ایک بار پھر عدم مساوات

لیکن یہ بات مکمل طور پر فطری قانون کے خلاف ہے کہ مٹھی بھر لوگ تو بے شمار دولت ہضم کرتے رہیں جب کہ آبادی کا وسیع حصہ بقائے حیات کی لازمی اشیاء کو ترستا رہے[3]۔

صفحہ 178 (113)

اس کی تخلیق کا حشر

'ایمیلی' اور 'سوشل کنٹریکٹ' دونوں ہی 1762 میں شائع ہوئیں۔ اول الذکر کو پیرس میں جلا ڈالا گیا، روسو بمشکل گرفتار ہوتے ہوتے بچا پھر دونوں کتابوں کو عوامی طور پر جنیوا میں اس کی جائے پیدائش میں جلایا گیا، جہاں اسے کہیں زیادہ شہرت ملنے کی امید تھی۔

بادشاہ کے اقتدار سے عوام کے اقتدار کی سمت

روسو اتحاد اور مرکزیت کے فرانسیسی عقیدوں کو برقرار رکھتا ہے جب کہ سترہویں صدی میں مملکت (یا اقتدار اعلیٰ) کو شہنشاہیت کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں روسو کے اثر سے یہ عوام میں مخفی سمجھا جانے لگا۔

1۔ ممکنہ طور پر روسو کا اقتباس۔

2۔ روسو: سوشل کانٹریکٹ۔

3۔ ایضاً

معاہدہ

معاہدہ کے لئے لوگ عوامی آزادی اور اخلاقی آزادی کے لئے فطری آزادی کو ترک کر دیتے ہیں[1]۔

اولین مالکانہ حق

ملکیت کا حق

اس کا جواز درج ذیل صورت حال پر منحصر ہے:

(الف) کہ زمین غیر آباد ہے (ب) کہ ایک آدمی صرف اتنے ہی رقبے پر قابض ہو سکتا ہے، جتنا کہ اس کے گزر بسر کے لئے ضروری ہو (ج) کہ وہ اس پر محض کھوکھلی خانہ پری کے ذریعہ نہیں بلکہ محنت اور کھیتی باڑی کرنے کے ناطے دخل رکھتا ہے[2]۔

صفحہ 173 (114)

مذہب

روسو مذہب کو خود مختار بادشاہ کی تانا شاہی کے تحت رکھتا ہے۔

پیش لفظ[3]

میں اس بات کی تفتیش کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آج لوگ جیسے ہیں، اور جیسے قوانین بنائے جا سکتے ہیں، ان کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ شہری امور کی انتظامیہ کے لئے کچھ انصاف پسند اور ضروری قوانین بنائے جائیں......

......مجھ سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ کیا میں کوئی بادشاہ یا قانون ساز ہوں جو میں سیاست پر لکھتا ہوں۔ میرا جواب ہے کہ میں نہیں ہوں۔ اگر میں ویسا ہوتا تو یہ کہنے میں وقت برباد نہیں کرتا کہ کیا کیا جانا چاہئے بلکہ اسے کر ڈالتا یا خاموش رہتا۔

''انسان پیدائشی طور پر آزاد ہوتا ہے لیکن ہر جگہ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے[4]''۔

غلامی کے طوق کو بزور طاقت اتار پھینکنا

میں کہنا چاہوں گا کہ جب تک لوگ تعمیل حکم کے لئے مجبور کئے جاتے رہیں اور وہ فرماں برداری کرتے رہیں، اچھا ہے، لیکن وہ جتنی جلدی اس طوق کو اتار پھینک سکیں اور اتار پھینکتے ہیں، تو وہ اور بھی اچھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ اگر اپنی آزادی پھر اسی حق (یعنی طاقت) سے واپس لیتے ہیں، جس حق سے یہ ان سے غصب کی گئی تھی تو یا ان کا ایسا کرنا مبنی بر انصاف ہے یا ان سے اسے چھین لئے جانے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔[5]

1۔ ایضاً

2۔ روسو: سوشل کانٹریکٹ کی بنیاد پر۔

3۔ روسو سوشل کانٹریکٹ کے پیش لفظ سے۔

4۔ روسو کا مشہور قول سوشل کانٹریکٹ سے۔

5۔ حوالہ واضح نہیں۔ ممکنہ طور پر روسو یا دیدرو۔

صفحہ 180 (115)

طاقت

'اقتدار' جو بذریعہ تشدد حاصل کیا جاتا ہے' محض ایک غصب شدہ اقتدار ہوتا ہے اور وہ تب تک ہی قائم رہتا ہے جب تک کہ اس کی کمان سنبھالنے والے کی طاقت اس کو ماننے والوں کی طاقت پر حاوی رہتی ہے اور جب اس کو ماننے والوں کی طاقت زیادہ ہو جاتی ہے اور وہ اس طوق کو اتار پھینکتے ہیں تو ایسا وہ اتنے ہی حق اور قانون کے تحت کرتے ہیں' جس کے تحت ان پر حکومت تھوپی گئی تھی۔ وہی (طاقت کا) قانون' جو حکومت کا حق دیتا ہے' بعد میں اسے غصب بھی کر لیتا ہے۔ یہ سب سے طاقت ور کا قانون ہے''۔

دیدیرو۔ انسائیکلوپیڈیا[1]

'اقتدار'

غلام اپنی زنجیروں میں سب کچھ کھو دیتے ہیں' یہاں تک کہ ان سے نجات پانے کی آرزو بھی[2]۔

سب سے زیادہ طاقت ور کا حق

''بااقتدار طبقہ کی فرماں برداری کرو۔ اگر اس کا مطلب طاقت کے آگے سجدہ ریز ہونا ہے تو یہ حکم اچھا تو ہے لیکن غیر ضروری ہے۔ میرا کہنا ہے کہ اس کی کبھی خلاف ورزی نہیں ہوگی''۔[2]

غلاموں کا حق

کیا تب غلام عوام اپنی عزت نفس کو اس شرط پر ترک کر دیں کہ ان کی ملکیت بھی لے لی جائے؟ میں سمجھ نہیں پاتا کہ ان کے لئے کیا باقی رہ جائے گا؟

کہا جا سکتا ہے کہ مطلق العنان حکمراں اپنے ماتحت لوگوں کے لئے شہری امن لازمی طور پر قائم کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی بات ہو' لیکن اس سے ان کو ملتا کیا ہے جب کہ' جو اس کی آرزو کی وجہ سے ان پر تھوپ دی جاتی ہے اور اس کی غیر فانی خواہش اور اس کی حکومت کی ناکامیاں خود اس کو ذلیل و خوار کرتی ہیں''۔

صفحہ 181 (116)

''یہ کہنا' کہ ایک آدمی اپنے آپ کو بغیر عوض یوں ہی سونپ دیتا ہے' بالکل واہیات اور ناقابل تصور بات ہے''۔

اس طرح کی بات چاہے ایک آدمی دوسرے آدمی کو مخاطب کر کے کہے یا ملک کو خطاب کر کے کہے' ہمیشہ احمقانہ ہی کہی جائے گی۔

''میں مکمل طور پر تمہاری قیمت پر اور اپنے مفاد کے لئے تم سے ایک سمجھوتہ کرتا ہوں اور میں اسے تب تک

1۔ ڈینس دیدیرو (1784-1713): فرانسیسی فلسفی۔ انسائیکلوپیڈیا کا چیف ایڈیٹر۔ فرانسیسی انقلاب کی نظریاتی راہ ہموار کرنے میں روسو اور والٹیر کے ساتھ اس کا اہم رول تھا۔ اس کی تحریروں کی بدولت اسے قید کی سزا بھی ہوئی۔

2۔ 2 اور 3 ممکنہ طور پر دیدیرو کا ہی اقتباس۔

نافذ کیے رکھوں گا' جب تک میں چاہوں اور تم بھی اس بات کو جاری رکھو گے جب تک کہ میں چاہوں گا"

مساوات

اگر تم مملکت کو استحکام فراہم کرنا چاہتے ہو تو ان دو انتہائی نظاموں کو جہاں تک ممکن ہو سکے' قریب لاؤ: نہ تو امیروں کو برداشت کرو' نہ ہی بھکاریوں کو۔ یہ دونوں ہی صورت حال جو فطری طور پر جزو لاینفک ہیں' مفاد عامہ کے لئے عام طور پر خطرناک ہے: ایک طبقہ سے انارکزم (نراجیت) پیدا ہوتا ہے اور دوسرے سے اس کے حامی: ہمیشہ انہی دونوں کے درمیان عوامی آزادی کی تجارت ہوتی رہتی ہے: ایک خریدتا ہے' دوسرا فروخت کرتا ہے"۔

صفحہ 182 (117)

ژالہ باری کچھ علاقوں کو برباد کر دیتی ہے لیکن اس سے قحط کم ہی پڑتا ہے۔ جھگڑے فساد اور خانہ جنگی برپا کرنے والے لوگوں کو کافی چونکا دیتے ہیں پھر بھی وہ ملکوں کے لئے کوئی حقیقی مشکل پیدا نہیں کرتے۔ جب کہ اس بات کو لے کر تنازعہ رہتا ہے کہ کون ان پر من مانے طور پر حکومت کرے۔ ان کی حقیقی خوش حالی یا آفات تو ان کے مقامی حالات سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب سب کچھ روند کر رکھ دیا جاتا ہے تو سب کچھ برباد ہو جاتا ہے: تبھی یہ حکمراں اطمینان سے سب کچھ برباد کرنے کے بعد سکوت مرگ پیدا کر دیتے ہیں جسے وہ امن کہتے ہیں"۔

صفحہ 183 (118) صفحہ 176

فرانسیسی انقلاب[4]

امریکا: امریکی جدوجہد آزادی کا فرانس کے حالات پر کافی اثر پڑا۔ (1776)

ٹیکس

'بادشاہ' کے نام پر کام کرنے والے کورٹ یا کابینہ نے من مانے طریقے سے ٹیکس کا فرمان جاری کیا اور اسے پارلیمنٹ میں اندراج کئے جانے کے لئے بھیج دیا کیوں کہ جب تک پارلیمنٹ ان کا اندراج نہیں کر لیتی تب تک وہ نافذ نہیں ہو سکتے۔

کورٹ کا دعویٰ تھا کہ پارلیمنٹ کو اعتراض کا سبب بتانے کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں تھا۔ جب کہ وہ (یعنی کورٹ یا کابینہ) اپنے پاس یہ فیصلہ کرنے کا اختیار محفوظ رکھے ہوئے تھے کہ اسباب واجب ہیں یا غیر واجب اور اکثر ہی وہ اپنی مرضی سے چاہے تو فرمان واپس لے لے یا باقاعدہ اسے اختیاری طور پر اندراج کئے جانے کا حکم جاری کر دے۔

1- غالباً دیدیرو کا ہی اقتباس

2- اور

3- حوالہ نامعلوم۔ ممکنہ طور پر دیدرو یا روس۔

4- فرانسیسی انقلاب کے بارے میں بھگت سنگھ کے ان نوٹس کے حوالوں کا کچھ کا پتہ نہیں۔

5- پارلیامنٹ: دراصل یہ کوئی منتخب نمائندوں کا گروپ نہیں بلکہ بادشاہ کے مشیروں کا ایک گروپ یا اجلاس ہوا کرتا تھا۔

دوسری طرف پارلیمنٹ کا دعویٰ تھا کہ اس کے پاس انکار کردینے کا حق تھا۔

وزیر ایم کے کیلون[1] کو پیسہ چاہئے تھا۔ وہ محصول کے معاملے میں پارلیمنٹ کے سخت تیور سے آشنا تھا۔ اس نے 'اسمبلی آف نوٹیبلس[2]' کا سیشن بلایا۔ (1787)

یہ اسٹیٹس جنرل[3] نہیں تھا جو منتخب کیا جاتا تھا بلکہ اس کے سبھی ارکان بادشاہ کے نامزد کردہ ہوتے تھے اور اس میں مجموعی طور پر 141 اراکین تھے۔ تب بھی وہ اکثریت ثابت نہ کرسکا۔ تب اس نے اسے سات کمیٹیوں میں تقسیم کردیا۔ ہر کمیٹی میں بیس ممبران تھے۔ کمیٹیوں میں ہر ایک سوال اکثریت سے اور اسمبلی میں کمیٹیوں کی اکثریت سے طے کیا جاتا تھا۔ اس نے کسی چار یا ہر کمیٹی میں گیارہ ایسے اراکین رکھنے کی کوشش کی، جن پر وہ اعتماد کرسکتا تھا لیکن اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔

صفحہ 184(119)

ایم دی لفایت[4] ایک دیگر کمیٹی کا نائب صدر تھا۔ اس نے ایم کیلون پر دو ملین لائیور میں شاہی زمین فروخت کرنے کا الزام لگایا۔ اسے اس نے تحریری طور پر بھی پیش کیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ایم کیلون کو برخاست کردیا گیا۔

تولوس کا آرک بشپ وزیر اعظم اور وزیر مالیات مقرر ہوا۔ اس نے پارلیمنٹ کے سامنے دو طرح کے ٹیکسوں کی تجویز رکھی...... اسٹامپ ٹیکس اور ایک قسم کا اراضی ٹیکس۔ اس پر پارلیمنٹ نے جواب دیا کہ ملک اب تک جس طرح وزارت مالیات کی حمایت کرتا آرہا ہے، اس کے ساتھ ٹیکسوں کی بحث ان میں کٹوتی کرنے کے علاوہ اور کسی بھی مقصد سے نہیں کرنی چاہئے۔

اور ان دونوں ہی تجاویز کو اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ اس وقت انہیں ورسائی بلایا گیا' جہاں بادشاہ نے 'اے بیڈ آف جسٹس' نام سے ایک خصوصی میٹنگ کی اور ان تجاویز کا اندراج کرلیا۔ پارلیمنٹ پیرس لوٹ گئی۔ وہاں ایک اجلاس ہوا۔ ورسائی میں کی گئی تمام کارروائی کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اندراج کو مسترد کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت سب کو 'لیٹر دی کوشیتس' نامی شاہی فرمان جاری ہوا اور سبھی کو ملک بدر کردیا گیا۔ بعد ازاں انہیں واپس بلالیا گیا اور پھر وہی فرمان ان کے سامنے رکھے گئے۔

1۔ چارلس الیگزنڈر دی کیلون: (1802-1734)' فرانسیسی سیاست داں جو نومبر 1783 میں وزیر مالیات بنا۔

2۔ اسمبلی آف نوٹیبلس: مملکت کا خزانہ خالی ہونے کے سبب وزیر مالیات کیلون شاہی خزانہ کے لئے قرض لینا چاہتا تھا لیکن پارلیمنٹ نے اسے نامنظور کردیا۔ تب اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ داخلی محصول کو ختم کردیا جائے اور نوٹیبلس یعنی اونچے طبقوں اور پادریوں پر ٹیکس لگادیا جائے۔ اس کے لئے اونچے طبقوں کا ایک اجلاس (اسمبلی آف نوٹیبلس) جنوری 1787 میں بلایا گیا۔ مگر اونچے طبقہ کے لوگوں نے اپنے خصوصی اختیارات میں کٹوتی کیے جانے کی مخالفت کردی۔ 3۔ یہ اعلیٰ طبقہ' پادری اور بورژوا طبقہ سے منتخب کیئے گئے نمائندوں کا ایک اجلاس تھا۔

4۔ مارکس دی لفایت (1834-1757): امریکی جدوجہد آزادی اور انقلاب فرانس میں حصہ لیا۔ وہ فرانسیسی فوج کا کرنل (1779) اور بعد میں میجر جنرل (1781) بھی رہا۔ 1790 میں اس کی ترقی نیشنل گارڈ آف پیرس کے کرنل جنرل کے عہدہ پر ہوگئی اور اس نے انقلاب کے ابتدائی ادوار میں بہت سرگرم رول ادا کیا۔ لیکن 1792 میں آئینی جمہوریت کی حمایت کرنے کے سبب اسمبلی نے اسے غدار قرار دے کر ملک بدر کردیا۔ اپنی ملک بدری کے دور میں بھی وہ اپنے انقلابی کردار کے سبب پانچ برسوں تک پرشیا جرمنی اور آسٹریا کی جیلوں میں مقید رہا اور نیپولین بوناپارٹ کے دستخط سے ہی جیل سے رہا ہو کر 1799 میں فرانس لوٹا۔

صفحہ 185(120)

پھر اسٹیٹس جنرل کی میٹنگ بلانے کا سوال اٹھا۔ بادشاہ نے اس کے لئے پارلیمنٹ سے وعدہ کیا۔ لیکن کابینہ نے مخالفت کی اور ایک 'فل کورٹ' تشکیل کرنے کی نئی تجویز پیش کی۔ لیکن اس کی دو بنیادوں پر مخالفت ہوئی: پہلا یہ کہ اصولی طور پر حکومت کو بذات خود بدلنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس طرح کی نظیر نقصان دہ ہوگی۔ دوسری مخالفت اس کی ساخت کو لے کر تھی۔ اس کی مخالفت میں یہ دلیل دی گئی کہ یہ ایک توسیعی کابینہ کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔

لہٰذا پارلیمنٹ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ تب اسے مسلح افواج کے حصار میں لے لیا گیا۔ کئی دنوں تک یہ حصار بندی رہی۔ پھر بھی پارلیمنٹ اپنی بات پر مصر رہی۔ تب اس کے کئی اراکین کو گرفتار کر کے علاحدہ علاحدہ جیلوں میں بھیج دیا۔

اس کے لئے احتجاجی مظاہرہ کرنے کے لئے برٹنی سے ایک نمائندہ وفد آیا۔ اس کے اراکین کو باسطیہ (جیل) بھیج دیا گیا۔

'اسمبلی آف نوٹیبلس' پھر بلائی گئی اور اسٹیٹس جنرل کی میٹنگ بلانے کے لئے پھر وہی طریقہ اپنانے کا فیصلہ کیا گیا' جو 1614 میں اپنایا گیا تھا۔

پارلیمنٹ نے طے کیا کہ اس کے لئے مجموعی طور پر 1200 اراکین میں سے 600 عام لوگوں کے درمیان سے' 300 پادری طبقہ سے اور 300 اعلیٰ طبقہ سے منتخب کئے جانے چاہئیں۔ اسٹیٹس جنرل کی میٹنگ مئی 1789 میں ہوئی۔ اعلیٰ طبقہ اور پادری طبقہ کے نمائندے دو علاحدہ علاحدہ ہالوں میں بیٹھے۔

صفحہ 186(121)

تیسرے درجہ یعنی عوام کے نمائندوں نے پادری اور اعلیٰ طبقہ کے اس اختیار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور خود کو ملک کا نمائندہ ہونے کا اعلان کرتے ہوئے اپنے ہال میں ساتھ بیٹھے قومی نمائندوں کے علاوہ' دیگر کسی بھی حیثیت کے کسی بھی ممبر کا کوئی بھی حق ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح اسٹیٹس جنرل ہی 'قومی اسمبلی' ہو گیا۔ اس نے دوسرے ہالوں میں دعوت نامہ بھیجا۔ پادری طبقہ کے نمائندوں کی اکثریت ان کے ساتھ آ گئی۔ اعلیٰ طبقہ کے 45 ارکان ان کے ساتھ ہو لئے پھر ان کی تعداد بڑھ کر 80 اور بعد از اں اس سے بھی زیادہ ہو گئی۔

1۔ اسٹیٹس جنرل- 175 سال کے طویل وقفہ کے بعد مئی' 1789 میں اس کا اجلاس ہوا۔ خزانہ خالی ہو جانے کے سبب مجبور ہو کر کنگ لوئی 14 کو سامنتوں' چرچ اور بر زوا طبقہ کے نمائندوں کی یہ میٹنگ بلانی پڑی۔ پہلے دونوں درجہ کے تقریباً 300-300 اور تیسرے درجے کے اس سے دو گنے نمائندے آئے۔ جلد ہی یہ ایک نئے سیاسی جدوجہد کا مرکز بن گیا۔ عوامی نمائندوں نے پیش قدمی کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ انقلاب فرانس کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔

صفحہ 187 (122)

ٹینس کورٹ کا حلف

اعلیٰ طبقہ اور پادری طبقہ کے شر پسند عناصر قومی اسمبلی کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کابینہ کے ساتھ مل کر سازش رچی۔ قوم کے نمائندوں کی موجودگی میں ہی ہال کا دروازہ بند کر دیا گیا اور اس پر گارڈس کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔ تب وہ ایک ٹینس کورٹ کی جانب بڑھ گئے اور وہاں سب نے مل کر قسم کھائی کہ جب تک وہ ایک آئین تشکیل نہیں دے لیتے، تب تک الگ نہیں ہوں گے۔

باسطیہ[1]

دوسرے روز ہال کا دروازہ ان کے لئے پھر کھول دیا گیا۔ لیکن چپکے چپکے تیس ہزار فوج پیرس کو گھیرنے کے لئے روانہ کی جا چکی تھی۔ پیرس کی غیر مسلح بھیڑ نے باسطیہ پر دھاوا بول دیا۔ اس طرح سقوطِ باسطیہ عمل میں آیا۔

14 جولائی 1789

ورسائی[2]

5 اکتوبر 1789۔ ہزاروں کی تعداد میں مرد و خواتین ملک کے وقار کے لئے حفاظتی افواج کے گستاخانہ برتاؤ کا انتقام لینے کے لئے ورسائی کی جانب کوچ کر گئے۔ اسے 'ورسائی[2] مہم' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہونے والے واقعات کے نتیجہ میں بادشاہ کو پیرس لایا گیا۔

صفحہ 188 (123)

ہر قوم کا ضمیر جب بیدار ہو جاتا ہے تو وہ اپنے سبھی مقاصد کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے۔

(صفحہ 112 'رائٹس آف مین')[3]

چوں کہ ہر عہد میں حکومت کا خاکہ مکمل طور پر قوم کی خواہش کا ہی معاملہ رہا ہے یعنی کہ اگر اس نے شاہی نظام کا انتخاب کیا تو ایسا کرنا اس کا حق تھا اور اس کے بعد اگر انہوں نے جمہوری نظام اپنایا تو یہ اس کا حق تھا کہ وہ جمہوری نظام ہو اور وہ بادشاہ سے یہ کہے کہ 'اب تمہارے لئے ہمارے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے'۔

1۔ باسطیہ۔ پیرس سے کچھ دور واقع باسطیہ کا قلعہ جہاں شہنشاہیت مخالف قیدیوں کو مقید رکھا جاتا تھا اور سزائیں دی جاتی تھیں۔ یہ مطلق العنانی اور ظلم و جبر کی علامت تھا۔ 14 جولائی 1789 کو غیر مسلح عوام کے اژدہام نے اس پر حملہ بول کر قبضہ کر لیا۔

2۔ ورسائی: پیرس سے کچھ فاصلہ پر واقع ورسائی کے محلوں میں بادشاہ اور اس کے وزراء کا مسکن تھا، جہاں سے وہ فوج کی مدد سے انقلاب کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ 5 اکتوبر 1789 کو ہزاروں لوگوں نے ورسائی پر دھاوا بول دیا اور کنگ لوئی 14' ملکہ میری انٹونیٹ اور اس کے عملہ کو قیدی بنا کر پیرس لے آئے۔

3۔ ٹامس پین کی تخلیق 'رائٹس آف مین' سے (دیکھیں صفحہ 114) کا حوالہ 3)

ہاؤس آف لارڈس میں' وزیر ارل آف سیلبورن [1]

صفحہ 189 (124)

بادشاہ

اگر کہیں کوئی ایسا آدمی ہو جو دیگر افراد سے اتنا زیادہ عقل مند ہو کہ اس میں ملک گیری کا ہنر ہو تو شاید شہنشاہیت کو کچھ حد تک مناسب سمجھا جا سکتا ہے لیکن جب ہم کسی ملک پر نظر ڈالتے ہیں کہ تو دیکھتے ہیں کہ اس کا ہر ایک حصہ اپنے معاملات کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے اور جب ہم پوری دنیا پر نظر دوڑاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس میں رہنے والے سبھی انسانوں میں بادشاہوں کی ہی نسل ایسی ہے جو اپنی صلاحیت میں بالکل صفر ہیں' تو ہمارا ذہن اس سوال سے پریشان ہونے لگتا ہے کہ آخر ان لوگوں کو اقتدار کیوں دیا گیا ہے؟۔

[2]112

ہتکِ عزت کرنے والے

"اگر ٹیکسوں کے ظلم و ستم کو ختم کرنے کی غرض سے شہنشائیت اور ہر طرح کی خاندانی نظام حکومت کی دھوکہ دہی اور حسد و جلن سے بھری ٹیکس پالیسی کا پردہ فاش کرنا' لاچار بچوں کی تعلیم اور ضعیفوں اور مصیبت کے مارے لوگوں کے امداد کی اسکیموں کی تجویز پیش کرنا' جنگ کے قابل نفریں چلن کو ختم کرنا' مکمل امن' تہذیب و ثقافت اور تجارت کو فروغ پیش کرنا اور سیاسی اندھ وشواش کی زنجیروں کو توڑ ڈالنا اور پسماندگی کے شکار لوگوں کو باوقار بنانا وغیرہ یہ سب چیزیں ذلت آمیز ہیں تو مجھے ایک ہتک عزت کرنے والے کی زندگی جینے دو اور میری قبر پر 'ہتک کرنے والا' کندہ کرا دینا"۔[3]"XI"

صفحہ 190 (125)

لیکن جب رتبہ نہیں بلکہ اصول عمل کو توانا کرنے کا سبب بن جاتا ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ آدمی ہر جگہ ایک ہی جیسا ہو جاتا ہے[4]۔

موت

اگر ہم امر ہوتے تو بہت دکھی ہوتے' اس میں کوئی شک نہیں کہ مرنا مشکل ہے لیکن یہ سوچنا اچھا لگتا ہے کہ ہم ہمیشہ جیتے نہیں رہیں گے"۔

1۔ پہلا ارل آف سیلبورن راونڈل پامر (1895-1812) یا اس کا بیٹا ارل دوم آف سیلبورن ولیم والڈگریو پامر (1942-1859)۔ دونوں ہی برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ پین۔ پین اور سیلبورن کے اقتباس موٹے حروف میں صفحہ پر ترچھے لکھے ہوئے ہیں۔

2۔ اور

3۔ حوالہ معلوم نہیں۔ 4۔ اور 5 یہ دونوں اقتباس موٹے حروف میں صفحہ پر درج ہیں۔

سماج وادی نظام`

”ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق، ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق“[1]

جرات مندی انقلاب کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

دانتوں[2] کا کہنا تھا ”کارروائی، کارروائی“۔ اقتدار پہلے، بحث بعد میں“۔[3]

روسی تجربہ[4]

1917-270

1۔ فیس اینڈ مائنڈ آف بولشوزم لیفٹنٹ رینے فلپ۔ ملر

2۔ رشیا لیفٹنینٹ ما کواوہارا۔

3۔ رشین ریولیوشن لیفٹنینٹ لینسالٹ لوٹن (میک ملن)

3۔ بولشووسٹ رشیا لیفٹنینٹ کارل گرین

5۔ لٹریچر اینڈ ریولیوشن۔ ٹراٹسکی

6۔ مارکس۔ لینن اینڈ سائنس آف ریوولیوشن لیفٹنینٹ اینٹن کارل گرین۔

”بولشوکوں کا فلسفہ ایک دم جارحانہ طور پر مادیت پرستی پر مبنی ہے، جس کی ایک اہم خاصیت کو ان کے سخت دشمن کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا، اور وہ یہ کہ ان میں کسی بھی طرح کے اندیشہ کی کمی ہے۔

وہ اپنے بانی کے اس اعتماد پر پوری مضبوطی سے قائم ہیں کہ ”ہر ایک چیز فطری قوانین کے ذریعہ یا ایک حد تک بہت محدود معنوں میں کہیں تو (فیزیولوجی) کے ذریعہ واضح کی جا سکتی ہے“۔ صفحہ 30

مارکس نے کہا ہے ”فلسفیوں نے اس دنیا کی مختلف طرح سے تعریف کی ہے، دراصل اہم بات تو اسے تبدیل کرنے کی ہے“۔[5]

صفحہ 192 (127)

مذہب اور سماج

مارکس کا قول تھا کہ ”مذہب انسانیت کے لئے افیون ہے“۔[6]

”سبھی جذباتی افکار بالآخر ایک طرح سے خدائی عقیدے پر پہنچتے ہیں اور اس لئے مارکس نوازوں کی نظر میں وہ خالص بکواس ہے۔ یہاں تک کہ ہیگل[1] کو بھی اس دنیا پر حکومت کرنے والی ہر اچھی اور مدلل چیز کی مستحکم شکل خدا

1۔ غیر استحصالی غیر طبقاتی غیر حکومتی اشتراکی سماج کی تعمیر کرنے والا مارکس اینگلس کا مشہور قول۔

2۔ جارج جاک دانتو (1769-1794): فرانسیسی انقلابی۔ مقرر اور فرانسیسی انقلاب کے سب سے ریڈیکل لیڈروں میں سے ایک۔ راج شاہی کو اکھاڑ پھینکنے (1792) میں اس کا اہم رول تھا۔ وہ مقامی سرکار کا چیف بنا اور شہری حفاظتی کمیٹی قائم کی جو بعد میں انقلابی دہشت قائم کرنے کا وسیلہ بن گئی۔

4۔ بھگت سنگھ نے ایک طرف کچھ کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام درج کئے ہیں اور ان کے سامنے ایک مثال لکھی ہے، جس کا حوالہ غیر واضح ہے۔

5۔ مارکس کی تھیسس آن فائرباخ سے۔ 6۔ دیکھیں نوٹ بک صفحہ 40 (37) کا حوالہ۔

میں ہی نظر آتی تھی۔ بھاودوادی اصول ہر چیز کو اسی بدقسمت' پکی داڑھی والے (یعنی خدا) کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے' جو اس کے معتقدین کی تعلیمات کے مطابق کامل ہے اور جس نے آدم کے علاوہ پسوؤں اور طوائفوں' قاتلوں اور کوڑھیوں' بھوک اور دکھ' پلیگ اور روو ڈکا کی تخلیق کی ہے تاکہ ان گناہ گاروں کو سزا دے سکے' جن کو اس نے خود ہی پیدا کیا اور جو خود اسی کی مرضی سے گناہ کرتے ہیں...... سائنسی نقطۂ نظر سے یہ اصول واہیات ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس دنیا کے سبھی واقعات کی محض سائنسی توضیح تو پوری طرح مادہ پرستی ہی پیش کرتا ہے۔

(صفحہ 32 بخارن[2]

ان کے (یعنی مادہ پرستوں کے) مطابق ابتدا صرف فطرت تھی: اس سے زندگی اور زندگی سے فکر اور وہ سبھی اشیاء جنہیں ہم ذہنی یا اخلاقی فتور کہتے ہیں۔ روح جیسی کوئی چیز ہے ہی نہیں اور تفکر ایک خاص طریقہ پر منظم ایک عمل کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے'[3]۔

(صفحہ 33)

صفحہ 193 (128)

عام بغاوت کے بارے میں مارکس کا نظریہ

پہلی بات: اگر عام بغاوت کو اس کے تلخ انجام تک پہنچانے (یعنی اس کے سبھی نتائج کو بھگتنے) کا عزم مصمم نہ ہو تو اس کے ساتھ کھلو مت۔ عام بغاوت ایسا تجزیہ ہے جس کے اندازے غیر یقینی ہوتے ہیں جو روز بہ روز تبدیل ہو سکتے ہیں۔ ان میں جن طاقتوں کی مخالفت کرنی ہوتی ہے ان کے پاس تنظیم' ڈسپلن اور روایتی اقتدار کے سبھی موزوں حالات ہوتے ہیں۔

''اگر عام بغاوت کرنے والے اپنے دشمنوں کے خلاف عظیم طاقت جمع کر لیں' تو وہ کچل ڈالے جائیں گے اور نیست و نابود کر دیئے جائیں گے''۔

دوسری بات: ''اگر عام بغاوت ایک بار شروع ہو گئی تو یہ ضروری ہے کہ پورے حوصلہ کے ساتھ کارروائی کی جائے اور جارحانہ رخ اختیار کیا جائے۔ تحفظاتی رخ ہر مسلح عام بغاوت کی موت ثابت ہوتا ہے۔ یہ دشمن سے زور آزمائی کرنے سے پہلے ہی تباہ ہو جاتا ہے۔ دشمن کو اسی وقت ہکا بکا کر ڈالنا ضروری ہے جب اس کے سبھی فوجی منتشر ہوں اور ہر روز نئی کامیابی حاصل کرنا ضروری ہے' خواہ وہ کتنی بھی چھوٹی کیوں نہ ہوں۔ پہلی کامیابی سے ملی حوصلہ افزائی کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ متذبذب افراد کو عام بغاوت کے حق میں لڑنے کے لئے تیار کرنا ضروری ہے جو ہمیشہ ہی طاقت ور کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور ہمیشہ زیادہ حفاظتی پہلو تلاش کرتے ہیں۔ ایک لفظ میں دانتوں۔ اب تک کی جانکاری میں انقلابی پالیسی کے سب سے بڑے ماہر۔ کے ان لفظوں کے مطابق کارروائی کرو: حوصلہ مندی...... حوصلہ مندی اور ایک بار پھر حوصلہ مندی......[4]

1۔ گے اورگ ولہیلم فیڈرک ہیگل (1831-1770): جرمن فلسفی۔

2۔ بخارن (1938-1888) سوویت لیڈر' رائٹر اور مدیر' بولشویک' لینن کے ساتھی رہے۔

3۔ ایضاً 4۔ اینگلیس کی تخلیق جرمنی میں کرانتی اور پرتی کرانتی سے ماخوذ۔ بھگت سنگھ نے یہ اقتباس اصل تصنیف سے نہیں بلکہ ایک دیگر کتاب سے لی تھی' اس لئے وہ اس بھرم میں رہے کہ وہ مارکس کا اقتباس ہے۔

نوٹ بک میں آئندہ تحریر صفحہ 273 پر ہے۔ صفحہ 194 سے صفحہ 272 تک سادہ ہے۔ پیچھے بھی ایسے ہی سادے صفحات یا وقفے آئے ہیں۔
ہوسکتا ہے کہ بھگت سنگھ نے اپنی 404 صفحات کی نوٹ بک میں اپنے زیر مطالعہ مختلف موضوعات کے مطابق الگ الگ حصے متعین کیے ہوں۔ یہاں اختتام شدہ حصے میں صفحہ 165 سے 193 تک ان کے نوٹس مملکت کے علم پر آزادی اور اقتدار اعلیٰ کے تصور اور ان کی ترقی پر اور ان کے تسلسل میں فرانسیسی انقلاب اور سوویت تجربہ پر مرکوز رہے۔ آئندہ حصے میں متعدد متنوع موضوعات پر ان کی نکتہ چینی اور کتابوں کے حوالے درج ہیں لیکن ان سب میں یکسانیت یہ ہے کہ زیادہ تر موجودہ ہندوستانی حالات اور دیگر متعلقہ مدعوں کے بارے میں ہیں۔ اگر وقت یا موقع ملتا تو اس کا فروغ کیسے ہوا' یہ فکر بے نظیر ہے۔

صفحہ 273 (130)[1]

''......کیا تم چاہتے ہو کہ اسمبلی کونسل مزید وسیع ہوں؟ کیا تم چاہتے ہیں کہ چند ہندوستانی تمہارے نمائندہ کے طور پر ہاؤس آف کامنس میں جا کر بیٹھیں؟ کیا تم چاہتے ہو کہ ہندوستان کی ایک بڑی تعداد سول سروس میں بھرتی ہوجائے؟ تو آؤ دیکھیں کہ کیا 50, 100, 200/300 (ہندوستانی) بھرتی ہوجانے سے سرکاری ہماری ہوجائے گی۔ بھلے ہی پوری سول سروس ہندوستانی ہوجائے لیکن سول سرونٹس کو تو صرف حکم کی ہی تعمیل کرنی ہوگی۔ وہ کوئی ہدایت نہیں دے سکتے' کوئی پالیسی وضع نہیں کرسکتے۔ ایک مرغ کی وجہ سے دن نہیں نکلتا۔ حکومت برطانیہ کی خدمت میں ایک سویلین' 100 سویلین یا 1000 سویلین بھرتی ہو کر سرکار کو ہندوستانی نہیں بنا سکتے۔ جو روایات ہیں' قوانین ہیں' پالیسیاں ہیں اور تابع داری تو ہر حالت میں سویلین کو کرنی ہوگی' چاہے وہ کالا ہو' بھورا ہو' گورا ہو اور جب تک یہ روایتیں تبدیل نہیں ہوتیں' جب تک ان کے اصولوں میں ردوبدل نہیں کیا جاتا' اور جب تک ان پالیسیاں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر تبدیل نہیں کی جاتیں' تب تک یوروپین کی جگہ صرف ہندوستانیوں کو بھرتی کردینے سے ہی ملک میں اپنی حکومت نہیں قائم ہوسکتی......''۔

اگر آج حکومت آکر مجھ سے کہے ''سوراج لو'' تو میں اس تحفہ کے لئے اظہار تشکر تو کروں گا لیکن میں اس چیز کو قبول نہیں کروں گا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے حاصل نہیں کیا ہے......''

''کوئی بھی حکومت جو ہمارے خلاف جاتی ہے' اسے ہم زبردستی اپنی مرضی کے آگے جھکنے پر مجبور کریں گے۔

......بنیادی چیز سرکار کا وقار ہے''۔

صفحہ 274 (131)

''کیا سامراجیہ کے اندر خود حکمرانی کا وجود واقعتاً ایک عملی اصول ہوسکتا ہے؟ اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اس کا مطلب یا تو ہماری کوئی اپنی حکومت نہیں ہوگی' یا انگلینڈ کا ہمارے اوپر کوئی حقیقی قبضہ نہیں ہوگا۔ کیا ہم خود حکمرانی کے تصور سے ہی مطمئن ہوجائیں گے۔

1۔ نوٹ بک صفحہ 194 سے نوٹ بک صفحہ 272 تک خالی ہے اور نوٹ بک صفحہ 273 تحریر شدہ صفحات کے بالترتیب (130) پر ہے۔

اگر نہیں تو کیا انگلینڈ ہمارے اوپر اپنے محض تصوراتی اختیار سے ہی مطمئن ہوجائے گا؟ دونوں ہی جہتوں میں انگلینڈ محض تصوراتی اختیار سے مطمئن نہیں ہوسکتا اور ہم بھی محض تصوراتی خودحکمرانی سے مطمئن ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ اور اس لئے ہندوستان میں محض خودحکمرانی اور انگلینڈ کے اس پر قبضہ کے درمیان ایسی صورت میں کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں ہے۔ اگر خودحکمرانی حقیقی ہو تو صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ خود برطانوی سامراج کے اندر انگلینڈ کی حالت کیا ہوگی؟ خودحکمرانی کا مطلب ہے خود ٹیکس لگانے کا اختیار' اس کا مطلب ہے کہ اپنا کنٹرول' اس کا مطلب ہے اپنی عوام کو غیرملکی برآمدات سے تحفظاتی اور ممنوعاتی چنگی لگانے کا اختیار۔ جس لمحہ ہم کو خود ٹیکس لگانے کا اختیار حاصل ہوجائے گا' اس وقت ہم کیا کریں گے؟۔ تب ہم صنعتی بائیکاٹ کے اس مشکل کام میں لگنے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ وہی کریں گے جو ہر ملک کرتا آیا ہے۔ آج ہم جن حالات میں جی رہے ہیں' اس کے مدنظر ہم مانچسٹر سے آنے والے کپڑے کی ایک ایک انچ پر اور لیڈس سے آنے والی ایک ایک بلیڈ یا چھری پر بھاری ممنوعاتی اور تحفظاتی چنگی لگادیں گے۔ ہم اپنے ملک میں ایک بھی انگریز کو گھسنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ آج جس طرح برطانوی سرمایہ ہندوستانی وسائل کی ترقی کے نام پر لگایا جارہا ہے' اس کی ہم قطعی اجازت نہیں دیں گے۔ ہم برطانوی سرمایہ کاروں کو ملک کی کانوں کی معدنی دولت کی کھدائی کرنے پر اسے اپنے ملک اٹھالے جانے کا کوئی اختیار نہیں دیں گے۔

صفحہ 275 (132)

ہمیں غیرملکی سرمایہ کی ضرورت ہوگی مگر اس کے لئے ہم پوری دنیا کے کھلے بازاروں سے غیرملکی قرض لینے کی درخواست کریں گے اور قرض واپسی کے لئے ہندوستانی سرکار' ملک کی ساکھ کی ضمانت دے گی ...... اور آج جس طرح سے انگلینڈ کے تجارتی مفادات ثابت ہو رہے ہیں تو عوام کی خودحکمرانی کی سمت میں' نہیں ثابت ہوں گے' خواہ یہ سرکار سامراجیہ کے ماتحت ہی کیوں نہ رہے۔ لیکن اس وقت سامراجیہ کے تئیں اس کا کیا معنی ہوگا' اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انگلینڈ کو چنگی سے متعلق کچھ ترجیحات پانے کے لئے ہمارے ساتھ کچھ معاہدہ کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ اگر انگلینڈ ہندوستان کے ہمارے بازاروں میں داخلہ کی کھلی چھوٹ چاہے گا تو اسے ہماری پیش کردہ شرائط کے تحت ہی آنا ہوگا اور ایک وقت کے بعد جب ہم اپنے وسائل کی ترقی کرلیں گے اور اپنی صنعتی زندگی کو ازسرنو منظم کرلیں گے تو ہم صرف انگلینڈ کے لئے ہی نہیں بلکہ برطانوی سامراجیہ کے ہر ایک حصہ کے لئے اپنا دروازہ کھول دیں گے۔ اور کیا تم سمجھتے ہو کہ انگلینڈ جیسا مٹھی بھر آبادی والا ایک چھوٹا سا ملک جو چاہے کتنا ہی خوشحال کیوں نہ ہو' غیر جانب داری اور مساوات کی شرائط پر ہندوستان جیسے قدرتی وسائل سے مالامال ملک کے ساتھ چیلنج لے سکے گا جس کے پاس اتنی بڑی آبادی ہے جو دنیا کے کسی بھی حصہ میں باوقار اور سنجیدہ تصور کی جاتی ہے؟

''اگر سامراجیہ کے اندر واقعی ہماری حکومت قائم ہوجائے' اگر 30 کروڑ افراد کو وہی آزادی مل جائے جو سامراجیہ کو حاصل ہے' اس وقت برطانوی سامراج کا وجود ہی نہیں رہ جائے گا۔ ہندوستانی سامراجیہ ہوجائے گا''۔

ب۔ چ۔ پال[1]

نیو اسپرٹ 1907 میں

1۔ بپن چندر پال (1932-1858): جدوجہد آزادی کے دوران بنگال میں اور دیگر سودیسی اور غیرملکی اشیاء کے بائیکاٹ کی تحریک کے اہم لیڈر: بال گنگادھر تلک' لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال یعنی لال۔ بال۔ پال'' کی تکڑی نے کانگریس میں پرجوش گروپ' کی قیادت کی۔ پال نے متعدد اخباروں جیسے نیو انڈیا' وندے ماترم' سوراج' دی انڈی پینڈنٹ اور نیو اسپرٹ کی ادارت کی ذمہ داری نبھائی۔

صفحہ 276 (133)

ہندو تہذیب و ثقافت

ہمیں ایسا محسوس ہو سکتا ہے کہ متعدد پہلوؤں کے نظریہ سے یہ ایک ایسا نا قابل تصور سچ ہے جس میں ایک جانب روحانی جذبہ کارفرما ہے تو دوسری طرف مبینہ مادیت پرستی ہے' ایک جانب اندر یہ نگرہ تو دوسری طرف اندر یہ پلسا بھی ہے' ایک طرف یہ انسانی روح کو عالمی روح کے ساتھ اقرار کرنے کا متکبرانہ دعوی کرتی ہے اور انسان کو دیوتا میں اور دیوتا کو انسان میں مدغم کرتی ہے تو دوسری طرف وہ پریشان کن نا امیدی بھی ہے جو یہ پیغام بھی دیتی ہے کہ زندگی اپنے آپ میں تکلیف دہ ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور کہ اس سے نجات اور سبھی برائیوں کے خاتمہ کا واحد علاج خاک میں مل جانا ہے۔

شرول صفحہ 26

انڈین انرسٹ

تعلیمی پالیسی

ہندوستان میں مغربی تعلیم کے آغاز کا اہم مقصد ہندوستانی نوجوانوں کو اچھی خاصی تعداد میں تعلیم یافتہ بنانا تھا تا کہ سرکاری ماتحتی عہدوں کو انگریزی بولنے والے ملک کے لوگوں سے بھرا جا سکے۔

صفحہ 34

صفحہ 277 (134)

برطانوی نوکر شاہی کے مظالم کے خلاف اپنے آپ کو سیاسی تحریکات میں جھونک دینے والے کتنے مغربی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے اپنے ملک کے لوگوں کو ان کی سماجی برائیوں کی لعنت سے نجات دلانے کے لئے کبھی انگلی اٹھائی ہے؟ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو خود اس سے آزاد ہیں' یا اگر آزاد بھی ہیں' تو کیا ان میں اپنے نظریات کے مطابق برتاؤ کی ہمت ہے؟

انڈیا اولڈ اینڈ نیو صفحہ 107[3]

صفحہ 278 (135)

کسی ہندوستانی پارلیمنٹ کا تصور مشکل ہے!

انڈین نیشنل کانگریس تقریباً ابتدا سے ہی ایک پارلیمنٹ کا طرز عمل اختیار کر چکی تھی۔ مگر ہندوستان میں پارلیمنٹ کی نہ تو کوئی گنجائش تھی' اور نہ ہے' وجہ ہے کہ جب تک برطانوی حکمرانی حقیقی شکل میں برقرار رہے گی تب تک ہندوستانی سرکار جیسا کہ لارڈ موسلی نے واضح طور پر کہا ہے' ایک مماثلہ نظام ہی ہو سکتا ہے جو بھلے ہی فلاحی ہو اور ہندوستانی نظریہ سے مکمل ہمدردی رکھے

1۔ سر ویلنٹائن شیرول (1920-1852): ایک معروف برطانوی صحافی' جس نے ہندوستان کا سترہ مرتبہ دورہ کیا۔ اس نے ہندوستان کے بارے میں دو اہم کتابیں لکھیں: انڈین ارنسٹ اور انڈیا: اولڈ اینڈ نیو۔ وہ 1890 سے 1912 تک لندن کے 'ٹائمس' اخبار کے فارن ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری تھے اور 1912 سے 1914 تک انڈین سول سروس کے رکن بھی رہے۔

2۔ انڈین ارنسٹ سے

3۔ شیرول کی کتاب

پھر بھی ایک مطلق العنان حکمرانی ہی ہوگی۔

ارنسٹ[1] 154

کانگریس کا مقصد یا نصب العین

''انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد ہندوستانی عوام کو سرکار کا ایک ایسا نظام دستیاب کرانا ہے جو بالکل ویسا ہی ہو جیسا برطانوی سامراجیہ کے تحت خودحکمرانی والے ملک چلا رہے ہیں جس میں وہ سامراجیہ کے اختیارات اور فرائض میں برابر کے حصہ دار ہوں''۔

مالویہ جی کی صدارتی تقریر 1909[2]
(کانگریس کا لاہور اجلاس)

صفحہ 279(136)

آزاد ہندوستان کا آئین

اور کوئی نہیں، بلکہ خود (ہندوستان) مادروطن ہی یہ طے کرے گی اور کرسکتی ہے کہ ایک بار جب وہ اپنا اختیار پالیتی ہے اور آزاد ہوجاتی ہے تو اس انقلاب کے ختم ہوجانے کے بعد وہ اپنی زندگی کی رہنمائی کے لئے کون سا آئین اپنائے گی...... تفصیلات سے قطع نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی امپیریل سرکار کا چیف صدر جمہوریہ بنے گا یا بادشاہ، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ انقلاب خود کو کیسے آگے بڑھاتا ہے...... مادروطن کی آزادی، اس کا اتحاد، اس کا ایک ہونا اور اس کی خواہشات اور امنگوں کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنی خواہشات کا اظہار کرسکتی ہے کہ وہ اپنے سر پر تاج شاہی پہنے یا اپنی تقدیس کو جمہوریت کے لبادہ میں رنگے۔

مگر مت بھولوائے بادشاہوں! کہ تمہارے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا اور نیا جنم لینے والے عوام تمہارے ساتھ تمہاری ہی طرح اپنا حساب کتاب برابر کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ ہر وہ شخص جو عوام کے ساتھ دغابازی کرے گا، اسے کچل کر خاک اور گردوغبار میں ملا دیا جائے گا۔ کیا تمہیں ہمارے عزم مصمم پر شک ہے؟ اگر ہے تو سن لو نام دھینگوا[3] کا اور خاموشی اختیار کرلو۔ اس شہید کا نام لے کر کہتے ہیں کہ اے ہندوستانی بادشاہوں! ان الفاظ پر سنجیدگی اور گہرائی سے غور کرو۔ جیسی مرضی ہو کرو لیکن تم وہی پاؤ گے۔ چن لو کہ تم ملک کے بانیان میں اول بنو گے یا ملک کے ظالموں میں آخری۔

صفحہ 196 انڈین ارنسٹ
'طے کرو، اور بھارتیہ شاسکو[4]

1۔ شیرول کی انڈین ارنسٹ: بھگت سنگھ نے شیرول کی کتاب سے تفصیلی نوٹ لئے ہیں۔ خاص کر اس میں لیڈروں کی تقاریر اور پرچوں سے۔ گزشتہ بپن چندر کا طویل اقتباس اور آگے آیا مدن موہن مالویہ کا اقتباس اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

2۔ پنڈت مدن موہن مالویہ (1861-1946) اہم قومی لیڈر اور ماہر تعلیم 1909-1918 میں کانگریس صدر 1915 میں بنارس ہندو یونیورسٹی قائم کی اور 1919-1939 تک اس کے وائس چانسلر رہے۔ وہ ہندو مہاسبھا کے بھی صدر رہے۔

3۔ مدن لال دھینگوا لندن میں 'انڈین ہوم رول سوسائٹی' اور 'انڈین ہاؤس گروپ' سے وابستہ نوجوان انقلابی۔ اس کی تشکیل انقلابی شیام جی کرشن ورما نے لالہ ہردیال، ساورکر اور دھینگوا جیسے محب وطن نوجوانوں کو ساتھ لے کر کی تھی۔ مدن لال دھینگوا نے بنگ بھنگ اور اس کے بعد ملک میں چلنے والی تحریکات پر بے رحمانہ مظالم کے خلاف سر ولیم کرزن واریلی کو لندن میں یکم جولائی کو گولی مار کر قتل کردیا۔ بعد ازاں انہیں پھانسی دے دی گئی۔

4۔ 'طے کرو، او بھارتیہ شاسکو' عنوان کا یہ پرچہ ملک کے انقلابیوں نے ہندوستان کے راجاؤں / ریاستوں کے حکمرانوں کے نام ارسال کیا تھا۔ ایک حکمراں نے اسے شیرول کو دیا تھا جس نے اس کے دو حصے اپنے کتاب 'انڈین ارنسٹ' میں شامل کیے۔

اچھوت

سیاسی نظریہ سے ہندوستانی آبادی کے لاکھوں لاکھ لوگوں کا اپنے حکمرانوں کے تئیں عقیدت کے سبب تبدیلی مذہب ایسے امکانات کے دروازے کھول دے گا کہ میں ان کا تفصیلی ذکر ضروری نہیں سمجھتا ہوں۔

صفحہ 184[1]

قتل نہیں یگیہ [2]

سونے کی دولت کے لالچ میں انسانی بھیس میں چند ملکی وحشی اور درندے ہندوستان کی پیشانی پر دھبہ پولیس نے ویریندر گھوش[3] وغیرہ ان عظیم سپوتوں کو گرفتار کرلیا جو اپنے ذاتی مفادات قربان کرکے اور بم بنانے جیسے 'یگیہ' کی مقدس تکمیل میں اپنی زندگی وقف کرکے اپنے ملک کی آزادی کے لئے کام کر رہے تھے۔ ان وحشی اور درندوں میں سب سے بڑا وحشی آسوتوش وشواس[4] ان بہادر سپوتوں کو پھانسی کے تختہ پر پہنچانے کا راستہ صاف کرنے لگا۔ لیکن شاباش چارو[5] (اشوتوش وشواس کو ختم کرنے والے) تمہارے ماں باپ لائق پرستش ہیں۔ تم نے ان کے فخر میں اضافہ کیا' اعلیٰ درجہ کی شجاعت کا مظاہرہ کیا جو اس لافانی زندگی کی پروانہ کرتے ہوئے' اس درندے کی اس دنیا سے چھٹی کردی۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب گوروں نے چھل بل سے ہندوستان کو ہندوستانی (اصل تین میں مسلمانوں سے) سے اچکوں کی طرح جھپٹ لیا۔ اور وہ کمینہ شمس العالم[6] جس نے اس عالم گیر بادشاہ[7] کا راستہ اپنایا جس نے سونے کی دولت پانے کے لالچ میں اسلاف کے نام پر دھبہ لگایا۔ آج اس بدعمل اور ذلیل شخص کو تم نے ہندوستان کی اس مقدس سرزمین سے مٹا دیا ہے۔ نرین گوسائی[8] سے لے کر تلت چکرورتی تک سبھی اس کمینہ جعل ساز شمس العام کی جعل سازیوں اور تکلیف دینے کے نتیجے میں سرکاری گواہ بن گئے۔ اگر تم نے وحشیوں کے ان معاونین کی چھٹی نہیں کی ہوتی تو کیا ہندوستان کے لئے کوئی امید باقی رہ جاتی؟

1۔ شیرول کی کتاب 'انڈین ارنسٹ' باب 'دولت ذاتوں' سے ماخوذ۔ بھگت سنگھ نے شیرول کی کتاب 'بھارتی اشانتی' کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس سے متعدد اقتباسات اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔

2۔ قتل نہیں یگیہ: اس کے مکمل ماخذات شیرول کی کتاب انڈین ارنسٹ (میک مل اینڈ کمپنی' لندن سے 1910 میں شائع شدہ) کی نکتہ چینی والے حصہ سے لیا گیا ہے۔ اس میں 'دی ریمول آف انفارمرس' (جاسوسوں کا خاتمہ) عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔ کہ "شمس العالم کے قتل کے فوراً بعد درج ذیل اپیل' انقلابیوں نے کلکتہ میں جاری کی:

بدھ نائے یگیہ (قتل نہیں یگیہ)

نقد انعام: ایک یوروپی یا دو جاسوسوں کا سر قلم کرنے پر

50 ویں شمارہ' کلکتہ اتوار چیترا' کی 1316

3۔ ویریندر گھوش: اروند گھوش کے چھوٹے بھائی اور انقلابیوں کے مانک تلا گروپ کے ایک لیڈر جو علی پور سازش کیس (مئی 1909) کے ملزم تھے' وہ 'یوگانتر' نامی انقلابی اخبار بھی نکالتے تھے۔

4۔ اشوتوش وشواس: انقلابیوں کو سزا دلانے کے لئے سبھی غلط طریقے اپنانے والا انگریز پرست ایک سرکاری وکیل جسے علی پور پولیس کورٹ کے باہر انقلابی چارو چندر گوہا نے گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

5۔ چارو چندر گوہا: ایک بہادر ترین جس نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پیدائشی طور پر نہ ہونے کے باوجود باغی سرکاری وکیل اشوتوش وشواس کو گولی ماردی۔ اسے 10 مارچ 1909 کو کو پھانسی دے دی گئی۔

6۔ شمس العالم: برطانوی پولیس کا سی آئی ڈی انسپکٹر جو انقلابیوں کی سراغ رسانی کرتا تھا۔ اسے ویریندر ناتھ دت نے 24 جنوری 1910 کو گولی سے اڑا دیا۔ اس نوجوان انقلابی کو 21 فروری 1910 کو پھانسی دے دی گئی۔ 7 عالم گیر بادشاہ: مغل بادشاہ اورنگ زیب جس نے دہلی کی بادشاہت پانے کے لالچ میں اپنے تین بھائیوں دارا' شجاع' اور مراد کو قتل کرادیا۔ 8۔ نوٹ بک صفحہ 281 نہیں ہے مگر صفحہ (137) کے بعد صفحہ نمبر (138) کی ترتیب درست ہے۔

کئی لوگ یہ شور وغل کر رہے ہیں کہ بغاوت گناہ عظیم ہے۔ لیکن بغاوت ہے کیا؟ کیا ہندوستان میں کوئی ایسی چیز ہے جس کے خلاف بغاوت کی جائے؟ کیا ایک فرنگی کو ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کیا جاسکتا ہے' جس کے محض چھونے سے' جس کے سایہ محض سے ہی ہندو اپنا شدھی کرن کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں؟

یہ محض مغربی لٹیرے ہیں جو ہندوستان کو لوٹ رہے ہیں...... انہیں نکال باہر کرو۔ اے ہندوستان کے سپوتو! وہ تمہیں جہاں کہیں بھی ملیں' ان پر اور ان کے ساتھ جاسوسوں اور خفیہ ایجنٹوں پر کوئی رحم مت کرو۔ گزشتہ سال صرف بنگال میں ہی 19 لاکھ لوگ بخار چیچک' ہیضہ' پلیگ اور دوسری بیماریوں سے فوت ہو گئے۔ تم اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھو کہ تم بچ گئے' لیکن یاد رکھو کہ تم کل بھی پلیگ اور ہیضہ کی گرفت میں آسکتے ہو۔ کیا تمہارے لئے بہتر نہیں ہوگا کہ تم بہادروں کی موت مرو؟۔

جب خدائے برتر کا یہی قانون ہے تو ذرا سوچو کہ کیا اس مبارک موقع پر ہندوستان کے ہر ایک سپوت کا فرض نہیں ہے کہ وہ ان گورے دشمنوں کا قتل عام کرے؟ [(صفحہ 282 (138)][1] اپنے آپ کو پلیگ اور ہیضہ سے مت مرنے دو' ایسا کر کے مادر ہند کی مقدس سرزمین کو پراگندہ مت کرو۔ ثواب و گناہ میں فرق کرنے کے لئے ہمارے لئے ہمارے دشمن ہمارے رہنما ہیں۔ ہمارے دشمن بار بار ہمیں بتاتے ہیں کہ ان گورے کمینوں اور ان کے معاونین اور شریک مجرموں کو قتل کرنا لازمی یگیہ کے برابر ہے۔ آؤ سب کے سب آؤ۔ آؤ ہم سب مل کر اس بلی ویدی پر اپنی یگیہ آہوتی نچھاور کریں اور دعا کریں کہ اس یگیہ میں سارے گورے سانپ اس کے شعلوں میں ویسے ہی بھسم ہو جائیں جیسے جنمے جے یگیہ میں سانپ نیست و نابود ہو گئے تھے۔ یاد رکھو یہ قتل نہیں' یگیہ ہے۔

(صفحہ 342' نوٹس) آئی یو[2]

"ہندوستان میں مجموعی طور پر 62,00,000 ووٹر ہیں یعنی ہندوستان کی مجموعی آبادی کے $2\frac{3}{4}$ فی صد ہیں جس میں وہ علاقے شامل نہیں جن پر 1919 کا قانون لاگو نہیں ہوتا تھا"۔

194

آئی او این[3]

صفحہ 283 (104)[4]

انڈیا اولڈ اینڈ نیو: شیرول وی

"برٹش لوگ یہ جان لیں کہ اگر وہ انصاف نہیں کرنا چاہتے تو یہ ہر ایک ہندوستانی کا اولین فرض بن جائے گا کہ اس سامراجیہ کو نیست و نابود کر دے"۔

مہاتما جی[5] (ناگپور کانگریس)

1۔ نوٹ بک صفحہ نمبر 281 نہیں ہے۔ مگر صفحہ نمبر (137) کے بعد صفحہ نمبر (138) کی ترتیب ٹھیک ہے۔

2۔ شیرول کی کتاب انڈین ارنسٹ۔

3۔ شیرول کی کتاب: انڈیا اولڈ اینڈ نیو۔

4۔ نوٹ بک صفحہ 282 کے بعد صفحہ 283 کی ترتیب تو درست ہے مگر (138) کے بعد (139) نہیں بلکہ (140) دیا گیا ہے۔

5۔ مہاتما گاندھی: شیرول کی کتاب 'انڈیا اولڈ اینڈ نیو' سے ماخوذ۔

دیہات اور شہر کا سوال

کچھ سرکاری دانشوری اس شکل میں دکھائی گئی تھی کہ جغرافیائی حالات پر غور کئے بغیر دور افتادہ شہروں کو ایک انتخابی حلقہ میں رکھ دیا گیا تھا تاکہ ایسے شہری افراد کو جو کہ (سرکار کے) نہ چاہتے ہوئے بھی ترقی یافتہ سیاسی نظریہ پا چکے تھے' ان دیہی انتخابی حلقوں میں امیدوار بننے سے روکا جاسکے جن میں اگر مذکورہ نظم نہیں کیا گیا ہوتا تو کئی ایک چھوٹے شہر قدرتی طور پر شامل ہو جاتے۔ یہ ایک آخری کوشش تھی جو اس یقین کی بنیاد پر تھی کہ پنجاب کی آبادی کو بکریوں اور بھیڑ کی طرح تقسیم کیا جاسکتا تھا جس میں بکریاں 'دغاباز افراد' شہری لوگ اور بھیڑیں 'لائق یقین' کسان فرقہ کے لوگ تسلیم کئے گئے تھے۔[1]

خالصہ کالج 1892 میں قائم ہوا۔[2]

صفحہ 284 (141)

ہندوستان جیسا میں نے جانا[3]

''ایک 'مہاتما' کی راہ سچ مچ مشکل ہے اور یہ تعجب خیز نہیں کہ گاندھی نے حال ہی میں اس خطاب کو اور اس کی ذمہ داریوں کو چھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان میں ان کا اثر و رسوخ مسلسل کم ہوتا جا رہا ہے۔ پھر بھی ان کا سنیاسی بننا اور اعلی اخلاقی سچائیوں کی شکل میں ان کے ذریعہ انتہائی مہارت سے مزین کئے جانے والے غیر واضح اور غیر عملی تولستو یہ مارک اصول بہت سارے لوگوں کو بامقصد ہونے کے بھرم میں مبتلا کرتے ہیں اور جذباتی انگلینڈ کے کمزور دل والے اور فرانس کے چند منطقی لوگ بھی اس بھرم میں مبتلا ہیں' جو مشرق سے ایک نئی روشنی کی امید لگائے ہوئے ہیں''۔

صفحہ 65

جاسوس

آئرش سازش میں جو قابل نفریں لیکن مفید طبقہ عام طور پر (جاسوسوں کی) کی سپلائی کیا کرتا تھا' اس کی بنیاد کیوں خشک ہوگئی' اس کے اہم اسباب میں سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایک یو بھی رہا ہے کہ حکمراں اپنے جاسوسوں کو چھپانے اور بچانے میں ناکام رہے (جیسے جیمس کیری کے معاملے میں' جب کہ اسی نے انقلابیوں کی جاسوسی کی تھی اور اسی کے عوض میں برینڈی' فٹز ہربرٹ اور ملین کو فنکس پارک کے دو قتل یعنی چیف سکریٹری اور انڈر سکریٹری کے قتل کے بدلے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اس جاسوس کی ایک نوجوان انقلابی اوڈانیل

1۔ ماخذ نامعلوم: غالباً انڈیا اولڈ اینڈ نیو سے ماخوذ

2۔ اصل میں صفحہ نیچے کی طرف حاشیہ پر ترچھا لکھا ہوا۔

3 سر مائیکل اوڈ وائر (1823-1885) کی کتاب کا عنوان: انڈیا ایج آئی نیو اٹ' جو 1925/28 میں لندن سے شائع ہوئی۔ 1988 میں جل پبلی کیشن' دہلی سے دوبارہ شائع ہوئی۔ اوڈ وائر پہلی جنگ عظیم کے دوران پنجاب کا لیفٹننٹ گورنر تھا' اس نے پنجاب سے بڑے پیمانے پر نوجوانوں کو جبراً فوج میں بھرتی کیا' لوگوں کو جنگ کے لئے سرکار کو قرض دینے پر مجبور کیا اور سیاسی لیڈروں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا۔ جلیان والا باغ کیس کی اس نے حمایت کی۔ بعد میں اودھم سنگھ نے لندن میں اس کا قتل کر دیا۔

4۔ اس حصہ میں اوڈ وائر نے آئرلینڈ کے انقلابیوں کے ذریعہ حکومت برطانیہ کے جاسوسوں کے صفایا کی مثال دیتے ہوئے پنجاب میں خود اس کے ذریعہ انقلابیوں کے خلاف اپنائے گئے طریقوں کا ذکر ہے۔

نے ڈربن میں دن دہاڑے گولی مار کر ہلاک کردیا)۔[1] گو کہ قتل کرنے والا گرفتار ہوا۔ جنگ عظیم سے قبل اور اس کے دوران پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر کے طور پر میرا کئی انقلابی سازشوں سے سامنا ہوا۔ جن کا پردہ فاش کرنے میں جاسوسوں نے اہم رول ادا کیا اور ہماری چوکسی اس قدر جامع اور مکمل تھی کہ ایک بھی معاملے میں کسی بھی مخبر پر کوئی آنچ نہیں آئی۔

صفحہ 285 (142)

میں سمجھ سکتا ہوں کہ اپنی ذلت آمیز چال بازی' غیر معمولی اہمیت (اہمنیتا)؟ ڈربھی سندھی رچنے کے اپنے پیدائشی رجحان اور حقائق پر پردہ ڈالنے کی صلاحیت سے پوری طرح لیس ہندوستانی سازشی کیسے اس ماحول میں آرام سے کام کرتے تھے۔

صفحہ 187 انڈیا ائز آئی نیو رٹ[3]

آریہ سماج

درحقیقت آریہ سماج مغربی اثر کے خلاف ایک قومی بیداری ہے۔ یہ اس فرقہ کے بانی دیانند کے مستند گرنتھ' ستیارتھ پرکاش میں اپنے معتقدین سے اپیل کرتے ہیں کہ ویدوں کی طرف لوٹیں اور آریوں کے تخیلاتی زریں ماضی میں سنہرے مستقبل کی تلاش کریں۔ ستیارتھ پرکاش غیر ہندو حکومت کے خلاف دلائل بھی دیتا ہے اور کچھ سال پہلے اس فرقہ کے اہم اخبار نے تو دیانند کو ہی سوراج کے اصولوں کی تبلیغ کا دعویٰ کیا بھی کیا۔

لیکن 1907 میں جب کچھ شرپسند عناصر نے آریہ سماج کے خلاف افواہیں پھیلانی شروع کیں تو اس فرقہ نے اپنے قدیم مذہبی اصولوں کا اعادہ کرتے ہوئے اس سلسلے کی ایک اپیل شائع کرنے کی عقل مندی دکھائی کہ اس تنظیم کا کسی بھی سیاسی یونٹ یا کسی بھی قسم کی سیاسی تحریک سے کوئی ربط ضبط نہیں ہے۔ اب اگر ایک یونٹ کے طور پر سماج کو منتشر کرنے کے اس دعوے کو تسلیم بھی کر لیں' تب بھی سخت گیر ہندوؤں کے لئے یہ بات غور طلب ہونی چاہئے کہ بھلے ہی' آریہ سماج میں پنجاب کی ہندو آبادی کے پانچ فی صد سے زیادہ لوگ شامل نہیں ہیں پھر بھی 1907 سے لے کر آج تک ہندوؤں کی ایک بڑی آبادی بغاوت اور دیگر سیاسی مقدمات کے تحت سزا یافتہ ہوتی رہی' وہ اس سماج کا ہی حصہ رہی ہے۔

صفحہ 184 ایضاً

صفحہ 286 (143)

ہندوستان کے بارے میں عددی تخمینے

انگلینڈ اور ویلس 4/5 آبادی شہروں میں رہتی ہے۔

1۔ جب آئرش انقلابیوں نے فنکس پارک میں چیف اور انڈر سکریٹری کو قتل کر ڈالا تو انہیں گرفتار کرنے اور پھانسی پر چڑھانے میں جیمس کیری نے مخبر کا رول ادا کیا' حالاں کہ اس کو بھی پیٹرک اوڈانیل نامی انقلابی نے گولی مار کر قتل کر دیا جس سے ہندوستانی انقلابیوں کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔

2۔ اوڈوائر کی کتاب انڈیا ایز آئی نیو اٹ سے ماخوذ۔

3۔ اوڈوائر کی کتاب۔

شہری زندگی کا پیمانہ وہاں	ہندوستان (برطانیہ)
سے شروع ہوتا ہے جب 1000 لوگ	مجموعی طور پر
ایک ساتھ رہنے لگتے ہیں۔ صرف	2,44,000,000
میونسپل کارپوریشن (نگر پالیکا) کی طرف سے	میں سے
پانی کا نکاس، روشنی اور پانی کی سپلائی کا نظم	266,000,000 لوگ
کیا جاسکتا ہے۔	گاؤں میں رہتے ہیں

انگلینڈ عام وقتوں میں	
مہیا کرتا ہے	58 فی صد (آبادی کا) صنعت کو 8 فی صد زراعت کو
ہندوستان دیتا ہے	71 فی صد زراعت کو
	12 فی صد صنعت کو
	5 فی صد تجارت کو
	2 فی صد گھریلو خدمات کو
	1½ آزادنہ پیشوں کو
	1½ فوج سمیت سرکاری خدمات کو۔

-پورے ہندوستان میں 31 کروڑ 50 لاکھ افراد میں سے 22 کروڑ 60 لاکھ لوگ زمین پر انحصار کرتے ہیں۔

--ان میں سے 20 کروڑ 80 لاکھ لوگ براہ راست زراعت پر گزر بسر یا انحصار کرتے ہیں

مانٹ فورڈ رپورٹ[1]

صفحہ 288 (144)

مجموعی رقبہ 1,800,000 مربع میل

برطانیہ عظمیٰ سے بیس گنا بڑا

-700,000 مربع میل یا 1/3 سے زیادہ ریاستوں کے ماتحت ہے۔ ہندوستانی ریاستوں کی تعداد 600 ہے۔

-برما فرانس سے بڑا ہے۔ مدراس اور بمبئی (صوبہ) علاحدہ علاحدہ اٹلی سے بڑے ہیں۔

ہندوستان کی مجموعی آبادی (1921 کی مردم شماری کے مطابق)۔

318942,000

یعنی مجموعی نسل انسانی کا 1/5

-247,000,000 آبادی برطانوی ہندوستان میں اور

71,900,000 ریاستوں میں ہے۔

25 لاکھ افراد انگریزی پڑھنا جانتے ہیں- فی ایک ہزار مردوں میں سے 16 اور فی ایک ہزار خواتین میں سے 2

ملکی زبانوں کی مجموعی تعداد 222 ہے۔

گاؤں کی مجموعی تعداد[2] 500,000

1۔ مانٹ فورڈ رپورٹ: ہندوستانی آئینی اصلاحات پر تیار کی گئی رپورٹ۔ اسے مانٹ فورڈ رپورٹ اس لئے کہا گیا کہ اسے سکریٹری آف اسٹیٹ مونٹیگیو اور گورنر جنرل چیمس فورڈ نے مشترکہ طور پر تیار کیا تھا۔ یہ رپورٹ 8 جولائی 1918 کو پیش کی گئی۔ 2۔ مذکورہ بالا سبھی تخمینوں کا وسیلہ غالباً مانٹ فورٹ رپورٹ۔

صفحہ 288(145)

سوئز نہر 1869 میں کھلی

اس وقت ہندوستان کی مجموعی درآمد تھی:

80 کروڑ روپے = 80,000,000

27-1926 اور اس کے پہلے کے دو برسوں میں اس کا اوسط تھا:

350 کروڑ روپے یعنی تقریباً 262,500,000

مجموعی آبادی = 31 کروڑ 90 لاکھ

جس میں سے 3 کڑور 20 لاکھ 50 ہزار یعنی 10.2 فی صد افراد قصبات اور شہروں (شہری خطے) میں رہتے ہیں۔

جب کہ انگلینڈ میں یہ 79 فی صد ہے۔

اور کام کا سب سے مشکل مرحلہ ہوگا جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے ذہن میں کچھ بہتر کرنے کی خواہش کو جاگزیں کرنا۔

صفحہ 22، سائمن رپورٹ[2]

1۔ تخمینوں کا ذریعہ نامعلوم۔

2۔ سائمن رپورٹ: رپورٹ آف دی انڈین اسٹیوٹری کمیشن (سائمن کمیشن لندن، 1930) سائمن کمیشن حکومت برطانیہ نے 1927 میں تشکیل دیا تھا۔ 1928 میں اس کے ہندوستان دورے کے خلاف لاہور میں پولیس کی لاٹھیوں سے لالہ لاجپت رائے شہید ہوئے۔ اسی کا انتقام لینے کے لئے برطانوی پولیس آفیسر سانڈرس کو قتل کیا گیا جس کے جرم میں بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی۔

صفحہ 304[1]

بھگت سنگھ

کے مختصر دستخط

مورخہ 12.09.1929

مدیر (بھوپندر ہوجہ) کا نوٹ

جس حیرت انگیز طریقہ پر ان نوٹس میں ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی جانب چھلانگ ہے یا بیچ بیچ میں رکاوٹ ہے اس سے قاری کے اندر امید کی کرن بھی بیدار ہوتی ہے۔ اور شاید خالی پن اور درد کا احساس بھی۔ بالآخر کئی سوال تشنہ ہی رہ جاتے ہیں۔

آخر بھگت سنگھ اس نوٹ بک میں اپنی زیر مطالعہ کتابوں کے نوٹس کس مقصد کے لئے لے رہے تھے۔؟ آخر وہ چاہتے کیا تھے؟ ان نوٹس کے ذریعہ وہ اپنے ہم عصروں یا جانشینوں......لیکن ممکنہ سامعین سے کیا کہنا چاہتے تھے؟

کچھ اور ضروری سوال بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان کے آدرش کیا تھے؟ ان کے نصب العین اور مقاصد؟ ان کا طرز عمل اور پالیسیاں؟ بھگت سنگھ اور ان کے بہادر ساتھی کیا کرنے کی کوشش کر رہے تھے؟

شیو ورمانے بھگت سنگھ کے جیل میں اپنے آخری اور نہ ختم ہونے والے دنوں چار کتابیں لکھے جانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتابیں جیل سے باہر تو بھیج دی گئیں، مگر بد قسمتی سے 1942 کی تحریک کے دوران کھو گئیں۔ یہ کتابیں تھیں:

1۔ سماج واد کا آدرش

2۔ آتمار کشا

3۔ بھارت کے کرانتی کاری آندولن کا اتہاس

4۔ مرتیو کے دوار پر

چند دیگر مصنفین نے بھی یہی یا کچھ مختلف عنوانات بتائے ہیں۔

یہ یقین کرنے کا کچھ جواز کہ بھگت سنگھ نے ان کتابوں کے لکھنے کی تیاری کے لئے بطور مواد یہ نوٹس لئے۔ ہمیں امید ہے کہ انہوں نے ان چار پانڈولپیوں کی تیاری میں ان کا چند اس استعمال بھی کیا۔ یقینی طور پر جیل میں تصنیف کا پس منظر یہ نوٹس بنے۔ چوں کہ اب چاروں پانڈولپیاں گم شدہ ہیں، ایک شہید کی نوٹ بک، میں شامل یہ نوٹس ہی ہمارے پاس صرف دستیاب متبادل ہیں۔

۔ بھوپندر ہوجہ

1۔ نوٹ بک میں صفحہ 289 سے صفحہ 303 تک کچھ نہیں درج تھا۔ مگر صفحہ 305 سے لے کر 404 تک کے صفحات کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ کل 304 صفحات دستیاب ہیں جن پر ربر کی مہر سے نمبر ڈالے گئے ہیں۔ یہ نمبر کب اور کس نے ڈالے یہ واضح نہیں ہے۔ بقیہ سو صفحات کیا ہوئے؟ وہ غائب ہو گئے یا کسی دیگر کام کے لئے استعمال کئے گئے یہ بھی واضح نہیں ہے۔

بھگت سنگھ نے کل 145 صفحات پر مشتمل نوٹس لئے ہیں جن میں بیچ بیچ میں خالی صفحات ہیں۔

بھگت سنگھ پر کچھ اہم کتابیں

ہندی

1۔ بھگت سنگھ اور ان کے مرتجے پر کھے ۔ویریندر سندھو
2۔ سردار بھگت سنگھ: پتر اور دستاویز ۔ویریندر سندھو
3۔ شہید بھگت سنگھ کی چنی ہوئی کرتیاں ۔ شیو ورما
4۔ سنسمرتیاں ۔شیوورما
5۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے دستاویز ۔ جگموہن سنگھ/چمن لال
6۔ امر شہیدوں کے سنسمرن ۔ راجارام شاستری
7۔ دیش کی دھروہر ۔ بھگوان داس ماہور/شیو ورما
8۔ 'چاند' پھانسی نمبر (نومبر 1928) ۔چتر سین شاستری
9 سنہاولوکن ۔یشپال
10۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی ۔ اجے گھوش
11۔ بھگت سنگھ اور ان کا یگ ۔ منمتھ ناتھ گپت
12۔ بھگت سنگھ: ایک جیون ۔ ہنس راج رہبر
13۔ امر شہید بھگت سنگھ ۔وشنو پربھاکر
14۔ امر شہید سردار بھگت سنگھ ۔ جتندر ناتھ سانیال
15۔ بھگت سنگھ سے میری ملاقاتیں ۔ سوہن سنگھ جوش
16۔ میرے بھائی: شہید سکھ دیو ۔ متھرا داس تھاپر
17۔ میرے کرانتی کاری ساتھی: بھگت سنگھ ۔ ادارت: ویریندر سندھو
18۔ نوسامراجیہ واد کے خطرے اور بھگت سنگھ کی انقلابی وراثت ۔ چمن لال
19۔ گولو لکریا بھگت سنگھ ۔مدیر: راجیندر رشرما
20۔ سردار بھگت سنگھ (مہاکاویہ) ۔شری کرشن سرل
21۔ پھانسی لاہور کی ۔ مرتب: گرودیو سنگھ سدھو
22۔ انقلاب (ناول) ۔مرنالنی جوشی۔

انگریزی

1. A Martyr's Notebook- Ed. Bhupendra Hooja
2. The Trial of Bhagat Singh-A.G. Noorani
3. Militant Nationalism in Punjab-Kamlesh Mohan
4. why I am an Atheist-Bipin Chandra

5. Martyr: Bhagat Singh: Experiments in Revolution-Kuldeep Nayyar
6. Shaheed Bhagat Singh: K. K khullar
7. Bhagat Singh & His Ideology: S. R. Bakshi
8. Sardar Bhagat Singh: The Man and His Ideology: Gurudev Singh Deol
9. Bhagat Singh: The Prince of Martyrs: L. P. Mathur
10. Jail Note Book and other Writings: Compiled by Chamanlal
11. Liberation's Blazing star: P.M. S. Grewal
12. To make the Deof Hear: S. Irfan Habibi
13. Selected Collections on Bhagat Singh: Edited by M.M Juneja
14. The Hanging of Bhagat Singh: Malwinderjit Singh Waraich & Gurudev singh Siddhu
15. Sardar Bhagat Singh: Jitendra Nath Sanyal
16. Bhagat Singh: Making of A Revolutionary: Edited by K.C.Yadav & Babar Singh
17. A Revolutionay's Quest for Sarifice: Srirajyam Sinha

❑❑❑

''میں ثقافتی خوبیوں' جیسے بے لوث ملک کی خدمت'
ایثار' اعتماد پر قائم رہنا' کو پورے خلوص سے
اپنا کر آگے بڑھنے کی کوشش میں ہوں لیکن
توہمانہ افکار کو جو قدیم عہد کی
فہم کے مطابق ہے' بعینہ تسلیم کرنے کو
قطعی تیار نہیں ہوں کیوں کہ سائنس نے
خوب ترقی کی ہے اور سائنسی خیالات
اپنا کر ہی مستقبل کے مسائل حل ہو سکتے ہیں......''۔

-بھگت سنگھ

قیمت: 210 روپے

پبلی کیشن ڈویژن
وزارت اطلاعات ونشریات
حکومت ہند